علم الانسان ما لم یعلم

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی

شعبہ
شمار
عدد داخلہ

Rare
891.43905
Call No. [illegible]
Acc. No

ادبِ لطیف

روری ۱۹۴۱ء

عصمت چغتائی

سعادت حسن منٹو

احمد ندیم قاسمی

حسن عباس

گوپال متل

ادو لاہور 5as,

Rare
891.43905
16941
AD^B

numbers
34057
Date 17.XI.76

ادارہ
چوہدری برکت علی
باری علیگ
بیدی

ادبِ لطیف

چندہ سالانہ
چار روپے ۴؍
فی پرچہ ۵؍

مینیجر رشید احمد

جلد ۱۲ | فروری ۱۹۴۱ء | شمارہ ۵

مندرجات

نمبر شمار	نگارندہ	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	نگارندہ	عنوان	صفحہ
۱	ادارہ	اشارات	۲	۱۵	سید مقبول حسین احمد پوری	یہ سنسار ہے پریم کا مارگ	۳۸
۲	احمد ندیم قاسمی	عیش کی اُجرت	۳	۱۶	روش صدیقی	غزل	۳۹
۳	گوری لعل سری واستو	ہندوستان کا ادبی مستقبل	۴	۱۷	سیدہ اختر حیدر آبادی	شمع و پروانہ	۳۹
۴	عصمت چغتائی	سفر میں	۸	۱۸	سید ضمیر جعفری	ایک چاندنی رات	۴۰
۵	پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں	انوکھ سنگھ کی بیوی	۱۱	۱۹	مرتضیٰ احمد خاں میکش	دردِ نارسائی	۴۱
۶	خواجہ حسن عباس	میکسم گورکی کی ڈائری	۱۵	۲۰	سعادت حسن منٹو	وہ خط جو پوسٹ نہ کئے گئے	۴۲
۷	احمد ندیم قاسمی	بیکاری	۱۷	۲۱	محمود ہاشمی	باتھال روڈ پر	۴۷
۸	کیلوش فیلی	دہقان	۲۱	۲۲	محترمہ ح۔ب۔ مخفی	کلام حسرت پر ایک نظر	۵۱
۹	باری	دو جنگوں کے درمیان	۲۴	۲۳	کلا نچوی بی۔اے	ڈاکٹر	۵۳
۱۰	گوپال متل	ایک حسن فروش لڑکی کے نام	۳۴	۲۴	یرق یوشی	ولیم بلیک	۵۶
۱۱	سید عطا حسین کلیم	انتظار	۳۵	۲۵	میکسم گورکی	جیل کی زندگی	۵۸
۱۲	مختار احمد خاں مختار	دیہات کے تین مناظر	۳۶	۲۶	اقتباسات	گرد و پیش	۶۴
۱۳	اشرف ریاض ایم۔اے	غزل	۳۷	۲۷	ادارہ	نقد و نظر	۶۸
۱۴	سکندر علی وجد	کلام وجد	۳۷	۲۸	اشتہارات	مشتہرین	۷۰

اشارات

پنجاب میں اُردو دسمبر کے پہلے ہفتہ میں آل پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیرِ اہتمام پنجاب اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں ہوا تھا جسے اہلِ پنجاب کا فیصلہ کہا جاسکے۔ اس کانفرنس کے بعد نئے سال کے آغاز میں پنجاب ہندی ساہتیہ سمیلن کا لاہور میں اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں پنڈت صاحب نے اس راز کا انکشاف کیا۔ کہ ہندوستان کی ۸۵ فیصدی آبادی ہندی بولتی پڑھتی اور سمجھتی ہے۔ اگر پنڈت صاحب کے اس نظریہ کو تسلیم کرلیا جائے۔ تو پھر ہندی اردو کا کوئی جھگڑا باقی نہیں رہنا چاہیئے۔ ہندی والے باقی ماندہ ۱۵ فیصدی کو بھی آہستہ آہستہ ہندیا لیتے ہیں۔ مدراس بنگال مہاراشٹر، گجرات اور سندھ کی اکثر آبادی ہندی سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ پنڈت جی کو پنجاب سے پہلے ان صوبوں کے باشندوں کو ہندی پڑھانا چاہیئے جہاں تک پنجاب کی زبان کا تعلق ہے۔ وہ بلاشبہ اُردو ہے۔ ہندی کے بڑے بڑے حامیوں نے لاہور سے ہندی زبان میں روزنامے جاری کئے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی اردو کے مقابلہ پر نہ ٹھہر سکا۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح پنجاب زبان کے جھگڑوں سے پاک تھا۔ لیکن اب محض سیاسی مصالح کے پیشِ نظر اس صوبہ میں بھی زبان کی آڑ میں فرقہ واری کے شعلوں کو ہوا دی جارہی ہے۔ حالانکہ پنجاب ہی وہ سرزمین ہے۔ جہاں سے اس زبان نے سر نکالا۔ اردو کا اولیں شاعر لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اسی صوبہ میں مختلف اقوام کے زیرِ اثر اردو نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ پنجابی بدستور بولی جارہی ہے۔ لیکن اس نے ایک بولی کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ پنجاب کی قومی زبان اردو ہے۔ یہ پنجاب کے قومی تمدن کی ترجمان ہے۔ کس قدر ستم ہے۔ کہ ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے یہ کہا جا رہا ہے۔ کہ اردو صرف پنجاب کے مسلمانوں کی زبان ہے۔ حالانکہ دوسرے ملکوں سے آنے والے مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ فارسی اور پنجابی سے ملاپ سے جو زبان پیدا ہوچکی ہے۔ اسے صرف مسلمانوں کی زبان کہنا ایک بہت بڑی ناانصافی ہے۔ اس زبان میں فارسی سے زیادہ دیسی زبان کے الفاظ موجود ہیں۔ فارسی الفاظ ہماری زبان میں اس طرح گھل مل گئے ہیں۔ کہ اب ان کے بولنے والوں کو پتہ تک نہیں کہ صبح سے شام تک وہ سینکڑوں فارسی کے الفاظ بولتے ہیں۔ اور یونہی بھی کیوں نہ جبکہ فارسی صدیوں تک پنجاب کی سرکاری زبان رہ چکی ہو۔ ہندی اور بنگالی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے۔ کہ ان زبانوں کا سرمایۂ الفاظ فارسی سے ماخوذ ہے۔

گزشتہ ایک صدی سے پنجاب کی سرکاری، علمی، تمدنی اور سماجی زبان اردو چلی آرہی ہے۔ .... اب اس زبان میں کونسی خامیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ جو اسے صرف پنجاب کے مسلمانوں کی زبان بتایا جارہا ہے؟

بالشویک ادیب جیمز جائس کو انگریزی ادب کے نقادوں نے بالشویک ادیب کہا۔ لیکن ایچ جی ویلز اسے انگریزی انشاپردازی میں سوفٹ کے بعد درجہ دیتا ہے۔ جیمز جائس نے گزشتہ ماہ چھپن سال کی عمر میں لندن کے ایک ہسپتال میں انتقال کیا۔ وہ ۱۸۸۲ء میں بمقام ڈبلن پیدا ہوا۔ ابسن کا اسکی اپنی زبان میں مطالعہ کرنے کے لئے اس نے ناروی زبان کا مطالعہ کیا۔ وہ عمر بھر اپنی کتاب یولی سس لکھنے میں مصروف رہا۔ آزاد خیالی میں یہ کتاب اس حد تک آگے بڑھی ہوئی تھی کہ برطانیہ کے کسی پبلشر نے اس کتاب کو شائع کرنے کی جرأت نہ کی۔ آخرکار ایک فرانسیسی فرم نے اسے شائع کیا۔

نئی کتابیں مکتبہ اردو لاہور کی طرف سے جنوری ۱۹۴۱ء میں دو کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ "جاگیرداری" میں ازمنہ وسطیٰ کے ذرائع پیدائش سے پیدا شدہ تمدن پر بحث کی گئی ہے۔ پدرسری نظام نے انسانی جماعت کو ہر جگہ جاگیردارانہ نظام بخشا تھا۔ اس نظام کے بطن سے جو نیا نظام پیدا ہوا۔ اسے معاشیات میں سرمایہ دارانہ نظام کہتے ہیں۔ اس نظام کی بنیادیں دوسرے عناصر کے علاوہ مشین اور مزدور پر قائم ہیں۔ دوسری کتاب جو مکتبہ اردو لاہور کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔ وہ بابی کی مشین مزدور ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ تاریخی بھی ہے اور معاشی بھی۔

احمد ندیم قاسمی

عیش کی اُجرت

(سانیٹ)

رقص گاہوں میں ہے آوارہ نگاہوں کا ہجوم
دِل کے شیشوں سے چھلکتی ہے ہوس کی صہبا،
نوجوانوں میں ہے پابندئ مذہب کا گِلا،

ہدفِ طعن ہیں اخلاق کے فرسودہ رسوم
ایک مے نوش نے ساقی کی بلائیں لے لیں

ایک بدمست نے رقّاصہ کے لب چوم لئے
قہقہے مار کے، جو جام مِلے، توڑ دیئے

بکھری زُلفوں سے مچلتی ہوئی باہیں کھیلیں
نصفِ شب تک یہ گناہوں کی گھٹائیں گونجیں

ایک ہنگامہ سا ناگاہ کہیں سے اُٹھا
وسعتِ شہر پہ بجلی کی طرح پھیل گیا

چند معصوم، المناک صدائیں گونجیں،
ایک مزدور نے، بیٹی کو نہ گھر پہ پا کر
جان دے ڈالی ہے افیون کی گولی کھا کر

گوری ہرن سری واستو

ہندوستان کا ادبی مستقبل

ایک صدی پہلے لٹریچر کے پرکھنے کا جو معیار تھا۔ وہ اب نہیں ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم نے بین الاقوامی ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور موجودہ جنگ کی بدولت اور بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ آج سے نصف صدی قبل جب ڈارون نے مسئلہ ارتقا کی بنیاد رکھی۔ تو تمام دنیا کے خیالات بدل گئے۔ مذہب کو زبردست ٹھیس لگی۔ لٹریچر میں انقلاب آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سائینس سارے دنیا پر چھا جانے لگا۔ اور لٹریچر کی جس قدر اسے ضرورت ہوگی۔ اسی قدر قائم ہوگا۔ باقی فنا ہو جائیگا۔ لیکن بعد میں مذہب اور سائینس کا میل ہوگیا۔ اور لٹریچر اس شدید نقصان سے بچ گیا۔ آج بھی ادب العالیہ کی وہی قدر ہے۔ جو ڈارون سے پہلے تھی۔ اور اگر حالات سازگار رہے۔ تو یہ قدر بڑھتی جائے گی۔

ہندوستان کا ادبی مستقبل بھی دنیا کے ادبی مستقبل سے وابستہ ہے۔ انگریزی کے مشہور مستقبل بین ایچ۔ جی۔ ولز نے اپنی مشہور کتاب دنیا ۲۰۰۰ء میں لکھا ہے۔ کہ لٹریچر اس وقت تک صرف پریس اور پلیٹ فارم تک محدود رہ جائے گا۔ کتابوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ کیونکہ لوگوں کو پڑھنے کی فرصت نہ رہے گی۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ کہ ہم اس رائے سے لفظ بہ لفظ اتفاق کریں۔ کیونکہ ہمارا لٹریچر اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہے ابھی اس میں ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ آئندہ نصف صدی کا زمانہ ہندوستان کے ادب کے لئے ترقی کا دور ہوگا۔ ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر تنزل اور انحطاط شروع ہوتا ہے۔ وہ منزل ہمارے لئے بہت دور ہے۔

ہندوستان میں دورِ قدیم۔ دورِ متوسط اور دورِ جدید کی تہذیبوں میں تصادم ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصادم کا نتیجہ کلیتہً کسی ایک کے حق میں نہیں ہوگا۔ آئندہ جو تہذیب قائم ہوگی۔ اس میں ان تمام تہذیبوں کی اچھی باتیں لے لی جائیں گی۔ اور بری باتیں ترک کر دی جائیں گی۔ سنسکرت فارسی اور ہندوستانی کی ایک خوشگوار آمیزش ہوگی جس سے مستقبل کے ہندوستانی ادب اور زبان کا خمیر تیار ہوگا اس میں علوم جدیدہ اور مذاہب قدیمہ ہر ایک کیلئے یکساں جگہ ہوگی۔ جس طرح یورپ میں عیسائیوں اور یہودیوں کا ادب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ادب ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوگا۔ اگرچہ مذہب کے اعتبار سے ان دونوں قوموں کے خیالات میں بعض اختلافات ہمیشہ قائم رہینگے

ہندوستان ایک ملک نہیں۔ بلکہ براعظم ہے۔ اس کے مختلف صوبے یورپ کے مختلف ملکوں کے برابر ہیں۔ اسلئے صوبائی ادب اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ البتہ بول چال کے لئے ایک ایسی زبان پیدا ہوگی جو تمام ملک میں آسانی سے سمجھی جائے گی۔ یہ زبان انگریزی یا کوئی مغربی زبان نہ ہوگی۔ بلکہ ہندوستانی جو تمام صوبائی زبانوں کی کم و بیش آمیزش سے بنے گی۔ اس میں ہر ایک قوم کے کلچر کی آئینہ داری ہوگی۔ اور دورِ جدید کے ترقی یافتہ تمدن کا عنصر غالب ہوگا۔ جب سارے ہندوستان کے لئے ایک عام زبان پیدا ہو جائے گی۔ تو اسکے بعد لازمی طور پر ایک مشترک ادب پیدا ہوگا۔ چنانچہ ہندی اور اردو ایک دوسرے میں گھل مل جائیں گی۔ اور ہندی کے شعرا و مصنفین کا انتخاب اردو نیز اردو کے شعرا و مصنفین کا انتخاب ہندی میں پڑھا جائے گا۔ الفاظ اور تلفظ کا جو فرق ہے۔ وہ خود بخود دور ہو جائے گا۔ جب ہندی اردو ایک دوسرے سے آشنا ہو جائیں گی۔ تو ان کے سمجھنے میں بھی کسی کو دقت نہیں ہوگی۔ یہ حالات اس وجہ سے اور زیادہ سازگار ہیں۔ کہ ہندی اردو میں بہت سی باتیں موضوع اور زبان دونوں اعتبار سے عام ہیں۔ اس عنصر کو اور زیادہ ترقی دی جائے۔ تو بہت ممکن ہے۔ کہ

کہ ہر حیثیت سے ہندی اردو ایک ہو جائیں گی۔ یہ خیال جو عام طور پر پھیلا ہوا
ہے کہ ہندی اردو ایک دوسرے سے مختلف زبانیں ہیں۔ اور کبھی مل
نہیں سکتیں۔ دو دس برس کے اندر خود بخود باطل ثابت ہوگا۔ ہندی
اردو ایک زبانیں ہیں۔ صرف ہندو و مسلمانوں میں معاشرتی خلیج حائل
ہونے کی وجہ سے ان میں اختلاف بڑھ گیا ہے۔ جب ہندو و مسلمان
دونوں اپنے ملک اور قوم کے لئے برابر کی ذمہ داری محسوس کریں گے
تو ان میں تمدنی اختلاط بھی پیدا ہوگا۔ اس تمدنی میل جول کا نتیجہ یہ
ہوگا۔ کہ ہندی اردو ایک دوسرے کے محاسن سمیٹ لیں گی۔ اور
ہندوستانی زبان پیدا ہوگی۔ آج بھی ہندی میں ہزاروں اردو کے
الفاظ اور اردو میں ہزاروں ہندی کے الفاظ موجود ہیں۔ اردو میں
ضرورت سے زیادہ جو فارسی عربی کے الفاظ مستعمل ہو جاتے ہیں اور
ہندی میں ضرورت سے زیادہ جو سنسکرت اور آریائی زبانوں کے الفاظ
جگہ پا جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت وہی ہے۔ جو سوسائٹی میں غیر ضروری
انسانوں کی ہوتی ہے مستقبل کا ہندوستان ضروری کو قائم رکھے گا۔
اور غیر ضروری کو نکال باہر کرے گا۔ جب غیر ضروری عناصر نکالے
جائیں گے۔ تو سر دست میں کوئی بنیادی اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ ہندی
میں جس قدر ہندوؤں کی مذہبی کتابیں اور ہندو سوسائٹی کے حالات
شائع ہوں گے۔ اسی قدر ان میں قرب پیدا ہوگا۔

تقریباً بیس برس سے ہندوستان کے لٹریچر پر سیاست کا گہرا
رنگ چڑھا ہوا ہے۔ ادب سیاسی لیڈروں کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔
ان کی رائے ادبی معاملات میں ادیبوں سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے
یہ تکلیف دہ بات ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں
ادب اور سیاست دو مختلف چیزیں ہیں۔ گو سیاسی کتابوں کو بھی ان
کے لٹریچر میں ایک اہم مرتبہ حاصل ہے۔ مستقبل کا ہندوستان ادب
میں سیاست کے دخل در معقولات کو برداشت نہ کر سکے گا۔

ہندوستان کی تاریخ میں پانچ ہزار برس سے اب تک عوام کو
لٹریچر سے بے بہرہ رکھا گیا ہے۔ ہندی میں صرف کبیر داس کا زمانہ ایسا
گزرا ہے۔ جب بہت سے شاعر اور ادیب دیہاتوں اور عام طبقوں میں
پیدا ہوتے۔ یہ ادبی چھوت چھات ہندوستان کے لئے سم قاتل
ثابت ہوا ہے۔ گزشتہ دس سال سے برابر یہ کوشش کی گئی ہے۔ کہ عوام
کو اس قابل بنا دیا جائے۔ کہ وہ ہمارا لٹریچر پڑھ سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ
بہت سا ایسا لٹریچر پیدا ہوا ہے۔ جو عوام سے متعلق ہے۔ یورپ میں
نشاۃ الثانیہ سے لے کر اب تک جو لٹریچر پیدا ہوا وہ بالعموم سرمایہ داروں
سے متعلق تھا۔ اور ان کے قلم کا پیداوار تھا۔ سرمایہ دارانہ لٹریچر نے
رومانیت اور مادیت کو بہت فروغ دیا۔ لیکن انقلاب روس نے
لٹریچر کا رخ پھیر دیا۔ نظم کی جگہ نثر نے لی اور رومان کی جگہ حقیقت نگاری
نے لی۔ دنیا میں اب تک ڈیڑھ صدی سیاسی معاشی اور تمدنی تحریکیں
سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی تھیں۔ لیکن اب بہت تحریکیں۔ کسانوں
اور مزدوروں کی طرف سے ہو رہی ہیں جس کی بدولت دنیا کا تقریباً ایک
چوتھائی معیاری ادب نچلے طبقوں سے متعلق پیدا ہو گیا ہے۔ ایک صدی کے
بعد یہ تعداد اور بڑھ جائے گی۔ ہندوستان پر بھی اس عالمگیر ادبی رجحان کا
اثر پڑتا تھا۔ ہر صوبائی زبان میں اشتراکیت اور بین الاقوامیت کا دور دورہ
ہے۔ انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں کوئی ادب نہ تھا۔ صرف بول چال
کی باتیں تھیں۔ جو چند میل سے دور تک نہ سمجھی جاتی تھیں۔ پھر خاص خاص
طبقوں کی بولیاں قائم ہوئیں۔ یہی بڑھتے بڑھتے صوبوں کی زبان بنیں
زبان نے جب جلا پائی۔ تو ادب کی صورت اختیار کی۔ لیکن اس ادب
کا حلقہ موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق محدود ہو رہا ہے۔ یہ کہا جاتا
ہے۔ کہ دنیا کی کوئی زبان دس کروڑ سے زیادہ آدمیوں کی مادری زبان
نہیں بن سکی ہے۔ چنانچہ انگریزی صرف انگلستان کے لوگوں کی مادری
زبان ہے یہاں تک کہ نو آبادیات کے لوگ بھی ادبی انگریزی میں کانٹ
چھانٹ کر رہے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ دنیا کی تمام زبانیں قومیت
کے محدود دائرہ میں ابھری رہی ہیں۔ تھوڑے دنوں سے زبانوں کو
بین الاقوامی بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ انگریزی کے بولنے
والے دنیا میں سب سے زیادہ ہیں۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لگ بھگ
پچاس کروڑ آدمی تمام دنیا میں انگریزی بولتے ہیں۔ اور اس زبان میں
خط و کتابت کرتے ہیں۔ انگریزی کے بعد فرانسیسی اور پھر جرمن کا سب سے
زیادہ رواج ہے۔ روسی زبان نے گزشتہ ربع صدی میں بہت مقبولیت
حاصل کی ہے۔ ہندوستان ابھی دوسرے دور میں ہے۔ مستقبل میں

وہ تیسرے دور میں شامل ہوگا۔ یعنی صوبائی زبانوں سے مل کر قومی زبان پیدا ہوگی۔ یہ بیس برس کے اندر ہی ہو جائے گا۔ غالباً سنہ ۶۰ تک ہندستانی زبان دنیا کے چپے چپے میں سمجھی جائے گی۔ اسکے امکانات اور زیادہ قوی اس وجہ سے ہو جاتے ہیں۔ کہ ہندوستان سے دنیا کا کوئی ملک بے نیاز نہیں

ہندوستانی زبانوں کا سرمایۂ ادب اتنا کم نہیں ہے۔ جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ تامل۔ تلگو۔ کنڑی اور ملیالم ہر ایک زبان میں طبعزاد تصانیف اور ترجمے ہیں۔ خصوصاً جنگِ عظیم کے بعد جو ادبی بیداری تمام دنیا میں پیدا ہوئی۔ اسکا براہِ راست اثر ہندوستان کے تمام صوبوں پر پڑا ہے۔ ایک نے اپنے اپنے لٹریچر کو ترجموں سے بھر دیا۔ اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ نصف صدی میں سائنس نے جو ترقی کی ہے۔ اسکے باعث تمام علومِ جدیدہ پر نئی نئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور نئی نئی اصطلاحات گھڑے گئے۔ بیس برس کے اندر تمام ہندوستان کیلئے علمی اصطلاحات ایک ہو جائیں گی گرامر ایک ہوگی۔ اور لسانیات کے اصول بھی ایک ہونگے۔

موجودہ جنگ کے اثر سے ہندوستان کو بھی دنیا کی طرف متوجہ ہونا پڑا ہے۔ ہندوستان کی خصوصیت ہر تمام دنیا سے الگ رہتی لیکن اب اسے اپنا رویہ بدل دینا پڑا ہے۔ چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے بین الاقوامی جلسوں میں ہندوستان کے نمائندے شریک ہونے لگے ہیں۔ مجلس بین الاقوام کی صدارت جب سے ایک ہندوستانی کو نصیب ہوئی۔ ہندوستان کی اہمیت دنیا کی نظروں میں بڑھ گئی ہے۔ اب تک تین ہندوستانیوں کو نوبل پرائز مل چکا ہے۔ اس سے علمی دنیا میں ہندوستان سر اٹھانے کے قابل ہوا ہے۔ اس زمانہ میں جب مادیت نے تمام دنیا کو آ دبوچا ہے۔ ہندوستان کی قدیم روحانیت کا ہر ملک میں تذکرہ ہونے لگا ہے۔ ہندوستان کی قدیم زبانیں تمام دنیا کے علمی حلقوں میں پڑھی جانے لگی ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور تمدنی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا یہ کوشش اور بھی استوار ہوتی جائے گی۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ ہندوستان کو جلد سیاسی معاملات میں بڑے اختیارات مل جائیں گے۔ غرض ایک طرح ہندوستان کا شمار جمہوریات اور آزاد ملکوں میں ہونے لگیگا۔ اس وقت بھی ہندوستان پچاس برس تک انگریزی سے پیچھا نہیں چھڑا سکے گا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ یورپ کی زبانوں کا بیشتر لٹریچر ہماری زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ لیکن وہ ترجمے اس قدر ناقص ہیں۔ کہ ایک بار پھر ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت پڑے گی۔ اس وقت انگریزی کتابوں کی مدد درکار رہیگی۔ انگریزی کے ذریعہ فرانسیسی۔ روسی اور جرمن ادب کی اچھی اچھی کتابیں بھی ہم تک پہنچتی رہیں گی۔ میرا اندازہ ہے۔ کہ یہ سلسلہ دو سو برس تک قائم رہے گا فرانسیسی۔ جرمن اور روسی زبانوں کے پھیلنے کا اس ملک میں امکان نہیں ہے۔ کیونکہ انگریزی ان زبانوں کے خیالات ہم تک پہنچانے کو کافی ہے۔ سائنس کی جسقدر ترقی ہوگی۔ اسی قدر انگریزی کی قدر بڑھتی جائے گی۔ آزاد ہندوستان میں سائنس کی اس وقت کو زیادہ قدر ہوگی۔ لیکن جب ہندوستانی میں اصطلاحات مکمل ہو جائیں گی۔ اور مشین کا رواج عام ہو جائے گا۔ تو انگریزی کا رواج کم ہو جائے گا۔ ہمارے ملک میں مشینوں سے کام کرنے والے مزدور عموماً انگریزی نہیں جانتے۔ اسلئے انہوں نے مشین کے مختلف پرزوں کے لئے نئے الفاظ گھڑ لئے ہیں۔ یہ یقینی ہے۔ کہ یہی الفاظ بعد میں اصطلاحات قبول کر لیں گے۔ ہاں ان میں ذرا تراش خراش کی ضرورت ہوگی۔

ہمارے ملک میں مشرق اور مغرب کا جو تصادم ہو رہا ہے اس کی اہم ترین صورت مشین اور چرخے کا مقابلہ ہے۔ ہندوستان میں مشین کا مستقبل کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اسلئے زیادہ تر آبادی چرخے کا استعمال کرے گی۔ کیونکہ اس سے ہر ایک کو روٹی مل جائے گی۔ اسکا اثر زبان پر یہ ہوگا۔ کہ اس میں دیسی پن آ جائے گا۔ اسی طرح زراعت اور صنعت میں بھی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ ہندوستان کو زراعت کی طرف ہی مائل ہونا پڑے گا۔ پس زراعت سے متعلق اتنے نئے الفاظ پیدا ہونگے۔ کہ ہمیں دوبارہ ڈکشنری لکھنی پڑے گی۔

ہمارے مستقبل کے لٹریچر کا بہت کچھ انحصار ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر ہے۔ اور یہ خود جنگ کے نتائج پر مبنی ہے۔ اگر جنگ کے بعد ہندوستان کو سیاسی آزادی مل گئی۔ تو لٹریچر میں قدیم بنیاد پر نئی عمارتیں بنیں گی۔ اگر برطانیہ کی فتح ہوئی۔ اور ہندوستان

غلام رہا۔ تو اشتراکی لٹریچر کی بھرمار ہو جائے گی۔ اور تمام علوم و فنونِ لطیفہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اگر جرمن، روسی یا جاپانی اس ملک میں گھس آئے تو کوئی ایسی چیز ہی نہ ہوگی۔ جسے لٹریچر کہا جا سکے۔ اگر ان کے حملے کے بعد ہندوستان کی تہذیب سلامت رہی۔ تو ایک صدی میں پھر کہیں ادب کا مرجھایا ہوا باغ پھولے پھلے گا۔

بہرحال یہ قیاس کی باتیں ہیں۔ ہندوستان کی قدیم ترین زبانیں عنقریب کتابوں میں دفن کر دی جائیں گی۔ صوبائی لٹریچر بھی محدود طبقوں میں ہوگا۔ اصل زبان جسے سب لوگ بولیں اور سمجھیں گے۔ وہ سینما اور ریڈیو کی زبان ہوگی۔ سینما اور ریڈیو حال کی ایجادیں ہیں۔ اسلئے ان کی زبان اب تک بہت ناقص رہی ہے۔ لیکن دس برس کے اندر یہ زبان بہت منجھ جائے گی۔ اور سارے ہندوستان میں بولی جائے گی۔ اس زبان میں جان ڈالنے کے لئے صوبائی اور قدیم زبانوں کے فصیح الفاظ استعمال کئے جائینگے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پبلک کی توجہ پریس سے ہٹ کر پلیٹ فارم کی طرف کھنچے گی۔ جیسا مغربی ممالک میں ہو رہا ہے۔ لیکن پریس اپنی طاقت قائم رکھے گا۔ کیونکہ تقریر جب تک اخباروں کے ذریعہ مشتہر نہیں کی جاتی۔ اس وقت تک وہ بہت کم لوگوں تک پہنچتی ہے۔ البتہ ضخیم کتابوں کا رواج کم ہو جائے گا۔ لوگ ہر بات کا خلاصہ جاننا چاہیں گے۔ اس کی ادبی خوبیوں کا مزہ لینے کے لئے تفصیل کے جھمیلے میں نہیں پڑینگے اسلئے ادبی کتابوں کی جگہ فنی کتابیں مثلاً معاشیات اور سائنس وغیرہ کی زیادہ رائج ہو جائیں گی

لٹریچر کی کثرت کے باعث لوگ پھر تصویر اور بت کی طرف رجوع کریں گے۔ لوگ یہ نہ چاہیں گے۔ کہ کسی انسان یا چیز کا ذکر خشک کتابوں میں پڑھیں۔ بلکہ انہیں دیکھنے کی کوشش کریں۔ اور جب اس کوشش میں وہ کامیاب ہونگے۔ تو تصویر کشی اور بت تراشی کی طرف مائل ہونگے ایسی حالت میں شاعری کا مستقبل بھی زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آج کل دنیا حقیقت کو تخیل پر ترجیح دیتی ہے۔ صدیوں سے ہماری شاعری خیالی رہی ہے۔ اسلئے اسے اپنا رویہ بدلنا پڑے گا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اس طرح آرٹ کا خون ہو جائے گا۔ لیکن آرٹ صرف آرٹ کے لئے نہیں ہے۔ اس کا مقصد ہے زندگی کی عکاسی کرنا۔

مختصر یہ کہ دس برس میں ہندوستان میں ہندوستانی پھیل جائے گی۔ جو مختلف زبانوں اور تہذیبوں کی آمیزش کا نتیجہ ہوتے ہوئے بھی فطری ہوگی۔ اسکے بعد کوئی رسم الخط قائم ہوگا۔ جب علم اس قدر عام ہو جائے گا۔ تو مزدور اور کسان کا لٹریچر بھی سرمایہ دار لٹریچر کے پہلو بہ پہلو جگہ پائے گا۔ شاعری کے بہت سے لطیف عناصر فنا ہو جائیں گے جہاں کہیں فن کی پابندیاں قائم رہیں گی۔ وہاں خیالات نثر کے ہونگے۔ کسی بات کو گھما پھرا کر نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں ادا کر دیا جائے گا۔ پلیٹ فارم کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ تحریر کی جگہ تقریر لے گی گو تحریر بالکل فنا نہیں ہو سکتی۔ انگریزی اور دوسری یورپین زبانیں اس وقت تک قائم رہیں گی۔ جب تک ان کا بہترین لٹریچر ہندوستانی میں منتقل نہ ہو چکے گا۔ سائنٹیفک لٹریچر کو دن بدن اہمیت حاصل ہوتی جائے گی کیونکہ یہ سائنس کی ترقی کا زمانہ ہے۔ سائنس کی بعض ایجادات انسان کے لئے مفید ہیں۔ اور بعض غیر مفید۔ ان دونوں کا رواج ہندوستان میں ہوگا۔ مفید کا تو اس وجہ سے کہ ہندوستان کو اپنی اقتصادی زندگی سدھارنی ہے۔ اور غیر مفید اس وجہ سے کہ ہندوستان کو دنیا کے ہر ملک سے حملہ کا ڈر ہے۔ اس لئے اس جنگ کا ہندوستان کے ادبی مستقبل پر بڑا اثر پڑے گا۔ ہندوستان قومیت کے دائرہ سے نکل کر بین الاقوامیت کی طرف مائل ہو جائیگا اسلئے اس کا لٹریچر بھی دوسرے ملکوں میں پھیلے گا۔ سینما اور ریڈیو کا رواج بڑھتا جائے گا۔ ان کے ذریعہ تعلیم ہوگی۔ اور تمدنی فلاح کا بہت کام ہوگا۔ انہیں کی زبان ہندوستان کی آئندہ زبان ہوگی اور جب ان میں ترقی پیدا ہوگی۔ تو انہیں کا ادب سب سے زیادہ رائج ہوگا۔ یہ سب کتنے عرصہ میں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اسی صدی کے اندر۔

ادب لطیف میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں

عصمت چغتائی

سفر میں

کاش یہ ریلیں ذرا کم ہلا کریں۔ اگھڑ گھڑ۔ پھٹ۔ پھٹ۔ جوڑ جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ کہ پھٹے اب نکلے اور اب نکلے۔ ریل میں بیٹھ کر انسان کن کن۔ عجیب و غریب زاویوں سے ہلنے ٹاڑا تڑپنا۔ پھر گول گول چکروں کی صورت میں اور پھر سر شمال سے جنوب کی طرف اور کندھے مشرق اور مغرب کی سمتوں میں جنبش کرتے ہیں۔ اور ٹنگی ہوئی ٹانگیں۔ مثلث بنانا شروع کر دیتی ہیں۔ پانی کا گلاس کئی دفعہ فشانہ باندھنے کے باوجود بھی کبھی ٹھوڑی اور کبھی ناک سے ٹکرا کر نوہا پانی چھلکا دیتا ہے۔ اس سے تو چھکڑے ہزار درجہ بھلے تھے۔ جب چلتے چلتے انسان تھک جائے۔ تو ٹھہر تو سکتا ہے۔ مگر یہاں ریل میں تو بس چلو۔ چلو اور پاگل ہو جاؤ۔

سامنے بیٹھا ہوا انسان ہلنے کے ساتھ ساتھ پھسلنے بھی لگا۔ اس کی ٹانگ جو پہلے ہی ران تک کھلی ہوئی تھی۔ اور بھی آگے کھلنے لگی۔ نہ جانے کس عجیب طریقہ سے دھوتی باندھی تھی۔ کہ گزوں کپڑا پیٹ ہونے کے باوجود ہر جنبش خطرناک طور پر اُسے برہنہ کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔ کاش وہ جاگ جائے۔ . . میں نے دعا مانگنا شروع کی۔ کاش وہ ایک دم ہی تڑپ کر اس کپڑوں کی گٹھڑی میں سے نکل آئے! یہ سسک سسک کر جو اُس کی دھوتی۔ کھسک رہی ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہے۔ کہ وہ ایک دم فیصلہ کر دے! تین اسٹیشنوں سے یہی جان کنی سی طاری ہے۔ بڑی معیوب سی بات ہے۔ لیکن ایسے موقع پر خواہ مخواہ نظر اٹھتی ہے۔ اور ہے یہ بڑی عجیب بات کہ کوئی اُسے کچھ نہیں کہتا۔

میری سیٹ سے ذرا ہٹ کر ایک پوری سیٹ لبالب ایک عورت سے بھری ہوئی تھی۔ پہاڑ کی پہاڑ عورت نہ جانے کیسے ایک بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ ساری رات بچہ دودھ پیتا رہا۔ اور وہ بالکل غافل سوتی رہی۔ جب کوئی اسٹیشن آ جاتا۔ تو بچہ کوؤں، کوؤں کر کے چیڑ چیڑ۔ منہ مارنے لگتا۔ عورت کا پلپلا پلپلا جسم ہر جنبش پر مختلف سمتوں میں ہلا رہا تھا

بچہ پیٹ پر چھپکلی کی طرح چپکا ہوا برابر دودھ پی رہا تھا۔ گیا وہ پیدا ضروری کام کے لئے ہوا ہے۔ وہ رات بھر دودھ پیتا رہا۔ اب پی ر نہ جانے اُسے ابھی کتنا اور پینا تھا۔ اور ننھا ہونے کی وجہ سے اُس کی پچکی جاتی تھی جس میں سے غلاظت کے بلبلے نکل کر ہوا میں پھوٹ رہ

کاش بچہ ذرا دودھ کم پیتا۔ اور وہ ننگی ٹانگ والا مسافر سنبھال لیتا۔ تو میرا سفر اتنا تلخ نہ ہوتا۔ ریل کے جھٹکوں نے نئے اختیار کر لئے تھے۔ اور جسم کو ذرا مختلف اطراف میں ہلنے میں نسبتاً ل رہا تھا۔

جب تک ریل چلتی رہتی ہے۔ ڈبہ کی بدبو ذرا دبی رہتی ہے۔ ریل ہی پسینہ اور میلے کپڑوں کے بھبکے اٹھنے لگے۔ باہر چند لفنگے نوجوا نے ٹہلنا شروع کیا! کاش کوئی ہمارے نوجوانوں کو آوارگی سکھا جی ہاں آوارگی بھی ایک ہنر ہے! مجھے یاد ہے۔ کہ چور لیے پر سے گزرتے ایک انگریز سپاہی کھڑا رہتا تھا۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ پر وہ کچھ س سے ٹوئی، کر کے سیٹیں بجاتا تھا۔ کہ لطف آ جاتا تھا۔ اور اس کی کبھی سے جھپکتی تھی۔ تو ہم لوگ بے اختیار مسکرا دیتے تھے۔ ذرا غور کیجئے۔ بچہ جس کی دھوتی نئی کروٹ لینے کے بعد اور بھی خطرناک ہو چلی تھی۔ ریل کے اور پھر غلط فہمی کا شکار بیسویں صدی کے نوجوانوں کی بد مذاقی۔ جی چاہا اُن میں سے ایک کو بلا کر کہوں۔ "بھائی یہ شعر جو تو گنگنا رہا ہے۔ بہت ہے۔ "شعلہ طور" میں سے کوئی جلتا ہوا شعر پکڑ اور تیرے بالوں میں آونلے کا تیل ہے۔ آدھ درجن سروں کے لئے کافی ہوتا۔ اور تیری بائیں مونچھ دائیں مونچھ سے ذرا اونچی کٹی ہے۔ اُبھر اُبھر کر تیرے ذوق کی دا دے رہی ہے۔ اور پان اتنا مت چبا۔ تیری کچلیں بہت نمایاں ہیں۔ پان کی پیک میں لتھڑ کر بڑی بھیانک ہو رہی ہیں۔ اور تو اتنی ڈھیلی دھو مت پہن۔ اور کرتا بھی بہت بڑا ہے۔ یہ جو تو نے سینما میں اشوک کمار

وغیرہ کو بے گریبانوں کے بڑے بڑے تھیلے پہنے دیکھا ہے۔ وہ تیرے اس ٹخنے سے قد پاچے نہیں لگتے۔ اور . . . ہمگر وہ ایک نئی بیاہی دلہن کو ڈبے میں سے جھانکتے۔ دیکھ کر عجیب بھیانک حرکتیں کرنے میں مشغول بھلا میری کیوں سُننے لگا۔ آہ میری آنکھیں! جی چاہا مٹھی بھر کے ریت اٹھا کر جھونک لوں ریل کا کوئلہ نہ جانے کتنا گھس گیا! میراجی بُری طرح متلا رہا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ سارا دودھ جو وہ بچہ پی رہا ہے۔ اور پی چکا ہے۔ میرے ہی حلق سے گزر رہا ہے۔ اور منہ کا مزہ بدلنے کے لئے میں نے ڈبیا میں سے تنکے توڑ کر چبانا شروع کئے!

دو قلی ہنسی مذاق میں باہم گتھم گتھا عجیب وغریب گالیاں دے رہے تھے مینے سوچنا شروع کیا۔ کہ دوسری قوموں کی گالیاں کسقدر پھوہڑ اور غیر دلچسپ ہیں۔ ہندوستانی دماغ کم از کم گالیوں کی ایجاد میں تو سب قوموں سے آگے ہے۔ جس نکتے پہ گالیوں میں ہمارے یہاں زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اُس کا اور لوگوں کو گمان ہی نہیں۔ ہزاروں آرٹ تو دنیا میں لاپرواہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارے ہندوستانیوں کے آرٹ کو تباہ ہی کر ڈالا گیا۔ انگوٹھے کاٹ ڈالے گئے۔ کپڑا بنانے والوں کے آپ اُس بچہ ہی کو لیجئے۔ اور اُس کی ماں کو۔ قریب اٹھارہ گھنٹے سے دودھ پی رہا ہے۔ فی گھنٹہ حساب لگائیے۔ تو کتنا پی چکا ہوگا۔ اور وہ ماں! اگر کسی تہذیب یافتہ ملک میں ہوتی۔ تو نہ جانے کتنے تمغے اور میڈل مل چکے ہوتے۔ اور مجھے بڑے بڑے حروف میں بچہ اور ماں کی حیرت انگیز حرکتوں کے متعلق سنسنی خیز الفاظ نظر آنے لگے۔ وبلا پتلا بچہ! باوجود اس تندہی سے جُتے رہنے کے۔ حیرت! حیرت زدہ ہوتے ہوتے میرا سر دُکھنے لگا۔ اور میں نے اُونگھنے کی کوشش کی۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔ کسی نے سر پر ہتوڑے مارنے شروع کئے۔ بمٹ بابو صاحب اپنا سر وتا کھڑکی کے پاس گنگنا رہے تھے۔ تھرڈ کلاس میں سفر کرنے والوں کے نہ تو شاید بھیجا ہوتا ہے۔ اور نہ اُس میں احساس! جی چاہا پاگل ہو جاؤں۔

پاس ہی سیکنڈ کلاس میں ایک کھدر پوش لیڈر نہ جانے رات کو کون سے اسٹیشن پر سوار ہو گئے تھے۔ جب وہ اسٹیشن پر اتر کر سر کھجاتے یا اخبار خریدتے تو میں برابر اُنہیں غور سے دیکھتی۔ اُنہیں دنوں میں ایک کتاب پڑھ رہی تھی جس میں ایک معمولی عورت نے ایک بڑے مشہور آدمی پہ طاری ہونا شروع کیا۔ اور ایسی پیچھے لگی کہ آخر میں اُسے مد ہوکر کے چھوڑا۔ میرا ارادہ بھی ہمیشہ سے ہی کوئی ان ہونی۔ اور سنسنی خیز حرکت کرنے کا ہے۔ جو اور عام لڑکیوں نے نہ کی ہو۔ پہلے میں سوچا کرتی تھی۔ ایڈیٹر یا کوئی مشہور مصنف ٹھیک رہے گا۔ پھر میری رائے بدل گئی۔ آجکل لیڈر ذرا آنکھ میں کھٹکتے ہیں!

اور اُن لیڈر صاحب کی آنکھیں بڑی بڑی کھلی ہوئی پیشانی دھوتی کے پلو سے پونچھتے ہوئے وہ خاصے شریف آدمی معلوم ہو رہے تھے کنپٹیوں پر سفید سفید بال جھلک رہے تھے۔ جو اُنکے متفکر ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ جنکشن پر میں نے جان بوجھ کر بک اسٹال پر اُن سے ملاقات کر لی

"ہماری استریاں ہی ہمیں آزاد کرا سکتی ہیں"۔ انہوں نے میری ساری کے موٹے کھدر سے مرعوب ہو کر کہا۔ دل میں تو مجھے شرم آئی۔ کہ ساری لیتے وقت مینے ملکی بہتری سے زیادہ اسٹائل پہ توجہ دی تھی۔ مگر انہیں کیا معلوم

میں نے جلدی جلدی اُن سے نصیحتیں لینا شروع کیں۔

"صاحب عورتوں کی مدد کے بغیر ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔

مجھے یاد آ گیا۔ جب کالج کے زمانہ میں ایک دفعہ خوش رنگ جھنڈے لے کر ہم لوگ کھدر کی ساریاں پہنکر نکلی تھیں۔ سلطانہ کی پیلے رنگ کی ساری بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔ اور ششی نے اپنی مور کے گردن کے رنگ کی ساڑھی

سنبھالتے ہوئے مجھے جلوس کے درمیان میں ہی اس کی ساڑھی کے رنگ پہ توجہ دلائی تھی۔ اور اس وقت سلطانہ کے کانوں پر پڑے ہوئے بال بالکل کنٹوپ کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ ہاں زینب غضب کی لگ رہی تھی۔ پر وہ راستہ بھر زبیدہ صاحب سے فس کرتی گئی تھی۔ جو کہ بے چاری نے ششی سے کتنی دفعہ ساڑھی مانگی۔ مگر ششی کی ساری ساڑھیاں جلوس والی لڑکیوں نے پہلے ہی لے لی تھیں۔ اور وہ اُسی روز نئی کھدر کی ساڑھی والی جیسے کلف کی بُو سے ناک اڑی جا رہی تھی۔ . . استریوں کو کسی دکھ کی پروا نہیں کرنا چاہیئے۔" وہ بولے۔

لیجئے! بھلا ہم لوگ دکھ کی پرواہ کریں گے۔ جلوس میں جاتے وقت

مِل سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ کاش پولیس مزاحمت کرے۔ ورنہ یہ تو کچھ بات نہ ہوگی، کہ جلوس نکلے۔ اور یونہی گشت لگا کر چلا آئے۔ جی تو یہاں تک کہتی تھی کہ کاش لاٹھی چارج ہو ہم پر!! مگر وہ تو ہماری قسمت میں نہ تھا! پولیس کو جیسے ہمارے دل کا حال معلوم ہو۔ اور جلوس چپ چپا ہی رہتا۔ اگر ایک جھگڑا! ٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ کچھ "بندے ماترم" اور "ہندوستان ہمارا" پر دسکتی ہوئی شششی نے کہا۔ "سارے جہاں" کی لَے کچھ پرانے فیشن کی ہے۔ اور بندے ماترم کی کچھ انگریزی سی ہے۔ غرض ظاہر ہے نے بندے ماترم نہیں گایا۔ اور "سارے جہاں" پر شششی کو کھانسی آگئی۔ یہ جھگڑا یونہی دب دبا گیا۔

"جس بات میں عورتیں حصہ نہیں۔ تو جانو گاڑی کا ایک پہیہ نہیں" مجھے یاد آیا۔ کہ بہت دن ہوئے میں نے ایک فلم دیکھا تھا۔ اُس میں سوائے ایک بڑھیا بوتل والی کے اور کوئی عورت نہ تھی۔ اس قدر غیر دلچسپ فلم تو میں نے ساری عمر نہیں دیکھا۔ ہم سارا وقت اسی انتظار میں رہے۔ کہ اب کوئی عورت آئے۔ اور اصل تماشہ شروع ہو۔ اور سچ کہتی ہوں۔ ایک پہیہ کی گاڑی تو پھر بھی چل جائے۔ وہ فلم تو ذرا بھی نہ چلا۔

اور پھر مجھے ایک دم خیال آیا کہ ہم لوگ زندگی کو گاڑی سے کیوں تشبیہ دیتے ہیں۔ چکی سے کیوں نہیں دیتے۔ یا چھلنے سے کیوں نہیں، یہ خیال بڑا بے تکا تھا پیدا ہوا دل میں۔ اگر لیڈر صاحب کو میرے دل کی باتیں معلوم ہو جاتیں۔ تو بس نہ جانے کیا کرتے۔ وہ کتنی دیر تک ایک گوڑ مغز سے سرہاتے رہے۔ جیسے خیالات کا سرنہ پیر۔ مگر اس میں میرا کیا قصور، کہ ایک بات پر مجھے ہزاروں الٹی سیدھی باتیں یاد آجاتی ہیں۔

پھر کچھ موجودہ نظامِ تعلیم کا ذکر ہونے لگا۔ دو تین اور آکر سننے لگے اُن میں سے ایک کی ناک سکڑے ہوئے لمبے چہرے پر عجیب چیز لگ رہی تھی گویا رگِستان پر ایک تنبو تنا ہوا ہے۔ دانت اُن کے بھی بھپوندی لگے ہوئے تھے میرا دل چاہا۔ کوئی اُن کے دانت مانجھ دے۔ اور لیڈر کا لیکچر سننے کے بجائے میں حیرت میں ڈوبی سوچ رہی تھی۔ اس شخص کی بیوی کیا کرتی ہوگی۔ کاش کوئی اُن کے دانت مانجھ دیتا۔! اور میرا دل گھبرانے لگا۔ جی چاہا۔ کسی نہایت خوبصورت آدمی کو دیکھوں۔ جیسکے دانت پھپھوندی چڑھے ہوئے نہ ہوں۔ اور جس کی مانگ دھوتی میں سے ٹانگ نہ کھلتی ہو۔ اور جس کے کپڑوں میں سے ہلکی ہلکی پنتلیں کی خوشبو آ رہی ہو۔ اور اتنا روؤں کو سارا گوکہ جو راستہ بھر میری آنکھوں میں جھونکا گیا تھا۔ دھل جائے۔ ورنہ پیچ کے تصور سے جو میرا جی متلایا تھا ۔ ۔ ۔ اور وہ تین آوارہ مزاج بننے کی کوشش کرتے ہوئے نوجوان! قلی اور اُن کی گالیاں۔ ریل کے ہچکولے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دنیا ساکت ہو جائے ۔ ۔ ۔ اور بس!

خاص رعایت — **ادبی جواہر پارے** — خاص رعایت

ادبِ لطیف کے مندرجہ ذیل خاص نمبروں کی چند کاپیاں دفتر میں بچی ہوئی ہیں۔ جلد از جلد توجہ فرمائیے۔ ورنہ ممکن ہے۔ چند ماہ بعد آپ کو ان میں سے ہر ایک نمبر پوری قیمت پر بھی دستیاب نہ ہو سکے۔

سالنامہ سنہ ۱۹۳۶ء حجم ۲۵۰ صفحات تصاویر ایک درجن قیمت رعایتی ۸ ر

" سنہ ۱۹۳۷ء " " سائز کلاں ۲۵ " " " ۸ ر

" سنہ ۱۹۳۸ء " " " " " " ۱۰ ر

افسانہ نمبر سنہ ۱۹۳۸ء ۲۲۵ " " " " ۱۰ ر

سالنامہ سنہ ۱۹۳۹ء " ۲۲۵ " تصاویر ڈیڑھ درجن قیمت " ۱۰ ر

ڈراما نمبر سنہ ۱۹۳۹ء حجم ۲۰۰ صفحات تصاویر ڈیڑھ درجن قیمت ۱۰ ر

افسانہ نمبر سنہ ۱۹۳۹ء " " " " " ۹ ر

سالنامہ سنہ ۱۹۴۰ء " " " " " ۱۲ ر

افسانہ نمبر سنہ ۱۹۴۰ء ۲۰۰ " " " " ۹ ر

سالنامہ سنہ ۱۹۴۱ء ۲۵۰ " " " " " ۱۴ ر

سابقہ عام پرچے بھی مل سکتے ہیں محصول ڈاک فی نمبر اس قیمت میں مزید رعایت ناممکن ہے۔ پہلے ہی یہ قیمت نصف برابر درج ہے۔ منیجر

[illegible]

وہ میرے پر دل و جان سے قربان تھی۔ اس وقت میں مشکل سے پچیس برس کا ہونگا۔ اور شکل بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

مگر اس بات پر اسکے چہرے پر کسی قسم کا گھمنڈ کا نشان نظر نہ آئیگا۔ آپ اسکے چہرے پر پوشیدہ سی توجہ ڈالیں گے۔ اور دل ہی دل میں مان جائیں گے۔ کہ واقعی اس وقت وہ ایک شکیل مرد ہوگا۔ کسی حد تک اسکا چہرہ اب بھی خوبصورت ہے۔ آپ سوچیں گے

"گاؤں میں ہم دونو گویا ایک عجوبہ تھے بلکہ تمام علاقے میں میلوں تک۔ کیا کہوں، بابو صاحب، دونو براعظموں میں اس سی خوبصورت عورت نہ ہوگی، ایشیا اور یورپ میں۔ یہ میمیں اسکا کیا مقابلہ کرسکتی تھیں؟ میں تو میموں پر تھوکتا بھی نہیں"

اس شخص کی سادگی اور الھڑپن پر آپ کو کچھ ہنسی آئے گی۔ پر پھر آپ سوچیں گے۔ کہ فوجی لوگ ایسے ہی سادے اور بڑبولے ہوتے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ "میں نے ایک نہایت عالیشان گھر تعمیر کروایا۔ گاؤں کیا سب علاقے میں اس سے بڑھیا گھر نہ ہوگا۔ اور ہم دونو گویا شہزادوں کی مانند رہتے تھے؛ ہاں سچ کہتا ہوں۔ شہزادوں کی طرح" وہ دہرائیگا۔ تاکہ آپ کے دماغ میں شہزادوں کے متعلق جو غلط اور مبالغہ آمیز خیال جاگزین ہوں۔ دب جائیں۔

سارا گاؤں، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، لڑکیاں، لڑکے حیران تھے۔ پاس والے گاؤں سے لوگ ہمیں دیکھنے آیا کرتے۔"

یہاں وہ اوپر نظر اٹھا کر دیکھے گا۔ کہ کہیں آپ کا دھیان کسی اور طرف نہ چلا گیا ہو۔

"ہاں؟ آپ جھجک کر اپنا دھیان کسی اور طرف سے موڑ کر کہیں گے آپ جانتے ہی ہیں۔ پنجابی چھوکریوں کو اپنے حسن پر کتنا گھمنڈ ہوتا ہے۔ وہ میموں کو اپنے مقابلے پر ہیچ سمجھتی ہیں۔ میموں میں سفید رنگ کے سوا ہوتا بھی کیا ہے۔ اور پنجابی چھوکرے بھی اپنی عورتوں پر کتنا اترایا کرتے ہیں لیکن سب مرد عورت میری عورت کی خوبصورتی کے آگے ہار مان جاتے تھے گاؤں کے لوگ اسے پیو دن کہہ کر بات کرتے تھے۔ لیکن اصل میں پیوڈن نہیں تھی۔

جوں جوں یہ کہانی آپ کے سامنے کھلتی جائے گی۔ حیران کرتی جائے گی۔ اور آپ کو چولھے کے منڈھے بیٹھ کر سنی، بہن، پھوپھی، دادی کی سنائی کہانیاں یاد آئیں گی: "ایک شہزادہ، تن تنہا، گھوڑے پر سوار جنگل میں دوپہر کے وقت ہرن کے تعاقب میں ساتھیوں سے بچھڑ گیا؛ گھومتا گھامتا ایک بڑ کے درخت کے تلے آیا۔ جہاں ایک نہایت حسین جوان عورت گھنے سایہ میں بیٹھی تھی۔ شہزادہ پہلی ہی نظر میں اس کا شکار ہو گیا۔ دونو نے بڑ کے سائے میں بیٹھ کر عشق کے اقرار و اصرار کئے۔ عورت گھوڑے پر شہزادے کے پیچھے چڑھ بیٹھی۔ دونو محلوں میں آگئے۔ اور کئی برس بڑے مزے کی زندگی بسر کرتے رہے۔ پر آخر ایک رات وہ عورت چوری سے جانے کدھر چل دی خود چلی گئی۔ اور شہزادے کو چاہ غم میں دھکا دے گئی۔" اس شخص کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی گزری ہے، آپ خیال کریں گے۔ اور قدرے مغموم ہونگے۔

"عورتیں جتنے بنا کر اسے کسی بیاہ شادی والے گھر یا گوردوارے لے جانے کو آتیں۔ نوجوان جب ہماری بیٹھک کے پاس سے گزرتے۔ تو دالانوں میں سے اندر جھانکا کرتے۔ میں صرف ان کی بے بسی پر ہنس دیتا۔ اس تک کسی کی رسائی نہ تھی۔ قسمت نے اسے گویا میرے ہی لئے بنایا تھا۔ نہیں تو جناب، خیال کیجیو: ایک لڑکی ہزاروں میل پرے پردیس میں پیدا ہوتی ہے، پلتی ہے۔ اور جوان ہوتی ہے۔ پھر یورپ کی جنگ ہوتی ہے۔ اور میں لڑنے کے لئے اس ملک میں جاتا ہوں، اور وہاں وہ میرے پرائیویٹ فسٹ سائٹ عاشق ہو جاتی ہے۔ . . . مجھے اس کی وفاداری کے بارے بال بھر بھی شک نہیں ہو سکتا تھا۔ اور گاؤں کے شوقینوں پر میں بس ہنس دیتا تھا۔"

یہاں پہنچ کر آپ قیاس کے گھوڑے دوڑانا شروع کر دیجئے۔ غالباً اسکے خلافِ توقع وہ عورت اس سے بیوفا ہو گئی ہوگی۔ اور گاؤں کے کسی نوجوان کے ساتھ یارانہ گانٹھ بیٹھی ہوگی۔ جس کا نتیجہ

آپ ابھی قیاس ہی لگا رہے ہونگے۔ کہ وہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچیگا اور آپکے دھیان کو اپنی طرف موڑ لے گا۔ "پھر تین برس میں ہمارے گھر دو بچے پیدا ہوئے، دونو لڑکے۔" وہ ذرا اینٹھ کر کہے گا۔ "گویا دونوں بچوں کا نرینہ ہونا۔ اس کی غیر معمولی مردانگی کا ثبوت تھا۔ ۔۔ ایشیا، یورپ دونو براعظموں میں ان سے خوبصورت بچے کہیں نہیں ہونگے۔ گاؤں کیا سارا علاقہ ان کی خوبصورتی پر حیران تھا۔ بڑا اب پندرہ برس کا ہے۔

"مانجر، واسے لمبی عمر دے، اور دو زبانیں بولتا ہے"

اب آپ اپنے اسپ قیاس کی باگ دوسری سمت موڑ دیجئے۔ شاید وہ عورت اپنے چھوٹے لڑکے کی وفات کے غم میں گھل گھل کر مرگئی ہو۔

"ہم بہت خوش تھے، ہر ہفتہ شہر میں سینما دیکھنے آتے، کبھی کبھی بڑے لڑکے کو بھی ساتھ لاتے"

اب آپ قیاس آرائیاں چھوڑ دیجئے۔ اس طرح آپ اس ڈور کو نہیں سلجھا سکتے۔ بلکہ نئی الجھنوں میں پڑتے جارہے ہیں

"ان موقعوں پر بہت لوگ ہمارے واقف ہوگئے۔ اس کی واقفی جاسنی میموں اور امیر گھرانوں کی لڑکیوں کے ساتھ تھی۔ مردوں کی دوستی وہ بالکل پسند نہ کرتی تھی۔ اور غیر آدمی کے ساتھ تو بہت کم بات چیت کرتی تھی۔ اس سوسائٹی میں وہ بہت خوش تھی۔ بہت دفعہ صاحب لوگ ہمیں اپنے بنگلوں پر چاء کے لئے بلاتے، اور۔ ۔ ۔ ۔"

یہاں آپ کو کچھ ہنسی بھی آئے گی۔ اور کچھ رحم بھی، یہ سوچ کر کہ اس طرح کی مہذب سوسائٹی میں یہ پگڑی والا اور داڑھی چڑھا آنریری کپتان کیسا اجڈ اور اُن گھڑ سا نظر آتا ہوگا، وہ کیسا بیوقوف لگتا ہوگا جب وہ اپنے انگریز دوستوں کے ساتھ ذوق و مذاق کی باتیں کرتی ہوگی

"پھر آپ جانتے ہی ہیں۔ گاؤں کے بڈھے لوگوں کو، یہ بڈھے ہر جگہ ایک مانک ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں خوش دیکھ کر کبھی خوش نہ تھے"

حقیقتاً! آپ بھی بوڑھوں سے نفرت کرتے ہیں، اسلئے آپ فوراً اسکے اس خیال کی تائید کردیجئے۔

"وہ ضرور دعائیں کرتے رہے ہونگے۔ کہ ہم لوگوں پر کوئی آفت آئے چنانچہ میرا چھوٹا لڑکا ڈیڑھ برس کا ہوکر گزر گیا"

آپ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھیں گے، پہلے شود، وہاں آنسو کے لئے جگہ ہی نہیں۔ ان آنکھوں میں ایک ایسا سوگ چھایا ہوا ہے جو ملتے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

"اس بچے کی موت کے سبب ہی وہ میرے سے کھو گئی، اور میرے سیاہ بال سفید ہوگئے۔ اس بات کو اب دس برس سے جاستی گزر چکے ہیں کیا آپ کھیال کرسکتے ہیں۔ کہ اس مصیبت کے بغیر میرے بال سفید ہوسکتے تھے؟"

یہ سُن کر آپ کے دل کو ایک بے چینی سی پکڑے گی۔ اور آپ بےصبری سے پوچھیں گے "ہاں تو آگے کیا ہوا؟"

"آپ جانتے ہیں۔ کہ ہم مردے کو جلاتے ہیں، اس لئے ہم اس بچے کی لاش کو مرگھٹ میں لے گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ اور لاش کو جلانے نہ دیتی تھی۔ وہ اُسے دفن کرنا چاہتی تھی لیکن آپ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف بات ہے، وہ یہ کہکر آنکھیں اوپر اٹھا لیگا گویا آپ سے اس امر کی تائید چاہتا ہے۔ کہ ایسے معاملوں میں مذہب کے سامنے بسی کی کچھ نہیں چلتی۔

"میرے بچے کا پھول سا بدن تم آگ میں جلا رہے ہو، کہکر وہ چلانے لگی، اور چتا کی طرف لپکی۔ تاکہ لاش کو وہاں سے اٹھالے۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ لاش کو لکڑی کے صندوق میں بند کرکے قبر میں دفنایا جائے۔ تاکہ قیامت کے دن اس کا بدن صحیح سلامت نکلے۔ یہ ان کے مذہب کا اصول ہے"

ہوں، آپ سمجھتے ہیں۔

"بڑی مشکل سے ہم نے اسے چتا سے پرے ہٹایا۔ لیکن اس دن سے وہ کوئی اور ہی عورت بن گئی، وہ پہلی سی نہ رہی۔ اس میں وہ پہلی سی زندگی وہ پہلا سا الھڑپن نام کو نہ رہا۔ مجھے بات بات پر پھٹکارا اور دھتکارا کرتی۔ تو نے میرا پھول سا بچہ آگ میں جلا دیا ہے۔ اب اسے نجات نہ مل سکے گی،"

آپ کے سر افسوس میں ہلنے لگے گا۔ پر وہ اپنی کہانی جاری رکھے گا۔

"چنانچہ میں اسے پہلے سے جاستی شہر لانے لگا۔ بہتیرا سینما، سوسائٹی میں اسے بہلانے کے جتن کئے۔ لیکن وہ کبھی خوش نہ ہوئی۔ اس سوسائٹی میں جسے وہ پہلے اتنا چاہتی تھی، اب وہ ایک زخمی ہرن کے مانک تھی، اور دوسروں سے گویا ڈرتی تھی۔ آخر ایک روز جب رات کو ہم سینما سے لوٹ کر ٹرین پر چڑھنے کے لئے یہاں آئے۔ اور میں ٹکٹ خریدنے کو بھیڑ میں گھسا۔ تو جانے وہ اس جگہ سے کہاں چلی گئی۔"

"ہوں" آپ سمجھ جائینگے۔

"وہ چار چاء واپس نہیں جاسکتی۔ چار چاء کوئی نزدیک کی بات تو نہیں، اور اگر اس نے اس مانک وہ جانا ہی تھا۔ تو وہ میرے ساتھ پہلے

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible] ١٣٤٤ [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible] FIRST SIGHT [illegible]

[illegible] MONTH [illegible]

[illegible] MOON [illegible]

ٹالسٹائی

میکسم گورکی کی ڈائری کا ایک ورق

ایک دن وہ مجھے سڑک کے کنارے ملا۔ ٹٹو پر سوار۔ وہ لیوزیا کی طرف جا رہا تھا۔

اس نے ٹٹو روک کر مجھے سلام کیا۔ اور میں بھی باتیں کرتا اس کے ساتھ ہو لیا۔ میں نے اُسے بتایا۔ کہ مجھے ابھی کورلینکو کی طرف سے ایک خط ملا ہے۔

"کیا وہ خدا کی ہستی کا قائل ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں"

"گویا تم اس کی زندگی کے ایک بڑے راز سے ناواقف ہو۔ اُس کا خدا پر ایمان ہے۔ لیکن دہریوں کی موجودگی میں وہ اس بات کا اقرار نہیں کرتا"

اُس نے یہ الفاظ غمگین سے ادا کئے۔ اور نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے شک گزرا شاید وہ اس وقت میرے ساتھ باتیں کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جب میں نے رخصت کی اجازت طلب کی۔ تو اس نے کہا۔

"نہیں جانا کہاں ہے؟"

اُس نے دوبارہ بڑبڑانا شروع کیا۔

"تمہارا اینڈریئیف بھی تو دہریوں سے خائف ہے۔ لیکن وہ بھی خدا کو مانتا ہے۔ اور اُس کی ہستی سے ہمیشہ مرعوب رہا" جب ہم گرینڈ ڈیوک کی جاگیر کے پاس سے گزرے تو ہمیں بیچ رومانوف خاندان کے تین فرد آپس میں باتیں کرتے دکھائی دیئے۔ ایک گھوڑا گاڑی اور ایک دوسرے مزین گھوڑے نے سڑک کا راستہ روک رکھا تھا۔ ٹالسٹائی کے لئے اُن کے درمیان سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ اُس نے گھور کر اُن راہگیروں کی طرف دیکھا۔ اور وہ سڑک کے ایک طرف سرک گئے۔ وہ مزین گھوڑا بھی اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا اور ٹالسٹائی کے ٹٹو کو گزرنے کا راستہ مل گیا۔ چند منٹ خاموش رہنے کے بعد ٹالسٹائی نے کہا۔ کہ وہ بیوقوف مجھے پہچانتے ہیں۔ اور اس گھوڑے کو بھی معلوم تھا۔ کہ ٹالسٹائی کو راستہ دینا پڑیگا۔ پہلے اپنی حفاظت آپ کرو اور پھر خود بخود دوسروں کی حفاظت کا خیال تمہارے دل میں پیدا ہو جائیگا۔

"جب ہم کہتے ہیں۔ کہ ہمیں یہ معلوم ہے۔ تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ مثلاً مجھے معلوم ہے۔ کہ میں ٹالسٹائی ہوں۔ میں ادیب ہوں۔ میری بیوی ہے بچے ہیں۔ سفید بال، بدنما چہرہ، اور داڑھی —— یہ سب کچھ میرے پاسپورٹ میں درج ہے۔ لیکن اس میں میری روح کے متعلق تو ایک نقطہ بھی موجود نہیں۔ مجھے اپنی روح کے متعلق معلوم ہے۔ کہ یہ خدا سے قریب ہونا چاہتی ہے"

"لیکن آخر خدا کیا ہے؟" "خدا وہ ہے۔ جس کا میری روح ایک ذرہ ہے۔ بس زیادہ سوچ بچار کرنے والوں کے لئے خدا پر ایمان لانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ تو اعتقاد کی بات ہے"

* * * * * * *

اُس کی تعلیمات کی ہم آہنگی کے باوجود اس کی لاثانی شخصیت سو رنگ میں نمایاں ہے! آج ہی وہ ہتر کے مُلّا سے پارک میں باتیں کر رہا تھا دیکھنے میں وہ تو کوئی سیدھا سادہ گیان معلوم ہوتا تھا مختصر سا قد بوڑھے آدمی کا سا لب و لہجہ اور خیالات جیسے کسی انسان کی روح اپنی گہرائیوں کے احساس سے جاگ اٹھی ہو اور وہ احساس کے انجام سے خوفزدہ ہو جائے!

اُس نے مُلّا سے بچوں کی طرح زندگی، روح اور خدا کے متعلق سوال پوچھے لیکن طرزِ گفتگو سے وہ بلاشبہ ایک بڑا آرٹسٹ اور صوفی منش معلوم ہوتا تھا۔

ابھی چند دن کی بات ہے وہ وُنی جف اور سُلر سے راگ کے متعلق بڑے جوش و خروش سے ذکر کر رہا تھا۔ اُس کا خیال ہے۔ کہ شوپنہار

سے بڑھ کر کوئی دوسرا انسان راگ کی تحریری داد نہیں دے سکا۔ اُسکے فلسفے کے ماتحت راگ روح کی خاموش دُعا ہے۔

"وہ خاموش کیوں؟" سلر نے پوچھا۔

"کیونکہ اس کی ادائیگی الفاظ کی محتاج نہیں۔ آواز، ایک خیال کی نسبت زیادہ متاثر کر سکتی ہے۔ خیال، ایک کیسہ ہے۔ جس میں سکے بھرے ہوں۔ لیکن آواز! بالکل خالی، ہر قسم کی لرزش سے پاک —"

اُسکے چہرے پر مسرت کھیل رہی تھی۔ اُس نے حسبِ معمول میٹھے میٹھے سیدھے سادے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

"تمام راگی دیوانے ہوتے ہیں۔ ایک راگی جتنا فن کار ہوگا اتنا ہی اُسے خام سمجھو۔ میں حیران ہوں کہ یہ لوگ کیونکر اتنے پرہیزگار بنتے ہیں۔"

* * *

ایک دن اُس نے چیخوف سے ٹیلیفون پر کہا۔

"آج کتنا اچھا دن ہے۔ میری روح کتنی مسرور ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی آج خوشی میں کھیلو۔ ہاں تم چیخوف تم کتنے اچھے آدمی ہو کتنے اچھے آدمی۔۔۔۔"

* * *

اگر تم ٹالسٹائی سے یونہی بے معنی باتیں کرنا شروع کر دو تو وہ ذرہ بھر توجہ نہ دیگا۔ وہ کبھی پوچھتا نہیں صرف دریافت کرتا ہے۔ ایک نادر اشیا جمع کرنے والے انسان کی طرح وہ بھی اپنے سینے میں وہی راز چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کا اُسکے کسی گزشتہ راز سے تعلق ہو۔

اُس کی آنکھوں میں۔ اُس کے لبوں پر مجھے اکثر ایک قناعت بھری مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی۔ وہ خوش تھا۔ اُس انسان کی طرح جسے کوئی دیر کی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ اُس نے کوئی چیز چھپا رکھنے کی کوشش کی اور پھر اُسے رکھ کر بھول گیا۔ "آخر یہ کہاں گئی ہو؟ ——" وہ کئی دن تک سوچ بچار میں کھویا رہتا ہے۔ "آخر کہاں گئی وہ چیز جس کی مجھے اشد ضرورت ہے؟" وہ اپنے ملنے جلنے والوں سے بھی خائف رہتا ہے۔ مبادا انہیں اُسکے اس نقصان کا علم ہو جائے۔ اور وُہ اسے یونہی ستاتے پھریں۔ اُسکے جذبات کو ٹھیس لگائیں۔ دفعتہً اُسکے ذہن میں اُس کی یاد لوٹ آتی ہے۔ اور اُسے وہ چیز مل جاتی ہے اپنی اس کامیابی پر وہ پھولے نہیں سماتا۔ اور لوگوں کی طرف تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھ کر کہتا ہے۔ "تم اب میرے جذبات کو مجروح نہیں کر سکتے!۔۔۔۔"

لیکن آخر اُسے کیا ملا۔ کہاں سے ملا —— یہ ایک راز ہے۔

ٹالسٹائی کی ذات کے متعلق سوچ بچار کرنا کوئی تکلیف دہ چیز نہیں۔ لیکن اُس سے زیادہ میل جول سے ذہنی کوفت ہوتی ہے ذاتی طور پر میں اُسکے ساتھ ایک مکان میں نہیں رہ سکتا۔ ایک کمرے کا تو ذکر ہی کیا ہے! اُس کا ماحول ایک صحرا کی مانند ہے جس کا ذرہ ذرہ سورج کی تیز شعاعوں سے جل اٹھتا ہے۔ اور خود سورج بھی اپنی تمازت سے تنگ آ کر اپنے پیچھے ایک سیاہ رات چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔

نئے زاویئے

مرتبہ کرشن چندر ایم اے —— قیمت تین روپے

اردو ادب کے جدید اسکول کے حامیوں کے افسانوں، ڈراموں اور منظومات کا مجموعہ۔ آپ اس کتاب میں حقیقت نگاروں کو ان کے اصلی خیالات میں پائیں گے۔ ایک ہی جلد میں آپ ہندوستان کے بہترین لکھنے والوں کا مطالعہ کر سکیں گے یہ کتاب اردو ادب کا ایک پیغام ہے۔ ایک پکار ہے۔ ہندوستان کے چوٹی کے ادیبوں کے افکار کی۔

مکتبہ اردو لاہور

احمد ندیم قاسمی

بیکاری

بوسیدہ سرائے پر رات نے اپنے سیاہ پر پھیلا رکھے تھے۔ کبھی کبھی بڑھی بھٹیارن کی لمبی لمبی کھانسی سے سرائے میں زندگی کی لکیر دوڑ جاتی تھی۔ ورنہ چاروں طرف بے پناہ سکوت طاری تھا۔ میں ایک کمرے میں ننھی منی سی کھاٹ پر بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ میں اپنے بھائی کو ملنے جا رہا تھا۔ جو یہاں سے دس میل دور ایک گاؤں میں پٹواری تھا۔ میرے سامنے ایک ننھی سی موم بتی جل رہی تھی جس کی ننھی لو پر ایک پتنگا بار بار تڑپ کر پھر دیوار پر جا بیٹھتا تھا۔ کھاٹ کے ایک پائے کے ساتھ میرا بیگ پڑا تھا جس میں دو سو روپے کے نوٹ اور میدے کے خستہ بسکٹ تھے۔ میرے بھائی کو روپوں کی اچانک ضرورت پڑ گئی تھی۔ اور بسکٹ بھائی جان نے بڑے شوق سے اپنے دور افتادہ مالک کے لئے ایک ہفتہ پہلے تیار کر رکھے تھے۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک مریل سا زرد رو شخص ٹھٹھرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور کواڑ بند کرتے "آداب عرض" کہتا ہوا ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ اپنی پھٹی پرانی چادر کو اپنے ارد گرد لپیٹنے کی غرض سے اُس نے ایک ہاتھ سے اُسے زور سے جھٹکا دیا۔ بتی بجھ گئی!

"اوہو۔ معاف کیجئے گا" اُس کی آواز آئی "بتی بجھ گئی۔ اور میرے پاس تو دیا سلائی بھی نہیں"

"میرے پاس ہے" میں نے موم بتی کو روشن کرتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے آ رہے ہیں آپ"

"بہت دور سے آ رہا ہوں"

میں خاموش ہو گیا۔ اُسکے اس مبہم سے جواب نے میرے احساس کو ٹھیس سی پہنچائی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نے کتاب کا ورق الٹا۔ تو کمرے کے اونگھتے ہوئے خلا میں دھیما دھیما ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ وہ ایک مصنوعی سی انگڑائی لے کر اٹھا۔ اور میری پائنتی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"کیا پڑھ رہے ہیں آپ" اُس نے اپنا چہرہ میرے نزدیک لاتے ہوئے کہا۔

اُس کی ہڈیاں اُسکے زرد تپتے چہرے کے اندر جھلملا رہی تھیں اُس کی آنکھوں کے ارد گرد گہرے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اور اُسکے بال اس قدر بے ترتیب تھے۔ جیسے وہ عمر بھر کنگھی کے شرمندۂ احسان نہیں ہوئے۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا؟ اُس کا لباس، اُسکا جسم، اُس کا طرزِ گفتگو، سب اُس کی مفلسی پر دلالت کر رہے تھے۔ اور مفلسوں کو ٹالنا ہر انسان کا خاصہ ہے — ہر اُس انسان کا جو صبح و شام پیٹ بھر کر کھانا کھا لیتا ہے۔ میں نے کتاب پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"ایک ناول ہے"

"کس کا ناول"

اللہ! — میری سانس رکتے ہی، سرائے کا کمرہ جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے کہا "ایک انگریز مصنف کا"

"کون انگریز مصنف" اُس نے کھنکار کر فرش پر تھوکتے ہوئے پوچھا

میرا دل بیٹھتا ہوا معلوم ہوا۔ میری زبان تالو سے چمٹ گئی۔ مجھے اُس سے نفرت ہو گئی تھی۔ اور اُسکے اِن سوالوں سے میرے اندر غم و غصہ کے جذبات لہریں لے رہے تھے۔

"گالزوردی" میں نے کہا۔

"مر گیا ہے بے چارا"

"ہاں۔ مدت ہوئی"

"اس پائے کا کوئی اردو مصنف بھی ہے۔ آپ کی نظر میں؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

اُس نے آزاد ماحول میں پرورش نہیں پائی۔

وہ خاموش ہو گیا۔ ٹوٹی پھوٹی دیوار کے ٹوٹے پھوٹے روشندان سے گزر کر میری نظریں ایک ستارے پر جم گئیں۔ جو یوں ہانپ اور کانپ رہا تھا۔ جیسے ایک نیا نیا قیدی قید خانے میں! ——— اُس نے ایک لمبی سرد آہ بھری، اور اٹھ کر اپنی کھاٹ پر جا بیٹھا۔ دو چار منٹ خاموشی میں گزر گئے۔ پھر وہ دراز ہو گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور کتاب پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔

اچانک ایک چمگادڑ روشندان کے رستے کمرے میں گھس آئی اور ادھر سے ادھر پھڑپھڑانے لگی۔ اُس نے کروٹ بدل کر چمگادڑ کو دیکھا اور پھر گردن موڑ کر مجھے گھورنے لگا۔ "آپ سوئیں گے نہیں؟"

"نہیں" میں نے تنگ آ کر بے پروایانہ لہجے میں جواب دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور قدرے نرم آواز میں بولا "آپ ... آپ شاید میرے سوالوں سے گھبرا گئے ہیں! میں تو ویسے ادھر چلا آیا۔ کہ میرا ایک ہم جنس اس کمرے میں بیٹھا ہے، جا کر کوئی بات کروں گا۔ مسافری کا معاملہ ہے سفر میں نیند تو آتی نہیں۔ اور باتوں میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔ سرائے کے تمام کمرے خالی پڑے ہیں۔ میں روشنی دیکھ کر ادھر آ گیا۔ آپ نے بُرا مانا ہے۔ تو لیجئے رخصت۔"

اور وہ چادر سنبھالتا ہوا اٹھ کر جانے لگا۔ میرا دل مجھے ملامت کرنے لگا۔ آخر میں بھی اُس کی طرح ایک انسان ہی تھا۔ ناک، منہ، آنکھیں سب کچھ ایک جیسا! کیا سلسلے میں ایک ہم جنس کی باتوں کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ میں نے اٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے معاف کیجئے ——— معاف کیجئے، اصل میں میری گفتگو کا انداز ہی ایسا ہے کہ اجنبی مجھے مغرور سمجھ لیتے ہیں۔ ادھر تشریف رکھئے۔"

وہ مسکراتا ہوا میرے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ اور گردن کی رگیں پھولتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ میں آج تک اس بے معنی اضطراب کا مقصد نہ سمجھ سکا!

"آپ کہیں پڑھتے ہیں شاید؟" اُس نے پوچھا۔

"جی ہاں ——— اور آپ؟"

"میں؟ ——— میں پڑھ چکا ہوں۔"

"کہاں تک تعلیم ہے آپ کی؟"

"بی۔ ایس۔ سی تک"

"خوب۔ کوئی ملازمت ....؟"

"سڑکیں ناپنا"

"کہیں اوورسیر ہیں آپ؟"

"جی نہیں۔ بغیر اجرت کے سڑکیں ناپنا ——— آوارہ گردی" وہ ہنس پڑا۔ میں بھی مسکرا دیا!

"کہیں کوشش کی ہے؟"

"ہر جگہ"

"پھر؟"

"سب کہتے تھے ٹائپ سیکھو"

"سیکھ لیتے"

"ٹائپ سیکھی تو بولے شارٹ ہینڈ سیکھو"

"پھر؟"

"شارٹ ہینڈ سیکھا۔ تو بولے اسامیاں پُر ہو گئیں"

"مجھے بڑا افسوس ہے"

"افسوس کی کوئی بات نہیں۔ میرا معاملہ کوئی نرالا نہیں۔ اسی قصبے میں آپ کو کئی بی۔ اے اور ایم۔ اے غلیظ دکانوں میں بیٹھے نون مرچ بیچتے ملیں گے۔ جو نوجوان بالوں میں "اسٹینز آف روز" کا تیل اور گالوں پر "ایوننگ ان پیرس" کی کریم رگڑتے تھے آج اُن کے ہاتھ ہلدی سے بھرے ہوتے ہیں۔ بالوں پر آٹا جما ہوا ہے۔ اور چہرے پہ جھریاں ہیں ——— گہری لمبی خوفناک جھریاں!"

"واقعی بہت بُری حالت ہے" میں نے جلتے ہوئے پروانے کو پھونک سے دور اُڑاتے ہوئے کہا۔

"بہت بُری حالت ہے۔ اوّل اوّل جب میں نے بی۔ ایس سی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ تو سیکرٹریٹ میں کوشش کی۔ کوئی دو ماہ کے بعد مجھے معلوم ہوا۔ کہ کلرک تو رکھ لئے گئے ہیں۔ ارے! ——— کس لحاظ سے؟ ——— لیاقت کے لحاظ سے! ایک دوست نے بتایا کہ ایک بی۔ اے تھرڈ ڈویژن اور ایک بی۔ اے فیل بھی کامیاب امیدواروں

کی فہرست میں شامل ہیں۔ کیوں؟ — اُن کے رشتہ دار سیکرٹریٹ میں ملازم تھے! — میرا دماغ گھومنے لگا۔ — یعنی بھوکے بھوکے ہی رہیں اور دولتمندوں کو اور دولت دی جائے! — کیا وحشت اور بربریت کا زمانہ واپس آ رہا ہے! خیر جی پھر تحصیلداری میں نام بھرا یا۔ انٹرویو ہوئے، دفتر جا کر پوچھا۔ کہ کاغذات کدھر گئے۔ جواب ملا۔ اوپر چلے گئے۔ اوپر جا کر پوچھا۔ جواب ملا۔ اوپر چلے گئے۔ یہ اوپر اوپر کی رٹ اس قدر بڑھی۔ کہ میں نے سمجھا۔ میری تحصیلداری کے کاغذات خدائے ذوالجلال کے دربار میں بھیج دئے گئے ہیں۔ نتیجہ نکلا۔ تو معلوم ہوا کہ انٹرویو کرنے والے پبلک کے بہی خواہ افسران کے لڑکے بھتیجے اور پوتے تحصیلدار ہو گئے اپنی خدمات کے لئے! — اُن کے بزرگوں کی خدمات کیا تھیں! لاٹ صاحب، کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے دروازوں پر چار چار گھنٹے بیٹھے رہنا اور پھر سلام کر کے اور "ڈالی" پیش کر کے اپنے محلوں میں نرم و گرم گدیلوں پر آ کر دراز ہو جانا۔ اور میں؟ — جس کے بھائی جنگ عظیم میں فرانس اور عراق عرب کی گدھوں کے غذا بنے۔ جس کے آباؤ اجداد نے اپنے جان و مال حکومت کیلئے وقف کر دئے۔ جس کی ذاتی لیاقت سب سے زیادہ تھی — مجھے بھلا دیا گیا۔ "تم تحصیلداری کے قابل نہیں!" ایک کلرک بولا۔ کیونکہ تمہاری مونچھیں بہت بڑی ہیں۔ اور اُس دن تمہاری پگڑی کا طرہ ٹیڑھا سا تھا!"

میں نے پوچھا۔ "کیا تحصیلداری مونچھوں اور طرّوں پر ہی موقوف ہے اور کیا وہ نوجوان جنہوں نے اپنے گالوں پر کریمیں اور پاؤڈر مل مل کے نسوانیت کی نزاکت کو شرمندہ کر دیا۔ جن کے چہرے دیکھ کر انسان کو یہ دھوکا ہوتا ہے۔ کہ عورتیں مردوں کے لباس میں پھر رہی ہیں۔ جن کی چال میں لچک ہے۔ آواز میں لوچ ہے۔ بات بات میں تصنع ہے جنہیں سو دو سو گز دور بھی جانا ہو۔ تو موٹر کار کی ضرورت پڑتی ہے۔ جن کو میرا ایک تھپڑ لگے۔ تو اٹھارہ دن تک کی ٹیسیں نہ اتر سکیں۔ وہ تحصیلدار بنا دئے گئے۔" — ایک چپڑاسی نے مجھے دھکا دے کر دفتر سے باہر نکال دیا۔

اگلے سال میں پھر مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ یہاں بھی انٹرویو کرنے والی کمیٹی کے کارپردازوں کے پوتوں پڑپوتوں نے کامیابی حاصل کر لی۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اُن کے پیچھے خالی ہیں۔ پھر حکومت کی طرف سے اعلان ہوا۔ کہ گریجوایٹوں کو دو دو مربع زمین دی جائے گی۔ میں بھی حاضر ہوا۔ انٹرویو ہوا۔ پوچھا گیا۔ "بشیر احمد تمہارا نام کیا ہے؟" (اصول، لا حول ولا قوۃ) میں نے کہا۔ "حضرت میرا نام بشیر احمد ہی تو ہے!" پوچھا گیا۔ "اگر تمہارا ایک دوست دریا میں ڈوب جائے۔ تو تم اُسے باہر نکال لاؤ۔ تو پھر کیا کرو گے" میں نے سوچا۔ کیا زمینوں پر مجھے دریاؤں میں ڈوبتے ہوئے دوست کھینچنے پڑیں گے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر ایک لڑکے نے اس سوال کا یہ جواب دیا "اُس کی مغفرت کے لئے دعا مانگوں گا!" — اُسے دو مربعے مل جائیں گے۔ اور مجھے صرف اسلئے ٹھکرا دیا گیا۔ کہ میرے باپ کی زمین صرف دس بیگھے ہے۔ اور جنہیں زمینیں دی گئیں۔ اُن کے والدین کے پاس پہلے ہی سے پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ مربع زمینیں تھیں!

زرد زرد نوجوان کے ملتجی پر اس سخت سردی میں بھی پسینہ ابھر آیا اُسکے پتلے زرد ہونٹ گفتگو کے زیر و بم کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ اور رات سو کھے ہاتھ ہوا میں اِدھر اُدھر لہراتے تھے۔ نوجوان کی گفتگو میرے لئے بہت دلچسپ ثابت ہوئی۔ سامنے سے باہر ایک چوکیدار "خبردار ہیا ہو" کہتا ہوا گزر گیا۔ بتی آدھی رہ گئی تھی۔ نیند میری آنکھوں سے غائب تھی۔ نوجوان نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ انسانی ہمدردی کے دعوے دار — یہ لوگ ہم جنہیں بڑے بڑے عہدے تفویض کئے گئے ہیں۔ کہ وہ دردمندوں کے درد کا مداوا بنیں! غریبوں کی فریادیں سنیں! اُن کی داد رسی کریں! اپنی بیغرض اور بے لوث خدمات سے ملک کو آزاد کرائیں۔ — آپ جانتے ہیں۔ وہ کہاں تک اپنے فرائض پر کاربند رہے ہیں؟ یہی تو غلامی کے بندھن کو مضبوط کر رہے ہیں! جس دن ان بڑی بڑی شانوں والوں نے خاک پر بیٹھنا سیکھا۔ جس دن ان غریبوں پر ہنسنے والے بے حمیت لوگوں نے انسانی دل کی شکستگی کی آواز سن لی۔ اُس دن شاید آزادی کی جھلک نظر آنے لگے! — میں جناب اسکے بعد دفتر دفتر پھرا۔ پرائیویٹ کمپنیوں کے دروازے کھٹکھٹائے! ہوتے ہوتے مزدوری تک نوبت آئی۔ لیکن ٹھیکیدار نے مجھے صرف اس لئے نہ رکھا۔ کہ میں پڑھا لکھا ہوں۔ اور پڑھے لکھے روڑی کی ٹوکریاں نہیں اٹھا سکتے۔ "میں اٹھا سکتا ہوں جی!" میں نے چیخ کر کہا۔ "نہیں، جاؤ"، ٹھیکیدار گرجا! اور میں اِدھر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سر کو کیلوش فیلی

مترجمہ رشید الدین

دہقان

نواب لاشخنی ڈیفیلٹ کیپولی اپنے آٹھ وفاداروں کے ہمراہ کہیں بھاگ گیا۔

پہاڑوں پر مکمل سکوت تھا۔ البتہ ان سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپ اور ان پتھروں کی گڑگڑاہٹ ضرور سنائی دیتی تھی جو رستے سے بکھر کر شگافوں میں جا گرتے تھے۔

پہلے بھی کئی ایک بار ڈیفیلٹ کو اس طرح بھاگنا پڑا تھا۔ کیونکہ ساتھ والی ریاست کا فرمانروا اچانک ایک دشمن کی طرح حملہ کر دیتا تھا۔ بہت مدت تک وہ کوشش کرتا رہا کہ اپنے دشمن بلکاروں، منگرالوں اور سلافوں کو اپنی حکومت سے باہر نکال دے لیکن جب تلوار اس سے بیوفائی کرتی۔ تو وہ رشوت دے کر اپنے آپ کو بچا لیا کرتا۔ وہ کبھی اتنا ذلیل اور شرمسار نہ ہوا تھا۔ جتنا کہ دشمن کا حملہ تو ایک علیحدہ بات تھی لیکن غلاموں کا اپنے آقا کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا۔ اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دینا تو اسکے خیال میں بہت ہی بری بات تھی۔

یہ سب کچھ اچانک ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ کل تک انتہائی مقتدر تھا۔ کہ اسے کسی دشمن کے حملے کا گمان تک نہ تھا۔ اور رعایا کے باغی ہو جانیکا تو اسے کبھی وہم بھی نہ ہوا تھا۔ وہ اس بغاوت پر بہت ہی متعجب تھا کیونکہ ابھی بہت دن نہ گزرے تھے۔ جبکہ اس نے اپنے علاقہ کے سرغنوں کو کڑی سزا دی تھی —— لیکن دہقانوں کو سزا دینے کا تو یہ پہلا موقعہ نہ تھا۔

اب اسے ایک ہی امید تھی۔ ساتھ والے گاؤں کے لوگوں پر اسے بھروسہ تھا۔ کیونکہ وہ اس کے وفادار رہے تھے۔

جلدی ہی انہیں اونچے اونچے سفید مینار نظر آنے لگے، ٹیلوں پر چھوٹے چھوٹے گھر بھی دکھائی دیتے تھے —— وفاداروں سمیت وہ گاؤں پہنچ گیا —— لیکن مخلصی کی بجائے وہاں بھی مصیبت اس کی منتظر تھی۔

ایک جگہ موڑ پر جہاں ان کا راستہ ایک سڑک سے ملتا تھا۔ ایک بہت ہی بڑا مٹی کا تودہ چٹان سے ٹوٹ کر گڑگڑاہٹ کے ساتھ نیچے گرا۔ ایک ٹکڑا آخری سوار کے لگا —— گرد و غبار بیٹھ گیا۔ تو ایک گھوڑا سوار سمیت سڑک پر پتھروں کے ڈھیر میں دبا ہوا پایا گیا۔

ڈیفیلٹ اور اسکے ساتھیوں نے گھوڑوں کو چھوڑ دیا۔ اور خود ایک برج میں جا کر چھپ گئے۔ اور اس کے فولادی دروازہ کو مضبوطی سے بند کر لیا۔

اب انہیں کوئی اندیشہ نہ تھا۔ باہر لوگ انہیں طرح طرح کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ تیروں کی سنسناہٹ برابر جاری تھی، اور دروازہ پر بھالوں سے چوٹوں پر چوٹیں لگائی جا رہی تھیں۔ برج چونکہ بہت وزنی پتھروں کا بنا ہوا تھا اسلئے اس کا کچھ نہ بگڑ سکا۔ شور برابر بڑھتا جاتا تھا، لوگ انبوہ در انبوہ اکٹھے ہو رہے تھے۔ نعروں اور جنگی ڈھولک کی آوازیں بلند سے بلندتر ہو رہی تھیں۔

رات کو چل چل اور بھی بڑھ گئی۔ ڈیفیلٹ نے جھروکوں سے دیکھا۔ سامنے میدان میں آگ روشن تھی۔ برج کے چاروں طرف باغی تیروں اور نیزوں سے مسلح بالکل بے بس بیٹھے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر ڈیفیلٹ کو اپنے سرپرست کی یادگار میں شبینہ خوشی کا نقشہ یاد آ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ گویا یہ سب لوگ اسی میلے کی خوشی میں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اسے گمان ہو چلا تھا۔ کہ اگر وہ برج کا دروازہ کھول دے۔ تو سارے دہقان پہلے کی طرح اسے

خوش آمدید کہیں گے۔

وہ بہت دیر تک اس نظارے کو دیکھا کیا۔ چاندنی رات میں سارا گاؤں صاف نظر آ رہا تھا۔ پہاڑوں کی روپہلی چوٹیاں بادلوں سے نیچے اور دھندکے اُوپر عجیب بہار دے رہی تھیں۔ بہت دور بُرجوں سے نیچے اس نے دھندکے کفن میں لپٹی ہوئی محبوبہ تشخینی کو دیکھا۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ڈیفلٹ جھروکوں سے ہٹا اور اپنے چغہ کو تہ کر کے سر کے نیچے رکھ کر پڑ رہا۔

معلوم نہیں کیوں گرما کی یہ رات غیر معمولی طور سے کچھ لمبی ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں اُسے کسی چیز کے چاٹنے کی آواز سنائی دی۔ یہ اس کے ساتھی تھے۔ بیچارے پیاس کی شدت سے تنگ آ کر سرد پتھروں کو چاٹ رہے تھے۔

دوسرے دن پھر برج کے گرد کھیتوں میں اس نے کسانوں کو دیکھا۔ رات ہوتے انہوں نے پھر آگ روشن کر لی۔ اور جوش و خروش ایک مرتبہ پھر بڑھ گیا۔

تیسرے روز کھیتوں میں، پہاڑوں کی ڈھلانوں پر اور سڑکوں میں فوج ہی فوج نظر آتی تھی۔ عورتیں اور بچے بھی اکٹھے ہو رہے تھے۔ لوگوں کا شور و غل، گھوڑوں کی ہنہناہٹ سب مل کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہے تھے۔

رات کو پھر برچھے اور بھالے آگ میں چمک رہے تھے۔

علی الصبح ان بدنصیبوں کو پیاس کی شدت نے بے چین کر دیا۔ ان کے ہونٹوں نے تین روز سے پانی کو چھوا تک نہ تھا۔ ڈیفلٹ نے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا۔ کہ اب ان میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے سوچا آخر یہ بھی دہقان ہیں۔ ان کی رگوں میں بھی وہی خون بہتا ہے۔ جو ان باغی کسانوں کی رگوں میں۔ جنگ میں تو وہ جوانمردی دکھاتے تھے۔ اور اب وہ ایسی شرمناک موت کو بھلا کیونکر قبول کر لیں گے۔ یقیناً وہ باغیوں پر دروازہ کھول دیں گے۔

چھٹے روز جب پیاس کی شدت حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ تو محصور آدمیوں نے ایک چغے کو پھاڑ ڈالا۔ اور اس کی دھجیوں سے ایک رسّہ بنایا۔ ڈیفلٹ نے ان میں سے ایک نہایت ہی وفادار آدمی کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ کہ وہ برج سے نیچے اتر کر باغیوں سے کہدے کہ اگر وہ امن کے ساتھ لوٹ جائیں۔ تو وہ ان سب کو معاف کر دیگا۔

نوجوان سفائن بڑی پھرتی کے ساتھ چھت پر چڑھا۔ اور اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا رسّہ چھت کے ساتھ باندھ دیا۔ اور اس کے سہارے نیچے اترنے لگا۔

وہ نصف راستہ میں ہی تھا۔ کہ یکایک ہلچل مچ گئی۔ برج کی چاردیواری پر ہزاروں کی تعداد میں تیر برسنے لگے۔ سفائن کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور وہ ایک تختہ چھیل کی طرح دھڑ سے زمین پر آ گرا۔

تیروں سے چھلنی ہو کر وہ مر چکا تھا۔

اسکے بعد کسی کی جرأت نہ ہوئی۔ کہ برج پر چڑھ کر باہر کی طرف دیکھتا۔ چھ وفاداروں نے قسم اٹھائی اور کہا۔ کہ آپ کی خاطر ہم جان پر کھیل جائیں گے۔

ان قسموں سے اس کی حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ ناامید ہو گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ حلیمی کا برتاؤ کر رہا تھا۔ اسکے ساتھی اسکے اس خلاف معمول۔ رویے کو تاڑ گئے۔ اب انہیں معلوم ہوا کہ اُنہوں نے اس کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ در گور کر رکھا ہے خود بین ڈیفلٹ نے کبھی کسی کو سر اٹھانے نہ دیا تھا۔ اپنے تئیں ایک بہت بڑا آدمی خیال کرتا تھا۔ اس نے شاذ ہی کسی سے نرمی کا سلوک کیا ہو گا۔ مہیب اور غیر مطمئن ڈیفلٹ کو کبھی کسی شخص نے ہنستے نہ دیکھا تھا۔ اور نہ ہی اسے کبھی غمگینی کی حالت میں پایا تھا۔

اسوقت وہ برج میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کہ اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اور اسکے ساتھ ہی گذشتہ سالوں کی خونریزی، ظلم اور سختی کا بھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائیگا۔ اور اب بھی جبکہ اس کے لئے سورج آخری مرتبہ غروب ہو رہا تھا۔ اسے اپنی موت کا کچھ افسوس نہ تھا۔ وہ خوب جانتا تھا۔ کہ اس کی موت پر کوئی نہ روئیگا

جب اس کی پہلی بیوی نے دوسری مرتبہ ایک لڑکی کو جنم دیا۔ تو اس نے قدیم وحشیوں کی طرح اس ننھی سی جان کو زندہ دفن کرا دیا۔ اور بیوی کو اسکے والدین کے ہاں بھیج دیا تھا — اس کی دوسری بیوی کے کوئی اولاد ہی نہ ہوئی۔ وہ تین برس کے اندر ہی مر گئی۔ کسی کو یہ پتہ نہ چلا۔ کہ وہ کیسے مری۔

ڈنیلٹ اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ اسقدر بخیل تھا۔ کہ اس نے سونا تو درکنار کبھی چاندی کی کوئی شے بھی گھر میں نہ دیکھی تھی۔ اس نے برجوں اور میناروں کی خوب دیکھ بھال کی۔ اپنے مورچوں کی بھی بہت حفاظت کرتا رہا۔ اور ان کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔

پیاس کی شدت سے تنگ آ کر اس نے باغیوں سے لڑنے کی ٹھان لی۔ مجمع کے شور و غل اور تند ہوا کی جب نم آوازوں میں سے اسے آبشاروں کے گرنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی — بھیڑوں کا ایک ریوڑ اس طرف نمودار ہوا۔ جانوروں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ چند دن پہلے وہ اپنے تجربہ کار شکاریوں کے ہمراہ ان پہاڑوں میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ شام ہوئے انہوں نے بھیڑوں اور بکریوں کی کھالوں والا تھیلا زمین پر رکھ کر شکاریوں کی طرح تمام رسوم ادا کیں۔ انہوں نے شکار کی دیوی ڈائنا کو قربانی دی۔ اور رات ایک غار میں بسر کی۔ دوسرے روز علی الصبح وہ واپس ہوئے۔ ابھی گاؤں سے کچھ دور ہی تھے۔ کہ ان کے استقبال میں ڈھولک اور شہنائیاں بجنے لگیں۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کامیابی کے ساتھ واپس آ رہے ہیں — اور اب وہی شہنائیاں اور ڈھولک باغیوں کا سکے برج کے گرد جمع کرنیکے لئے بجائے جا رہے تھے

آج رات ڈنیلٹ نے ساتھیوں کو معرکوں سے ہٹا لیا۔ اور ان کو پیچھے ٹھہرا کر خود برج کی چھت پر جا چڑھا۔

دور سے سفید برف پوش ٹیلے چاندنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ برج کے گرد میدانوں اور ڈھلوانوں پر ہر جگہ خیموں میں آگ جل رہی تھی۔ لوگ زمین پر بیٹھے مزے لے لے کر تاڑی کی چسکیاں لے کر گا رہے تھے۔ ان کے آس پاس نیزے اور بھالے بکھرے پڑے تھے ششنیتی کے نواب نے ایسی مجلسیں اس وقت بھی نہ دیکھی تھیں۔ جبکہ اس کے آدمی لڑائی سے فتحیاب لوٹتے تھے۔

"او سوائیو!" ڈنیلٹ نے آواز دی

ہزاروں نگاہیں برج پر گڑ گئیں۔ ایک مکمل سکوت چاروں طرف چھا گیا۔ باغیوں نے اسے پہچان لیا۔ اسکا مضبوط جسم اور سفید لمبی داڑھی۔

آگ کی روشنی میں ڈنیلٹ نے ایک ہٹے کٹے اور لمبے تڑنگے جوان سوائی کو دیکھا۔ اس نے اسکی آواز کو پہچان لیا۔ جسوقت اس نے گرج کر کہا۔

"ڈنیلٹ مردہ باد"

وہ ایک نوامی سوان تھا جسکی معیت میں ڈنیلٹ کئی ایک مہموں میں فتح حاصل کر چکا تھا۔ ہر جنگ میں وہ اسکا دستِ راست ہوتا تھا۔

ہجوم میں ہلچل مچ گئی۔ پہلے آہستہ آہستہ اور پھر بڑی پھرتی اور جوش و خروش کیساتھ سب نے لپک لپک کر اپنے ہتھیار سنبھالے۔ اور برج کی طرف بڑھنے لگے۔

"مردہ باد" وہی نعرہ پھر دہرایا گیا۔ ایک تیر چھوٹا، پھر دوسرا۔ اسکے بعد تیسرا

تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ سب نے نیزے اوپر اٹھا لئے۔ اور برج کے گرد جمع ہو گئے۔

"ڈنیلٹ مردہ باد" سب نے ہم آواز ہو کر نعرہ بلند کیا۔

ڈنیلٹ نے خیال ہی خیال میں اس قدآور سوائی کو پکڑ کر اسکا خنجر چھین لیا۔ اور اسپر ایک ایسا وار کیا۔ کہ وہ دو ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔

پھر ڈنیلٹ نے جسے تیر برسا کر مار ڈالنے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ ایک آخری غضبناک نگاہ ان ناقابلِ تسخیر دیواروں پر جو نیزوں کو اٹھائے برج کے گرد کھڑے تھے ڈالی اور نیچے کود پڑا اسکے مضبوط جسم کے ایک نیزے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ رات بھر نیزہ بازی کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اور باغیوں کا جشن ختم ہو گیا۔

باری

دو جنگوں کے درمیان

موجودہ جنگ نے گذشتہ جنگِ عظیم کے اسباب و نتائج کو پس پردہ ڈال رکھا ہے۔ کسی گزری ہوئی مصیبت پر غور فکر دشوار ہو جاتا ہے جب کوئی نئی مصیبت سامنے کھڑی دکھائی دے۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد اکناف عالم میں اس خیال کی اشاعت کی گئی۔ کہ اب نوعِ انسانی نے اس خاکدان سے جنگ کے دیوتا کو ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیا ہے جلا وطنی کا یہ فرمان امریکی صدر ولسن نے جاری کیا۔ اقوامِ عالم کو امن و آزادی سے ہمکنار کرنے کے لئے مجلسِ اقوام بنائی گئی۔ لیکن اسکے باوجود فرانسیسی ادیب اناطول فرانس نے کہا "معاہدۂ ورسائی اپنے آغوش میں ایک اور جنگ کو پال رہا ہے" اناطول فرانس کا یہ مقولہ ٹھیک نکلا۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے اکیس سال بعد اقوامِ عالم نے اوکھا۔ وآ رکے ساتھ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوئی اس مختصر مقالہ کا مقصد اقوامِ عالم کے ان اہم حوادث کو پیش کرنا ہے۔ جو دو جنگوں کی درمیانی مدت میں رونما ہوئے

متحارب قوتوں کے لیڈر صلح کے لئے جس انداز میں غور کر رہے تھے۔ ان سے بالکل مختلف انداز میں امریکی جمہوریت کا صدر ولسن نظامِ نو پر نئی دنیا میں بیٹھا غور کر رہا تھا۔ ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو صدر ولسن نے اپنے مشہورِ عالم چودہ نکات پیش کئے۔ آرمسٹس پر دستخط ہونے کے ایک ماہ بعد صدر ولسن یورپ آیا۔ امن کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۸ جنوری ۱۹۱۹ء کو پیرس میں ہوا۔ اس اجلاس میں بڑی طاقتوں کے دس نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی لیکن یہ کمیٹی کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ دس اشخاص کی کمیٹی قابو سے باہر تھی۔ چنانچہ کمیٹی کے ارکان کو چار افراد پر مشتمل کر دیا گیا۔ ارکانِ اربعہ کی کونسل —— ولسن، لائیڈ جارج، کلمینشو اور اورلنڈو۔ اس مجلسِ اربعہ کے اجلاس میں کسی دوسرے شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ لائیڈ جارج چاہتا تھا کہ مفتوحہ ممالک کے علاقے اتحادیوں میں بٹ جائیں۔ اورلنڈو اٹلی کیلئے بحیرۂ ایڈریاٹک چاہتا تھا۔ کلمینشو کے پیشِ نظر جرمنی کو تباہ و برباد کر دینے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجلسِ اربعہ میں صرف کلمینشو کو کامیابی نصیب ہوئی۔ صرف کلمینشو انگریزی اور فرانسیسی زبانیں جانتا تھا۔ ولسن اور لائیڈ فرانسیسی کا ایک لفظ نہیں جانتے تھے۔ اورلنڈو انگریزی نہیں جانتا تھا۔ ان حالات میں کلمینشو کا بازی لیجانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ صرف کلمینشو جانتا تھا۔ کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مجلسِ اربعہ کی کارروائی سے جرمنی بالکل بے خبر تھا جب جرمنی کے نمائندے ورسائی پہنچے۔ تو وہ نہیں جانتے تھے۔ کہ کیا ہونے والا ہے۔ ان کے خیال میں ان سے معاہدہ کی شرطوں پر بحث ہوگی۔ لیکن جب وہ ورسائی پہنچے۔ تو ان کے ہاتھ میں ایک "کتاب ابیض" دی گئی۔ یہ تھا معاہدۂ ورسائی جس میں چار سو سے زائد شرطیں تھیں۔ جرمن نمائندے اس کتاب ابیض کو تھامے ہوئے ہال سے باہر بھاگ نکلے۔ اب جرمنی کو معاہدۂ ورسائی کی شرطوں کا پتہ چلا۔

برطانیہ

یہ خیال غلط ہے۔ کہ برطانیہ دنیا سے الگ تھلگ ایک جزیرہ ہے۔ برطانیہ دنیا کے ہر ملک سے زیادہ قریب ہے۔ ہر ملک سے اسکے تاجرانہ تعلقات ہیں خام اشیا کی درآمد کے لئے اسے دوسرے ملکوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ:۔

و برطانیہ کے چہرے پر دنیا کے دور دراز ملکوں کے معاشی حالات اثر انداز ہوتے ہیں۔ چین کے کسی شہر کے کسی نئے کارخانہ کی چمنی سے نکلا ہوا دھواں برطانیہ کے کارخانہ داروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر جرمنی، جاپان، آسٹریا یا روس دیوالیہ ہو جائے۔ تو سب سے زیادہ اثر برطانیہ پر ہوگا۔ برطانیہ کا اثر دنیا کے ہر گھر پر موجود ہے۔ اس کی مصنوعات برفستانوں، صحراؤں، وادیوں اور میدانوں میں یکساں فروخت ہوتی ہیں۔

جنگ عظیم کے بعد برطانیہ ایک فتح مند ملک تھا۔ اس کے مقبوضات میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بہر حال برطانیہ سے اس طرح منسلک تھا جس طرح جنگ سے پہلے۔ جنگ عظیم کی سے پہلے "برطانیہ" دنیا کا کارخانہ تھا۔ لیکن جنگ کے دوران میں اس کی تجارت کو اسکے دشمنوں کی وجہ سے کافی نقصان پہنچا تھا۔ اختتام جنگ پر عام خیال یہ تھا کہ برطانیہ کی تجارت کو بہت جلد فروغ حاصل ہوگا۔ لیکن یہ رجائیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں برطانیہ میں بیکاروں کی تعداد دس لاکھ کے قریب تھی۔ اس سال بالشویکوں نے زاری قرضے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ مالیاتی معاملات میں لندن کی جگہ نیو یارک لے رہا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں قدامت پسندوں نے وزارت مرتب کی۔ ۱۹۲۴ء کے انتخابات میں لبرل پارٹی اور لیبر نے مل کر وزارت مرتب کی۔ ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم تھا۔ ریمزے میکڈانلڈ کی لیبر پارٹی مسکوی ساخت کی نہیں تھی۔ تاہم بالشویکی خطرات کے پیش نظر ریمزے میکڈانلڈ کو وزارت سے علیحدہ کرنا پڑا۔ اب بالڈون وزیر اعظم تھا۔ بالڈون نے برطانیہ کے صنعتی حالات کو بہتر بنانے کے لئے بہت کچھ کیا۔ ۱۹۲۶ء میں ملک میں بہت بڑی ہڑتال ہوئی۔ اس ہڑتال میں ایک سو پچاس ملین پونڈ نقصان ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں عنان اقتدار پھر ریمزے میکڈانلڈ کے ہاتھ میں آئی۔ ۱۹۳۱ء میں معاشی بحران اپنی انتہا پر تھا۔ میکڈانلڈ نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مشترکہ وزارت مرتب کی تھی۔ اس قومی وزارت کے عہد میں انگلستان کی حالت بہت کچھ سدھر گئی ۱۹۳۴ء میں انگلستان دنیا کے ہر ملک سے زیادہ دولت مند و خوشحال اور خود اعتماد تھا۔

جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کی خارجہ پالیسی میں فرانس سے اتحاد اور مجلس اقوام کی تائید سب بڑے عنصر رہے ہیں۔ چیمبرلین کی پالیسی صلح کن تھی۔ وہ ڈکٹیٹروں کو اتنی مراعات اور آزادی دینا چاہتا تھا کہ پایان کار ان کے خیال کے مطابق وہ امن عالم کے ضامن بن جائیں گے۔ چیمبرلین کے بعد مسٹر چرچل وزیر اعظم بنے۔ دو جنگوں کے درمیان برطانیہ کو آئرستان اور ہندوستان کے مسائل نے بھی پریشان کئے رکھا۔

فرانس:

دو جنگوں کی درمیانی مدت میں وسطی یورپ کے ملکوں میں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری فرانس پر ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال سے فرانس یورپ کے سب ملکوں سے زیادہ متمدن تھا۔ اس نے سب سے پہلے قومی آزادی حاصل کی۔ سترھویں صدی میں فرانس کا تمدن تمام یورپی ملکوں کے لئے نمونہ تھا۔ اس کی زبان ہر یورپی تاجدار کے دربار کی زبان تھی۔ انقلاب فرانس میں اس نے حریت، اخوت اور مساوات کا علم بلند کیا تھا۔ تہذیب و تمدن میں فرانس یورپ کے سارے ملکوں سے آگے بڑھا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسے ہر لمحہ غیر ملکی حملوں کا خطرہ رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں فرانس چاہتا تھا کہ جرمنی کو معاہدوں میں اس طرح جکڑ دیا جائے۔ کہ اس میں دوبارہ حملہ آور ہونے کی طاقت نہ رہنے پائے۔

۱۶ نومبر ۱۹۱۹ء کے انتخابات کا نتیجہ ایک مخلوط وزارت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ وزارت "بلاک نیشنل" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ وزارت رجعت پسندوں اور سرمایہ داروں کے باہمی سمجھوتہ کا نتیجہ تھی۔ اس وزارت کی حکمت عملی یہ تھی۔ کہ جنگ کے تمام اخراجات جرمنی سے وصول کئے جائیں۔ کلیمنشو کو جنوری ۱۹۲۰ء میں مستعفی ہونا پڑا۔ برسر اقتدار آنے کے بعد "بلاک نیشنل" کا لیڈر پوانکارے تھا۔ وہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک جمہوریت فرانس کا صدر تھا۔ بلاک نیشنل کے دور حکومت میں فرانس کے بڑے بڑے

سرمایہ داروں کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ آسٹریا، ہنگری، پولینڈ اور یوگوسلافیہ کو بہت زیادہ قرض دیا۔ قرض کے مسئلہ پر پوئنکارے اور رائن کے بڑے تاجروں میں اختلاف پیدا ہو گیا جس سے پوئنکارے کو مستعفی ہونا پڑا۔ ۱۹۲۴ء میں کارتل وکاشے نے اقتدار حاصل کیا۔

کارتل کسی حالت میں بھی ترقی پسند، انقلاب پسند یا سوشلسٹ نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک جماعت تھی۔ چھوٹے چھوٹے صنعتی اداروں کے مالکوں کی۔ کارتل کا پہلا لیڈر ہیریو تھا۔ کارتل کی خارجہ پالیسی امن پسندانہ تھی۔ کارتل کی کوششوں سے لوکارنو کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ کارتل کی داخلہ پالیسی زائد ٹیکسوں کو ختم کرنا تھا فرانسیسی لوگ ٹیکس ادا کرنے کے معاملے میں بہت عجیب و غریب واقع ہوئے ہیں۔ وہ فرانس کے لئے جان دے سکتے ہیں۔ لیکن فرانس کو ٹیکس دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان حالات میں کارتل کے لئے زیادہ دیر برسر اقتدار رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں پوئنکارے وزیر اعظم بنا۔ اس نئی پارٹی کا نام "یونین نیشنل" تھا۔ ۱۹۳۲ء تک یونین نیشنل کی حکومت قائم رہی۔ یونین نیشنل نے بلاک کی صنعتی پالیسی اور کارتل کی خارجہ پالیسی کو اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ یہ اچھا خیال کیا تھا۔ اس نے بریان کو وزیر خارجہ مقرر کر کے غیر ملکی رائے کی تسلی کر دی۔ اور ہیریو کو وزیر تعلیم مقرر کر کے داخلی طور پر سوشلسٹوں کو مطمئن کر دیا۔ فرانس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ مالیات کا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ فرانس کے میزانیہ میں توازن پیدا کیا۔ پوئنکارے کی کوششوں سے فرانس چار تا پانچ قرضوں سے بچ گیا۔ اب فرانس کی پوزیشن بہت مستحکم تھی، اور فرانس کی فوج یورپ میں سب سے بڑی تھی۔ اس کے پاس سب سے زیادہ سونا تھا۔ اس کے میزانیہ میں بچت تھی۔ اس کی صنعت و حرفت روز افزوں ترقی پر تھی۔ لیکن اس کے علاوہ فرانس کو خطرات کا بھی سامنا تھا:-

(۱) جرمنی دوبارہ مسلح نہ ہو جائے۔

(۲) مسولینی کہیں فرانس پر حملہ نہ کر دے۔

(۳) آسٹریا اور ہنگری ہیپسبرگ شاہیت کے ماتحت متحد ہونا چاہتے تھے۔

(۴) روس ابھی تک ایک معمہ تھا۔

لیکن فرانس کے لئے سب سے ضروری مسئلہ یہ تھا۔ کہ فرانسیسیوں کو اس امر کا یقین دلایا جائے۔ کہ فرانس کے حالات بہتر رہیں گے۔

مسیو بریان نے چاہا۔ کہ فرانس اور امریکہ میں ایک علیحدہ معاہدہ ہو جائے۔ پیرس کے مطالبہ کو واشنگٹن نے تسلیم نہ کیا۔ کیلاگ نے جواب دیا۔ کہ امریکہ کیوں صرف فرانس ہی سے دوستانہ معاہدہ کرے۔ وہ یورپی طاقتوں سے ایک عام معاہدہ کر سکتا ہے۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں ۲۳ ملکوں نے کیلاگ پیکٹ پر دستخط کئے۔ اس پیکٹ کی تصدیق کے تین ہفتے بعد امریکہ نے پندرہ نئے جنگی جہاز بنانے شروع کئے۔

امریکہ سے مایوس ہونے کے بعد بریان مجلس اقوام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ مجلس اقوام کے یورپی ممبروں کی ایک علیحدہ پارٹی بنائی جائے۔ جسکے ذریعہ متحدہ ریاستہائے یورپ کے تصور کو کامیاب بنایا جائے۔ لیکن بریان کی یہ اسکیم بھی پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس یورپی گروپ میں فرانس کے چھ ووٹ ہو جاتے تھے۔ اور برطانیہ کا صرف ایک۔

ایم بریان کی موت کے بعد فرانس میں یکے بعد دیگرے وزارتیں مرتب ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۴ء میں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ فرانس میں پارلیمنٹری نظام شاید زیادہ دیر تک قائم رہ سکے۔

سوال یہ تھا۔ کہ اب عنان حکومت کس کے ہاتھ میں ہو؟

کمیونسٹ پارٹی کمزور تھی۔ سوشلسٹ کئی پارٹیوں میں منقسم تھے ان میں سے ایک پارٹی کا لیڈر لیون بلوم تھا۔ اسکے عقائد کا مارکس کے خیالات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ فرانس کی بعض سیاسی پارٹیوں کے پیش نظر فرانس میں شاہیت قائم کرنا تھا۔ فرانسیسیوں کی ایک بہت بڑی جماعت۔ تیسری جمہوریت، کی اس لئے مخالفت چلی آتی تھی۔ کہ یہ ایک شکست کی پیداوار تھی۔ فرانس میں شاہ پسندوں کی جماعت کا بھی بڑا زور تھا۔ اسی اثنا میں ستاویسکی کے مالیاتی فراڈ نے فرانس کے مالی حالات کو سخت دھکا لگایا۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا۔ کہ فرانس میں جمہوریت چند دنوں کی مہمان ہے۔ پیرس کی گلیوں میں شاہ پسندوں اور سرخوں میں فسادات ہوئے۔ صرف ایک رات میں ۱۵ ہلاک اور ۱۲۰۰ مجروح ہوئے۔

فرانسیسی جمہوریت کو بچانے کے لئے فرانس کا ۰۰ سالہ سابق صدر میدان میں نکلا۔ لیکن اسے بھی زیادہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ ۱۹۳۶ء میں پاپولر فرنٹ کے برسرِ اقتدار آنے سے فرانس میں اصلاحات کا سیلاب نہ نکلا۔ نیز چیکوسلاویکیہ، یوگوسلافیہ اور رومانیہ سے معاہدے کئے گئے۔ روس سے بھی از سرِ نو دوستانہ تعلقات قائم کئے۔ لیکن ۱۹۳۸ء کے "معاہدہ میونخ" نے فرانس کے ان تمام غیر ملکی تعلقات کو ختم کر دیا۔ فرانس اور روس کے تعلقات ختم ہو گئے۔ فرانس نے جرمنی کو چیکوسلاویکیہ پر قابض ہونے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ ایم دلادیر نے نیا کابینہ مرتب کیا۔ ۱۹۳۹ء کو فرانس نے برطانیہ سے مل کر جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

دو جنگوں کی درمیانی مدت میں فرانس کچھ زیادہ خوش نہیں رہا۔ اسے مقصدِ تہذیب میں کامیابی نہ ہو سکی۔

جرمنی:۔

جرمن سلطنت کی بنیاد ۱۸۷۱ء میں رکھی گئی تھی۔ چالیس سال تک اس سلطنت کو عروج حاصل رہا۔ جنگِ عظیم میں یہ سلطنت پارہ پارہ ہو گئی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی جرمنی کا محاصرہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اپریل ۱۹۱۹ء میں معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدہ کی رو سے جرمن کو چھ ارب ساٹھ کروڑ پونڈ بطور تاوانِ جنگ ادا کرنا تھا۔ جرمنی نے الزیک اور لورین کے علاقے فرانس کے حوالے کر دئے۔ ملیشیا، پروشیا اور پوزن کے بعض علاقے چیکوسلاویکیہ اور پولینڈ کو دئے گئے۔ ڈنمارک اور بلجیم کو بھی جرمنی کے بعض علاقے ملے۔ ڈانزگ کو ایک نئی ریاست میں بدل دیا گیا تھا۔ افریقہ اور جنوبی سمندروں کی نو آبادیات بھی جرمنی سے لے لی گئیں۔ یورپ میں جرمنی سے جو علاقے چھینے گئے تھے۔ ان کا رقبہ پچیس ہزار مربع میل اور آبادی ساٹھ لاکھ تھی۔ جرمنی میں جنگ کو ختم کرنے والے وہ سپاہی ملاح اور مزدور تھے۔ جنہوں نے آرمسٹس سے دو ہفتے پہلے شاہ پسندوں کی جماعت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ جرمنی کے بڑے بڑے شہروں میں سرخ پھریرے لہرا رہے تھے قیصر تخت سے علیحدہ ہو گیا۔ اس خاندان کو ختم کرنے کے لئے جس نے جرمنی میں پانچسو برس حکومت کی تھی۔ صرف پندرہ انسانوں کا خون بہانا پڑا۔ قیصر کی تخت سے دست برداری کے بعد جرمنی کی بیس ریاستوں کے حکمرانوں کو بھی تاج و تخت چھوڑنا پڑا۔ اب جرمنی ایک جمہوری ملک تھا۔ اس کا صدر ایبرٹ تھا۔ لیکن جرمنی میں کس قسم کی جمہوریت ہو؟ اس مسئلہ پر جرمنی کی جمہوری پارٹیوں میں اختلاف تھا جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی کا خیال تھا۔ کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ صرف اس وجہ سے ہوئی ہے۔ کہ یورپی ملکوں کے سرمایہ دار اپنے ملک کے لئے منڈیاں چاہتے تھے۔ اس لئے اگر جرمنی میں سرمایہ دارانہ نظام کو جاری رہنے دیا۔ تو اس کا لازمی نتیجہ مستقبل کی جنگ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اسلئے ان کے خیال میں جرمنی میں نئے انتخابات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کمیونسٹوں کے ہاتھ میں اقتدار ہونا چاہئے۔ لیکن جرمنی میں انتخابات ہوئے اعتدال پسند سوشلسٹوں کو کامیابی ہوئی۔ ویمر میں جرمنی کے لئے جو نیا دستور بنایا گیا۔ اسے دستورِ ویمر کہتے ہیں۔ اگست ۱۹۱۹ء میں دستورِ ویمر نے قانون کی صورت اختیار کر لی تھی معاہدہ ورسائی کی کڑی شرطوں کے باوجود دس سال تک دستورِ ویمر کامیابی سے چلتا رہا۔ چونکہ جرمنی نے تاوانِ جنگ ادا نہیں کیا تھا۔ اسلئے فرانس نے جرمنی کے صنعتی علاقے روہر پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۵ء میں ہنڈنبرگ جرمنی کا صدر بنا۔ ۱۹۲۹ء میں سٹریس مان کی موت کے بعد جرمنی نے اس امر کا اعلان کر دیا تھا۔ کہ وہ تاوانِ جنگ ادا کرنے کے ناقابل ہے۔ اسی اثنا میں نازی پارٹی اہمیت حاصل کر رہی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں ہنڈنبرگ پھر صدر منتخب ہوا۔ اس مرتبہ نازی پارٹی کے نمائندوں کی تعداد دوسری ہر پارٹی سے زیادہ تھی۔ چانسلر برونگ کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کی جگہ فان پاپن نے لے

ی۔ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر جرمن کا ڈکٹیٹر تھا۔ نازیوں کی داستان ہٹلر کی کہانی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جرمنی مجلسِ اقوام سے علیحدہ ہوا معاہدۂ ورسائی کی پابندیوں کو ایک ایک کر کے توڑ گیا۔ رائن لینڈ آسٹریا اور چیکو سلاویکیہ پر قبضہ کیا گیا۔ کوریڈور اور ڈانزگ کے مطالبات کو پولینڈ نے ماننے سے انکار کر دیا۔ پولینڈ کے خلاف جرمنی کی جنگ ——

اٹلی ۔۔ جنگِ عظیم کے بعد اٹلی تباہ حال اور شکستہ تھا۔ اٹلی کو نہ صرف حرب و ضرب میں شکست ہوئی۔ بلکہ سیاست میں بھی اسے منہ کی کھانا پڑی۔ اٹلی مقبوضات کے حصول کے لئے جنگ میں شریک ہوا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں وہ اتحادِ ثلاثہ (جرمنی، آسٹریا، اٹلی) کا رکن تھا۔ لیکن مرکزی طاقتیں (جرمنی، آسٹریا) اٹلی کو سوائے ٹورنٹینو کے ایک حصہ کے اور کچھ نہیں دینا چاہتی تھیں۔ انگلستان نے اٹلی کو جرمنی کے افریقی مقبوضات کا حصہ ٹورنٹینو، ٹرسٹ اور البانیہ دلانے جانے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ اٹلی نے اپریل ۱۹۱۵ء میں معاہدہ لندن پر دستخط کر دئے۔ اور مئی ۱۹۱۵ء میں اس نے آسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ پندرہ ماہ بعد اٹلی نے جرمنی کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کر دیا۔ اختتامِ جنگ پر مجلسِ اربعہ میں اطالوی نمائندے اورلینڈو کو مایوس ہونا پڑا۔ اٹلی میں ہر شخص آمادہ پیکار تھا۔ جنگ نے اٹلی کو معاشی اور سیاسی اور دستوری طور پر تباہ و برباد کر دیا تھا اٹلی کے میزانیہ میں بارہ ہزار ملین لیرا کا خسارہ تھا۔ اٹلی کے طول و عرض میں خفیہ انجمنوں، خونیں اخوتوں، اور دہشت پسندوں کا دور دورہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس بدامنی سے کسی نوعیت کا نیا نظام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۱۹ء میں ہڑتالیں عام تھیں ۱۹۲۰ء میں مزدوروں نے جا بجا سوویٹ قائم کر لئے تھے۔ تمام کارخانوں پر ان کا قبضہ تھا۔ لیکن مفاہمت کی گفت و شنید کے بعد انہیں معلوم ہوا۔ کہ وہ خام اشیاء اور بیرونی منڈیوں سے منقطع ہو چکے ہیں۔ وہ کارخانہ داروں کے آگے جھک گئے۔ اٹلی میں سرخ انقلاب نہ ہو سکا۔

۱۹۲۱ء کے انتخابات میں ۳۴ فاسسٹ امیدوار پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن فاسسٹوں نے ملک میں اندھیر مچا رکھا تھا۔ قتل و غارتگری کے واقعات عام تھے۔ ان حالات میں مسولینی فاسسٹ پارٹی سے الگ ہو گیا۔ لیکن چند ماہ بعد تمام فاسسٹوں نے مسولینی کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ فاسسٹ بنیادوں پر جدید اٹلی کی عمارت کندہ ہونی شروع ہوئی۔ اطالوی کابینہ کے ہیجم بحران کے پیشِ نظر مسولینی نے ریاستی ضرب کا پروگرام مرتب کیا۔ ۲۷ اکتوبر کا دن مقرر ہوا۔ فاسسٹوں کے رضاکار دستے روم کے گرد و نواح میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ وقت مقررہ پر مسولینی کے حامیوں نے بادشاہ سے ملاقات کی۔ اب اٹلی کے وزیر اعظم کے لئے مستعفی ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ۳۰ اکتوبر کو مسولینی روم پہنچا۔ وزارت مرتب کی۔ پچاس ہزار فاسسٹ رضاکار چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر روم سے باہر چلے گئے۔ اس کے بعد ان رضاکاروں کو قومی فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔

مسولینی کون تھا؟ اٹلی کے باہر اسے بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اٹلی میں بھی وہ زیادہ شہرت کا مالک نہیں تھا۔ اس نے پارلیمنٹ کے ارکان کو ستانا شروع کیا۔ ۱۹۲۵ء تک اس کی ساری سرگرمیاں اپنے مخالفوں کو کچلنے میں صرف ہوئی تھیں۔ اب اس نے اٹلی کو فاسسٹ خطوط پر چلانا چاہا۔ یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا۔ کہ مسولینی اٹلی کے غریب لوگوں کے لئے روٹی میسر کر سکتا۔ اٹلی کی مالی حالت خراب ہو چکی تھی۔ مسولینی اٹلی کو کافی بالذات بنانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے پروگرام کے مطابق اٹلی میں تمام ٹریڈ یونینوں کو بند کر دیا۔ اور ان کی جگہ مختلف صنعتوں کے مالکوں اور مزدوروں کے الگ الگ سنڈیکیٹ بنا دئے۔ ان سنڈیکیٹوں پر فاسسٹوں کا قبضہ تھا۔ مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا حق نہیں تھا۔ سرمایہ و محنت کے تمام جھگڑوں کے تصفیوں کے لئے ایک لیبر کورٹ آف اپیل تھا۔ اسکے جج مسولینی مقرر کرتا تھا۔ مسولینی نے اٹلی کے معاشی نظام کو ۱۹۲۷ء کے لیبر چارٹر میں پوری طرح پیش کر دیا معاشیات

کے بعد مسولینی اٹلی کے سیاسی دستور کی طرف متوجہ ہوا۔ ظاہراً اٹلی کا آئین ابھی تک دستوری شاہیت تھا۔ جس کی ترتیب و تشکیل برطانیہ کے دستور سے ملتی جلتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ مسولینی نے اٹلی کی وزارتِ عظمیٰ کو صرف بادشاہ کے آگے جواب دہ بنا دیا نیز ایک ایکٹ کے ذریعہ اس نے وزارتِ عظمیٰ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کو غیر آئینی بنا دیا۔ آہستہ آہستہ مسولینی نے اٹلی کے تمام سیاسی اقتدار کو گرانڈ فاسسٹ کونسل میں مرکز کر دیا۔ اس کونسل میں مسولینی، اسکے مدیر اور لفٹیننٹ شامل ہیں۔ اس کونسل کا اجلاس خفیہ ہوتا ہے۔ ان جلسوں میں اٹلی کے حال اور مستقبل کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ کونسل مسولینی کے جانشین تک مقرر کر چکی ہے۔ فاسزم اٹلی کے مردہ جسم کی ایک ہڈی ہے۔ اس ہڈی کو کیونکر زندہ رکھا جائے؟ بچوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ صرف اُن سکولوں میں پڑھیں۔ جہاں فاسسٹ معلم ہوں۔ درسی کتابوں کے ذریعہ فاسزم کی تعلیم دی گئی۔ انہیں مسولینی کی تصویروں کے زیر سایہ تعلیم دی جانے لگی: "مسولینی ہمیشہ راستی پر ہوتا ہے" سبق کی طرح زبانی یاد کرایا گیا۔ اٹلی کے تمام اخباروں پر فاسسٹوں کا قبضہ تھا ہر اخبار کے سرورق کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایک اخبار دوسرے اخبار سے صرف اس افسانے سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ جو ہر اخبار میں سلسلہ وار شائع ہوتا ہے۔ خبروں کی ترتیب، مقالات اور شذرات میں اٹلی کے تمام اخبار ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں

ایک فاسسٹ کا حلف وفاداری یہ ہے:-

"میں ریاست پر عقیدہ رکھتا ہوں جس سے الگ ہو کر میں کبھی مکمل انسان نہیں بن سکتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ اٹلی کی مقدس تقدیر دنیا پر سب سے زیادہ روحانی اثر ہے۔ میں قائد کی اطاعت کرونگا کیونکہ اطاعت کے بغیر کوئی زندگی نہیں" فاسزم بین الاقوامی امن کی قائل نہیں۔ فاسزم جنگ پر عقیدہ رکھتی ہے۔ ہر وہ عقیدہ جس کا مقصد دنیا میں امن قائم کرنا ہو۔ فاسزم کی اسپرٹ کے منافی ہے اس اسپرٹ کا مظاہرہ اٹلی کی خارجہ پالیسی بارہا کر چکی ہے۔ حبشہ اور البانیہ پر قبضہ کرنے کے بعد آج اٹلی یونان سے دست و گریبان ہے،

ہسپانیہ:-

گذشتہ جنگ عظیم میں ہسپانیہ غیر جانبدار تھا۔ حالانکہ شاہ الفانسو کے لئے شرکتِ جنگ کا بڑا معقول بہانہ تھا۔ اس کی ماں آسٹریا کی رہنے والی تھی۔ اور اس کی بیوی برطانوی تھی۔ ہسپانیہ کی اس غیر جانبداری سے اس کی تجارت کو بڑا فروغ حاصل ہوا حکومت نے کئی ایک غیر ملکی قرضے ادا کر دئے۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں ہسپانوی تجارت کو بہت دھکا لگا۔ ملک بھر میں بے چینی کے آثار پائے جاتے تھے۔ اس وقت الفانسو نے ازمنہ وسطیٰ کے بادشاہوں کی حکمت عملی اختیار کی عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے اس نے امیر عبدالکریم کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ لیکن امیر نے ہسپانیہ کی شاہی فوجوں کو شکست دی۔ اس شکست کے اسباب پر غور کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ چونکہ شاہ الفانسو کو اپنی غلطی کا پورا احساس تھا۔ اسلئے اس نے پریمو دی ریورا کو تمام اختیارات سونپ دئے۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۲۳ء کو اس نے اپنی آمریت کا اعلان کر دیا۔ ہسپانوی دستور معطل کر دیا گیا۔

پریمو دی ریورا ۱۹۲۹ء تک ہسپانیہ کا ڈکٹیٹر رہا۔ اس مدت میں اس نے ہسپانیہ کو یورپ کے گاؤں سے یورپ کا ایک شہر بنا دیا مسولینی اور دی ریورا کے طریق کار میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن دی ریورا ہسپانیہ میں فاسسٹ روح پیدا نہ کر سکا۔ آخر ۱۹۲۹ء میں دی ریورا کو مستعفی ہونا پڑا۔ شاہ الفانسو نے دستور کو بحال کر دیا۔ اور نئے وزیر مقرر کئے۔ لیکن نیا وزیر اعظم ناکام رہا۔ ہسپانیہ انقلاب کے دروازے کو دستک دے رہا تھا۔ انقلابیوں اور سوشلسٹوں کو گرفتار کر لیا گیا باغی سپاہیوں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ گرفتار شدہ کارکنوں نے میڈرڈ کے موڈل جیل سے ایک زندانی پروگرام پیش کیا۔ آزادوں نے اسیروں کی فریاد کو بڑی ہمدردی سے سنا۔ تمام جمہوریت پسند عناصر متحد ہو گئے۔ شام کو میڈرڈ میں جمہوریت کا اعلان کیا گیا اور رات کو شاہ الفانسو ہسپانیہ سے باہر چلا گیا۔ جمہوری تحریک کا لیڈر زمورا تھا۔ یہ انقلاب پر امن تھا۔ صرف راہبوں کو تکلیف پہنچائی گئی تھی۔ کیونکہ انہوں نے ہسپانیہ کو شاہیت کی گود میں بٹھا دیا تھا جمہوریت پسندوں نے کسی ایک راہب کو بھی قتل نہ کیا۔ صرف دو

سو کے قریب کلیساؤں کو جلا دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۳۱ء میں نئے جمہوری دستور کا اعلان کیا گیا۔ اس دستور میں ہسپانیہ کو "مزدوروں کی جمہوریت" بتایا گیا۔ وزیر اعظم زمورا اور وزیر داخلہ چونکہ پکے کیتھولک تھے۔ اس لئے وہ سوشلسٹوں کے اس مطالبہ کو نہیں مان سکتے تھے۔ کہ کلیسا کی ساری جائداد ضبط کر لی جائے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں زمورا اور وزیر داخلہ دونوں مستعفی ہو گئے۔ اب ازانا نے نئی وزارت مرتب کی۔ اس نے کلیسا کو تعلیمی اور تجارتی مشاغل سے علیٰحدہ کرتے ہوئے پادریوں کے وظائف بند کر دئے۔ لیکن اسکے باوجود ہسپانیہ میں مذہب ایک ادارہ کی حیثیت سے باقی رہا۔ یسوعیوں کی سوسائٹی کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ اور ان کی ساڑھے ستر لاکھ پونڈ کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ پچاس سال میں شاہیت ہسپانیہ کے لئے اتنا نہ کر سکی۔ جتنا جمہوریت نے اٹھارہ مہینوں میں کر دکھایا۔ ازانا نے ہسپانیہ کا فوجی مسئلہ نہایت آسانی سے حل کر دیا۔ فوجی جماعت کے زائد اختیار ختم کر دئے گئے۔ بلکہ اُن ہی کو حکومت کی تحویل میں لایا گیا۔ مزدوروں کے لئے آٹھ گھنٹے مقرر کئے گئے۔ تاجر اور امیروں کی جاگیروں کو ضبط کر لیا گیا۔

۱۹۳۱ء کے انقلاب میں لبرل اور سوشلسٹ متحد تھے۔ لبرل آزادی کے حامی تھے۔ اور سوشلسٹ معاشی آزادی کے دلدادہ تھے۔ ازانا ازارنہ کے سوشلسٹوں نے سرمایہ داروں کو بہت زیادہ برافروختہ کر دیا تھا۔ لیکن مزدوروں کو وہ اپنی طرف مائل نہیں کر سکے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں آئندہ انتخابات لڑنے کے لئے ایک "اینٹی مارکسٹ پارٹی" بنائی گئی۔ انتخابات میں اس پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ہسپانیہ کا نیا وزیر اعظم لیرو تھا۔ لیرو کی رجعت پسندانہ حکمت عملی سے ہسپانیہ میں خانہ جنگی کا آغاز ہوتا ہے۔ دایاں اور بایاں بازو الگ الگ متحد تھے۔ لیرو کو اپریل میں مستعفی ہونا پڑا۔ اس کا جانشین سیمپر سوشلسٹوں کا بہت زیادہ دشمن تھا۔ ستمبر ۱۹۳۴ء میں بائیں بازو کے تمام عناصر متحد ہو گئے دایاں بازو ذرہ برابر جھکنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سیمپر کی جگہ پھر لیرو نے لی۔ اکتوبر میں فسادات شروع ہوئے۔ فوج اور پولیس لیرو کی طرف دار رہی۔ ۱۹۳۵ء میں تیس ہزار کے قریب سوشلسٹ جیلوں میں تھے۔

۱۹۳۶ء کے انتخابات میں تمام جمہوری عناصر نے مل کر "پاپولر فرنٹ" بنایا۔ اور اس طرح سے دائیں بازو کے اقتدار کو توڑ دیا۔ انتخابات میں پاپولر فرنٹ کامیاب ہوا۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں جنرل فرانکو نے ہسپانیہ کی جمہوری حکومت کے خلاف اقدام کیا اس طرح ہسپانیہ میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ ہسپانیہ کی یہ خانہ جنگی دراصل قدیم اور جدید میں تصادم تھا۔ جمہوریت کی حمایت میں وہ تمام لوگ تھے۔ جو صدیوں سے جاگیر شاہی کے مظالم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے ― سوشلسٹ، کمیونسٹ اور انارکسٹ۔ باغیوں میں اشرافیہ، شاہ پسند، کلیسائی تھے۔ باغی نیشلسٹوں کے نام سے ظاہر ہوئے۔ گویا ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں دو پارٹیاں تھیں۔ جمہوری اور نیشلسٹ۔ دراصل خانہ جنگی تھی۔ تو ہسپانیہ کی دو سیاسی پارٹیوں کے درمیان۔ لیکن ہم اسے "نیم کرہ کی عالمگیر جنگ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ نیشلسٹوں کی حمایت پر جرمنی اور اٹلی کے رضاکار تھے۔ جمہوریت پسندوں کی حمایت کے لئے ایک انٹرنیشنل بریگیڈ بنایا گیا تھا۔ جس میں پول، بلجی، چیک، امریکی، برطانوی اور فرانسیسی رضاکار شریک تھے۔ انٹرنیشنل بریگیڈ میں ہندوستان کی نمائندگی بھی کی گئی تھی۔

جنرل فرانکو جزائر کنیری کا گورنر تھا۔ بغاوت کے آغاز ہونے پر وہ مراکو چلا گیا۔ وہاں سے مور سپاہیوں کو لے کر ہسپانیہ میں داخل ہوا۔ ۱۹۳۶ء کے اواخر میں جنرل فرانکو کی فوجوں نے میڈرڈ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ خانہ جنگی ۱۹۳۷ء میں بھی جاری رہی۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کے دوران میں یہ خیال عام ہو گیا تھا۔ کہ یہ جنگ بین الاقوامی جنگ کی صورت اختیار کرے گی۔ اسی خیال کے پیش نظر میثاق عدم مداخلت پر ۲۷ اقوام نے دستخط کئے لیکن بے سود۔ جرمنی اور اٹلی بدستور فرانکو کی مدد کرتے رہے۔ لیکن برطانیہ اور فرانس ہسپانیہ کے جمہوریت پسندوں کی مدد نہ کر سکے۔ موجودہ جنگ میں جنرل فرانکو اس وقت تک بے طرف ہے۔ لیکن ہسپانیہ کا اس جنگ

میں زیادہ دیر تک بے طرف رہنا مشکل نظر آتا ہے۔

آسٹریا:۔

۱۲۷۳ء میں خاندان ہیپسبرگ نے آسٹریا میں اپنی حکومت قائم کی۔ یہ خاندان ۱۹۱۸ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ جنگِ عظیم کے خاتمہ پر آسٹریا ایک چھوٹا سا ملک تھا جس کی آبادی ساٹھ لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ ۱۹۲۲ء میں آسٹریا کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مجلسِ اقوام کے ایک کمیشن نے آسٹریا کو مالی تباہی سے بچا لیا۔ آسٹریا کی سیاست میں دو پارٹیوں کی کش مکش قابلِ ذکر ہے۔ جوبیرا اور شٹنز بنڈ ۱۹۳۴ء میں ڈاکٹر ڈالفس نے شٹز بنڈ (ایک سوشلسٹ پارٹی) کو دبا دیا لیکن ڈاکٹر ڈالفس کو نازیوں کی ایک جماعت نے قتل کر دیا۔ ڈاکٹر ڈالفس کی جگہ ڈاکٹر شوشنگ نے لی۔ اس نے ہیمر پارٹی کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ اسی اثنا میں نازیوں نے تحریک اتحاد (ANCHLUSS) کو بڑے زوروں سے چلایا۔ اس تحریک کا مقصد آسٹریا کو جرمنی سے ملحق کرنا تھا۔ آسٹریا میں شاہ پسندوں کی تحریک بھی زوروں پر تھی۔ آخر ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کر لیا۔

ہنگری:۔

۱۹۱۸ء میں شہنشاہ چارلس کی تخت سے دست برداری کے بعد ہنگری میں جمہوریت کا اعلان کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں ایک معاہدہ کی رو سے ہنگری کو آسٹریا سے الگ کر دیا گیا۔ جنگ کے بعد ہنگری میں ایک کمیونسٹ بیلا کون نے پانچ مہینے حکومت کی۔ ۱۹۳۱ء میں مزدوروں کی بے چینی نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک جنرل گومبوس ہنگری کا وزیر اعظم رہا۔ ہنگری میں شاہیت کے دو دعویدار ہیں۔ پرنس اوٹو اور ڈیوک آف الوٹا۔ بعض لوگوں نے "ڈیلی میل" کے مالک لارڈ راتھر میر کا نام بھی ہنگری کی بادشاہت کے لئے تجویز کیا تھا۔

چیکوسلاویکیہ:۔

۱۹۱۸ء میں آسٹریا ہنگری کی شاہیت کے خاتمہ پر پراگ میں چند چیکوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا جسے پیرس میں مقیم اتحادی نمائندوں نے تسلیم کر لیا۔ سلاویکیہ کا علاقہ اس میں شامل کر کے چیکوسلاویکیہ کے نام سے ایک نئی ریاست بنا دی گئی۔ جنگِ عظیم کے بعد اس جمہوریت کا صدر مساریک اور وزیر خارجہ بینیش تھا۔ ڈاکٹر بینیش نے رومانیہ اور یوگوسلافیہ سے معاہدے کئے۔ جنگ کے بعد چیکوسلاویکیہ نے بہت زیادہ صنعتی ترقی کی۔ جرمنی میں ہٹلر کے عروج کے ساتھ ہی چیکوسلاویکیہ کی سوڈیٹن جرمن پارٹی نے ہنلین کی رہنمائی میں ایک قومی تحریک چلائی۔ اس تحریک کے مطالبات تسلیم کئے جانے کے بعد ہٹلر نے یہ مطالبہ کیا کہ سوڈیٹن لینڈ کو جرمنی کے ساتھ ملا دیا جائے۔ ستمبر ۱۹۳۸ء میں جرمنی نے چیکوسلاویکیہ پر حملہ کر دیا۔ معاہدہ میونخ نے چیکوسلاویکیہ کو ختم کر دیا۔

یوگوسلافیہ:۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد یوگوسلافیہ کا موجودہ ملک ظہور میں آیا۔ تمدنی اور لسانی اختلافات کے پیشِ نظر یہ ملک ہندوستان اور چین سے ملتا جلتا ہے۔ مختلف قوموں میں باہمی تضاد اور تصادم رہتا ہے۔ دستوری مسائل میں یہ اختلاف بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ نومبر ۱۹۲۸ء میں شاہ الگزینڈر نے پارلیمنٹ توڑ کر جنرل زرکووچ کی امداد سے آمریت قائم کی۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں سرکاری طور پر اس نے ملک کا نام یوگوسلافیہ رکھا گیا۔ ملک کو صوبوں میں منقسم کیا گیا۔ تمام سیاسی پارٹیوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں نئے دستور کا اعلان کیا گیا۔ ۹ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو شاہ الگزنڈر فرانس کی سیاحت کے دوران میں قتل کر دیا گیا تھا۔ موجودہ جنگ کے آغاز میں یوگوسلافیہ نے بے طرفی کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام نو اس پر اثر انداز ہو کر رہیگا۔ یوگوسلافیہ کا رقبہ چھیانوے ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ پایۂ تخت بلگریڈ۔ یوگوسلافیہ ایک

زرعی ملک ہے۔ صنعت کان کنی میں فرانس اور برطانیہ کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ فوجی قوت پندرہ لاکھ سپاہیوں پر مشتمل ہے

پولینڈ:-

پولینڈ کی تاریخ ۹۹۶ سے پتہ چلتا ہے۔ ۱۷۷۲، ۱۷۹۳ اور ۱۷۹۵ میں پولینڈ کو تین مرتبہ روس، پروشیا اور آسٹریا میں تقسیم کیا گیا آخری تقسیم کے موقع پر پولینڈ کی آزادی ختم کر دی گئی تھی۔ پولش قوم ایک سو بیس سال تک آزادی کے لئے جدوجہد کرتی رہی۔ آخر جنگِ عظیم کے بعد پولینڈ نے از سرِ نو وجود حاصل کیا۔ جنگِ عظیم کے آغاز میں پولینڈ وسطی طاقتوں سے مل کر روس کے خلاف لڑا۔ اور جنگ کے آخری دور میں اتحادیوں سے مل کر وسطی طاقتوں کے خلاف لڑا۔ جنگِ عظیم کے بعد روس، جرمنی اور دوسری ریاستوں سے علاقے چھین کر پولینڈ کی جمہوریت بنائی گئی۔ ۱۹۲۶ء میں مارشل پلڈوسکی نے اقتدار حاصل کیا۔ ازاں بعد پولینڈ میں کرنیل گروپ، کی حکومت تھی۔ مخالف لیڈروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں پولینڈ نے جرمنی سے سمجھوتہ کرنا چاہا۔ چنانچہ دونوں ملکوں میں دس سال کے لئے غیر جارحانہ معاہدہ ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں مارشل پلڈوسکی کی موت پر مارشل سمگلی پولینڈ کا ڈکٹیٹر تھا۔ پارلیمنٹ کو معطل کر دیا گیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے پولینڈ کو چیکوسلاویکیہ کا ایک حصہ دے دیا۔ لیکن اگلے سال اس نے ڈانزگ اور کوریڈر کا مطالبہ کیا۔ جسے پولینڈ نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ موجودہ جنگ کا آغاز۔

رومانیہ:-

جنگِ عظیم کے بعد رومانیہ کی آبادی اور رقبہ میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں فرڈیننڈ ثانی کی موت کے بعد اس کے پوتے مائیکل کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ولی عہد کیرول سے زبردستی استعفیٰ دلایا گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں رومانیہ میں جمہوری نظام چلانے جانے کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد رومانیہ میں یکے بعد دیگرے کئی وزارتیں مرتب ہوئیں۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد گوگا وزیر اعظم بنا۔ لیکن اُس نے پارلیمنٹ کو معطل کر دیا اور نازیوں کے خطوط پر چلنے لگا۔ شاہ نے اسی اپنے وقار کو ختم ہوتا دیکھ کر وزیر اعظم گوگا کو موقوف کر دیا۔ اب شاہ رومانیہ نے تمام جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ ۱۹۳۹ء میں یہ اعلان کیا گیا۔ کہ پارلیمنٹ کی جگہ گرانڈ کونسل، کام کرے گی۔ رومانیہ کے تیل کے چشمے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ اب رومانیہ کی آزاد حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ اسکے حصے بخرے ہو چکے ہیں

بلغاریہ:-

رقبہ :- اڑتالیس ہزار مربع میل، آبادی ساٹھ لاکھ، دارالسلطنت صوفیہ۔ شاہ بورس شاہیت اسکا حکمران ہے۔ جنگِ عظیم میں بلغاریہ نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ ۱۹۱۸ء میں تباہ و برباد شاہ فرڈیننڈ اپنے بیٹے بورس کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ کسانوں کی ریڈیکل نے ستامبولسکی کی زیر قیادت اقتدار حاصل کیا۔ لیکن جون ۱۹۲۳ء میں اس پارٹی کا اقتدار چھن گیا۔ اور ستامبولسکی کو گولی سے مار دیا گیا۔ بدامنی کا دور دورہ ہوا۔ امن قائم کر دیا گیا۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں پھر وہی گرم بازاری تھی۔ ۱۹۳۴ء میں فاسسٹ پارٹی کا زور ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں بادشاہ نے تمام اختیارات اپنے قبضہ میں کر لئے۔ بلغاریہ اتحاد بلقان میں شامل نہیں۔ کیونکہ اسے اپنے ہمسایہ ملکوں سے شکایت ہے۔ بلغاریہ کی ساٹھ فیصدی تجارت جرمنی سے ہے۔ بلغاریہ ایک زرعی ملک ہے موجودہ جنگ میں بلغاریہ بے طرف ہے۔

یونان:-

رقبہ	ایک لاکھ تیس ہزار مربع میل
آبادی	ستر لاکھ کے قریب
حکمران	جارج ثانی

راجدھانی . . . . . ایتھنز

جنگِ عظیم میں یونان نے اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ اور جرمنوں کے حامی شاہ یونان کو ملک بدر ہونا پڑا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں شاہ یونان اس خیال سے واپس آیا کہ ہمیں ماندے ترکوں کے علاقہ پر قبضہ جما لے۔ لیکن کمال اتاترک نے یونانیوں کو ترکی تلواروں کا مزہ چکھ دیا چنانچہ سنہ ۱۹۲۲ء میں اسے تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ جنگ نے یونان کو دیوالیہ کر رکھا تھا۔ نئے یونانی بادشاہ جارج ثانی کو بھی اگلے سال تاج و تخت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ خانہ جنگی کا آغاز جمہوریت کا قیام۔ شاہ پسندوں کے زور پکڑ لینے کے بعد وینزیلاس کو انتخابات میں شکست ہوئی جارج ثانی کو واپس بلا لیا گیا۔ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء میں جنرل میتاکساس یونان کا وزیرِ اعظم بنا۔ اس نے آمریت اختیار کرتے ہوئے پارلیمنٹ کو توڑ دیا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں جنرل میتاکساس کو عمر بھر کے لئے وزیرِ اعظم بنا دیا گیا۔ یونان کی ۴۰ فیصدی غیر ملکی تجارت پر جرمنی کا قبضہ ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں یونان اور ترکی کی قدیم رقابت ختم ہو گئی۔ یونان اٹلی کے حملوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بہت جلد شاید اس مضمون کے شائع ہونے سے پہلے، جرمن فوجیں یونان پر حملہ کرنے والی ہیں۔

پرتگال:-

رقبہ . . . . . ساڑھے تین ہزار مربع میل

آبادی . . . . پچھتر لاکھ

دستور . . . . جمہوری

راجدھانی . . . . لزبن

سنہ ۱۹۱۰ء میں پرتگال میں جمہوریت قائم ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں یہ جمہوریت ختم ہو گئی۔ اس وقت سے تا دم تحریر ڈاکٹر سالازار کی آمریت قائم ہے۔ پرتگال میں آئینی سازی کے دو ایوان ہیں۔ صدر کا انتخاب ہر سات سال بعد ہوتا ہے۔ گذشتہ چار سو سال سے برطانیہ اور پرتگال کے دوستانہ تعلقات چلے آتے ہیں۔ موجودہ جنگ میں اس وقت تک پرتگال بے طرف ہے۔ (باقی)

کامریڈ پارٹی کی کتابیں

کمپنی کی حکومت: ہندوستان کے صد سالہ دور پُر آشوب کی لرزہ خیز داستان گبن اور کارلائل کا انداز بیان۔ خون کھولا دینے والے حوادث۔

تاریخ ——— ادب ——— تنقید۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

مشین اور مزدور: ہم اپنے موجودہ سرمایہ دارانہ دور کو مشینی دور کہہ سکتے ہیں۔ مشینوں کی وجہ سے پہلے مزدوروں کی حالت کیا تھی۔ مشینوں نے سرمایہ و محنت کے مفاد کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ مزدور تحریکوں کی داستان سے

"احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات" کی تشریح۔

قیمت چھ آنے

کارل مارکس: سرمایہ پرستی میں ڈوبی ہوئی دنیا کو نیا پیغام دینے والا ساہو کارانہ تہذیب و تمدن کو ریگ آسا بنانے والا اپنے ایام زیست کو وطن سے کوسوں دور بسر کرنے والا انقلاب پسند ——— مارکس کے سوانح حیات اور اس کی تعلیمات پر اردو میں پہلی کتاب۔ قیمت چھ آنے

انقلابِ فرانس: انقلاب کے دوران میں جماعتی کش مکش برسرِ اقتدار بورژوا کی مجلسی اور معاشی پالیسی۔ کوچک بورژوا کے اقتدار و زوال کے اسباب انقلابِ فرانس کا بورژوی ردِ عمل۔ فلسفہ انقلاب پر اپنی نوعیت کی واحد کتاب

قیمت چھ آنے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ اردو لاہور

گوپال متل

ایک حُسن فروش لڑکی کے نام

مری جاں گو تجھے دل سے بھلایا جا نہیں سکتا — مگر یہ بات میں اپنی زباں پر لا نہیں سکتا
میں تجھ کو چاہتا ہوں والہانہ پیار کرتا ہوں — میں گانا چاہتا ہوں پر یہ نغمہ گا نہیں سکتا
تجھے اپنا بنانا موجبِ راحت سمجھ کر بھی — تجھے اپنا بنالوں یہ سمجھ میں آ نہیں سکتا
بنا سکتا ہوں شب کو اپنے بستر کی تجھے زینت — مگر دن میں ترے قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
ہوا ہے بارہا احساس مجھ کو اس حقیقت کا — ترے نزدیک رہ کر بھی میں تجھ کو پا نہیں سکتا
مرے دستِ ہوس کی دسترس ہے جسم تک تیرے — میں تیری روح کی گہرائیوں تک جا نہیں سکتا
میں تیرے رس بھرے ہونٹوں کو پیاری چوم سکتا ہوں — مگر میں تیرے دل پر آہ قبضہ پا نہیں سکتا
ترے دل کی تمنا بھی کروں تو کس بھروسے پر — میں خود درگاہ میں تیری یہ تحفہ لا نہیں سکتا
مری مجبوریوں کو بھی بہت کچھ دخل ہے اس میں — تجھی کو موردِ الزام میں ٹھہرا نہیں سکتا
میں تجھ سے بڑھ کے اپنی آبرو کو پیار کرتا ہوں — میں اپنے عزت و ناموس کو ٹھکرا نہیں سکتا

ترے ماحول کی پستی کا طعنہ دوں تجھے کیونکر
میں خود ماحول سے اپنے رہائی پا نہیں سکتا

سید عطا حسین کلیم

انتظار

ستارے چپ ہیں فضا پر سکوت طاری ہے — جبینِ ماہ سے دریائے نور جاری ہے
اُداس ٹیلوں پہ وہ ریت کا منظر — کنارِ آب پہ خاموش کھیت کا منظر
وہ رہگذار وہ موسم وہ منتظر اشجار — ہواؤں میں وہ برستا ہوا سا کیفِ بہار
ہے کائنات کا ہر ذرہ شوقِ دید لئے — خموش بیٹھا ہوں دل کو فریبِ ہوش دیئے

امید و بیم کی ہے کشمکش نگاہوں میں — برس رہے ہیں سجودِ نیاز راہوں میں
نفس کے ساتھ پھر اک نام لب پہ آیا ہے — تصورات کی دنیا پہ کوئی چھایا ہے
کسی کی یاد پھر آئی ہے دل میں یوں میرے — ربابِ درد کو جس طرح زخمہ ور چھوڑے
فضا میں لہر سی کھاتی ہے چاندنی ایسے — لرزتی شمع ہو اجڑے دیار میں جیسے
تھکی ہوئی ہیں نگاہیں فلک پہ تاروں کی — فضا میں گم ہیں صدائیں تک آبشاروں کی

ہوا میں اس طرح اک نالہ پیدا ہوتا ہے — شبِ فراق میں جس طرح کوئی روتا ہے
گذرتا جاتا ہے مایوس چاندنی کا شباب — فضائے زیست پہ گھرنے لگے الم کے سحاب
فلک کی راہ میں لے خوش نظر مسافرِ شب — کٹھن ہے تیری منازل سے میری راہِ طلب
خدا کے واسطے دم بھر ذرا ٹھہر جانا — ابھی ابھی کوئی آئے تو پھر گذر جانا
اندھیر چھایا ہے ویران دل کی بستی میں — میرا شباب ہے دامانِ تیرہ بختی میں
ذرا سا نور مجھے مستعار دیتا جا — نگاہِ مست سے رنگِ خمار دیتا جا
ٹھہر کہ میری امیدوں کا چاند آ جائے — اداس لمحوں پہ روحِ بہار چھا جائے
تجھے میں اپنے مہِ نو کا نور دے دوں گا — کلیم ہوں گا تو انوارِ طور دیدوں گا
وفورِ شوق لئے محوِ انتظار ہوں میں — فریب خوردۂ پیمانِ نو بہار ہوں میں
نگاہِ شوق کی امید ٹوٹی جاتی ہے — کہ جوں جوں گھٹتی ہے شب نبض چھوٹی جاتی ہے

جنوں سے چاک کہیں دامنِ شکیب نہ ہو
یہ انتظار بھی امید کا فریب نہ ہو

مختار احمد خاں مختارؔ

دیہات کے تین منظر!

(۱)

یہ گھر کے متصل رنگیں فضائیں
مہکتی جھاڑیاں شاداب جنگل
عمیق نالے کا، اور اس کی لگر پر
بچھے شادابیوں کے سبز آنچل
لپکتی کونپلیں موج ہوائیں
نظر کے سامنے اُڑتے سے بادل
وہ ہر جانب پپیہے کی پکاریں
ہمک کر کوکتی آموں پہ کوئل
خمار آلودہ شاخوں کا لچکنا
ہوائیں، بور کی خوشبو سے بوجھل
وہ مِم پرواز وہ طوطوں کی چہکار
برستے سے وہ موسیقی کے بادل
گھنے سائے میں دریا کی روانی
اور اس کے حاشیے پر فرشِ مخمل
وہ اک بنتی ہوئی موبافِ رنگیں
پروئے آب ہر موجِ مسلسل
وہ شاموں کا سکوں پرور دھندلکا
وہ صبحوں میں طرب انگیز منقل
اتر کیا اس جگہ پر ماہ پارے
دکھاتے ہیں رخِ فطرت کو مشعل
نکھرتی ہے بہاروں کی جوانی
یہیں لہراتے ہیں سبزے کے آنچل

(۲)

یہ کمسن چاند یہ دوشیزہ کرنوں کی ضیا باری
خمار آلودہ سائے خاک پر کروٹ بدلتے ہیں
فلک پر کہکشاں کی نرم رَو موجوں میں رہ رہ کر
سفینے ان گنت ننھے ستاروں کے مچلتے ہیں
گھنے بانسوں کے جھرمٹ میں ہوائیں سنسناتی ہیں
فضائیں جھومتی ہیں نَے بلب نغمے نکلتے ہیں
دھندلکے میں جٹائیں اس طرح برگد کی ہلتی ہیں
کہ جیسے بانسری پر سانپ لہرا کر مچلتے ہیں
سیہ ملبوس میداں خیمۂ لیلٰے کا سایہ ہے
نگاہوں کے قدم کب ان فضاؤں میں سنبھلتے ہیں
کھلے ہیں بابِ رنگیں دلپذیر فطرت کے صحیفے کے
تخیل ہیں کہ گویا کیف کے سانچے میں ڈھلتے ہیں
ہے اتنا جذب میں ان منظروں میں اب سما جاؤں
مرے جذباتِ دل تحلیل ہو کر اب نکلتے ہیں

(۳)

جنوں انگیز بوروں کی یہ خوشبو
بنے ہیں عطر میں دامن ہوا کے
سنہری شام کی کرنیں افق میں
ہوئی جاتی ہیں غائب جھلملا کے
طلائی ریت پر رنگیں دھندلکا
ہوا بیدار ذرّوں کو سُلا کے
ہوئی جاتی ہے ہر شے غرقِ نکہت
کھلے عطار خانے ہیں فضا کے

اشرف ریاض

غزل

عشق اک فریب اور حسن بے ثبات ہے
جانِ صد سکون تو حاصلِ حیات ہے

برق باری جمال و تیرہ بختیٔ جنوں
رات پہلے رات تھی اب تو دن بھی رات ہے

اضطراب کو چھپا دیکھ اس طرف نہ دیکھ
تیری کم نگاہیاں میری کائنات ہے

کبرِ حسن ختم ہے نازِ عشق ہے شروع
جب کچھ اور بات تھی اب کچھ اور بات ہے

ہم قفس نصیب ہیں ہم کو کیا غمِ سکوں
اپنا دورِ انبساط سحرِ التفات ہے

حسن کیا ہے کچھ نہیں آنکھ کا فریب ہے
عشق کیا ہے کچھ نہیں دل کی واردات ہے

سکندر علی وجد

کلام وجد

دل کی بستی عجیب بستی ہے
یہ اُجڑنے کے بعد بستی ہے

سارا عالم ہے خواب کا عالم
ساری ہستی فریب ہستی ہے

ابر نیساں برس کے ہو نہ خجل
چشمِ ساقی سے مے برستی ہے

بیم صیاد آشیاں کو نہیں
برق کے زیرِ سر پرستی ہے

وجد مت بھول اوجِ قسمت پر
ہر بلندی کے بعد پستی ہے!

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] — [illegible] — [illegible]

روش صدیقی

غزل

جنّت دید بہ اندازِ دگر پیدا کر!
حُسن آباد ہو جس میں وہ نظر پیدا کر!

کب سے پامال ہیں یہ ترک وطلب کی راہیں
عشق کی ایک نئی راہگذر پیدا کر!

درِ جاناں پہ تجھے حسرتِ سجدہ ہے اگر
عرش جس کیلئے جھک جائے وہ سر پیدا کر!

فلکِ عشق کے ٹوٹے ہوئے تاروں کی قسم
اور اک انجمنِ شمس و قمر پیدا کر!

منتظر ہیں ابھی تیرے لئے لاکھوں جلوے
تو ذرا وسعتِ دامانِ نظر پیدا کر!

دلِ افسردہ محبت کو نہیں ہے درکار
اِس گلستاں کے لئے اک گلِ تر پیدا کر!

کیا ہوا گر تری راتیں رہیں بیگانۂ خواب
حسن بیدار ہو جس سے وہ سحر پیدا کر!

عالم وعدۂ فردا جو یہی ہے روشؔ
اک نیا سلسلۂ شام و سحر پیدا کر!

سیدہ اختر

شمع و پروانہ

تاثیرِ محبت کے افسانے کو کیا کہئے
خود شمع ہے پروانہ پروانے کو کیا کہئے

اُن مدبھری آنکھوں کے افسانے کو کیا کہئے
ہر چیز ہے میخانہ میخانے کو کیا کہئے

جس دردِ محبت کے درماں نہ ہوئے وہ بھی
اُس دردِ محبت کے افسانے کو کیا کہئے

جس راہِ محبت میں آساں نہیں کھونا
اُس راہِ محبت میں کھو جانے کو کیا کہئے

جب سامنے وہ آئیں جب لطف و فرمائیں
اُس وقت کسی دل کے گھبرانے کو کیا کہئے

واعظ کا تکلم بھی دلدوز سہی لیکن
ساقی تری آنکھوں کے فرمانے کو کیا کہئے

تاثیرِ محبت سے کوئی نہ بچا اخترؔ
خود شمع بھی سوزاں ہے پروانے کو کیا کہئے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

Date 7.XI.74
accession number 240257

[illegible]

[illegible]

دوسرا خط مسز اڈوانی کے نام

محترم بہن۔

تسلیمات۔ میں نے پچھلے دنوں آپ کو باندرہ کے میلے پر چند سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ آپ نے پیلے رنگ کی جارجیٹ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بارڈر کے بغیر۔ بلاؤز کالی ساٹن کا تھا۔ کھُلے گلے کا۔ آستینوں کے بغیر گلے پر زرد رنگ کی ساٹن کا پائپنگ تھا۔ اور سامنے سینے پر بسی رنگ کا پھول۔ پاؤں میں آپکے سنہری سینڈل تھی۔ جا بجا سیاہ رنگ کا تھا۔ جس کی مُونٹھ زرد رنگ کے ملمع ٹیڈ کی تھی۔ کالے بالوں میں پیلا ربن تھا۔ سیاہی اور زردی کا یہ میل مجھے بہت پسند آیا تھا۔ آپکے ذوق کی میں بے حد معترف ہوں۔ رنگوں کے صحیح التزام کا آپ خوب سلیقہ رکھتی ہیں۔ مگر کل آپ جب بس پر سے اتریں۔ تو مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ آپ نے کالی ساڑھی کے ساتھ بھوسلے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا ہے۔ آپ کے بالوں میں نیلا ربن گندھا ہے۔ اور جوتا سفید کینوس کا پہن رکھا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی اعلیٰ ذوق رکھنے والی خاتون نے کیوں کر ایسے بھونڈے لباس میں باہر نکلنا گوارا کیا۔ اور پھر غضب یہ ہے کہ آپ بس میں کہیں دور گئی تھیں۔ آئندہ اگر میں نے آپ کو ایسے بے تکے لباس میں دیکھا۔ تو مجھے اتنا صدمہ ہوگا کہ میں بیان نہیں کر سکوں گی

ایک بات اور میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کہ آپ کی نوکرانی اتنا سنگھار کیوں کرتی ہے ؟ اُس کی عمر میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ برس ہے بظاہر وہ کنواری ہے۔ اس عمر میں اور خاص کر کنوارے پنے میں اُس کا یوں بن سنور کر سودا سلف لینے باہر بازار تک نکلنا اتنا خطرناک نہیں۔ جتنا کہ اُس کا آپکے گھر میں اپنے سنگھار پر توجہ دینا ہے۔ آپ عموماً گھر سے باہر رہتی ہیں۔ اور مسٹر اڈوانی چونکہ دفتر نہیں جاتے۔ اسلئے وہ اکثر گھر ہی میں رہتے ہیں۔ . . . آپ کی غفلت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

میرا خیال ہے۔ کہ آپ کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے . . . . اگر آپ چشمہ پہنا کریں۔ تو یہ عیب بالکل دور ہو جائے گا۔ کیونکہ شیشوں میں سے یہ معمولی فرق نظر نہ آئے گا۔

ہاں، یہ آپ اپنی سہیلیوں کو اپنی ساڑھیاں پہننے کے لئے کیوں دے دیا کرتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ یہ بدعت معاشرتی نقطۂ نظر سے بہت بُری ہے۔ اسکے علاوہ سہیلیاں خواہ وہ کتنی ہی محتاط ہوں۔ مستعار کپڑے کو نہایت بے دردی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو۔ تو اُس سفید ساڑھی کو غور سے دیکھئے۔ جو آپ نے ایک روز مسز کرپلانی کو پہننے کے لئے دی تھی۔ اسکا تِلّے کا کام کئی جگہ سے اکھڑ گیا ہے

بازار میں چلتے وقت آپ۔ بار بار ساڑھی کا پلو نہ سنبھالا کریں۔ مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

آپ کی . . . . . .

تیسرا خط مسٹر ایوب خاں انسپکٹر پولیس کے نام

مکرمی محترمی۔ سلام مسنون۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ آپ دن میں دو بار اپنی ڈاڑھی مُنڈوانا چھوڑ دیں — میں سمجھتی ہوں۔ کہ نارمل آدمی کی ڈاڑھی کے بال نارمل حالت میں اتنی جلدی کبھی نہیں اُگتے۔ پولیس سٹیشن جاتے ہوئے اور وہاں سے شام کو آتے ہوئے آپ کا پہلا کام یہ ہوتا ہے۔ کہ سیلون میں داخل ہو جائیں — میرا خیال ہے۔ کہ آپ کو MANIA ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا دماغی توازن درست ہو۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ آپ دن میں دو بار صبح و شام اپنی داڑھی پر استرا پھروائیں . . . . کیا سیلون کا نائی آپ کی اس عجیب و غریب عادت پر زیر لب کبھی نہیں مسکرایا ؟

اور پھر یہ آپ اپنے سر کے بال کس طور سے کٹواتے ہیں ؟ — واللہ بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ گردن سے لے کر کھوپری کے بالائی حصے تک آپ بالوں کا بالکل صفایا کرا دیتے ہیں۔ اور کانوں کے اوپر تک باریک مشین پھروا کر آخر آپ کیا فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت آپ کی گردن بہت

بھدی ہے۔ اور آپکے سر کے نچلے حصے پر پھوڑوں کے نشان ہیں۔ جو صرف بال ہی چھپا سکتے ہیں۔ اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے۔ کہ بار بار بال مونڈنے سے آپ کی گردن موٹی ہو جائے گی۔

آپ کے کان بہت بڑے ہیں۔ جس فیشن کی حجامت کا آپ کو شوق ہے۔ اُس سے یہ اور بھی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ میری رائے ہے۔ کہ آپ قلمیں رکھیں۔ اور کانوں کے قریب سے بال زیادہ نہ کٹوایا کریں۔ گردن پر اگر آپ تھوڑے سے بال اُگنے دیں۔ تو کوئی ہرج نہیں۔ اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

ہاتھ میں چھڑی لے کر جب آپ بازار میں چلتے ہیں۔ تو دماغ میں اس خیال کو جگہ نہ دیا کریں۔ کہ ہر اسکول جانے والی لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے۔ کسی شائستہ مذاق کی لڑکی کی آنکھیں آپ کی طرف نہیں اٹھ سکتیں۔ اسلئے کہ آپ اپنے کاندھوں پر ایسا بھونڈا سر اٹھائے پھرتے ہیں۔ جس کو آپ کے ایجاد کردہ فیشن نے اور بھی زیادہ بدنما بنا رکھا ہے۔

بار بار آپ اپنے کوٹ سے کیا جھاڑا کرتے ہیں؟ کیا گرد و غبار کے ذرے صرف آپ ہی کے کوٹ پر آ بیٹھتے ہیں ...... یا پھر آپ حد سے زیادہ نفاست پسند ہیں؟

کسی نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ چالیس برس کے ہونے پر بھی آپ کنوارے ہیں! — اگر یہ سچ ہے۔ تو اس سے آپ کو عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔ میرا مشورہ لیجئے۔ اور دن میں دو بار سیلون جا کر داڑھی منڈانا چھوڑ دیجئے۔ خدا آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپ کی مخلص
....

جو خط مس ڈی سلوا کے نام۔

ڈیئر مس ڈی سلوا۔

تمہاری حالت پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ تم روز بروز موٹی ہو رہی ہو۔ اگر تمہارا موٹاپا اسی رفتار سے بڑھتا گیا۔ تو مجھے اندیشہ ہے۔ کہ تم کسی مرد کے قابل نہ رہو گی — اسکول جانے کے لئے جب تم "جم" پہن کر گھر سے نکلتی ہو۔ تو میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہوتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں۔ کہ اس کرسمس پر تم ڈانس کیسے کرو گی۔ ایک دو رقصوں ہی میں تمہارا پسینہ چھوٹ جائے گا۔ اور تمہارا ساتھی کیوں کر تمہاری باہوں کو حسب منشا حرکت میں لاسکے گا۔ تمہاری بغلوں کے نیچے اس قدر گوشت جمع ہو رہا ہے۔ کہ تم ڈانس کرنے کے بالکل قابل نہیں رہی ہو۔ خدا کیلئے اپنا علاج کرو اور اس موٹاپے کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرو۔

ایک نصیحت میری اور سن لو۔ شام کو تم ہر روز ٹیرس پر اکیلی جاتی ہو۔ اور سامنے والے مکان پر ڈی کوسٹ کے بڑے لڑکے کو اشارے کرتی رہتی ہو۔ اول تو یہ شریف لڑکیوں کا کام نہیں۔ دوسرے تمہارے اشارے چربی بھرے گوشت کے مانند بھدے اور بے لذت ہوتے ہیں۔ تم جیسی موٹی لڑکیوں کو ایسی اشارہ بازی سے نہیں کرنی چاہیئے۔ اسلئے کہ اشارہ ایک لطیف یعنی باریک اور پتلی چیز کا نام ہے۔ تمہارے اشارے، اشارے نہیں ہوتے۔ اُن کے لئے مجھے کوئی اور نام تلاش کرنا ہوگا۔

جس لونڈے کے ساتھ تم رومان لڑانا چاہتی ہو۔ اُسکے متعلق بھی سن لو۔ وہ ایک آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ ڈھائی مہینے سے کالی کھانسی میں مبتلا ہے۔ ماں باپ نے ناقابلِ اصلاح سمجھ کر اُسکو اپنے حال پر چھوڑ رکھا ہے۔ اُسکے پاس صرف تین پتلونیں ہیں۔ جن کو وہ بدل بدل کر پہنتا ہے۔ ہر روز اپنی قمیص اور پتلون پر وہ دو بار استری کرتا ہے۔ تاکہ باہر کے لوگوں کی نظر میں اُس کی وضع داری قائم رہے۔ مجھے ایسے آدمیوں سے نفرت ہے۔

تم اپنی پنڈلیوں کے بال استرے سے نہ مونڈا کرو۔ بال اڑانے کے سب پوڈر اور سب کریمیں بھی فضول ہیں۔ بال ہمیشہ کے لئے کبھی غائب نہیں ہو سکتے۔ اسلئے تم اپنی پنڈلیوں پر ظلم نہ کرو۔ بال رہنے دو۔ اور لمبی جرابیں پہنا کرو۔

تمہارا دوست آج دوپہر کو اپنا پھٹا ہوا جوتا خود مرمت کر رہا تھا۔

تمہاری خیرخواہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پانچواں خط کوشلیا دیوی کے نام۔

شریمتی کوشلیا دیوی۔ نمسکار۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ اپنے گھر میں ہر شخص کو اختیار ہے۔ کہ وہ آرام دہ سے آرام دہ لباس پہنے۔ اور تکلفات سے آزاد رہے۔ مگر دیوی جی آپ ململ کی باریک دھوتی پہن کر اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ اور پھر یہ دھوتی آپ کچھ اس بے تکلفی سے پہنتی ہیں کہ جب آپ اتفاق سے نظر آ جائیں۔ تو سوچنا پڑتا ہے۔ کہ آپ کو کس زاویے سے دیکھا جائے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ روشنی کے سامنے کھڑے ہونے سے آپ کی ململ کی دھوتی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ کی عمر اس وقت چالیس برس کے قریب ہے۔ عمر کی اس زیادتی نے آپ کے جسم کو بالکل ڈھیلا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باریک دھوتی میں سے آپ کی بھدی ٹانگوں کی نمائش آنکھوں پر گراں "بنکر" رہ جاتی ہے۔

آپ کے فلیٹ کا دروازہ عام طور پر کھلا رہتا ہے۔ اور میں نے اکثر آپ کو باورچی خانے کے پاس یہی باریک دھوتی پہنے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو اس کا استعمال ترک نہیں کرنا ہے۔ تو براہ کرم اپنے فلیٹ کا دروازہ بند رکھا کریں۔

آپ کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چھٹا خط مسٹر سعید حسن جرنلسٹ کے نام

جناب من۔ تسلیم

آپ ہر روز صبح بالکونی میں تہبند پہنتے ہیں۔ آپ کا یہ فعل کیونزم کی بدترین مثال ہے۔ مجھے امید ہے۔ کہ یہ خط پڑھ کر آپ ضرور شرمسار ہونگے۔ اور آئندہ سے تہبند شریف آدمیوں کی طرح اپنے کمرے میں پہنا کریں گے۔

مخلص ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مکرر۔ ۱۔ آپ کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ سیلون آپ کے مکان کے نیچے ہے۔ ہمت کر کے آج ہی کٹوا دیں۔

ساتواں خط مسز قاسمی کے نام۔

خاتونِ مکرم۔ السلام علیکم۔

میں بہت عرصے سے آپ کو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ مگر چند در چند وجوہ کے باعث ایسا نہ کر سکی۔ میں نے سُنا ہے کہ دو گھروں میں نفاق پیدا کرنے کے لئے آپ کو بہت سے گُر زبانی یاد ہیں۔ مسز اڈوانی اور مسز کرپلانی کے درمیان ایک دفعہ آپ ہی کی کوششوں سے رنجش پیدا ہوئی تھی۔ اور پچھلے دنوں سیٹھ گوپال داس کی لڑکی پشپا کے بارے میں آپ نے جو افواہیں مشہور کی تھیں۔ اُن سے سیٹھ گوپال داس اور سیٹھ رام داس کے خاندانوں میں اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں۔ کہ ابھی تک آپ کے اور مسز قانونگو کے درمیان کشیدگی پیدا کیوں نہیں ہوئی۔ اب تک آپ نے جس عورت کو اپنی سہیلی بنایا ہے۔ اُس سے تیسرے چوتھے مہینے آپ کی تو تو میں میں ضرور ہوئی ہے۔ لیکن مسز قانونگو سے آپ کی دوستی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ جو کئی برسوں کے برابر ہیں۔ میں اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتی۔ اس مہینے میں مسز قانونگو سے آپ کی چخ ضرور ہو جانی چاہیئے۔ آپکو اپنی روایات برقرار رکھنی چاہئیں۔

ہاں یہ ضرور بتائیے۔ کہ آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ کہ آپ پنجاب کی رہنے والی ہیں۔ مگر آپ کا چہرہ نیپالیوں اور تبتیوں سے کیوں ملتا جلتا ہے؟ ―― آپ کی ناک بالکل نیپالیوں کی طرح چپٹی ہے۔ اور گالوں کی ہڈیاں بھی انہی کی طرح ابھری ہوئی ہیں، البتہ آپ کا قد

اُن کی طرح پست نہیں۔

آپ نے عید پر جو ساڑھی پہنی تھی مجھے پسند نہیں آئی آپ کا ذوق نہایت فضول ہے۔ اگر آپ بھڑکیلے اور شوخ رنگوں کے بجائے ہلکے رنگ کے کپڑے انتخاب کیا کریں۔ تو بہت اچھا ہو۔ جیسے قد کی عورتوں کو کھڑی لکیروں کی قمیض نہیں پہننی چاہیئے۔ اس سے وہ اور لمبی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح آپ کو "پف سلیوز" کا بلاؤز بھی نہیں پہننا چاہیئے۔ کیوں کہ لمبے قد کی عورتوں کے لئے یہ موزوں نہیں ہوتا۔ اور پھر آپ تو ویسے ہی دُبلی پتلی ہیں۔ آپکے کاندھے پر بلا ضرورت کے اُٹھے ہوئے "پف" بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کی خیر اندیش . . . . .

آٹھواں خط مس راجکماری ایکٹرس کے نام۔

مس راجکماری

مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم عورت نہیں ہو۔ سوٹ کیس ہو۔

تم سے نفرت کرنے والی . . . . .

نواں خط مسٹر صالح بھائی کنٹریکٹر کے نام۔

جناب صالح بھائی صاحب۔ تسلیم۔

مجھے آپکے خلاف کوئی شکایت نہیں لیکن پھر بھی میں آپکو پسند نہیں کرتی۔ نہ معلوم کیا وجہ ہے۔ کہ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں غیض و غضب پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی شکل و صورت بھی کوئی خاص بُری نہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ پھر آپ کو میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہوں . . . آپکے چہرے پر یتیمی برستی ہے، آپ کی چال بھی نہایت واہیات ہے۔

آپ کی ہمدرد . . . .

دسواں خط مس رضیہ صلاح الدین کے نام۔

ڈیئر مس رضیہ۔ سلام مسنون۔

تم ابھی ابھی پنجاب کے کسی گاؤں سے آئی ہو۔ پہلے ساڑھی پہننے کی عادت اختیار کرو، پھر اس لباس میں باہر نکلو۔ تمہیں یہ لباس پہننے کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو تماشہ نہ بناؤ۔

تمہاری خیر خواہ . . . .

منٹو کے افسانے

سعادت حسن منٹو ـــــ

سعادت حسن منٹو کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے منٹو کے افسانوں کے کردار ہمارے اور آپ کی طرح چلتے پھرتے انسان ہیں۔ منٹو نہ اصلاح پسند اور نہ پروپگنڈسٹ ہے۔ وہ انسانی حوادث کا عکاس ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے۔ اُسے افسانوں کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے

مکتبہ اردو لاہور

آؤ

سعادت حسن منٹو ـــــــــ زیرِ طبع

ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ سعادت حسن منٹو ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں یدطولیٰ رکھتا ہے۔ اسکے ریڈیائی ڈرامے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ریڈیو اسٹیشنوں سے براڈکاسٹ ہو چکے ہیں۔ "آؤ" منٹو کے آٹھ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ آؤ بھی منٹو کے ڈرامے پڑھیں

مکتبہ اردو لاہور

محمود ہاشمی

بانہال روڈ پر

لاری کشمیر کی طرف دوڑتی ہوئی جا رہی تھی۔

اس میں مسافروں سے زیادہ اسباب بھرا پڑا تھا۔ صرف اگلے حصے میں چند مسافر بیٹھے تھے، کل جب یہ جموں سے روانہ ہوئے تھے۔ تو کوئی کسی سے واقف نہ تھا۔ مگر آج جب انہیں اکٹھے سفر کرتے دو دن ہو گئے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے یوں گھل مل گئے تھے۔ جیسے وہ ایک ہی کنبے کے مختلف افراد ہوں۔

بانہال کی چڑھائی شروع ہوتے ہی لاری میں ایک سکوت سا چھا گیا، وہ سب جو صبح سے اب تک آپس میں گپیں اڑاتے آئے تھے۔ یکایک خاموش ہو گئے، اور ان کی نگاہیں جو اس سے قبل ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں، باہر دور دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار، گہری گھاٹیوں، اور ان کے بیچوں بیچ بہتے ہوئے پانیوں پر دوڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد جب پہاڑ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ان کے چہروں سے چھونے لگے تو ان میں سے چند ایک وہیں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔ اب ڈرائیور پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ البتہ کلینر لاری کے پچھلے حصے میں کہیں بہت سی بوریوں کے انبار میں دبکا پڑا تھا۔

کافی وقت گزرنے پر جب ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا نوجوان اپنی اونگھ سے بیدار ہوا۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ لاری کھڑی ہے اور کلینر ایک ٹین کا ڈبہ ہاتھ میں لئے اس کے انجن میں پانی ڈال رہا ہے نوجوان نے اپنے آپ کو مکمل بیدار کرنے کے لئے جھٹکا دیا اور کہا

"کیا چڑھائی ختم ہو گئی ہے؟"

"ہاں"

اور لاری پھر چل پڑی۔

نوجوان نے اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے پہاڑوں پر نگاہ ڈالی اور پھر اس آئینے میں جو ڈرائیور کے داہنے ہاتھ لٹکا تھا۔ اپنا عکس دیکھنے لگا۔ بکھرے بکھرے ہوئے بالوں والا گرد سے اٹا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے دل ہی دل میں تھوڑی جھینپ سی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا۔ منہ صاف کیا، اور پھر بال سنوارنے کے لئے انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔ یکایک اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اور اس کی گردن گویا کسی بے کلی اثر سے دفعتاً پیچھے مڑ گئی۔ اس کی نگاہیں پچھلے بنچ کے ایک سرے پر جم کر رہ گئیں۔ جہاں ایک نوجوان لڑکی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک عینک والے بڈھے کے گھٹنوں پر سر رکھے سو رہی تھی۔ وہ اگرچہ خوابیدہ تھی۔ مگر اس کے پُر شباب چہرے کی قیامتیں ابھی بیدار تھیں۔ اور وہ نوجوان تو اس کی پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی نیم وا آنکھیں اب بھی دیکھ سکتا تھا۔

نوجوان خیالات کی گہرائیوں میں کھو گیا۔ وہ اب کسی اور دنیا کے خواب دیکھ رہا تھا۔

یکایک سوتی ہوئی لڑکی کے ہلکے پھلکے جسم نے حرکت کی، اور اس کے ساتھ ہی نوجوان کے خیالات کی دنیا بھی متزلزل ہو گئی۔

اس نے دیکھا۔ لڑکی پھر سو گئی ہے۔ اور لڑکی کا بڈھا محافظ اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ گویا وہ نوجوان کے دل کی سب باتیں سمجھ رہا ہے اس بات کے احساس نے اسے شرمندہ سا کر دیا۔

"آپ شاید پہلی مرتبہ کشمیر جا رہے ہیں"، نوجوان نے شاید شرمندگی کے اثر کو دور کرنے کے لئے عینک والے بڈھے سے باتوں کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

"نہیں۔ میں ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ مگر آج سے بہت پہلے۔ تقریباً پچیس سال پہلے۔"

بڈھے کی بے جان سی آنکھیں عینک کے موٹے موٹے شیشوں

کے اندر چمکتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھا خود ہی کہنے لگا۔ "ان دنوں میں جوان تھا۔ جوانی میں میں کہاں کہاں نہ گیا۔ کشمیر۔ شملہ۔ ڈلہوزی۔ دھرم سالہ اور چمبہ جیسوں رنگینوں کی خاک چھان ڈالی۔ مگر جی پھر بھی سیر نہ ہوا ـــــ"

نوجوان سوچنے لگا۔ "بوڑھا باتونی معلوم ہوتا ہے۔" اُسے یہ خیال نہ آیا۔ کہ بوڑھے جب اپنی جوانی کی باتیں سناتے ہیں۔ تو وہ ہمیشہ باتونی بن جاتے ہیں۔

نوجوان پھر بوڑھے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو کہہ رہا تھا۔ "چمبہ ـــ چمبہ کی حسین اور سرسبز پہاڑیاں مجھے کبھی بھی نہیں بھول سکتیں جب میں وہاں آخری مرتبہ گیا تھا۔ تو وہاں ایک بہت بڑا میلہ لگنے والا تھا۔ وہاں ایک بہت بڑی ندی ہے۔ جو بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی اس تیزی سے بہتی ہے کہ ـــــ"

نوجوان یکلخت بول اٹھا۔ "لیکن وہ میلا ـــــ کیا آپ نے وہ میلہ دیکھا؟ سرسبز پہاڑوں اور بہتی ندیوں کے قریب لگنے والے میلے کتنے دلفریب ہوتے ہونگے۔"

بوڑھے کی آنکھوں کی چمک جو اُس وقت لحظہ بلحظہ بڑھ رہی تھی۔ یکایک مدھم پڑ گئی۔ اُس کی نگاہیں پھسلتی ہوئی ایک بوڑھی عورت پر جا پڑیں۔ جو ایک نیلے رنگ کا شال اوڑھے چپ چاپ بیٹھی بوڑھے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شاید بوڑھے کی بیوی تھی۔

تھوڑی دیر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بوڑھا پھر نوجوان کی طرف مخاطب ہو گیا اور کہنے لگا۔ "چمبہ کے میلوں پر بہت رونق ہوتی ہے وہاں کے لوگوں کو میلے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ یہی وجہ ہے۔ جو اُن دنوں میں مرد اور عورتیں قرب و جوار سے اُمڈ آتی ہیں۔ میں چونکہ اُن دنوں ابھی بیمار ہی تھا۔ اس لئے میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور میلہ شروع ہونے سے چند دن پہلے ہی واپس آ گیا۔"

بوڑھے نے ایک مرتبہ پھر نیلے شال والی بوڑھی عورت کی طرف دیکھا۔ اُس وقت اُس کی آنکھیں عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں مچل رہی تھیں۔

نوجوان سوچ رہا تھا۔ "یہ بوڑھا جوانی میں کس بلا کا انسان ہوگا ـــ کاش میں چمبہ کی پہاڑیوں کے میلے دیکھ سکتا۔"

اُس کے لئے بوڑھے کی باتوں میں اب کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اُس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور اپنی نگاہیں نوجوان لڑکی پر جما دیں۔ وہ اب جاگ اٹھی تھی۔ اور اپنے روئی ایسے ملائم سفید ہاتھوں سے اپنی موٹی موٹی آنکھیں مل رہی تھی۔

* * *

نیلے شال والی عورت کے ساتھ ایک اور بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ جو کچھ دیر اونگھنے کے بعد اب بیدار ہوئی تھی۔ وہ اُس بوڑھے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو ابھی ابھی چمبہ کی پہاڑیوں کے میلوں کا ذکر کر رہا تھا۔

وہ عورت اس وقت بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اُسکے دماغ میں زندگی کے پرانے نقوش جو اب وقت نے مدھم کر دئے تھے۔ اُبھر رہے تھے۔ چمبہ کی سرسبز پہاڑیوں میں گذرے ہوئے جوانی کے دن اس بوڑھے نے اُسے یاد کرا دئے تھے۔

اُسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آج سے بیس بائیس برس پہلے کا زمانہ پھر لوٹ آیا ہے۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے ایک جھریوں بھرے چہرے والی بوڑھی عورت نہ تھی۔ جو اس وقت اپنے بیٹے کو ملنے کشمیر جا رہی تھی۔ جہاں وہ کسی دفتر میں کلرک تھا۔ بلکہ اُسے ایک نوجوان اور صحت مند حسین چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ جو چمبہ کی پہاڑیوں پر ننگے پاؤں دوڑ دوڑ کر بھی نہ تھکتا تھا۔ اور جس کا دل اُن تیز رو اور بہنے والی ندیوں کے کنارے ہونے والے میلوں کے لئے ہمیشہ تڑپا کرتا تھا۔

بوڑھی عورت نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ اب اُسے تمام کائنات آہستہ آہستہ بھولتی جا رہی تھی۔ کسی نوجوان کا چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے بار بار آ کر اُس کا منہ چڑا رہا تھا۔

اُس نوجوان کو اُس نے آج سے کئی برس پہلے ایک میلے کے دنوں میں چمبہ کی پہاڑیوں پر پھرتے دیکھا تھا۔ اور اُس کے ساتھ اُس نے اپنی زندگی کے چند خوشگوار لمحے گزارے تھے جنہیں وہ اپنی

زندگی کا سہاگ سمجھتی تھی۔

اُس سال میلے پر بہت زیادہ رونق تھی۔ کیونکہ اتفاق سے میلہ اُن ہی دنوں میں ہو رہا تھا جب چمبہ کی پہاڑیاں دور دور سے آنے والے سیاحوں سے آباد ہو جاتی ہیں۔

وہ اُس سال اپنی بہت سی سہیلیوں سمیت میلہ دیکھنے آئی۔ میلے کے دنوں میں وہ تمام دن اپنی سہیلیوں کے ہمراہ چمبہ شہر میں لڑکی اُس نوجوان پر نگاہیں جھکائے رہتی۔ جو اُس سے تھوڑی دور پرے کھڑا اُس کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ رات کو جب میلے کے تھکے ہوئے سب لوگ سو جاتے۔ تو وہ اپنی نیند میں کھوئی ہوئی سہیلیوں کو تنہا چھوڑ کر نہایت خاموشی سے دبے پاؤں اُٹھتی اور چنار کے اُس درخت کے نیچے پہنچ جاتی۔ جہاں وہ نوجوان کھڑا اُن کا انتظار کر رہا ہوتا۔ پھر وہ وہاں سے اُس وقت ہی لوٹتی جب تمام چاند سامنے کی اونچی اونچی پہاڑیوں کے پیچھے جانے والا ہوتا۔

تمام رات وہ دونو چاندنی روشنی میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے ایک دوسرے کو ۔ ۔ ۔ بار نیند جیسے اُن کی آنکھوں سے اُڑ جاتی۔ اور پہاڑی کی اُس لمبی اور سرد رات کی اُن کے سامنے کوئی حقیقت نہ تھی۔

پھر کئی راتوں کے بعد وہ رات آئی۔ جس کے بعد وہ پھر کبھی نہ مل سکے۔ اُس رات وہ دونو اُسی چنار کے درخت کے نیچے سبز سبز گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ نوجوان کے کشادہ سینے پر اُس کے لمبے لمبے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جن سے نوجوان کی چھاتی تر بتر ہو رہی تھی۔ اور وہ اُس کے بالوں پر نہایت آہستگی سے ہاتھ پھیرتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "رانی۔ تم ہمیشہ میرے دل میں رہو گی۔ میں شاید تمہیں پھر نہ دیکھ سکوں۔ مگر میری اکثر راتیں تمہارے خیالوں سے ہی آباد رہیں گی۔ میں تمہیں کبھی بھی نہ بھلا سکونگا۔ کبھی بھی نہیں"

* * * * *

بوڑھی عورت کے جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا ہوئی اُس نے اپنا سر اٹھایا۔ اور اپنی نگاہیں اُسی عینک والے بوڑھے پر جمادیں۔

بوڑھے نے اپنی عینک درست کی۔ اور پھر اپنا سر جس پر بہت چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ اپنے دائیں ہاتھ سے کھجلانے لگا

بوڑھی عورت نے دیکھا۔ جس ہاتھ سے وہ بوڑھا اپنا سر کھجلا رہا ہے۔ اُس کی انگلیاں چھ ہیں۔ اور بوڑھی عورت کی آنکھوں میں حیرانیاں دوڑ گئیں۔ اُسے یاد تھا۔ آج سے کئی برس پہلے جس نوجوان کے ساتھ اُس نے چمبہ کی پہاڑیوں پر میلے کے دنوں میں چند راتیں بسر کی تھیں۔ اُس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں بھی چھ ہی تھیں۔

بوڑھی عورت کے دماغ میں یکایک ایک خیال پیدا ہوا لیکن فوراً ہی وہ ماضی کے دھندلکوں میں کہیں کھو گیا۔

* * * * *

نیلے شال والی بوڑھی عورت نے کہا۔ "جب ہم سرینگر پہنچ جائینگے۔ تو میرے پتی کا سارا درد جاتا رہے گا۔ لاری کے اتنے لمبے سفر میں پٹرول کی بو سونگھ سونگھ کر سر میں درد ہو جانا تو قدرتی بات ہے"

مگر اس بوڑھی عورت کا جس نے اپنی جوانی کے دن چمبہ کی پہاڑیوں پر گزارے تھے۔ خیال تھا۔ کہ پرانی یاد جب زبردستی دماغ میں گھسنا چاہے۔ تو سر میں درد ہو جانا ایک قدرتی بات ہے۔

بوڑھی عورت کے دل میں اُس وقت نجانے کیوں یہ آرزو پیدا ہو گئی۔ کہ وہ اُس بوڑھے کی آنکھوں میں جن پر موٹے موٹے شیشے لگے ہوئے تھے۔ آنکھیں ڈال کر اُسے کچھ دیر دیکھتی رہے۔ چنانچہ اُس نے اپنی نگاہیں بوڑھے پر جما دیں۔ مگر وہ تو اس طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ اُس کی نگاہیں ارد گرد پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ شاید وہ انہیں دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

بوڑھی عورت کتنی ہی دیر تک بوڑھے کی طرف دیکھتی رہی۔ مگر بے سُود۔ وہ بے جان بت کی طرح خاموش بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا اُس کے جسم کو جنبش نہ ہوئی۔

اس دوران میں جنبش تک نہ ہوئی۔

بوڑھی عورت کی آنکھیں جواب تک ایک ہی جگہ جمی رہی

[illegible]

محترمہ ح ب مخفی

کلامِ حسرت پر ایک نظر

اگرچہ بادِ صرصر کے جھونکوں نے گلشنِ تیموری کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ لیکن کچھ دیر غالب، مومن، ذوق، شیفتہ اور آزردہ جیسی مقدس ہستیوں کی وجہ سے شعر و سخن کی محفل قائم رہی۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ یا "رستخیز بیجا" میں لوگ شاعری کیا اپنی عزت و ناموس اور جان مال تک کی حفاظت نہ کر سکتے تھے۔ اسلئے کچھ مدت تک تو ہر طرف سناٹا اور ہو کا عالم رہا؛ لیکن اس "خاموش فضا" میں بھی غالب کا فلسفیانہ کلام، مومن کی نازک خیالی، ذوق کے عالمانہ قصیدے انسانوں کی تھکی ہاری روح کے لئے کسی قدر تسلی کا سامان مہیا کرتے رہے۔

جب یہ "ہنگامہ" فرو ہوا، تو اہلِ ذوق نے اِس چراغ کو روشن رکھنے کی کوشش کی، لیکن دنیا میں ادب کیا بلکہ ہر چیز ماحول کیساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اسلئے ہمارے "ادب" اور ہماری "شاعری" پر بھی مغربی "لٹریچر" کے اثرات پڑنے لگے۔ اور چونکہ یورپ کی تمام زندگی "جدید" ہونے کی وجہ سے بہت دلکش تھی، اسلئے کچھ مدت اہلِ ہند "اصنامِ مغربی" کے کامل پرستار بننے کی خواہاں رہے۔ یہ حالت کچھ دیر قائم رہی، لیکن طبائع میں بغاوت کا مادہ قدرتی ہے، اسلئے اپنی پستی اور اُن کی بلندی، اپنی خاک نشینی اور اُن کی فلک پروازی کو دیکھ کر طبیعتوں میں تشویش سی پیدا ہوئی، تاہم "مغرب" کا جادو ساری قوم کیا سارے ملک پر چل گیا تھا، اسلئے کچھ عرصہ تک اہلِ ہند مبہوت سے رہے۔ طرزِ معاشرت رسم و رواج، علوم و فنون سب میں ایک نمایاں فرق آگیا، فرش سے لے کر عرش تک، ذرہ سے لے کر آفتاب تک یورپی رنگ میں رنگا ہوا تھا اسلئے ہماری "شاعری" بھی تغیر بغیر نہ رہ سکی،

ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا، جو بلینک ورس اور انگریزی شاعری کا حامی تھا انہیں جدید پرست کہنا چاہیئے۔ مولانا حالی اور پروفیسر آزاد ان مقبل اکابر میں سے ہیں، جنہوں نے "شاعری" میں ایک نئے طرز کی ابتدا ڈالی۔ انہی کی کوشش سے مشاعرے قائم ہوئے۔ اور اس جدید طرز کی شاعری کو کچھ قبولیت حاصل ہوئی۔

لیکن "مغربی طرزِ معاشرت اور کلچرِ مشرق" کو کس طرح بھا سکتا ہے۔ ایک ملک کا پودا دوسرے ملک میں پروان چڑھ کر کس طرح پھل پھول سکتا ہے، اسلئے ہندوستانی طبائع بہت جلد اس طرزِ نو سے بیزار ہونے لگیں، اور پھر غزل کی طرف رجحان پیدا ہوا، چنانچہ جدید ترین دور میں بعض بلند پایہ غزل گو شعرا پیدا ہوئے، جن میں مولانا محمد علی جوہر جگر، جوش، اصغر، فانی، حسرت اور اختر شیرانی شامل ہیں۔ جنہوں نے "غزل" کو پھر سے چمکا دیا۔

اس امر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، کہ اس نئے دور کے شعرا کی شاعری کے محاسن پر کچھ نظر ڈالی جائے، چنانچہ آج میں صرف حسرت کی شاعری پر کچھ اظہارِ خیال کرنا چاہتی ہوں:

حسرت موہانی جو "شاعری" کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں، سیاسیات کی دنیا میں بھی ایک بلند جگہ پر نظر آتے ہیں، ان کا بیشتر کلام زندان خانوں کی تنہائی کا ثمرہ ہے، جس طرح کہ دنیا میں اس سے پہلے بھی بہت بڑے بڑے ادبی کارنامے "جیلوں کی چار دیواری" میں انجام پائے، حسرت کی شاعری کا دورِ شباب بھی اسی ماحول میں گزرا،

درحقیقت حسرت کی شاعری ۱۸۹۴ء سے شروع ہوتی ہے۔ تسلیم لکھنوی جن کو نسیم دہلوی کا تلمذ حاصل تھا۔ حسرت کے استاد تھے، لیکن یہ غالب کے معتقد ہیں، سچ تو یہ ہے، کہ انہوں نے اس رنگ کو خوب نبھایا، صرف فرق اتنا ہے۔ کہ مرزا کے ہاں ہر قسم کے اشعار مثلاً فلسفہ، اخلاق، تصوف و معرفت، غم، خوشی، خودداری، رشک، حسن و عشق، خمریات کے تمام مضمون ملتے ہیں، لیکن حسرت کے کلام

میں سب سے نمایاں جگہ "حسن و عشق" کو حاصل ہے۔ آغازِ الفت، انجامِ محبت سوزِ فراق، انتظارِ وصل، عاشق و معشوق کے راز و نیاز، شیخ و رند کی چھیڑ چھاڑ، اور اس قسم کے عاشقانہ مضامین کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اگرچہ ان کی ساری زندگی سیاسیات میں کٹی، لیکن واضح طور پر سیاسی نظمیں ان کے ہاں کچھ زیادہ نہیں ہیں، ہاں بعض بعض جگہوں میں دبی زبان سے "پالیٹکس" کے متعلق بھی کچھ کہہ گئے ہیں۔

ان کی غزلوں میں فارسی محاورے، متوازن فقرے اکثر مقام پر بہت اچھی طرح ادا کئے گئے ہیں، لیکن سب سے اہم خصوصیت جس نے انہیں تمام ہندوستان میں مقبول کر دیا، ان کا حسنِ کلام یعنی زبان کی صفائی شستگی اور روانی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور خوبی یعنی "سوز و گداز" ہے، جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، سچے جذبات سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں؛ ایک اُس شخص کا تصور کیجئے، جسے دنیا میں صرف ایک ہی "محبوب" کی چاہت زندہ رکھتی ہو، لیکن اس سے ملاقات میسر نہ ہو۔ اسکو اپنے مطلوب سے دور — بہت دور — کالی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا ہو، جہاں بادِ نسیم بھی "یار" کا پیغام نہ پہنچا سکے، اس فضا میں جو شعر زبان سے نکلیں گے، وہ دلی احساسات کی آئینہ دار ہونگے اور ان میں انتہائی سوز ہوگا، کیسے پُر درد ہیں یہ شعر۔

آہ! وہ شہر کانپور کی شام | وہ لبِ آب وہ کنارِ گنگ
بڑھ چلا جوشِ آرزو حسرت | ختم ہونے کو آئی قیدِ فرنگ

دراصل حسرت جن مضامین محبت کا ذکر کرتے ہیں، انکے اشاروں معنی سے خود ناواقف نہیں ہیں، وہ گاہے گاہے وفورِ درد سے مجبور ہو کر دکن کی ہواؤں کو پکار کر اپنا پیغام دیتے ہیں، گویا دکن کی دنیا میں انکا "محبوب" بس رہا ہے، ؎

ہے ایک پیام ہمارا بھی اے نسیم دکن | خدا تجھے طرب افزود غم شکار کرے
ملے جو اُس سے تو کہنا کہ تیرے شوق کا راز | کہاں تلک دلِ حسرت نہ آشکار کرے

حسرت کے کلام کی ایک خوبی یہ ہے، وہ بہت سادہ ہیں، مختصر بحروں میں سادہ جذبات محبت کا اظہار بے حد مقبول چیز ہے، جس کا اثر دل پر بہت گہرا ہوتا ہے ؎

ہم نے تو نثار کر دیا دل | اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے

یاس کا دلبر کچھ اثر نہ ہوا | قصۂ شوق مختصر نہ ہوا۔
خبر اس بے خبر کی لا دیتی | تم سے اتنا بھی اے صبا نہ ہوا
خُم کے خُم تُم نے لے گئی ساقی | مجھ کو اک جام بھی عطا نہ ہوا

حسرت آغازِ محبت کا تذکرہ نہایت لطیف پیرائے میں کرتے ہیں۔ فراق کی اذیتوں کا حال اور بھی دردناک رنگ میں بیان ہوتا ہے اور مضامین اتنے مختلف پیرایوں سے ادا ہوتے ہیں۔ کہ جدا پیرایہ نیا لطف دیتا ہے،

ان کے ہاں فارسی ترکیبیں بھی آئی ہیں، لیکن بدنما نہیں معلوم ہوتیں۔ بعض اوقات تو اردو میں ترجمہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً زندگی کردن کے لئے ع پھر کہے کسی امید پہ ہم زندگی کریں،

متوازن فقرے اور جملے بھی بکثرت ہیں، جن سے شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے ؎ رعنائی و زیبائی و محبوبی و خوبی
کیا بات ہے جو اس قد و لجو میں نہیں ہے

حسرت کے ہاں بعض سوقیانہ الفاظ موجود ہیں، لیکن شاعر کی مقدس ہستی نے ان سے سوقیت کو زائل کر دیا ہے، مثلاً "یار" کا لفظ بہت استعمال ہوا ہے، لیکن بدنما نہیں ہے، ؎

کہنے کو تو میں بھول گیا ہوں مگر اے یار۔ ہے خانۂ دل میں تیری تصویر ابھی تک

حسرت کی شاعری اگرچہ غزل اور عشق و محبت ہے، لیکن شاعر کی زندگی کی مناسبت سے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا، کہ "عشق و محبت" کے پردے میں شاعر نے وطن کی آزادی کا عشق لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ آزادی بھی دنیا کی زندہ قوموں کے لئے ایک محبوب ہے کسی طرح کم نہیں، جس کے عشق میں ہزاروں شیدائی یوں مرمٹے جیسے پروانہ شمع پر جان نثار کر دیتا ہے!

کلانچوی بی اے

ڈاکٹر

بازارِ حسن و گناہ میں بہت سی شمعیں روشن تھیں۔ مگر ان کی روشنیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ پروانے ایک نو افروز شمع پر اکٹھے ہونے لگے۔ اور وہ زبیدہ تھی۔ ایک نیا چہرہ۔ لوگ پیسے خرچ کرتے ہیں۔ کہ چند لمحوں کے لئے مسرت خرید سکیں۔ اور وہ مسرت فروخت کار کو اپنی ذات مذہب اور سوسائٹی کے نقصان پر بھی بیچنا پڑتی ہے۔ اسلئے جو آدمی زبیدہ کے پاس آتا۔ زبیدہ اپنی دوزخ کی گہرائیوں میں سے اسے مسرت ڈھونڈ دیتی۔ جو اسکے زخموں پر نمک چھڑکتا۔ وہ اسے لذت بخشتی۔ اور جو اسکے دکھوں میں اضافہ کرتے۔ وہ اسے اپنا رہا سہا سکھ بھی بانٹ دیتی۔ یہی اسکی زندگی تھی۔

وہ ان گندگیوں میں دھکیلی گئی تھی۔ اسلئے بہت جلد اپنی نئی زندگی سے بیزار ہو گئی۔ پیٹ اپنا ایندھن مانگتا ہے۔ اسے اپنے دل پر جبر کرنا پڑا لیکن ہر نئے آنے والے سورج کی کرن نے اسکے چہرے سے سرخی چرانا شروع کر دی۔ تھوڑے دنوں میں زبیدہ اس قدر بیمار پڑ گئی۔ کہ اس پر جانثاری کرنے والے دل اب بیدل ہو گئے۔ کوئی بیماری خریدنے تو آتا نہیں۔ اور اب زبیدہ کے پاس دکھ اور بیماری کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی جو اپنے طلبگاروں کو دے سکتی۔

جب زبیدہ ہسپتال میں داخل ہوئی۔ تو ہسپتال کے بھنگیوں تک کو کچھ منہ کھولنے کا موقعہ مل گیا۔ زبیدہ کسی کی نظروں میں اچھی نہ تھی جتنے منہ تھے زبیدہ کیلئے اتنی باتیں گھڑی گئی تھیں۔ مگر ڈاکٹر نے اسے دوسرے مریضوں کی طرح ایک مریض سمجھا۔ ہسپتال میں داخل ہونے پر اسے کچھ سہولتیں ضرور مہیا ہو گئی تھیں۔ وقت پر کھانا آ جاتا۔ مفت کی دوائی مل جاتی۔ ڈاکٹر کی دیکھ بھال بھی باقاعدہ رہتی۔ وہ ایسے ماحول میں محسوس کرتی تھی۔ کہ گرتے ہوئے مٹی کے برتن کو کسی نے تھام لیا ہے۔ اور یہ حقیقت تھی۔ اسے کچھ دن اور جینے کے ذرائع حاصل ہو گئے تھے

نرس اور دوسرے کمپوڈر مریض کی تیمارداری کی بجائے اس کا گلا گھونٹنا چاہتے تھے۔ وہ لالچی تھے۔ زبیدہ سے نفرت کرتے تھے۔ زبیدہ چاہتی۔ کہ وہ ان باتوں کے متعلق ڈاکٹر کو کہے۔ مگر وہ چپ رہتی۔ اسلئے کہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر اچھا نہیں۔ دوسرے وہ ڈاکٹر کو کس برتے پر کسی کی شکایت کرے۔ علاوہ ازیں جب وہ ڈاکٹر کو اپنے کمرے میں آتا دیکھتی۔ تو یہ سب باتیں بھول جاتی۔ اور اپنی نظریں اسکے چہرے پر گاڑ دیتی۔ ڈاکٹر نرس کو ضروری ہدایات دیکر چلا جاتا۔

کچھ دن گذر گئے۔

زبیدہ کی حالت روبصحت تھی۔ مگر اب اُسے اور غم کھائے جاتا تھا۔ وہ صحت پا کر کہاں جائے گی۔ وہ ایک بیسوا کی زندگی کی بجائے موت چاہتی تھی۔ اگر وہ جینا چاہتی تھی۔ تو وہ کسی کے سہارے جینا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر ہی ایک ایسا آدمی تھا۔ جس پر اس کی امیدوں کا محل تیار ہو سکتا تھا مگر وہ ڈاکٹر تھا اور زبیدہ ایک بیسوا۔ ان خیالوں سے زبیدہ بعض اوقات گھبرا جاتی تھی۔ اس کی ذہنی تکلیف بڑھ جاتی۔ ڈاکٹر اپنے مریض کی ان تبدیلیوں کو نوٹ تو کر لیتا تھا۔ مگر وہ ان کی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ اور نہ اس نے ایسا کرنے کی کبھی کوشش کی۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ سنجیدہ طبیعت اور خاموش! وہ ایسے مرض کے لئے بھی دوائی تجویز کر دیتا۔ زبیدہ کو ان باتوں سے اور اذیت پہنچتی۔ وہ اب ڈاکٹر سے اپنا مرض نہ چھپانا چاہتی تھی۔ ایک دن جب ڈاکٹر معائنہ کر کے واپس جا رہا تھا۔ تو زبیدہ بولی۔ "ڈاکٹر"! مگر اس کی آواز کمرے کے دروازے کے بند ہونے کی آواز کے ساتھ دب گئی۔ ڈاکٹر کچھ کہے سنے بغیر دوسرے مریض کے پاس چلا گیا۔ زبیدہ کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟

کچھ تاریخیں اور کٹ گئیں۔

اگر زبیدہ کے تفکرات کو دور کر دیا جاتا۔ تو زبیدہ اچھی طرح صحت پا چکی تھی۔ مگر فکر بھی تو ایک مرض ہے۔ جب تک مریض نہ کہے۔ ڈاکٹر اسے سمجھ نہیں سکتا۔

"ڈاکٹر! مجھے . . . ." ایک دن زبیدہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر الفاظ منہ ہی میں رہ گئے۔ ڈاکٹر نے جھٹ کہہ دیا۔ "ہاں ہاں اب تم اپنے گھر جا سکتی ہو۔ میں آپ کو کامل صحت کا سرٹیفکیٹ دے سکتا ہوں"۔

زبیدہ نے وہ الفاظ سنے جنہیں وہ سننے کے لئے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ کہنے لگی "ڈاکٹر! مجھے سہارا چاہیئے"۔

"میں تانگے کا انتظام کر دونگا" ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔ امید کا ایک دیا تھا۔ وہ بھی بجھ گیا۔

زبیدہ بچی تھی۔ تو ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ جوان ہوئی تو یتیم اور لاوارث تھی۔ سماج نے اسے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کیا۔ سوسائٹی نے کہا عصمت فروشی کرو۔ اور ڈاکٹر نے تانگے کا سہارا بتلایا۔ تاریک مستقبل میں ہمت بھی ہار جاتی ہے۔ مگر زبیدہ ایک بار ڈاکٹر سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے اسے موت کے منہ سے کیوں چھینا ہے؟ اس نے کیوں اسکے روح اور جسم کے رشتے کو اور مضبوط کر کے اسکے لئے تکلیفیں پیدا کر دی ہیں اور وہ اسے ندی کے درمیان میں لے جا کر کیوں ڈبونا چاہتا ہے!

ڈاکٹر ایک غریب خاندان کا فرد تھا۔ صرف ماں کے سائے میں پروان چڑھا تھا۔ تعلیم کے اخراجات گورنمنٹ وظیفہ کے ذریعے ادا کرتی رہی محنت کسی کی ضائع نہیں جاتی۔ جلد ہی سرکاری ہسپتال میں لگ گیا۔ ایک بنگلہ بھی مل گیا تھا۔ وہ غریب تھا۔ اسلئے اس کی شادی بھی ابھی تک نہ ہو سکی تھی۔ وہ دکھوں میں پلا تھا۔ اسلئے وہ سنجیدہ طبیعت اور خاموش ڈاکٹر تھا۔

جب زبیدہ نے کہا۔ کہ وہ ڈاکٹر سے ملنا چاہتی ہے۔ تو ڈاکٹر کی ماں نے اسکا کھلے دل سے استقبال کیا۔ اور اس خیال سے کہ وہ کوئی مریضہ ہے۔ کچھ دے کر جائے گی۔ بڑے چاؤ سے اسے بٹھلایا۔ وہ گھڑیاں گننے لگے۔ کہ کب ڈاکٹر آئیگا۔ ڈاکٹر آیا۔ تو حیران رہ گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ اس نے اپنے مکان میں ایک غیر عورت کو دیکھا۔ کیا وہ ڈاکٹر کو کچھ دینے آئی ہے۔ مگر ڈاکٹر تو کسی سے کوئی چیز [illegible] نہیں۔ نہ ہی آج تک ڈاکٹر نے کسی سے کوئی چیز مانگی ہے . . . . یہ سب کس لئے . . . . ڈاکٹر . . . [illegible]۔ لمحہ بھر میں کئی خیال دوڑ گئے۔

"زبیدہ! تم یہاں؟" سنجیدہ اور خاموش طبیعت ڈاکٹر نے پہلی مرتبہ چھوٹی ہنسی ہنس کر کہا۔

"تانگے والے نے پوچھا۔ کہاں لے چلوں؟ میں کیا کہتی ڈاکٹر! یہاں میرا کون تھا"۔

ڈاکٹر کے دماغ میں الجھن پڑ گئی۔ ڈاکٹر کی ماں کچھ نہ بولی۔

دو عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ کئی دنوں تک باتوں کا سلسلہ کٹنے نہ پایا۔ لوگ کہتے ہیں۔ گھر میں دو عورتیں کبھی نہ کبھی جھگڑ بیٹھتی ہیں۔ مگر ڈاکٹر کی ماں اور زبیدہ تو شیر و شکر ہو گئی تھیں۔ دونوں کی طبیعت ایک نکلی۔ ڈاکٹر خوش تھا۔ کہ ماں اکیلی تھی۔ اسے ساتھی مل گیا ہے۔ اب اسکے دن خوشی خوشی گزر جائینگے۔ اور ماں کی وہ اداسی جو اسے مدت سے کھا رہی ہے۔ کچھ دنوں کیلئے دور ہو جائے گی۔ یہی بات تھی۔ کہ ڈاکٹر نے اپنے گھر میں زبیدہ کی رہائش کو برداشت کر لیا تھا۔ ادھر زبیدہ بھی مصیبتوں کی شکار تھی۔ اسکے دن بھی سائے میں گزرنے لگے۔ گھر میں جو کام کاج ماں کرتی تھی وہ زبیدہ نے سنبھال لئے۔ ماں اب ماں ہی بنی بیٹھی رہتی۔

ڈاکٹر کے ڈرائنگ روم میں ٹنگے ہوئے کیلنڈر پر سے چند مہینے بدل گئے۔

زبیدہ کے چہرے سے یہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ کہ وہ بھی کبھی بیمار ہوئی تھی۔ خوشی میں خون بڑھ جاتا ہے۔ چہرہ نکھر آتا ہے۔ ہر حرکت میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ زبیدہ نے دلکشی کے تمام سامان جمع کر لئے تھے۔ وہ اب چاہتی تھی۔ کہ تمام خوشیوں کو اپنے اندر جذب کر لے۔ وہ ایک زندگی چاہتی تھی۔

وایک عورت کو چاہیئے ۔ کلی کی سی زندگی ۔ خوشبودار رنگین ۔ وہ موقعہ پاکر ڈاکٹر کو چھیڑ دیتی ۔ مگر ڈاکٹر صرف ڈاکٹر ہی تھا ۔ سنجیدہ طبیعت اور خاموش مفلسی اور یتیمی کی پیداوار ! اگر کبھی سہمی ہوئی ہنسی ڈاکٹر کے ہونٹوں پر کھیل بھی جاتی ۔ تو وہ بہت جلد اپنی طبیعت کو بچا لیتا !

قدرت نے ایک کھیل دیکھنا تھا ۔

ایک دن ڈاکٹر بہت دیر سے آیا ۔ ماں سو چکی تھی ۔ ڈاکٹر بھی کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا ۔ محبت کا دیوتا دیکھ رہا تھا ۔ اس نے زبیدہ کے دل میں عشق کی چنگاریاں بھر دیں ۔ زبیدہ نے سوچا ۔ ڈاکٹر تھکا ماندہ ہے ۔ وہ سو چکا ہوگا ۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے بستر کے نزدیک گئی ۔ تھوڑی دیر سہمی ہوئی کھڑی رہی ۔ پھر وہ ڈاکٹر پر جھکی ۔ اس نے ڈاکٹر کے سانس میں اپنی سانس ملا دی ۔ اور ڈاکٹر کے ہونٹ سے اپنے ہونٹ ۔ اس کی پیاس دگنے زور سے بھڑک اٹھی اس نے چاہا ۔ کہ وہ اپنے ہونٹوں سے ڈاکٹر کے گال سینک دے ۔ جب ڈاکٹر نے محسوس کیا ۔ وہ لرز اٹھا ۔ زبیدہ جان گئی ۔ کہ سونے کا بہانہ ہی تھا ۔ زبیدہ عورت تھی ۔ شرم میں ڈوب گئی ۔ جلدی اپنے بستر پر چلی گئی ۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا ۔ اس نے کیا کیا ہے ؟ وہ اندھی ہو گئی تھی ۔ محبت میں اندھی تھی ۔ ڈاکٹر اسے اپنے گھر سے نکال دے ۔ اور تاریک دنیا میں پھینک دے ۔ وہ کہاں جائے گی ۔ تمام رات اس کا دل دھڑکتا رہا ۔ مگر ساتھ ہی وہ مسرت نگاہیں بھرتی رہی ۔

پتھر پر کافی عرصہ تک پانی کی بوند ٹپکتی رہے ۔ تو وہ اپنا نشان کر جاتی ہے ۔ ایسی غیر معمولی باتوں کا اثر ہونا ضروری تھا ۔ سنجیدہ اور خاموش طبیعت میں تغیر آیا ۔ ڈاکٹر زبیدہ کی طرف کھینچنے لگا ۔ ٹھنڈے منی کے تیل اور جلتی آگ کا ملاپ تھا ۔ آگ کے شعلے اور بھڑک اٹھے ۔ ڈاکٹر کے خشک اور مردہ ہونٹوں پر زندگی دوڑنے لگی ۔ آنکھوں کے خالی پیالے شراب سے بھر گئے ۔ اسے بے کیف دل میں حسن و محبت کی لہریں اٹھنے لگیں ۔ اب اس نے جانا ۔ کہ وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں ۔ جب کبھی دل لگی کے لئے ڈاکٹر کہتا " زبیدہ اب سہارے کی ضرورت نہیں رہی ۔ اب تو تم بغیر سہارے گھر جا سکتی ہو ! "

زبیدہ پکار کر ماں سے کہہ دیتی " ماں ! تم نے سنا ۔ ڈاکٹر کیا کہتا ہے "

ماں سنتی تو اس کا من پھول جاتا ۔ اماں کی آخری خوشی !

حسن کی قیمت

از حکیم احمد شجاع

مؤثر اور دلکش افسانوں کا حیرت انگیز مجموعہ

(دوسرا ایڈیشن)

جب کسی قلم سے نہایت خوبصورت الفاظ ۔ عجیب اسلوب اور دلفریب استعاروں میں اسرار حیات بے نقاب کیا جاتا ہے ۔ تو اس کارنامے کو ادبی الفاظ میں سحر و اعجاز کہتے ہیں ۔ حسن کی قیمت اور دوسرے افسانے اسی قسم کے سحر زا اعجاز کا ایک نادر مجموعہ ہے ۔ اس میں عورت کی محبت گناہ کی کشش اور نیکی و بدی کی طاقت کے ہر پہلو کو ایک نہایت ہی پر زور اور واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ انسانی زندگی کے اسرار کا پہلا انکشاف جو دنیائے ادب اور مشاہیر ہند سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے ۔

کاغذ لکھائی ۔ چھپائی ۔ دیدہ زیب حجم ۲۰۰ صفحات ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے

مکتبہ اردو لاہور

چق بوشی

ولیم بلیک

ولیم بلیک کو اس دنیا سے رخصت ہوئے سو سال ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی اس کی عظمت کے اقرار کا آغاز ہو رہا ہے۔ وہ انگلستان کا سب سے بڑا آرٹسٹ تھا۔ اس کی داستانِ حیات ان لوگوں سے ملتی جلتی ہے جن کی ذہانت کو ان کا زمانہ اس لئے قبول نہیں کرتا کہ انکے خیال اپنے ہمعصروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ولیم بلیک کو اس کی زندگی میں دیوانہ کہا گیا۔ اس کی موت کے بعد اسکے شاگردوں نے اس خیال سے اسکے غیر مطبوعہ مسودوں کو جلا دیا تھا۔ کہ کہیں ولیم بلیک کی حماقت اس کی شہرت کو ختم نہ کر دے۔ لیکن آج ولیم بلیک کی ایک ایک تصویر، ایک ایک مکتوب اور ایک ایک شعر ہزاروں روپوں میں بیچا جا سکتا ہے۔ ولیم بلیک کی عظمت کا اقرار سب سے پہلے ایک امریکی نے جو گارڈ ولسن نے کیا۔ لیکن بلیک اس وقت مقبول ہوا۔ جب ۱۸۶۳ء میں روزیٹی نے اسکے سوانح حیات کو شائع کیا۔ یہ کتاب "غیر معروف مصور" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

آرٹ کی ہر تاریخ میں اس کا نام آتا ہے۔ اسکول کا ہر بچہ اسکے چند اشعار زبانی یاد کرتا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ ایک مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اسکے باوجود وہ ابھی تک اجنبی، غیر معروف، اور معمہ ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ وہ پہلے دور میں صوفی تھا۔ جب مصور گلیوں اور بازاروں کی منظر کشی کر رہے تھے۔ تو وہ تمثیلی تصویروں کو بنا رہا تھا۔ جب دوسرے شاعر کلاسیکی راستے پر چل رہے تھے۔ تو اس نے رومانی طریقہ اختیار کیا تھا۔ بلیک کی زندگی کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ وہ ۱۷۵۷ء میں بمقام لندن پیدا ہوا۔ اور وہیں ۱۸۲۷ء میں مرا وہ صرف تین سال لندن سے باہر رہا۔ اسکے باپ نے اسے آرٹسٹ بنانے میں ہر طرح کی مدد کی۔ لیکن اسے شاعر بننے سے منع کرتا رہا۔ ایک مرتبہ بلیک نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ اس نے درختوں پر فرشتے دیکھے ہیں۔ اسپر اسکے باپ نے بلیک کو پیٹا تھا۔ ولیم بلیک کا آرٹ قدیم اسکول کی کسی روایت سے پوری طرح وابستہ نہیں ولیم بلیک کی ابتدائی شاعری غزلیہ ہے۔ اس کی پہلی کتاب "نغماتِ معصوم" (William Black) میں کہیں بھی تصوف دکھائی نہیں دیتا۔ پڑھنے والا کہیں بھی پریشان نہیں ہوتا۔ اسکی دوسری کتاب "نغماتِ تجربہ" میں اسکے بہترین اشعار ہیں۔ ولیم بلیک نے ایک باغبان کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ اس کی مدد سے اس نے ایک معمولی سا چھاپہ خانہ کھول دیا تھا۔ اسکا بھائی رابرٹ بھی وہیں کام کرتا تھا۔ اسے تجارتی کاروبار میں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ناقدر شناسی زمانہ اور بھائی کی موت کے غم نے بلیک کو ایک پُرجوش انقلابی بنا دیا تھا۔ لیکن بعد میں ولیم بلیک ایک صوفی، فلسفی، مصور اور شاعر ہو گیا تھا۔

اپنے زمانے میں بلیک کو بہت کم لوگوں نے سمجھا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے زمانے سے آگے تھا۔ بلکہ وہ اپنے زمانے کا مخالف بھی تھا وہ اپنے زمانے کے آرٹ، فلسفہ، سیاست اور اخلاق کا شدید نکتہ چین تھا۔ اسکے بہترین دوست بھی اسکے ہم خیال نہیں تھے۔ لیکن وہ راسخ عقیدہ لوگ نہیں تھے۔ اپنے بہت سے دوستوں کی طرح وہ امریکی اور فرانسیسی انقلابوں کا سرگرم حامی تھا۔ اس حمایت کی وجہ سے بلیک کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ آغازِ تہذیب سے انسانی تاریخ میں امریکی انقلاب اہم ترین واقعہ تھا اس واقعہ نے زندگی کی نئی شاہراہیں کھول دیں، آزادی اور آرٹ کی نئی راہیں۔ اس نے اس قسم کے خیالات کو "امریکہ" "انقلابِ فرانس" اور "یورپ" میں پیش کیا۔

چونکہ وہ جارج سوم کی حکومت کا مخالف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے امریکہ میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اٹھارویں صدی کے انگلستان نے اس کی ذہانت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا۔ چند لوگ ایسے تھے۔ جو بلیک کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کہ بلیک کی ذہانت کا تقاضا کیا ہے۔

بلیک کا ایک ہم عصر شاعر کہتا ہے۔ کہ اگر وہ اپنے زمانے کے مطابق ذہانت پیش کرتا۔ تو اسے زندگی میں بہت زیادہ کامیابی ہوتی۔ اسی شاعر کے ہاں ولیم بلیک نے تین سال بسر کئے۔ ہیلی اسکے لئے بہت زیادہ کام لے آتا تھا۔ اس نے بلیک کو اتنا مصروف رکھا۔ کہ وہ اس مدت میں شعر نہ کہہ سکا۔ ہیلی کی دوستی اور تعاون سے بلیک کی مالی حالت ذرا سدھر گئی تھی۔ لیکن آخر کار بلیک اپنے اس دوست سے لڑ پڑا۔ بلیک اپنی نظموں میں اس دوست کو "شیطان" بنا کر پیش کرتا ہے ―― "جسمانی دوست لیکن روحانی دشمن"

اپنی عمر کے آخری حصہ میں بلیک صوفی فلسفی ہو گیا تھا۔ اس نے معموں اور تمثیلوں میں مسائل بیان کرنا شروع کئے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اگر اس کی کتابوں کا سرسری مطالعہ کیا جائے۔ تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اوپندر ناتھ اشک کے افسانے

ہندی، اردو و پنجابی ہی نہیں، گجراتی، مرہٹی اور تامل میں ترجمہ ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

اوپندر ناتھ کا معمول ہے۔ کہ یا تو وہ ایک خالص فنی چیز لکھتے ہیں یا منشی پریم چند کی طرح کسی سماجی برائی کو مرکز بنا کر اسکے گرد اپنی کہانی کا جال بنتے ہیں۔ اور پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس برائی کا ایسا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ جو مدتوں محو نہیں ہوتا۔ ادبی دنیا

کونپل

ان کی بہترین منتخب معاشرتی سماجی

کہانیوں کا مجموعہ ہے جن میں ہر ایک افسانہ فنی لحاظ سے مکمل، دلچسپ، موثر اور فرسٹ ریٹ ہے

قیمت عہ

پرواز لق لق

ظرافت و مزاح کی قہقہہ آفرین مضامین حاجی لق لق کی تازہ ترین اڑان دیکھنے کے لئے ان کی نئی تصنیف "پرواز لق لق" ملاحظہ فرمائیے۔ یہ حاجی صاحب کے بہترین مزاحیہ مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جسکے ایک ایک جملے سے آپکی محفل قہقہہ زار بن جائیگی۔ ہم نے اسے خاص اہتمام سے چھاپ کر معنوی اور صوری خوبیوں کو یکجا کر دیا ہے۔

قیمت عہ

اشک کے ڈرامے

ہندوستانی معاشرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں

ان میں زندگی کی تڑپ ہیجان اور رنگینی بدرجہ اتم موجود ہے۔

بسیوا

اوپندر ناتھ اشک کے ڈراموں کا مجموعہ ہے

بہترین حزنیہ، طنزیہ، مذاحیہ اور طربیہ ناٹکوں کا مرقع جمیل۔ جملہ طباعتی جاذبیتوں کے ساتھ جلد شائع ہو رہا ہے

مکتبہ اُردو لاہور

میکسم گورکی

جیل کی زندگی

شام کی کمک ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ اپنی کوٹھڑی کے وسط میں کھڑے ہوئے قیدی نے جیل کے گھڑیال کی آواز کو فضا میں گم ہوتے سُنا۔ آہنی دروازے کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ قدموں کی چاپ اور بس، جیل میں نہ صرف خاموشی طاری تھی۔ بلکہ [illegible] کا اس میں دخل نہیں تھا

دو منٹ تک قیدی خاموش رہا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ خاموشی توڑنے کے لئے کوئی آواز باقی نہیں تھی۔ قیدی نے آہ بھری۔ انگڑائی [illegible] کوٹھڑی کے سیاہ کونوں پر ایک مشتبہ انداز میں نظر دوڑائی۔ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ ایک نوجوان ہے۔ جس کے چہرے پر صحت کا کوئی نشان نہیں دکھائی دیتا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ ان آنکھوں سے خوفناک ابید ایک لمحہ کے لئے جدا نہیں ہوتی اس کی ذات سے خوف و ہراس ٹپکتا ہے۔ اس کے کندھے اتنے باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے گویا وہ اس کا سر چھپانا چاہتے ہیں۔ آج سے دو ماہ پہلے وہ گرفتار ہوا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کے خلاف مقدمہ نہیں چلایا گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ کہ اسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے اس نے دو مہینے اپنے جرم کی نوعیت معلوم کرنے کا انتظار کیا۔ شروع میں وہ سخت برہم تھا۔ اس نے احتجاج کیا۔ اس نے اپنے غریب اور بوڑھے والدین کی مصیبتوں کی دل ہلا دینے والی داستان بیان کی۔ اسی خیال سے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی نہر جاری ہو جاتی اور کبھی وہ غصے سے دانت پیستا۔

دن گذرتے گئے۔ جیل خانے کی خاموش دیواروں نے بہت حد تک اُس کی جسمانی طاقت زائل کر دی۔ اب وہ بہادر نوجوان کی جگہ ایک خوفزدہ قیدی تھا جس کا کمزور و نحیف بدن ہیبتناک واقعات کے ظہور کی مسلسل انتظار میں تھا۔

کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر اُس نے اپنا چہرہ زور سے لوہے کی سلاخوں میں دبایا۔ اور بے خوف ہو کر رات کی تاریکی میں باہر دیکھا۔ رات بے حد تاریک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ باہر تاریکی میں بازو پھیلانے سے کوئی سیاہ و مرطوب مادہ دھوئیں کی کلونس کی طرح بازو کے گرد حلقہ ہو جائیگا۔ وہ ایک دھیمی روشنی چمک رہی تھی یہ بھی رات کی سیاہ تاریکی میں لپٹی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی۔ کہ جیل خانے کی چار دیواری میں بند ہے۔ قیدی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑے ہو کر ہر رات یہ روشنی دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ خیال کرتا۔ کہ یہ دھیمی روشنی اس کی طرح کمزور اور نحیف ہے۔ اس لئے اُس سے ملتی جلتی ہے۔ ہر شام گنتی کے بعد تاریکی اور خاموشی میں گھرا ہوا وہ محسوس کرتا۔ کہ ہراس اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس پر حاوی ہو رہا ہے۔

وہ جیل خانے کی کوٹھڑی میں گھوم کر اس کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جرأت نہ کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اُس کا کمرہ دروازے کے اوپر آویزاں لیمپ سے روشن ہوتا ہے۔ اور سائے کونوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ اُسے اس بات کا بھی علم تھا۔ کہ ان سایوں کے علاوہ کمرے میں ایک چارپائی۔ ایک میز اور کرسی ہے اور بس۔ کمرہ اتنا چھوٹا تھا۔ کہ اس میں اور کسی شے کی گنجائش نہ تھی۔ اُسے یقین تھا۔ کہ کمرے میں صرف یہی اشیا ہیں۔ اسکے باوجود وہ نہیں مانتا تھا۔ اگرچہ اُسے صاف طور پر علم تھا۔ کہ وہ تنہا ہے۔ پھر بھی وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ وہ تنہا نہیں۔

جیل میں کافی عرصہ رہنے سے دیواروں کے پلستر میں چھوٹے سے چھوٹے نشانوں اور درازوں کے مقامات کا اُسے پورا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ روشنی کو مسلسل دیکھتے ہوئے وہ نشانات اور درزوں کا تصور جمانے کی کوشش کرتا تاکہ اُسے تسکین حاصل ہو اور خوف و ہراس

جسکے دل سے محو ہو سکے۔ چارپائی کے قریب دیوار پر اُس کے کسی پیشرو قیدی نے بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ شاید اپنے آپ کو حاصل کردہ تعلیم میں مشغول رکھنے کے لئے۔ تاکہ جیل کے بیکار دنوں میں دل بہلا سکے اور تنہائی کے خلاف جنگ کر سکے۔ سامنے کی دیوار پر سیلاب کے بڑے بڑے سبز نشان تھے۔ ایک نشان میں کسی نے بڑے بڑے اور شکستہ الفاظ میں لکھا تھا۔

ہم لمبے پہاڑوں اور گھاٹیوں میں سفر کیا ہم سو ووکے دو ڈاکو، ہم گلیم پوش تھے۔ کوئی بلند و ارفع آرزو ہمارے دل میں نہ تھی۔ رات ہم نے ایک واقفکار لڑکی کے گھر بسر کی۔ یہاں ہم نے خوب سیر ہو کر شراب پی۔ اور لوٹ کا مال کا تقسیم — "

قیدی نے آخری لفظ "ا" پر غور کیا — کافی دیر تک غور کرتا رہا۔ اُس نے اپنے دل سے سوال کیا کہ "ا" ڈاکوؤں کی دماغی کیفیت پر کیا روشنی ڈالتا ہے — کیا یہ خوشی کا نعرہ ہے؟ سنگدلی کا اظہار؟ — وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اغلباً یہ بھوک کی ندا ہے — بھیڑیوں کی سی کھانے اور پینے کی خوشی — ہاں ہاں بالکل حریصانہ چباہٹ — اُس نے بآسانی اس حقیقت کا تصور جما لیا۔ اُس نے خیال کیا دونوں ڈاکو خوش باش جانباز ہونگے — قاتل — گودڑی پوش لیکن مسرور — اور یقیناً ڈر اُن کے نزدیک تک نہیں گیا ہوگا لیکن دوسری جانب وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ شخص کس نوعیت کا ہوگا جس نے دروازے کے قریب کونے میں یہ لکھا تھا: یہاں حبیب اگنیٹ ارساف نے قیام کیا۔ جس نے اپنی بیوی اور ساشا گزروف کو اُن کے ناجائز تعلقات کی وجہ سے قتل کر دیا۔ ۱۹۱۰ء میں میں نے اُن کی گردنیں ماریں اُسکے نیچے ایک فضول سوگند درج تھی۔ قریب ہی ایک صنوبر پڑی کی تین کھڑکیاں دکھائی گئی تھیں۔ کٹیا کی چھت پریشاں بالوں کی طرح کچھ بنا تھا۔ شاید یہ درخت یا دود کش سے نکلتا ہوا دھواں دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کونے میں اکھڑا ہوا پلستر معلوم دیتا تھا۔ جیسے کوئی شخص جانور کی کھال اتار رہا ہے۔ کمرے کا دروازہ وزنی لکڑی سے بنا تھا۔ جو اندر کی طرف مضبوط آہنی سلاخوں سے بند تھا۔ دروازے میں ایک مربعہ سوراخ تھا جسے باہر کی جانب دھات کے ٹکڑے سے بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن دھات کا ٹکڑا سوراخ کے برابر نہ تھا۔ سوراخ کے کونے میں باریک سی درز رہ گئی تھی۔ اس درز میں سے روشنی چھن چھن کر کمرے میں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا یہ درز بدقطع آنکھ ہے۔ جو ہر وقت مار رہی ہے۔

قیدی کال کوٹھڑی کی پوری تفصیل سے واقف ہو چکا تھا — وہ تنہا تھا — اسکے باوجود کمرے کی تفصیلات کا اسے جسقدر زیادہ علم ہوتا۔ وہ احساس کرتا کہ وہ اکیلا نہیں۔ ضرور اس کا کوئی ساتھی ہے۔ جسے وہ دیکھ نہیں سکتا۔ پاس نہیں کر سکتا۔ ہر رات قیدی کسی کی موجودگی کا احساس کر کے ڈر جاتا۔ وہ خیال کرتا۔ اُس کے پیچھے کوئی کھڑی ہے۔ جب وہ اپنی پشت زور سے دیوار کے ساتھ بھینچتا۔ جب بھی اُس کا تصور اُسے وہیں موجود پاتا۔ اور سمجھتا۔ کہ وہ خاموش صورت فاتح ہے — ناقابلِ تسخیر — جو اس کی ہڈیوں کے گودے تک میں خوفناک مایوسی پیدا کر رہی ہے۔

— ہو سکتا ہے۔ کہ وہ دیو ہو جو مست ہو کر اُس پر حاوی ہو رہا ہے۔ اور عنقریب اُس کے قلب میں خونخوار پنجے گاڑ کر اُسے بھینچ دیگا۔ دیو! بھاری بھرکم دیو — دلدل کی طرح سبز جس پر جالا جما ہو۔ قیدی اُسے صاف طور پر محسوس کرتا۔ اور لرز جاتا۔ وہ کھڑکی کی سلاخوں میں سے مسلسل سامنے دیکھتا رہتا۔ اس لئے کہ وہ مڑ کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ آنکھیں اُسے دکھ پہنچاتیں۔ ٹانگیں تھکاوٹ کی وجہ سے کانپتیں لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔ مبادا مڑنے میں وہ خوفناک صورت اُسکے سامنے آ جائے۔

روز کے اس معمول میں کمرے سے باہر وہ دیکھتا۔ کہ خاموشی اور تاریکی ہم آغوش ہو رہی ہیں۔ سطحِ زمین پر ہر شے اس طوفانِ عظیم سے چھپی پڑی ہے — مر چکی ہے۔ اور کہ دنیا میں بجز اُسکے — جو کمرے میں بند، خوفزدہ اور انجام کے لئے ہمہ تن مسلسل انتظار بنا ہے۔ کوئی دوسری ذی روح اور ذی حس شے باقی نہیں — وہی ہے اور بس — دائمی آسائش کی ناکام تلاش میں ہے جو وہ صدیوں تک حاصل نہیں کر سکیگا — وہ خیال کرتا۔ کہ رات کبھی ختم نہ ہوگی۔ دوسرے دن کا سورج کبھی طلوع نہ ہوگا۔ اور یہ موہوم صورت تا عینِ حیات

خاموشی سے اُسکے پیچھے کھڑی اُس کی نگہداشت کرتی رہے گی۔

کھڑکی کے عقب میں بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ قیدی خوشی سے اچھل پڑا۔ لیکن فوراً ہی ضبط کرکے بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ اور سُنتا۔

"ٹھہرو، گری، ور کرخت آواز میں کسی نے حکم دیا تھا۔ اور بندوق کا کُندہ فرش سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ سنتری نے عبدی سے دھیمی آواز میں گنتی کی۔

"بارہ کھڑکیاں —— دو گھنٹہ گھر"

"رِتن! اگر تم کھڑکی کے قریب تمہیں کوئی سر جنبش کرتا ہوا دکھائی دے تو فائر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سمجھ گئے؟"

"جی"

"پہلے انچیں کو اطلاع دو۔ اور اگر تم کھڑکی میں سے کسی کو باہر ہوا نکتے ہوئے دیکھو۔ جب بھی فائر مت کرو۔ لیکن اگر کوئی کھڑکی کے رستے باہر نکل کر اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کرے۔ اسوقت تمہارا فرض ہو جاتا ہے۔ کہ قیدی فرار نہ ہو سکے —— سمجھتے ہو؟"

"جی حضور"

"فوراً آواز دو۔ کون ہے؟ —— ایک دفعہ —— دوسری دفعہ —— تیسری دفعہ —— اس کے بعد اُسے خائف کرنے کے لئے ہوا میں فائر کرو۔ . . . لیکن تم فرار ہونے والے پر بھی فائر کر سکتے ہو۔ یا اگر مناسب معلوم ہو تو بندوق کے کُندے سے اُسے ضرب لگاؤ —— یہ بھی سمجھ گئے؟"

"جی حضور"

"بس دیکھو! تمہارا فرض ہے۔ کہ گشت کرتے رہو۔ کھڑکیوں کا اچھی طرح سے دھیان رکھو۔ ایک لمحہ کے لئے تمہاری آنکھ نہ جھپکے"

"نہیں! نہیں جناب"

"اچھا! اب دوہراؤ۔ کن حالات میں تم فائر کرو گے؟"

"اگر وہ میری جانب آئے . . . . ."

"اور اگر وہ دیوار کو پھاندے جائے؟"

طویل خاموشی —— اس خاموشی میں قیدی کے بھاری سانس کی آمد و رفت اور اُس کی بیقرار حرکتیں صاف طور پر سنائی دیتی تھیں

"احمق"

"پھر . . . . ضرور مارو . . . . ."

"اور اگر تم کھڑکی کے قریب کوئی سر دیکھو؟"

پھر خاموشی۔ بندوق کے کُندے کی آواز سنائی دی اور کسی نے ٹھنڈا کا۔

"احمق! تمہارے دماغ میں بھُس بھرا ہے؟"

"پھر کچھ نہیں"

"کیوں؟ کیوں نہیں؟ —— کہو کر سر اندر رکھو۔ سمجھ گئے؟ جاؤ اپنے فرض کا خیال رکھو۔

قیدی نے کھڑکی میں سے جھک کر معلوم کرنے کی کوشش کی۔ کہ عاجزی کے ساتھ بولنے والا کون ہے۔ لیکن جیل کی دیوار اور بیرونی بلند جھکاؤ کے درمیان تنگ راستے پر تاریکی چھائی ہوئی تھی اُسنے صرف سنتری کے پاؤں کی آہستہ چاپ سُنی۔ اور بندوق کی چمک دیکھی۔

"اپنا سر اندر رکھو" سپاہی کی آواز گرجی

قیدی پیچھے ہٹ گیا۔ دروازے کے قریب جاکر چاروں طرف کمرے میں دیکھا۔ اور پھر چارپائی پر بیٹھ کر سامنے کی دیوار پر نظر جما دی۔

ستون کے عقب سے اچھل کر ایک چوہا نکلا اور اونی گولے کی طرح فرش پر لوٹنے لگا۔ یہ چوہا بہت ہشیار اور وضع دار تھا۔ اِدھر اُدھر بھاگتا۔ ناک اٹھا کر ہوا کو سونگھتا۔ اُسکے کان حرکت کرتے۔

قیدی چوہے کی اٹکھیلیوں میں محو ہو گیا۔ لیکن اُسنے قلب کی بیقراری کا پورا احساس تھا۔

ابھی دس بجے تھے۔ وہ سوچتا۔ کہ دوسرے دن کی روشنی دیکھنے کے لئے اُس سے چھ یا سات گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔ اس خیال سے اُسے سخت کوفت ہوئی۔ اس کا احساس اسقدر تلخ تھا۔ کہ اُسے جسم کی ہڈی ہڈی ٹوٹتی۔ اعضا کٹتے اور کھال سکڑتی ہوئی معلوم ہوئی اُس نے سر کو نیچے ڈال دیا۔ دانت پیسنے لگا۔ اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔

"ا — ا — ا — او ہو — او ہو — او — اُوہ"

قیدی اس درد بھری آواز سے چونک پڑا۔ اُس نے خیال کیا یہ اس کے قلب کی غیر شعوری گریہ وزاری ہے — نہیں! یہ باہر کسی کے رونے اور کراہنے کی آواز ہے — دھیمی — جو آہنی سلاخوں سے ٹکرا کر رہے میں غائب ہو گئی۔

"اُو — اُو — اُو" — رات کی تاریکی میں رونے اور کراہنے کی آواز درحقیقت سنتری گا رہا تھا۔ قیدی نے غور سے سنا اور خود اُس کے ہونٹ بھی حرکت کرنے لگے۔ اُس کے کان گانے سے غیر مانوس ہو چکے تھے۔ سنتری کی دھیمی آواز سے ایسا معلوم ہوتا کہ بہت دور کوئی گا رہا ہے — جیل اور تاریک رات سے بہت پرے — قیدی کے وطن سے دور — گانا جو پرانے زمانے میں گایا جاتا تھا — گیت اور سنتری کی آواز میں کوئی کشش نہ تھی۔ اُس کی آواز ایسی ہی تھی۔ جیسے بوسیدہ درخت کے از خود ٹوٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔

قیدی نے دل سے سوال کیا۔ گیت کے الفاظ کیا تھے۔ وہ نہ سمجھ سکا لیکن سنتری کے مسلسل گانے نے اُس کے تخیل کی رو منقطع کر دی۔ قیدی نے سمجھنے کی کوشش کی کہ سنتری اونچی آواز میں گانے کی جرأت کیوں نہیں کرتا؟ اُسے ضرور کسی کا خوف ہوگا۔ قیدی نے گیت میں گہرا غور کیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ اُسکا اپنا رنج — خوف تنہائی اور مستقبل سے مایوسی اور بیقراری رو رہی تھی۔ گیت میں محو ہو کر قیدی بے قابو ہو گیا۔ اور چارپائی پر لیٹ کر کمبل سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ خیال کرنے لگا۔ کہ انسان اُس وقت اس طرح گاتا ہے جب اُسے والدہ کی یاد ستاتی ہو۔ یا جب اُس والدہ کے درد و کرب کا تصور کرتا ہے۔ جس کا بچہ اُس سے چھین لیا گیا ہو۔ یا جب اُس بچے کے رنج و اندوہ کا خیال کرتا ہے۔ جس کی والدہ اُس سے بچھڑ گئی ہو آنسو اس کی آنکھوں میں منجمد ہو گئے۔ خاموش گریہ سے اُسکے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ عجیب روح فرسا انداز میں بولا۔

"اماں! — اماں! — میں نے کچھ نہیں کیا — میں بے گناہ ہوں۔ اُنہوں نے بلا وجہ مجھے گرفتار کیا ہے — اماں! مجھے بچاؤ! مجھے ڈر لگتا ہے اماں! — اماں! اماں! — پیاری اماں"

اُس نے والد اور والدہ دونوں کا تصور کیا۔ والدہ اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ اُسکا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ قیدی نے صاف طور پر محسوس کیا۔ کہ اُس کی آنکھیں اُسے دیکھنے کے لئے بیقرار ہو رہی ہیں — اُس کا والد صاحبِ فراش ہے — کمزور — ناتوان — اور اُس کی والدہ کو تسلی دینے سے یکسر قاصر کیونکہ بچے کے تاریک انجام کے خیال سے بیقرار ہو کر اُسکی نقاہت بڑھ رہی ہے۔ تاریکی میں دونوں کی آنکھیں چمکتی ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں۔ تلاش کرتے ہیں۔ آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے — قیدی نے خیال کیا۔ سنتری کا گانا بالکل اُن بڑھے لوگوں کے گریہ وزاری کی صدائے بازگشت ہے۔ جو بچے کے فراق میں تڑپ رہے ہیں۔ وہ اچھل کر چارپائی سے نیچے اتر آیا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ دروازہ آہنی سلاخوں سے بند تھا۔ اُس نے چلاتے اور منت وزاری کرتے ہوئے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارے۔ "کھولو! مجھے رہا کر دو! میں اب یہ دکھ برداشت نہیں کر سکتا — رحم! — کھولو — خدا را کھولو!"

سلاخوں کے سامنے ایک چہرہ نمودار ہوا جس پر لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ اُس نے قیدی کو سرزنش کی۔

"تم پھر ڈرامہ رچانا چاہتے ہو — خاموش رہو — یہ اچھا نہ ہوگا — تم تعلیمیافتہ ہو سمجھدار ہو — تم سمجھ سکتے ہو کہ شور مچانے کی اجازت نہیں۔"

"سنو! میں تم سے التجا کرتا ہوں۔ میری والدہ — سنو! میری والدہ ہے۔ تم انہیں بتا دو — مجھے جانے دو — میں واپس آجاؤں گا —"

"او خدا! — قیدی! رات کے وقت غل کرنا ممنوع ہے کیوں بیوقوف بننے کی کوشش کرتے ہو؟ لوگ سو رہے ہیں۔ ہر شے محوِ خواب ہے۔ اور تم دروازہ کھٹکھٹا کے سب کو بیزار کرنا چاہتے ہو — اس کی ہرگز اجازت نہیں ہو سکتی —"

"لیکن سنو! میں التجا کرتا ہوں —" "وہ تمہیں

زمین دوز محبس میں بند کر دینگے،،۔ خدا را بتاؤ،،
"یہ سب بے سود ہے۔ یہ پہلا موقعہ نہیں۔ تم جانتے ہو۔ بارہا وہ تمہارے سوالوں کا جواب دے چکے ہیں۔ اُن کا حکم ہے۔ کہ تمہاری باتوں پر کوئی غور نہ کریں۔ اسلئے تم سے کہتا ہوں۔ کہ غل مت کرو۔ یہاں کسی قسم کا شور و غل کرنے کی اجازت نہیں"

چہرہ غائب ہوگیا۔

"سنو!" قیدی نے کہا۔ ملتجیانہ انداز میں ۔۔ اپنے رخسار آہنی سلاخوں کے ساتھ بھینچتے ہوئے۔ تاکہ اُس کی نگاہیں پاؤں کی چاپ کا تعاقب کرسکیں۔

"سنو! واپس آؤ!" قیدی نے پھر آہستہ سے کہا "آؤ اور دروازے کے قریب کھڑے ہو جاؤ۔ تاکہ میں تمہیں دیکھ سکوں ۔۔۔"

ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ قیدی نے فرش پر گھٹنا ٹیک دیا۔ آہنی سلاخوں مضبوطی سے پکڑلیں۔ اور زور سے سر کو دروازے کے ساتھ دبایا۔ دھات کی خنکی اُس کے رگ و پے میں سرایت کرگئی اور وہ کانپنے لگا۔ اُسکے دل میں جوش پیدا ہوا۔ اور اُس نے محسوس کیا۔ کہ اُس کے وجود میں زہر حل ہو رہا ہے۔ جو اُس کی رہی سہی طاقت کو زائل کرکے رہیگا۔

دفعتہً ایک اور آواز سنائی دی۔ پہلو کے کمرے میں اُس خونخوار درندے کی طرح جس کے پنجے پنجرے میں فرش سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتے ہیں۔ دوسرا قیدی کرب و اضطراب سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ یہ اُسکے پاؤں کی چاپ تھی۔ قیدی اٹھا۔ اُس کا چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں بھاری۔ لڑکھڑاتا ہوا میز کے قریب پہنچا۔ میز پر پانی کا لوٹا پڑا تھا۔ اور ایک گلاس میں دوائی جو پہلے ڈاکٹر نے اُس کے لئے تجویز کی تھی۔ قیدی نے دوائی اٹھائی۔ لیکن کچھ خیال کرکے پھر رکھ دی۔ اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُس کی بیقراری ختم ہوگئی۔ اُس نے محسوس کیا۔ کہ رنج و غم کا بوجھ اُس کے کندھوں سے اتر گیا ہے۔ لیکن فوراً ہی اُس بلا کرب نے اُسے پھر آدبایا۔ ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ زندگی کی آخری منزل کے قریب آ گیا ہے۔

لیمپ سے جو دروازے کے اوپر آویزاں تھا۔ کمرے کا بہت کم حصہ روشن ہوتا۔ کونوں میں بدستور تاریکی چھائی رہتی رات کے وقت یہ تاریکی دیوار پر پھیلے ہوئے سیلاب زدہ نشانات میں زندگی پھونک دیتی۔ اور وہ حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ایسا معلوم ہوتا۔ کہ وہ انسانی چہرے ہیں ۔۔ تمام اُن انسانوں کے چہرے جو یہاں قید رہ چکے ہیں۔ قیدی نے خیال کیا۔ بہت ممکن ہے۔ یہ انسانی چہرے ہوں۔ اسلئے کہ یہ تیرہ وتاریک دیواریں قیدی کی روح کو چوس لیتی ہیں۔

انسان کی روح ایک پرندہ ہے۔ جب روح آزاد ہو تو وہ مشرق و مغرب میں زندگی کی مسرتیں پھیلا دیتی ہے۔ اور جب جیل کی چاردیواری میں مقید ہو۔ تو جیل کی دیواریں خود اُس کی تروتازگی کو چوس لیتی ہیں ۔۔ ہوسکتا ہے۔ کہ پلستر میں سیاہ نشانات کو سودو کے ڈاکوؤں اور تمام اُن لوگوں کی روحیں ہوں۔ جو یہاں قید رہ چکے ہیں۔ ان نشانات سے خائف ہونے کی کوئی وجہ نہیں لیکن انکے گرد تاریکی کسقدر ہولناک ہے۔ اس میں زندگی ہے ۔۔ غیر محسوس ۔۔ اس تاریکی کے پردے میں طاقت ہے ۔۔ قبیح طاقت ۔ جو ہر وقت انسانی روح پر حاوی ہو جانے کے بیقرار رہتی ہے۔ اکثر اُس کی روح میں حل ہو جاتی ہے ۔۔ زنگ کی طرح اُس سے چمٹ جاتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اُس کی دھجیاں بکھیر دیتی ہے۔ اگرچہ اس کی ظاہری شکل و صورت کوئی نہیں۔ لیکن یہ کسی وقت ہیبتناک صورت میں نمودار ہوسکتی ہے۔

خوف سے قیدی کا سر کھولنے لگا۔ اُس نے محسوس کیا۔ کہ اُسکا جسم عمیق غار میں غائب ہو رہا ہے۔

"او خدا" اُس نے کہا۔ اُسکے لبوں میں از خود جوش پیدا ہوئی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ اُس کا دل اس سے کیا کہلانا چاہتا ہے فوراً ہی اُسے احساس ہوا۔ "یہ موت جرم ہے ۔۔ ندامت ۔۔ موت اتنی خطرناک نہیں۔ جتنا خوف کا درد" وہ بلبلا اٹھا۔ دوائی کا گلاس ہاتھ میں لیا۔ اور زور سے فرش پر دے مارا۔ دوائی کی بوند تمام کمرے میں پھیل گئی۔ اُسنے جھک کر گلاس کے شکستہ ٹکڑے اٹھالئے۔ اور ہتھیلی پر

...دیکھنے لگا۔ اُس کا سانس پھول رہا تھا۔ سر جھکا رہا تھا۔ اور ایک
...مسرم طاقت اُس کی آنکھیں بند کر رہی تھی۔ اس احساس نے اُسے
...خوفزدہ کر دیا۔ اُسے معلوم ہوا کہ کوئی پوشیدہ اور طاقتور بازو
...ے کھینچ رہے ہیں

"نہیں! ۔۔۔ نہیں!" اُس نے پاگلوں کی طرح دیکھتے ہوئے
...اور فوراً اپنا ہاتھ منہ کے قریب لاکر شیشے کے ٹکڑوں کو دانتوں میں
...پیسنے لگا۔ اُسکے مسوڑے۔ لب اور زبان چر گئی۔ اُسے سخت درد ہوئی
...خون سے بھر گیا۔ وہ جھکا اور خون اور شیشے سے کے ٹکڑے تھوک دیئے
...کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا۔ اسلئے کہ وہ پاگل بن بس تھا

"میں نہیں! ۔۔۔ میں نہیں" اُس نے کہا۔ "میں نہیں مر سکتا!
۔۔۔ اے خدا میری امداد فرما"

فوراً ہی اُس لڑکی کی یاد اُسکے دل میں تازہ ہو گئی۔ جو آگ میں
...کر تمام قسم کی آلائشوں سے پاک ہو گئی تھی ۔ وہ خوشی سے اچھلنے
...لگا۔ اور جس تاریکی سے وہ ابتک خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اُسے چیلنج کیا۔۔۔
...ے محسوس ہوا۔ کہ اُس کی مردہ روح میں نئی زندگی آگئی ہے

خوشگوار ہنسی کی لہر اُسکے چہرے پر دوڑ گئی۔ اُس نے دروازے کے قریب تپائی رکھی۔ اور اُس پر چڑھ گیا۔ وہ مسلسل خون اور شیشے کے ٹکڑے تھوک رہا تھا۔ لیمپ کی چمنی چارپائی پر گرا دی۔ اور لیمپ ہاتھ میں لیکر نیچے اتر آیا۔ کمرے کے مرکز میں کھڑے ہو کر اُس نے دیوار کے نقش و نگار کو دیکھا۔ اور کہا۔ "مجھے معاف کر دو!" اور پھر لیمپ کو سر کے اوپر لیجاتے ہوئے "وہ مجھے معاف کر دینگے" آگ اُسکے سر پر گری۔ اور فوراً ہی وہ سر سے پاؤں تک شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔ ایک لمحہ شعلوں کے وسط میں اُس نے توقف کیا۔ پھر بازوؤں کو ہلا کر ہوا کو تیز تر کیا اور مسرت و فتحمندی کا نعرہ لگایا۔ آگ کے شعلے دم بدم بلند ہوتے گئے۔ اُسکا کمرہ اس طرح روشن ہو گیا جیسے دن چڑھا ہو۔ دیوار کے نشانات خوشی میں جھومنے لگے

کمرے کا دروازہ کھلا لیکن پیشتر اسکے کہ لوگ اندر داخل ہوتے۔ قیدی راکھ کا ڈھیر ہو چکا تھا۔

(مترجم بشیر قریشی بی۔ اے)

حاجی لق لق کے افسانے

حاجی لق لق ۔۔۔ بارہ آنے

ارے بھائی آپ ہنستے کیوں ہیں؟ کیا ابتک حاجی لق لق کے افسانے نہیں پڑھے۔ ناممکن ہے آپ حاجی لق لق کے افسانے پڑھیں۔ اور آپکے قہقہوں سے فضا نہ گونج اٹھے۔ ہر شخص حاجی لق لق کے افسانوں کا دیوانہ ہے۔ کیونکہ حاجی لق لق اردو ادب میں اپنی مخصوص طنز نگاری کا واحد مالک ہے۔ آپ اپنے غموں کو بھولنا چاہتے ہیں۔ تو آج ہی حاجی لق لق کے افسانے پڑھیں ... اتنا شاندار ہے کہ آپ اسے دیکھتے ہی ... پڑھیئے۔

دنیا کی حور

کوثر چاندپوری ۔۔۔ ایک روپیہ

دنیا کی حور خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ بالکل ہمارے تمدن اور معاشرت کے مطابق ہے۔ طبیعت خود بخود الفاظ کا اثر قبول کرتی ہے۔ اور مصنف غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے دل و دماغ پر پائدار اور حسین نقش بنا جاتا ہے۔ زبان کی سلاست، سادگی اور مضامین کی اثر آفرینی نے کتاب کی افادیت میں بہت بڑا اضافہ کیا ہے۔ بہت مفید اصلاحی کتاب

نغمۂ حرم

اختر شیرانی ۔۔۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

جب آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کہ ہر جگہ روشنی پھیل گئی ہے۔ اسی طرح حضرت اختر شیرانی کی دلآویز رومانی نظموں کے مجموعے کے متعلق بھی کہنا بیکار ہے۔ کہ یہ اختر شیرانی کا مجموعہ کلام ہے اسوقت اختر ہندوستان کا مقبول ترین رومانی شاعر ہے۔ اور یہ رومانی نظموں کا مجموعہ اپنی دلآویزیوں کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔

مکتبہ اردو لاہور

تم صبح کے وقت صحن میں کھیلنے کے لئے باہر نکل آتے ہو۔ اور تم ڈگمگاتے
ہوئے گرتے ہو۔ اور ٹھوکر کھاتے ہو۔
لیکن میرے بچے وہ کون تھا۔ جس نے اس چھوٹے کرتے کو رنگا؟
میری زندگی کی چھوٹی کلی وہ کون ہے۔ جو تمہیں ہنساتا ہے؟
جو کھٹ پر کھڑی ہوئی ماں تمہیں دیکھ کر مسکراتی ہے۔
تالیاں بجاتی ہے۔ اور سامنے کڑے بجتے ہیں۔ اور تم ایک چھوٹے
گڈریے کی طرح اپنے ہاتھ میں بانس کی چھڑی لئے ہوئے ناچتے ہو۔
لیکن میری زندگی کی چھوٹی کلی وہ کون ہے۔ جو تمہیں ہنساتا ہے؟
ارے ساوحو۔ اپنی ماں کی گردن میں دونوں ہاتھ ڈالے
ہوئے تم کیا مانگتے ہو؟
او لالچی بچے۔ کیا میں دنیا کو ایک پھل کی طرح تمہاری گلابی
ہتھیلی پر رکھنے کے لئے آسمان سے توڑ دوں۔
ارے ساوھو تم کیا مانگ رہے ہو؟
اخوشی میں تمہارے کڑوں کی جھنکار بے جاتی ہے۔

سورج مسکراتا ہے۔ اور تمہاری پوشاک کو دیکھتا ہے۔
آسمان تمہیں اوپر سے اُس وقت دیکھتا ہے۔ جب تم اپنی
ماں کی گود میں سوتے ہو۔ اور صبح تمہارے بستر میں پنجوں کے بل آتی ہے
اور تمہاری آنکھوں کو چومتی ہے۔
ہوا خوشی میں تمہارے کڑوں کی جھنکار لے جاتی ہے
خوابوں کی پریوں کی مالکہ۔ آسمان کی مدہم روشنی میں سے
اُڑکر تمہارے پاس آرہی ہے۔
دنیا کی ماں تمہاری ماں کے دل میں تمہارے قریب بیٹھتی ہے
وہ جو تاروں کو اپنا گانا سناتا ہے۔ اپنی بانسری لئے ہوئے
تمہاری کھڑکی میں کھڑا ہے۔
اور خوابوں کی پریوں کی مالکہ آسمان کی مدہم روشنی میں سے
اُڑکر تمہارے پاس آرہی ہے۔

بال عمر بھر نہ اُگے

آج ہی ایک بوتل ہیر ڈسٹرائر Dusen Hair منگالیں جسکے
لگانیسے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ کیلئے دور ہو جاتے ہیں پھر زندگی بھر دوبارہ
اُسجگہ کبھی پیدا نہیں ہوتے۔ اور جگہ بچوں کی جلد کی مانند صاف اور خوبصورت دکھائی
دیتی ہے (نوٹ) فلم ایکٹر اور ایکٹریسیں بھی سٹیج پر استعمال کرتے ہیں آپ بھی استعمال کیجئے
قیمت فی بوتل اڑھائی روپیہ صرف محصولڈاک معاف: ناپسند ہونے پر واپسی کی شرط

اصلی کالا تیل درجہ اول

آپ ہر چیز استعمال کر سکتے ہیں لیکن سفید بالوں کو جڑ سے اصلی رنگ میں تبدیل کرنے
کیلئے مستقل و یقینی ذریعہ بال کالا تیل کا استعمال کرنا ہے یہ بینظیر سنیاسی نسخہ ہے
قیمت فی بوتل رعایتی اڑھائی روپیہ محصول ڈاک معاف۔

واحد تقسیم کنندہ:۔ منیجر ساہنی سٹورز AL/41 پشاور (صوبہ سرحد)
PESHAWAR C NWFP

میٹریکولیشن کے طلباء کے لئے

ماڈرن ٹیچر

سالانہ چندہ	تین ماہ کے لئے
تین روپے	صرف ایک روپیہ

ہیڈ ماسٹر صاحبان کی رائے

واقعی آپ نے ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔
پہلی فرصت میں منی آرڈر ارسال کریں

پنجاب کتاب گھر رجسٹرڈ ۱۹ موہن لال روڈ لاہور

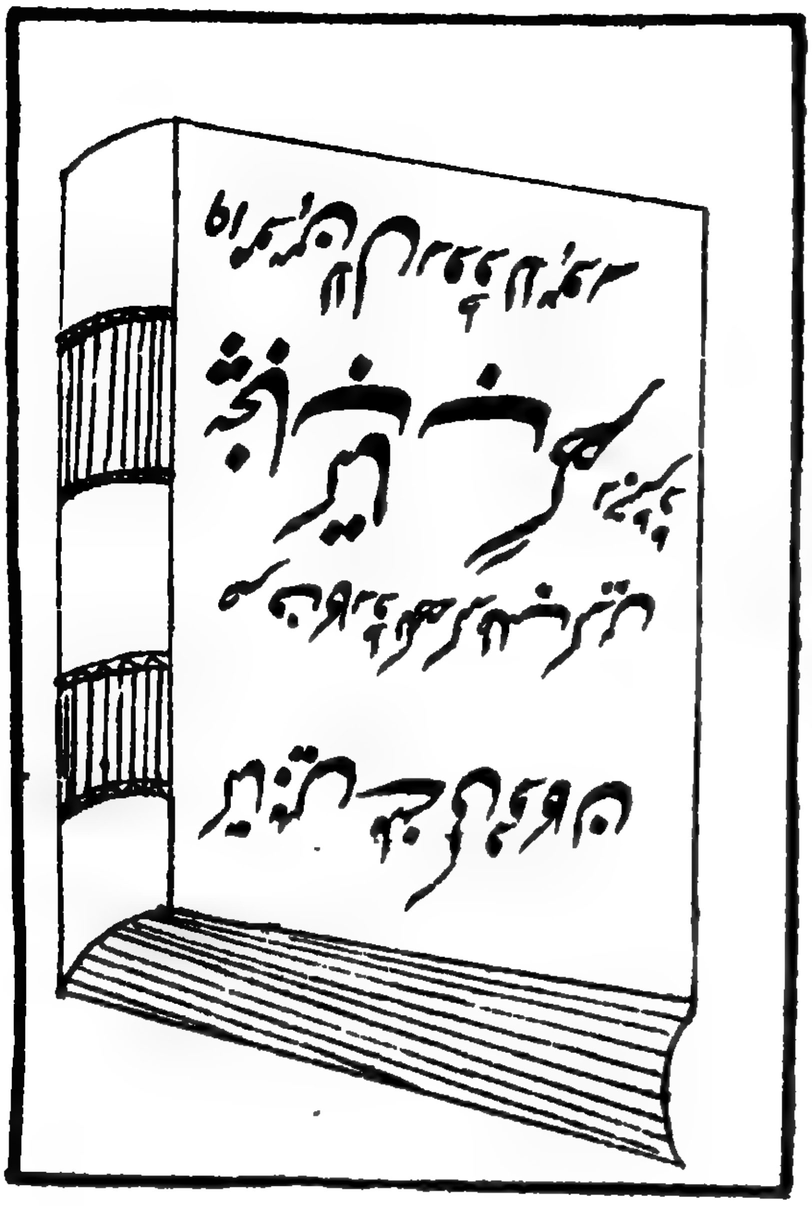

[illegible]

60

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نقد و نظر

مقدمہ تاریخ دکن:۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۴۴ صفحے قیمت ایک روپیہ

عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ کی لکھی ہوئی کتاب مقدمہ تاریخ دکن، اردو زبان کے تاریخی ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب میں دکن کی زمانہ قدیم، ازمنہ وسطیٰ اور عہد حاضر کی تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن سے ایک روپے میں مل سکتی ہے۔ باری

سلطان محمد قلی قطب شاہ:۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۰۰ صفحے قیمت پانچ روپے

جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن کے فاضل پروفیسر سید محی الدین قادری زور نے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، شہر حیدرآباد کے بانی اور سلسلہ قطب شاہیہ کے پانچویں حکمران سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی اور ان کے اردو اور فارسی کے کلام کے نمونے کمال جامعیت سے یکجا کر دئے ہیں۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد دکن سے پانچ روپے میں مل سکتی ہے۔ باری

مسافر کی ڈائری: سائز ۲۲×۱۸/۱۶ حجم ۱۹۲ صفحے قیمت عہ

خواجہ احمد عباس انگریزی زبان کے بہترین انشا پردازوں میں ہیں۔ آپ کے مقالات انگریزی کے بلندپایہ رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ امریکہ کے مشہور رسالہ "ایشیا" کے نگار رہے ہیں۔ کافی مدت سے آپ انگریزی روزنامہ "بمبے کرانیکل" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔ آپ نے اپنی سیاحت کے واقعات کو "آؤٹ سائیڈ انڈیا" کی صورت میں پیش کیا تھا۔ مسافر کی ڈائری آپ کی اسی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ خواجہ صاحب کا انداز بیان سہل اور دلچسپ ہے۔ حالی پبلشنگ ہوس کتاب گھر دہلی سے ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔ باری

دانائے راز:۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۹۰ صفحے قیمت بارہ آنے

علامہ اقبال مرحوم کی تعلیمات سے متعلق بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "دانائے راز" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں علامہ مرحوم کے ان خیالات کو پیش کیا گیا ہے جن کا تعلق بیداری مشرق، تہذیب فرنگ اور اشتراکیت سے ہے۔ انداز بیان پرجوش اور بااثر ہے۔ "دائرہ ادب اردو، لودیانہ سے مل سکتی ہے۔ باری

پیام شوق:۔ از پنڈت موہن ناتھ رینہ صاحب سائز ۲۲×۱۸/۱۶ حجم ۴۴ صفحے قیمت سوا روپیہ۔

جناب شوق کہنہ مشق لوگوں میں ایک بلند اخلاق شاعر ہیں جن کے کلام میں خلوص نیت اور بلندیٔ فکر نمایاں ہے۔

میرے خیال سے شاعری میں روحانیت کا بڑا دخل ہے۔ جو شعر حقیقی درد اور مقدس فکر سے کہا جائیگا۔ وہ اس شعر کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز ہوگا جو الفاظ کے گورکھ دھندے اور عبارت کے جوڑ توڑ سے کہا گیا ہو۔ جناب شوق کے کلام کا بیشتر حصہ روح کے ان پہلوؤں کو چھیڑتا ہے۔ جہاں شاعر کے سوا دوسرے کا گذر نہیں! کیا خوب شعر ہے۔

بتکدہ چھوٹنے کو چھوٹ گیا   اب ٹھکانہ نظر نہیں آتا

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

نقش ہستی مٹا رہے کوئی۔ پر مٹتا نظر نہیں آتا

اسی طرح بہت سے اشعار نشتر کا حکم رکھتے ہیں۔

کتاب کا تعارف جناب مولوی نظام الدین حسن نظامی ایڈیٹر "ذوالقرنین" نے لکھا ہے۔ اور تین پیش لفظ ایک پنڈت منوہر لال زتشی ایم۔ اے نے دوسرا ڈاکٹر سید عبدالحفیظ ایم۔ اے نے اور تیسرا پیش لفظ پنڈت امرناتھ جھا، ایم۔ اے وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی نے سپرد قلم کیا ہے۔ جس کا انگلش کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شامل کتاب ہے۔ تینوں پیش لفظ اپنی جگہ مستقل مضامین ہیں جناب شوق کی شاعری پر لیکن تعارف جس سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے وہ شاعر کی اس تعریف پر مہر تصدیق ثبت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کہ شاعر وہ ہے۔ جو جہاندیدہ ہو لیکن باوصف معصوم ہو"

کتاب کے خاتمہ پر نظامی پریس کی مطبوعات کے اشتہارات شروع ہو جاتے ہیں اور صحت نامہ اغلاط طباعت جو آغاز کتاب سے پہلے ہونا چاہیئے اشتہارات کے بعد لگا دیا گیا ہے۔ اور یہ درست نہیں۔ ان تمام طباعتی نقائص کے باوجود کتاب اپنی جگہ وہی ہے۔ جو اسے ہونا چاہیئے شاعرانہ عظمت عظمتِ جاویدہ ہوتی ہے۔ اسے اس قسم کے پردے نہیں چھپا سکتے!

اس کو کل پڑھیئے **امرت کایا کلپ** سچ مچ کایا کلپ کا ذکر ہے

کایا کلپ کے بہت سے نسخہ جات پرانی کتب ویدک میں لکھے ہیں۔ مگر ان کا ٹھیک طریقے سے استعمال کرنا بہت مشکل ہے۔ اس طریقے کے متعلق بھی ابھی بہت تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا ارادہ ہے۔ کہ ایسے کایا کلپ کروانے کے واسطے کوئی انتظام کریں۔ اس اشتہار کے ذریعے ہم ایسی ادویات مشتہر کر رہے ہیں۔ جو کہ بلا پرہیز کے کایا کلپ کر سکتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ ان کو دیر تک استعمال میں رکھنا چاہیئے۔ ان کو جو استعمال کرے گا۔ وہ خوش ہوگا۔ ہر دن بدن اپنے بچپن کی جوانی۔ خوشی محسوس کرے گا۔ یہ کایا کلپ صرف بوٹیوں یا نباتاتی اشیا سے تیار ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہیں۔

امرت کایا کلپ نمبر ۱ کھانے کی رغبت ہوگی۔ ہاضمہ تیز ہوگا۔ پیٹ کی قبض کی عادت جاتی رہے گی۔ بھوک بڑھے گی۔ بہت ہوگی۔ دن بدن جسم میں پھرتی و طاقت بڑھتی جاوے گی۔ اور اگر جسم پر جھریاں یا سیاہی پن وغیرہ بڑھاپے کے آثار ہوں گے۔ تو وہ دور ہوتے جاویں گے۔ دانت مضبوط ہوں گے۔ منہ سے پانی بہنا یا بدبو آنا دور ہوگا۔ خون صاف ہوتا جاویگا۔ خوشی بڑھتی جاوے گی۔ دل خوش رہا کریگا اور غمی کی طرف کم جاوے گا۔ جسم کے اندر سرایت کی ہوئی کئی امراض دور ہوتی جاویں گی۔ نزلہ۔ زکام وغیرہ دور ہو جاتے ہیں۔ مرگی۔ جنون۔ پاگل پن جاتا رہے گا۔ مرد و عورت جوان بوڑھے سب کھا سکتے ہیں۔ قیمت۔ ایک پاؤ صرف ایک روپیہ۔ جو کہ ۴۰ دن سے ۸۰ دن تک کی کافی ہے۔ پیسہ ڈیڑھ پیسہ روزانہ ہر کوئی خرچ کر سکتا ہے۔

امرت کایا کلپ نمبر ۲ ان لوگوں کی طرح کھا کر کمزور کر رہا ہے۔ پرانا احتلام۔ جریان یا پرمیہ جن کے جسم کو گھن کی طرح کھا کر کمزور کر رہا ہے اس سے شدہ۔ گاڑھا۔ قابل اولاد ویریہ۔ خوب پیدا ہوتا ہے۔ جسم مضبوط اور تنومند۔ طاقتور سڈول ہوتا جاتا ہے۔ دماغ تیز ہوتا ہے۔ پہلی عمر کا گنوایا ہوا ویرج دوبارہ جسم میں عود کرتا ہے۔ اور آدمی اپنے کو جوان محسوس کرتا ہے۔ یہ ان عورتوں کو بھی کھلائی جا سکتی ہے۔ جو کہ کثرت . . . . کے باعث کمزور ہو گئی ہیں۔ سفید پانی جانے یا پرمیہ سے دبلی ہوتی جاتی ہوں۔ یا کمزوری سے خون بہت جاتا ہو۔

قیمت اس کی بھی ایک پاؤ ڈبہ کی صرف ایک روپیہ ہے۔

امرت کایا کلپ نمبر ۳ یہ کلپ ان کے واسطے تیار کی گئی ہے۔ جن کے جسم میں بادی یا ریح گھر کر چکی ہے۔ کبھی جوڑوں میں درد کبھی کمر میں درد۔ کبھی ہاتھ پاؤں کا ملنا۔ کبھی چلتے ہوئے لڑکھڑانا۔ بڑھاپا ایسے لوگوں پر پورے طور پر جوبن سے آتا ہے۔ اور کئی جوانی میں بوڑھے نظر آتے ہیں۔ اس کی خوراک صرف ۲ ماشہ سے تین ماشہ ہے۔ اس کے فوائد بھی امرت کایا کلپ نمبر ۱

قیمت آدھ پاؤ صرف ایک روپیہ۔ یہ بھی ۴۰ دن سے ۸۰ دن تک کافی ہوگی۔

یہ کلپ امرت کایا کلپ نمبر ۱ یا نمبر ۲ کے ساتھ بھی کھائی جا سکتی ہے۔

امرت کایا کلپ امیری (نمبر ۴)

یہ لوگ کسی بھی اوپر کی اکسیر کے ساتھ یا اکیلے اس اکسیر کو استعمال کریں۔ تو یہ ان کے واسطے بہترین فوائد رکھتی ہے۔ اس کایا کلپ میں جواہرات کے کشتہ جات ہیں۔ اس کے کھانے والا تمام امراض سے محفوظ رہتا ہے۔ اور بڑی عمر پاتا ہے۔ اور بڑھاپے تک جوانی کا لطف اٹھاتا ہے۔ ہر کام میں چستی رہتی ہے۔ دل۔ دماغ۔ جگر۔ گردہ۔ مثانہ۔ اعضائے رئیسہ کو خاص طاقت حاصل ہوتی ہے۔ وسواس۔ وہم۔ دل کی دھڑکن۔ خفقان۔ جنون۔ وغیرہ۔ دماغی یا قلبی امراض دور ہوتی ہیں۔ خون۔ گوشت۔ ہڈی۔ ویریہ۔ بڑھتا ہے۔ مرد توانا۔ دبلے۔ اور موٹے سڈول جسم ہوتے ہیں۔ نیا لہو پیدا ہوتا ہے۔ حافظہ بڑھتا ہے۔ روشنی چشم زیادہ ہوتی ہے کانوں کے سننے کی طاقت۔ زبان کے چکھنے کی طاقت اور ناک کے سونگھنے کی طاقت ٹھیک رہتی ہے۔ پرانا بخار اور تپ دق جاتا رہتا ہے۔ غرضیکہ جسم کندن کی طرح ہو جاتا ہے۔

قیمت اس کی بھی محنت اور اجزاء کے خیال سے بہت تھوڑی رکھی ہے۔

سات گولی ایک روپیہ (عہ)، چالیس گولی پانچ روپیہ ۸۰ گولی ۹ روپے۔

المشتہر

ٹھاکر دت شرما وید مالک امرت دھارا لاہور

دو بڈھے مردوں کی جوان دوستی

اور

ایک حریص دولتمند کی بڑھتی ہوئی ہوس

ہندوستان کے ترقی پسند ڈائرکٹر شانتارام کے تازہ ترین فلم

پڑوسی

کا

موضوع ہے

ظاہر ہے کہ فلم ہر نقطۂ نگاہ سے بلند ہوگا

خاص اداکار:۔ مظہر خاں۔ انیس، جاگیردار، بلونت اور شانتا معظمدار

بہت جلد آپکے شہر میں پیش ہوگا

نمائش کار:۔ فیمس پکچرز لمیٹڈ۔ دہلی۔ مدراس۔ بمبئی

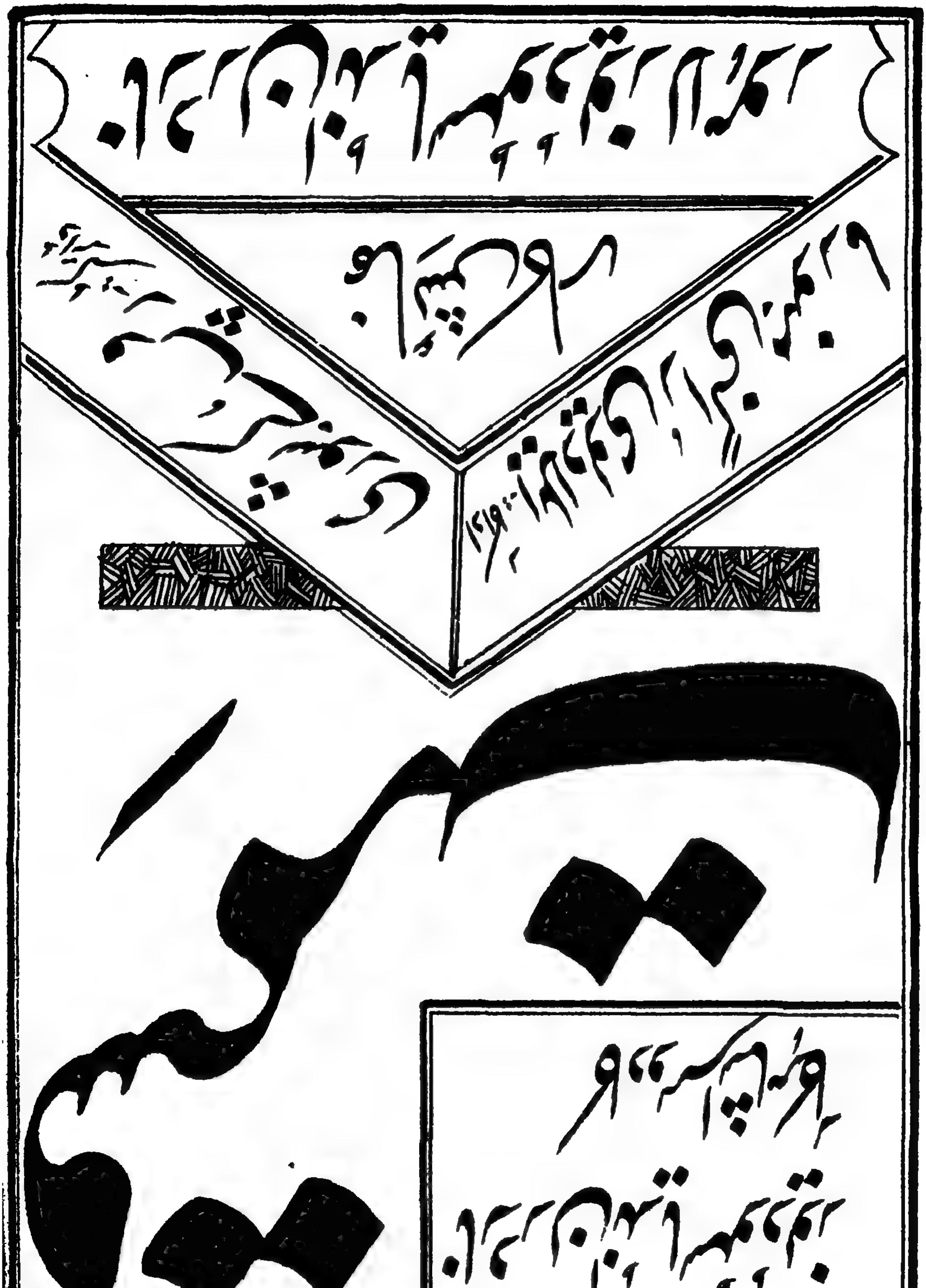

پوسٹ بکس نمبر ۲۲

قائم شدہ سنہ ۱۹۰۳ء

فولادی

رستم کو رستم زماں بنانے والی اکسیر

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی بیاض کا نادر نسخہ

جسے عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب رئیس اعظم

جدید سائینٹفک طریقہ پر ترمیم کرکے سہل الاستعمال اور پُراثر بنا دیا ہے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب مرحوم نے سیاحت عالم کے دوران میں ایک عجیب وغریب نسخہ کا پتہ لگایا۔ جو

رستم وسہراب کی طاقت کا ضامن ہے

اور سلاطین اعظم کی لاثانی قوت کا موجب تھا۔ اجمل خان اعظم نے اس نسخہ کے نادر اجزا سے ایک معجون تیار کی۔ یہ نواب صاحب رامپور اور مہاراجہ پٹیالہ کی پسندیدہ معجون تھی جو اکثر والیان ریاست کے استعمال میں رہی مسیح الملک حکیم جمیل خانصاحب رئیس اعظم نے اس معجون کو جو صرف رؤسا کے لئے خاص طور پر تیار ہوتی تھی۔ جدید اصول پر ترتیب دے کر زیادہ پُراثر بنا کر قرصوں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اور رفاہ عام کے لئے ہندوستانی دواخانہ کو مرحمت فرمادی۔ اب یہ

فولادی قوت پیدا کرنے والی اکسیر

جو قوت باہ کی لاثانی دوا ہے۔ اعضائے رئیسہ میں حیرت انگیز قوت وتوانائی پیدا کرتی ہے۔ اعصاب کو طاقتور بناتی ہے۔ بدن میں قوت۔ دل میں جوش جسم میں چستی اور چہرہ پر رونق پیدا کرتی ہے۔

سال نو کا لاثانی تحفہ

فولادی ہے۔ جو زندگی۔ طاقت۔ ولولہ اور جوش سب کچھ ہی پیدا کرتی ہے۔ اس سے جوانی کی امنگیں از سر نو پیدا کی جاتی ہیں۔ اس کے چند روزہ استعمال سے بوڑھے بھی جوان ہوجاتے ہیں۔

قیمت:۔ فی قرص دو آنے (۲؍) پندرہ یوم کی مکمل خوراک ۳۰ قرص کی سربند شیشی ۴؍ صبح دو قرص دودھ کیساتھ کھلائے جاتے ہیں

مینیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام چودہری برکت علی پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر ادب لطیف سرکلر روڈ لاہور سے شائع ہوا

آبگینے

اختر انصاری ... ... ایک روپیہ

یہ قطعات دنیا کی حسین ترین رومانی شاعری میں شمار ہونے کے لائق ہیں ۔ تمام نقادان سخن اس امر پر متفق ہیں کہ اختر کی یہ دل افروز جذباتی شاعری اپنی جدت طرازی، اچھوتے پن، البیلے انداز اور مغربی اسلوب کے اعتبار سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ نزاکت تخیل، شدت احساس، صداقت جذبات، حسن بیان، اثر انگیزی اور وجد آفرینی ان قطعات کی نمایاں خصوصیات ہیں *

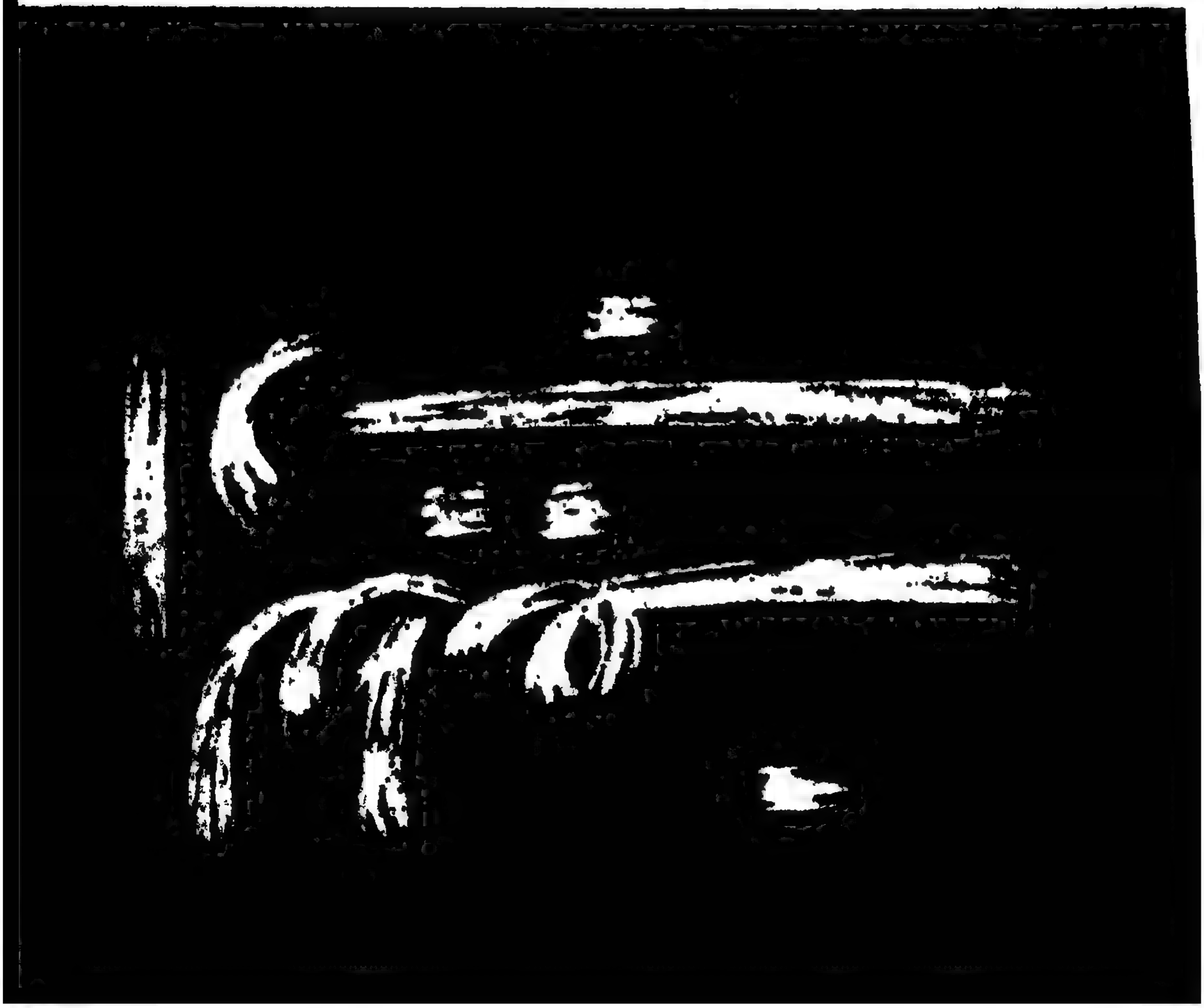

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اشارات

لاہور کی ادبی محفلیں نسبتاً سونی ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ کلی طور پر موسم کی شرارت نہیں بلکہ یہ ہے کہ یہاں سے حسرت صاحب، کرشن چندر صاحب اور چند ایک اور ادیب دہلی انتقال فرما گئے ہیں اور چند انتقال فرمانے والے ہیں۔ دہلی کے چمبک پتھر نے بمبئی کے [illegible] کو بھی کھینچ لیا ہے۔ اور اب منٹو صاحب بھی دہلی میں رونق افروز ہیں۔ اسلئے ہمیں دہلی کی محفلوں سے بجا طور پر حسد ہے۔ بہت مدت بعد ان لوگوں کی کوئی نہ کوئی خبر ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ کرشن چندر صاحب کرشن چندر ہی نہیں بلکہ کرشن چندر ایم اے ہیں اور انہیں یقین ہو رہا ہے۔ کہ وہ اس دنیا میں محض ایک بلبلے کی حیثیت رکھتے ہیں" اور بقول سعدی ؎

تاکی ایں باد کبر و آتش خشم * شرم بادت کہ قطرۂ آبی

پھر ابھی ابھی جناب احمد علی نے جنگ اور ادیب کے عنوان سے نیا ادب، میں مضمون لکھا ہے۔ جس میں بتایا ہے کہ اس جنگ نے تمام ترقی پسند مصنفین کو عجب گو مگو میں ڈال دیا ہے۔ ان میں سے بعض کا تو خیال ہے کہ فاشیت کے خلاف انگریزوں کی امداد کرنی چاہیئے چنانچہ اسی لئے ہیرلڈ نکلسن اور ولیم پلومر نے، اگرچہ (سرکاری) ملازمت تو نہیں کی تاہم ریڈیو اور اخباروں کے ذریعہ اس بات کا اعلان شروع کر دیا ہے۔ کہ ملک کو فاشیت اور حملہ سے بچانے کے لئے حکومت کی مدد کرنی چاہیئے۔ بہت سے وہ مصنف بھی جن کی سیاسیات جنگ سے پہلے انقلابی تھیں۔ اب حکومت کا ساتھ دینے لگے ہیں۔ اسکی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہت سے ادیب روس اور جرمنی کے معاہدہ کے بعد اشتراکیت سے برگشتہ خاطر ہو کر سیاسیات سے علیحدہ ہو گئے۔ مثلاً جان سٹریچی، سٹیفن سپنڈر

کرشن چندر نے اس مضمون کو دوبارہ سہ بارہ پڑھا ہے۔ اور ان کے خیال کے مطابق اگر آلڈس ہکسلے کے سے بیدار مغز آدمی نے امریکہ جا کر یوگ کی مشق شروع کر دی ہے۔ تو انہیں دہلی جا کر یہ کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا کہ انسان پانی کا بلبلا ہے وغیرہ۔ . . . . اور وہ ادب لطیف کے لئے لکھیں بھی تو کیا خاک لکھیں؟

دوسری طرف سعادت حسن منٹو سومرسٹ ماہم (SOMERSET MAUGHAM) پر دل و جان سے فدا ہیں۔ اور حسرت صاحب حیران ہیں کہ چونکہ انہوں نے اس نام کا مصنف نہیں پڑھا اسلئے وہ ادیب کہلانے کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ بارے کچھ لے دے کے بعد منٹو اور حسرت صاحب میں تصفیہ ہو جاتا ہے۔ اور آخر فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم (حسرت صاحب) بھی سومرسٹ ماہم ہیں۔ اور آپ (منٹو) بھی سومرسٹ ماہم ہیں" اور سامان اکل و شرب کے اردگرد سب سومرسٹ ماہم ہیں۔ . . . . .

—— پرانے دیئے گرتے ہیں اور نئے دیئے ان کی جگہ لیتے ہیں

مغرب کی لیبارٹری میں جو تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اس میں استعمال کیا جانیوالا تیزاب بہت تیز (EFFERVESCENT) ہے اور ہمیں امید ہے۔ نتیجہ جلدی ظاہر ہو جائیگا اور مصنفین کو دماغی سکون میسر ہو سکے گا۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم جنگ کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ یا مغرب ہی ہمارے فیض کا سرچشمہ ہو؟

سالنامہ ادب لطیف، کے متعلق ہمیں ابھی تک توصیفی خط موصول ہو رہے ہیں۔ ادبی حلقوں نے سالنامہ کی سادگی، ترتیب و تدوین کو پسند کرتے ہوئے ہماری ہمت کو سراہا ہے جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ لیکن سالنامہ کے متعلق ہمیں آج تک ایک بھی تنقیدی خط نہیں موصول ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ توصیفی خط کی نسبت تنقیدی خط کی ضرورت اسلئے زیادہ ہوتی ہے کہ آئندہ پرچوں میں نقائص کا اعادہ نہ ہو سکے۔

'ادب لطیف، کا موجودہ سرورق سردار جسونت سنگھ کے موقلم کا رہین منت ہے۔ اور اس کی سادگی اور خوبصورتی کے سبب اسے احباب نے بہت پسند کیا ہے۔ 'آبگینے'، 'رنگ و بو'، 'پروانہ لق لق' اور مکتبہ اردو کی دوسری کتابوں کے سرورق سردار صاحب ہی کے ذوق سلیم کا نتیجہ ہیں۔ آپ ایک نوجوان فنکار ہیں۔ لیکن آپ ابھی سے عامیانہ اور بازاری چیز سے بہت بلند ہیں۔ ہمیں توقع ہے۔ کہ آپ کمرشل آرٹ میں بہت ترقی کریں گے

مکتبہ اردو سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کے نام ہیں 'نئے زاویئے'، 'کمپنی کی حکومت' دوسرا ایڈیشن، اور راشد کی نظمیں بعنوان 'ماورا'۔

'ادب لطیف، کا مئی کا پرچہ افسانہ نمبر ہوگا۔ ابھی سے اچھے اچھے افسانے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اہل قلم حضرات سے درخواست ہے۔ کہ وہ اپنے افسانے ابھی سے بھیج دیں۔ تاکہ ترتیب میں آسانی رہے۔

ادارہ

سیّد برکات احمد

وفاقِ عالم

ایک نئی تجویز اور اُس کا تجزیہ

خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا۔
سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز رہے۔ اسلئے اُس کا نام بابل ہوا کیونکہ
خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبانوں میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے
خداوند نے اُنکو تمام روئے زمین پر پراگندہ کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پیدائش ۹/۱۱

مینار بابل کا واقعہ تو آپ کو یاد ہو گا؟ — دنیا کے رہنے والوں نے سوچا۔ کہ ایک بہت اونچا مینار تیار کیا جائے۔ خیال کا آنا تھا کہ کام شروع کر دیا گیا۔ اللہ میاں کو یہ بات کب پسند آتی! اُنہوں نے اسی وقت سب انسانوں کو پراگندہ کر دیا۔ اور سب کی زبانیں مختلف کر دیں — اوس دن سے اب تک انسان متحد اور متفق ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

اتفاق و اتحاد کی کوشش اور معیار حکومت کو بلند کرنے کی سعی ہمیشہ ہی جاری رہی۔ افلاطون کی "ریاست" ارسطو کی "سیاست" طامس مور کی "اٹوپیا" ( ) سوفیٹ کی سلطنت، اینجلز اور مارکس کا "سرمایہ" اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ بدھ مت، مسیحیت اور اسلام نے معیار انسانیت کی بلندی اور اتحاد کے لئے جو کوششیں کی ہیں۔ اسکے نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں۔

انسان؟ — کیا یہ مدنی الطبع جانور کبھی متحد ہو سکے گا؟ کیا کبھی افلاطون اور مور کی خیالی حکومتیں جامہ عمل پہن سکتی ہیں؟ یہ سوال پھر ایک بار دنیا کے کئی حصوں میں دوہرایا جا رہا ہے۔

کہیں کہیں سے آوازیں اُٹھیں "اشتمالیت، اشتراکیت، مگر کیا تیسری انٹرنیشنل کی ناکامیابی۔ اور ٹراٹسکی کی موت کے بعد یہ جواب دیا جا سکتا ہے؟ لوگ مشکوک سے نظر آتے ہیں۔

امریکہ سے بھی ایک جواب دیا گیا۔ اور کچھ برطانوی اور فرانسیسی حلقوں نے اسکی تائید بھی کی
"وفاقِ عالم" — یہ تھا جواب
لوگ پوچھتے ہیں یہ نئی چیز کیا ہے؟ "وفاقِ عالم"؟ یہ نام تو اُنہوں نے پہلے نہیں سُنا۔

جس طرح فرقہ وارانہ اختلافات اور ذات پات کا فرق کسی ملک اور قوم کی ترقی میں روک ہوتا ہے۔ اسی طرح قوموں اور ملکوں کے اختلافات رنگ و نسل کا امتیاز انسانی ترقی میں ایک بڑی روک ہے۔ ہمیں ہندوستانی اور امریکن، جاپانی

اور جرمن کہلانے کی بجائے اپنے آپ کو صرف انسان کہلانا چاہیئے۔ اور اگر ہم سب انسان ہیں۔ تو پھر ہماری حکومت بھی ایک ہونی چاہیئے

جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے۔ یہ بہت پرانا ہے۔ یہودی تو اس قسم کی ایک آسمانی بادشاہت کے عرصے سے منتظر تھے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ انہوں نے اسے مذہبی رنگ دے کر اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ اسکے بعد سینٹ پال نے بھی اسی پیغام کی اشاعت کی۔ اور مسلمانوں نے بھی اخوت و مساوات کے نام سے اس کی تبلیغ کی۔ مگر موجودہ شکل میں اسکا وجود شاید جنگِ عظیم کے بعد ہوا۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے انسان کو دعوت فکر دی۔ اور پریذیڈنٹ ولسن نے جمعیۃ الاقوام کے نام سے اس تجویز کو پیش کیا۔ مگر یہ بے چاری جمعیۃ آخر میں کفن کھسوٹوں کی انجمن بن گئی۔ اور یہ تجربہ بری طرح ناکام رہا — موجودہ جنگ نے پھر لوگوں کی توجہ اس طرف پھیری ہے۔ اور اب ہمارے سامنے وفاقِ عالم کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

ریاست کا کوئی نظام جب تک مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک کے اس میں بیکاری کو دور کرنے کے وسائل، اقتصادی مشکلات کا حل، شخصی آزادی، بدامنی کا انسداد، بیرونی حملوں سے بچاؤ، تمدن کی حفاظت اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے طریقے شامل نہ ہوں

موجودہ وفاق کا نقشہ بھی اسی خاکہ پر تیار کیا گیا ہے۔

بہرحال تفصیل میں پڑنے سے قبل ایک بات جان لیجیئے۔ اور وہ یہ کہ دنیا کی حکومتوں کے ایک مرکزی نظام سے الحاق کا نام وفاقِ عالم ہے۔ اس نظام سے ملحق ہر ایک ریاست داخلی معاملات میں آزاد اور خود مختار ہوگی۔ مگر نہ تو فوج رکھ سکے گی اور نہ اُس کی کوئی خارجی حکمتِ عملی ہوگی۔ نہ اسے کسی وفاقی ریاست کے سامان کی درآمد پر محصول لگانے کا اختیار ہوگا

اور نہ ریاست جمہوری دستور کے خلاف چلے گی۔ انفرادی آزادی اور شخصی حقوق کے سلب کرنے کا اختیار بھی اسی ریاست کو نہ ہوگا۔

کیا یہ قابلِ عمل ہے؟

اس نظام پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہو سکتا ہے۔ کہ کیا یہ تجویز کبھی قابلِ عمل ہو سکتی ہے؟ اور کیا مختلف اقوام مختلف فرقے، مختلف تمدن اور معاشرت کے لوگ ایک ساتھ اس نظام کے ماتحت رہ سکتے ہیں۔ کیا معاشرت کا فرق، جغرافیائی حالات اس میں روک نہ ہونگے؟

اعتراض بظاہر معقول اور وزنی معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ اعتراض وفاقی نظام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ وفاقی نظام سے ملحق ہر حکومت آزاد ہوگی۔ اور ملک اپنی زبان، اپنی معاشرت تہذیب۔ تجارت اور تمدن کا مالک ہوگا۔ اس مرکزی نظام کا مقصد ہرگز لوگوں کو ایک تمدن۔ ایک تہذیب اور ایک ہی معاشرت دینا نہیں۔ بلکہ یہ تو صرف اتنا چاہتا ہے۔ کہ دنیا میں امن اور انفرادی آزادی کو قائم کیا جائے۔

اعتراض کا پہلا حصہ کہ یہ کہاں تک قابلِ عمل ہے۔ قائم رہتا ہے۔ کیا یہ نظام بھی صرف ایک نظری تخلیق ہی نہیں؟ کیا یہ بھی مور کی اٹوپیا ہی نہیں —؟

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا وفاقی نظام اس اعتراض کا عملی جواب ہے۔ امریکہ کے وفاقی نظام سے دو سال قبل [illegible] میں طامس پائن (اسی نظام کے بنانے والوں میں سے ایک اہم ہستی) نے لکھا تھا۔ کہ "اتنے مختلف الخیال، مختلف المذہب مختلف تمدن اور معاشرت کے پیرو اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں کا ایک ایسے نظام میں بندھ جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے" — مگر کیا اب بھی کوئی اس امریکی نظام کو ناقابلِ عمل ناممکن اور ناکامیاب کہہ سکتا ہے؟

آج کل کوئی ایسی نئی نفسیاتی ۔ سیاسی یا معاشرتی شکل نہیں ۔ جو ۱۷۸۷ء میں امریکہ کے سامنے نہ تھی۔

یہ نظام تو دراصل اس لئے ہے کہ مختلف قوموں اور ملکوں کو آپس میں لڑنے سے باز رکھا جائے ۔ ایک ایسی آزاد تجارت قائم کی جائے جو حفاظتی محصول ،، اور چنگی سے مستثنیٰ ہو اور جو منافع کی صحیح روح کو قائم رکھ سکے ۔ وہ تمام روپیہ جو محکمہ محصول فوج اور وزارت خارجہ پر خرچ کرتا ہے ۔ اگر ملک کی فلاح اور بہبود پر خرچ کیا جائے ۔ تو اُس ملک کے لوگوں کا معیار زندگی کتنا بلند ہو جائیگا ؟ اگر دنیا میں جنگیں اسی طرح ہوتی رہیں تو وہ تمام تہذیب ۔ تمدن جو انسانیت کا ہزاروں سال کا سرمایہ ہے ۔ بالکل ختم ہو جائیگی ۔

ایک اور اعتراض ہوتا ہے ۔ کہ کیوں نہ اسی مقصد کے لئے اشتراکی نظام قائم کیا جائے ؟ اس اعتراض کے تین حصے ہیں ۔

(ا) جنگ سرمایہ داری کی وجہ سے ہوتی ہے ۔ اس لئے جنگ سے بچنے کا بہترین اور صحیح طریقہ یہ ہے ۔ کہ سرمایہ داری کو ختم کیا جائے ۔

(ب) اگر ایسا وفاقی نظام قائم کر دیا گیا ۔ تو انقلاب مشکل ہو جائیگا اور سماجی اصلاح بھی ناممکن ہو جائیگی ۔

(س) ایسا وفاقی نظام سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دنیا اور متوسط طبقہ پر ظلم کرنے کا ایک آلہ بنکر رہ جائیگا ۔

اعتراض کے پہلے حصے پر غور کرتے وقت یہ دیکھنا پڑیگا ۔ کہ آیا لڑائی کی وجہ سرمایہ داری ہے ۔ یا کچھ اور — سر نارمن اینجل نے جو لڑائی کا نظریہ قائم کیا ہے ۔ وہ آسانی سے غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ اور اُن کا یہ خیال کہ لڑائی کی وجہ حکومتوں کی طاقت اور طاقت کی ہوس اور اُسکی حفاظت کا خیال ہے ۔ ہر حکومت اپنا اقتدار منوانا چاہتی ہے ۔ اور اپنے آپ کو ممتاز کرکے اپنے لئے وہ حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے ۔ جو اور حکومتوں کو حاصل نہ ہوں ۔ طاقت کی ہوس صرف جذبات کی آسودگی کے لئے ہوتی ہے ۔ سرمایہ اس کی وجہ نہیں ہوتا ۔ بہرحال اگر یہ مان بھی لیا جائے ۔ تو کیا ہر ایک حکومت اشتراکیت قبول کرے گی ۔ وفاقی نظام صرف جمہوریت اور انفرادی آزادی چاہتا ہے ۔ مگر اشتراکیت کے مطالبات بہت زیادہ سخت ہیں — کیا انہیں کوئی حکومت قبول کرے گی ؟ یقیناً یہ ماننا پڑے گا ۔ کہ دنیا میں اشتراکیت کا نظام پھیلانے کی نسبت وفاقی نظام کا قیام کرنا آسان ہے ۔ اشتراکیت ایک تبدیلی چاہتی ہے ۔ اور بہت بڑی تبدیلی نہ صرف ہمارے طرز حکومت میں بلکہ ہماری عادتوں میں خصلتوں میں سوچنے اور غور و فکر کے طریقوں میں اور محسوسات میں ۔ غرضیکہ مکمل زندگی میں ایک انقلاب چاہتی ہے ۔ کیا یہ آسان کام ہے ؟ اسکے بالمقابل وفاقی نظام اس قسم کی تبدیلیاں نہیں چاہتا ہر شخص کو آزادی دیتا ہے ۔ اور ہر قوم اس میں آزادی کے ساتھ اپنا تمدن ۔ معاشرت اور سماجی نظام رکھ سکتی ہے ۔

(ب) انقلاب دو طرح ہوتا ہے ۔ یا تو عوام میں ان کی تکالیف اور مشکلات کی ترویج و اشاعت کی جائے اور اُن کے جذبات کو اتنا ابھارا جائے ۔ کہ اسکے ذریعہ انقلاب ہو جائے ۔ جیسے روس میں ہوا ۔ یا پھر حالات خود اتنے ناقابل برداشت ہو جائیں ۔ کہ لوگ زندگی سے بالکل مایوس ہو جائیں ۔ زندگی میں اُنکے لئے کشش باقی نہ رہے ۔ بھوکے مرنے لگیں ۔ اور انسانی آسائشوں سے بالکل محروم کر دیئے جائیں تب انقلاب ہو سکتا ہے ۔ انقلاب فرانس اس کی مثال موجود ہے ۔ اگر ایسے ناقابل برداشت حالات وفاقی نظام میں پیدا نہ ہو سکیں ۔ تو گویا یہ تو وفاقی نظام کی تعریف ہوئی نہ کہ خرابی — رہی سماجی خرابی تو اُس کا راستہ کھلا ہے — وفاقی نظام نہ تو کسی ایسی تحریک کو روکتا ہے ۔ اور نہ اُسکی کسی طرح سے

حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

(س) کیا حقیقتاً یہ نظام سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں عوام پر ظلم کرنے کا ایک آلہ ہوگا؟ یہ اعتراض حقیقتاً سب سے زیادہ غیر معقول ہے — وفاقِ عالم کے دستور میں سب سے پہلی چیز "انسانی حقوق کا منشور" ہے۔ اسکے گیارہ نکات دراصل انسانی آزادی کا سب سے بڑا معاہدہ ہیں۔ یہ منشور دراصل میگنا کارٹا، بل آف رائٹس اور ہیبس کارپس کا نچوڑ ہے۔ پچھلے دنوں ٹائمز میں کچھ مراسلات شائع ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک مراسلہ ایچ۔ جی۔ ویلز کا تھا۔ مسٹر ویلز نے انسانی حقوق کا ایک منشور پیش کیا تھا۔ اور مناسب ہوگا۔ اگر اُس کا بھی اسی مضمون میں تذکرہ کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ منشور وفاقِ عالم کے موجودہ دستور میں شامل نہیں۔ لیکن اگر یہ بہتر ہو تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ اسے دستور میں شامل نہ کر لیا جائے۔

منشور یہ ہے:۔

۱۔ ہر شخص کو بلا رنگ و نسل کی تخصیص کے کھانے کپڑے راحت و آرام اور صحت برقرار رکھنے کی تمام آسائشیں حاصل کرنے کا پورا حق ہوگا

۲۔ اسے ایک اچھا شہری بنانے کے لئے معقول تعلیم دی جائے گی۔ اوسے ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

۳۔ اُس کی تمام جائداد اور ملکیت جو اُس نے جائز طریقے سے حاصل کی ہے۔ بالکل محفوظ رہے گی۔

۴۔ ہر شخص کو جائز نکتہ چینی اور تنقید کا حق حاصل ہوگا لیکن کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے متعلق جھوٹی باتیں ہتک آمیز فقرات۔ یا اس قسم کی اور تکلیف دہ باتیں نہ کر سکیگا حکومت کے دفاتر میں کسی شخص کے متعلق ایسی خفیہ تحریریں اور ریکارڈ نہ ہونگے جنہیں وہ دیکھ نہ سکے۔ اگر اُن کی صداقت میں شبہ ہو تو اسے ان تحریرات کے ثبوت طلب کرنے کا حق ہوگا — یہ تحریریں کسی مقدمہ میں بلا ثبوت کے کام نہ آسکیں گی

۵۔ اوسے ہر قسم کا کام کرنے کی اجازت ہوگی۔ اور کام کی نوعیت کے لحاظ سے پوری اُجرت وصول کرنے کا حق ہوگا۔

۶۔ وہ دنیا کے ہر حصے میں آجا سکے گا۔ پاسپورٹ اور ویزا کی قیود سے آزاد ہوگا۔ لیکن اسکا گھر اوسکا محفوظ قلعہ ہوگا جس میں کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔

۷۔ اُسے دنیا کی ہر جائز چیز بیچنے اور خریدنے کا حق ہوگا لیکن وہ کوئی چیز اتنی بڑی تعداد میں خرید و فروخت نہیں کر سکتا۔ جس سے اوروں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

۸۔ کسی کو تین ہفتہ سے زیادہ بلا جرم بتائے قید نہیں کیا جاسکے گا — اور کوئی شخص بلا سماعت تین مہینہ سے زیادہ قید نہیں کیا جاسکے گا۔

۹۔ کسی آدمی کے ناک، کان یا اعضا نہیں کاٹے جائینگے اُسے سارا پیٹا نہیں جاسکتا۔ یا اور کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچائی جاسکتی۔ نہ قید تنہائی میں رکھا جاسکتا ہے۔ اور نہ اس قسم کی کوئی اور ذہنی تکلیف پہنچائی جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ سزائے قید پندرہ برس بامشقت یا پھانسی کی سزا ہوگی۔

۱۰۔ یہ تمام حقوق باقاعدہ ایک قانون کی صورت میں تبدیل کرئے جائیں گے۔ اور اس قانون کی خوب اچھی طرح اشاعت کی جائے گی۔

وفاقی نظام کا دستور

آئیے اب اسکے دستور پر نظر ڈالیں۔ وفاقی نظام کے تمام ممالک اپنی حکومت جمہوری نظام کے ماتحت سنبھالیں گے۔ داخلی پالیسی انکے ہاتھ نہیں ہوگی — وفاقی ممالک کے تمام باشندے ہر ملک میں بلا پاسپورٹ آجا سکینگے۔ جہاں چاہیں رہ سکتے ہیں ان ممالک کے درمیان میں تجارت آزاد ہوگی۔

[illegible] — ١٣٦٦ — [illegible]

[illegible]

[illegible]

مسعود احمد قریشی

فیض کی شاعری

قدرت نے ہر زندہ چیز میں بڑھنے اور پھولنے پھلنے کا مادہ ودیعت کیا ہے۔ دراصل پھولنا پھلنا ہی زندگی ہے۔ اور اس سے عاری گویا موت کی نشانی ہے۔ اردو زبان بھی ایک جیتی جاگتی زبان ہے۔ اور چونکہ ابھی عالم شباب میں قدم رکھ رہی ہے۔ اس میں بڑھنے کا مادہ دنیا کی اور زبانوں کی طرح موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہر لمحہ اسکے رنگ روپ پر ایک نئی کیفیت نظر آتی ہے۔ ہم اس کیفیت کو ابھی اچھی طرح سمجھ کر اسکو کوئی نام بھی نہیں دینے پاتے۔ کہ ایک اور تبدیلی پیش نظر ہوتی ہے۔ اردو ادب اور پھر خاص طور پر شعری ادب تیزی سے اپنی تکمیل کے لئے سوئے منزل رواں ہے۔ اگر ادیب ذرا بھی قدامت پسند واقع ہوا ہو۔ تو اسکے دوران حیات ہی جب اسکے حسن کو ایک تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے تو اپنے متین ناز و انداز دیکھ کر وہ خود ہی جھینپا سا ہو جاتا ہے اور ناپ تول باتیں کرنے سے جھجک کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ موجودہ دور ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے ایک جداگانہ دور ہے۔ معنوی لحاظ سے بہ زیادہ مختلف ہے۔ ادب کا بنیادی تصور ہی بدل چکا۔ اور اس انقلاب میں جس مشاطہ کا ہاتھ بالکل نمایاں طور پر نظر آ رہا ہے وہ نظریہ اضافیت ہے۔ اس نظریے نے صرف اس کی آرائش و زیبائش کو ہی نظر فریب نہیں بنایا۔ بلکہ عملی جراحی سے اس کے خد و خال تک کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ نظریہ آئین سٹائین کا نظریہ اضافیت نہیں۔ بلکہ زندگی کے ناقد کا اضافی نظریہ ہے۔ جو ہر شے پر حاوی ہے۔ زمانہ سلف میں تو ہر شے کا تصور مطلق تھا۔ یعنی ہر شے اپنے اپنے ماحول میں بالکل آزاد تھی دوسرے لفظوں میں فن برائے فن کا نظریہ اُن ادیبوں کی اختراع تھی جو بزدلی اور پست ہمتی کی وجہ سے زندگی کے تلخ حقائق کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اسلئے گریز پر مائل ہوئے۔ اور ادب کو زندگی سے بالکل علیحدہ کر کے اس کی حسین خوابگاہوں میں پناہ لینے لگے۔ اس نظریے کو کم ہمت ادیبوں میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ اور اگر کسی شاہین جگر ادیب نے کبھی اسکے خلاف آواز اٹھائی بھی۔ تو گدھوں کے اس گروہ نے اپنی مکروہ چیخوں سے اُس کی آواز کو بالکل دبا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا پرانا ادب ایک حد تک بے جان، ناکارہ، اور دماغی عیاشی بن کر رہ گیا۔ ملک اور قوم تو کیا خود ادیب اس سے بیگانہ تھا۔ یہاں تک کہ عشق و حسن کے تمام قصے بھی بالکل فرضی اور متصنع تھے۔ اور اس داغ سے کسی میر، سودا، ذوق یا غالب کا دامن پاک نہیں۔ گو یہ چیز بہت تلخ ہے اور ماننے کو دل نہیں چاہتا لیکن حقیقت کو ہم ماننے پر مجبور ہیں۔ آخر یہ پردۂ فریب چاک ہو کر رہا۔ اور اضافی نظر دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی اثر انداز ہوا اب ہر شے اپنی تکمیل کے لئے دوسری شے کی محتاج ہے۔ مذہب سیاست کا محتاج، سیاست اقتصادیات کی، اقتصادیات سماج کی، اور سماج مذہب کی، اسطرح ایک ازلی دائرہ بن چکا ہے۔ اس نظریے کے ماتحت ہمارا ادب بھی انفرادی طور پر ان تمام شعبوں اور پھر ان کے مجموعے یعنی زندگی سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ پرانے ادب اور ترقی پسند ادب میں بنیادی طور پر بڑا فرق یہی ہے کہ جہاں ایک اپنے ماحول میں بالکل آزاد اور الگ تھلگ تھا۔ وہاں دوسرا زندگی سے متاثر ہوتا ہے اور زندگی کو متاثر کرتا ہے۔

اردو شاعری کا موجودہ دور اپنی خصوصیات کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہری لحاظ سے بھی اور معنوی لحاظ سے بھی اس وقت دو بڑے گروہ ہیں۔ دونوں اپنے اپنے نظریوں کا اظہار بڑی شد و مد سے کر رہے ہیں۔ اور اپنی اپنی روش پر قائم رہتے ہوئے مستقبل کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ہمیں اپنی پرانی طرز پر قائم رہتے ہوئے ہی ترقی کی طرف قدم اٹھانا چاہیئے۔ ردیف قافیہ کی پابندی اور اوزان کی قید ویسی ہونی چاہیئے تاکہ ہم اپنے ماضی سے بالکل ہی کٹ کر رہ جائیں۔ اکثریت ابھی تک اسی نظریے کو اپنائے ہوتے ہے۔ یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی ہے۔ زندگی اپنی تکمیل کے لئے ہر وقت تغیر پذیر رہتی ہے۔ لیکن بڑے بڑے انقلاب پسند دماغ بھی بشرطیکہ اُن کا مقصد تعمیری ہو۔ ماضی سے یک لخت قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ماضی کے بغیر مستقبل ایک بے معنی سی چیز ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ ماضی اور مستقبل حال کی کڑی کے ذریعے ایک ہی سلسلے میں منسلک نظر آئیں۔ اور اس طرح ماضی اپنا زور سا ور زندگی مستقبل کی نذر کرتی رہے دوسرا گروہ ان پابندیوں سے یکسر بے نیاز ہو کر شاعری کو مغربی طرز اور نئی نئی روشوں پر ڈالنے کے لئے تلا ہوا ہے۔ اور اسی عمل یہ تحریک پھر بڑے زور شور سے اٹھی ہے۔ معنوی لحاظ سے بھی یہی دو گروہ ہیں۔ پہلا گروہ کہتا ہے۔ کہ حسن و عشق کی دنیا کا اس دردکی ماری دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اُس دنیا کے خالق اور نقیب یعنی شاعر کو بھی اس دنیا کی کشمکش سے بے نیاز رہ کر اپنی مخصوص آواز میں پیغام لغاد دیتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ دنیا اس کشمکش سے اُسی وقت نجات پا سکتی ہے۔ جب وہ ان لافانی نغموں کو اپنا راہبر بنائے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے۔ کہ ہمیں ہر ہر لفظ سے یہ ظاہر کر دینا چاہیئے۔ کہ ہم اسی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ اور اس کی تقدیر بنانے اور اسکو صراطِ مستقیم پر چلانے کے اتنا ہی ذمہ دار ہیں۔ جتنا کوئی اور بلکہ سب سے زیادہ۔ اُس کے دکھوں کو دور کرنے کے لئے ہمیں کوئی تخیلاتی نہیں۔ بلکہ حقیقی راستہ تلاش کرنا ہے۔ فیض ان دونوں گروہوں کے درمیان رابطائی کڑی ہے۔ وہ پہلے گروہ سے بہت گہرا روحانی تعلق رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے فیض اپنے زمانے کا نمائندہ شاعر ہے۔ کیونکہ ایک ناقد فیض کے کلام سے اس دور کے ادب کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بڑی آسانی سے لے سکتا ہے۔ وہ ردیف و قافیہ کا پابند بھی ہے اور آزاد بھی۔

فیض نے ماضی اور مستقبل کے امتزاج سے اپنے لئے ایک نئی راہ ایجاد کر لی ہے۔ معنوی لحاظ سے اُس کی شاعری اُس انقلاب عظیم کی حامل ہے جو تجسس پسند اور بلند ہمت طبائع کے سینوں میں پرورش پا کر دنیا کو بدل دیتا ہے۔ لیکن ظاہری لحاظ سے مشرق اور مغرب یا ماضی اور مستقبل کا ایک لطیف امتزاج ہے۔ دونوں اپنی اپنی خوبیوں کو لئے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے جاتے ہیں۔ اور ایک زوردار حال پیدا ہو جاتا ہے جو زندگی کی تر و تازگی لئے ہے۔

فیض کے دل میں موجودہ ماحول اور سماجی نظام کے سنہری طلسم کو توڑنے کی آرزو ہمیشہ کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ وہ اس فضا کو یکسر بدل دینا چاہتا ہے جہاں غریب کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہ جذبہ اُسکے دل میں روز بروز ایک شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اُس جذبے کی تلخیوں سے بچنے کے لئے حریم دوست کی رنگین فضاؤں میں کھو جانا چاہتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ اُسکے دل و دماغ پر اس طرح مسلط ہو چکا ہے۔ کہ یہ رنگین فضائیں بھی اُسکے اثر سے مسموم ہو جاتی ہیں۔ اور وہاں ویرانی اور اداسی کے سوائے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اُس کی محبوبہ کی بے بسی کا خیال اُس کو تمام دنیا کی مجبوریوں اور لاچاریوں کی یاد دلا دیتی ہے۔

(LAW OF CONTROST

[illegible] ان دونوں کا آپس میں ایک خاص اور گہرا تعلق ہے یعنی:-

"تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے۔

تجھ پہ برسا ہے اُسی بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے"

اور اس سے بھی بڑھ کر تو اُس کا رازداں ہے جسے ہر بات معلوم ہے۔ شاعر کے لئے رقیب قابلِ پرستش ہو چکا ہے کیونکہ اُس کو وہ مسرتیں حاصل ہو چکی ہیں جن کی تمنا میں ہی اُس کی زندگی مٹ گئی۔

"تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے"

یہاں تک اُن کے ذاتی معاملات تھے۔ جن کی یاد دلا کر وہ رقیب کو اپنا بنا چکا ہے۔ لیکن یہ اُس کی منزل تو نہیں۔ ایک فردِ واحد کی ہمدردی اُس کے لئے کیا وقعت رکھتی ہے۔ وہ تو کاکلِ الفت ہو کر خود کو دنیا کے لئے وقف کر چکا ہے۔ رقیب کی ہمدردی ابھی تک صرف اُس کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اس سے دنیا کو کیا فائدہ اُسے تو دنیا کو سدھارنا ہے۔ اس لئے وہ پہلی کوشش میں کامیاب ہو کر پلٹا کھاتا ہے۔ ذاتی باتوں کو چھوڑ دیتا ہے اور عام انسانی ہمدردی کے جذبات کو تحریک دیتا ہے۔

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

اور وہ احسان کیا ہیں، شاعر نے عشق میں کیا سیکھا ہے؟

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے

زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخِ زرد کے معنی سیکھے

فیض محبت کو ایک بیکار عیاشی اور فضول جذبہ نہیں سمجھتا۔ انسان کی آپس کی محبت بھی اُس کے لئے اتنی ہی اہم، حقیقی اور ضروری ہے۔ جتنے دنیا کے اور اہم مسائل، بلکہ اُن سے بھی زیادہ ضروری۔ وہ اس سایوں کی دنیا میں اس حقیقت کے پرتو سے ان تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ محبت کے غم، خوشیاں، تغیر اور واقعات کے ساتھ اُن کا تعمیری یا تخریبی تصادم اس کے کلام کا بنیادی اور مرکزی عنصر .... ہے۔ وہ اس تصادم اور اس کے نتائج کو ایک عمیق تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے۔ جس میں اُس کی فلاسفی اور گہری سوجھ کی آب ہوتی ہے۔ وہ اس محبت کا پرستار ہے جو ایک بے پناہ خاموش قوت کی مالک ہے۔ جو بزدلوں کی طرح ایک خیالی فردوس کے خواب نہیں دیکھتی۔ جس کی نظریں افق پار کی رنگین دنیا کی تلاش میں سرگرداں نہیں بلکہ اس دنیا کو اپنی دلی خواہشات کے مطابق ڈھال کر اسی کو فردوس بناتی ہے۔ جو اس ماحول سے آزاد ہو کر ایسی فضا کی تخلیق کرتی ہے جو اُس کے قدرتی نشوونما میں ممد و معاون ثابت ہو۔ وہ دنیا کی قسمت بنانے میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ مصروفِ عمل رہتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ افسردہ طبیعتوں کو شاندار مستقبل کی جھلک دکھا کر حوصلہ دیتی جاتی ہے۔ ایسی ہی محبت کی ایک جھلک ہم نسلی میں دیکھتے ہیں۔ جہاں شاعر پہلے اپنی محبوبہ کو اپنے ڈگمگاتے ہوئے آج، کا نقشہ دکھاتا ہے:-

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم

چند روز اور ستم سہہ لیں تڑپ لیں رو لیں   اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

اور یہ ناجائز پابندیاں اس قدر سخت ہو گئی ہیں کہ :-

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں   فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں۔
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں   ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں۔

لیکن وہ مایوس ہونا تو جانتا ہی نہیں۔ اُسے حق کی فتح کا اس قدر پختہ یقین ہو چکا ہے۔ کہ وہ ان پابندیوں کو صرف چند روزہ سمجھتا ہے۔ اور اپنی محبوبہ کو ان الفاظ میں تسلی دیتا ہے۔ اور اپنے عزمِ آہنیں کا اظہار کرتا ہے۔

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں   اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں   ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم   آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

فیض شاعرِ امید ہے۔ وہ ناامید ہونا نہیں جانتا۔ فیض مایوسی کی تاریکیوں میں گھرا ہوا بھی شاعرِ امید اور فریبِ تسلی، کا منتظر رہتا ہے۔ وہ بربادی میں آبادی کا رنگ تلاش کرتا ہے۔ اور اگر ناکام ہو کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کہ بربادی کی تکمیل میں کہاں تک کمی رہ گئی ہے۔ اور جب اُس کو کوئی کسر نظر آ جاتی ہے۔ تو اُس کو کچھ اس طرح اُجاگر کرتا ہے۔ کہ دنیا سچ مچ دھوکا کھا جاتی ہے۔ وہ خود اپنے دل کو بھی فریب میں مبتلا کر لیتا ہے۔

وہ جانتا ہے۔ کہ دنیا خود ہی اپنے بوجھل دکھوں کے نیچے اس قدر دبی جا رہی ہے۔ کہ اُسکے بے پایاں غم کی تاب بالکل نہ لا سکے گی۔ وہ قربانی پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور اس غم کو اپنے دل میں ہی چھپائے رکھنے کی خطرناک سعی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات کا غم نہیں کرتا۔ کہ اُس کا آشیاں جل گیا۔ بلکہ اس بات پر خوش ہے کہ وہ شاخ تو ابھی سلامت ہے جس پر اُسکا آشیاں تھا۔ وہ اس حقیر سی خوشی کو اپنے شاعرانہ اندازِ بیان اور الفاظ کے حسین طلسم میں پابند کر کے اس قدر وسعت دیتا ہے کہ وہ اُسکے بے پایاں غم پر چھا جاتی ہے اور پڑھنے والا محسوس کرتا ہے۔ کہ واقعی شاعر کے پاس ابھی وہ چیز باقی ہے جس پر وہ ناز کر سکتا ہے۔ "رہگذر" میں وہ اپنے محبوب کی جدائی کو بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کسی لاثانی حسن کے کھوئے جانے کے تلخ تاثرات سے امان پانا چاہتا ہے۔ وہ اُس جنتِ ارضی کی ایک جھلک دکھاتا ہے جس میں کبھی بستا تھا۔ کبھی وہ چونک اٹھتا ہے۔ اُس کا دل غم کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔ کیونکہ وہ حسن تو اب خواب ہو چکا۔ وہ اس انکشافِ حقیقت سے پژمردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یک دم ایک تازہ جوش سے اُٹھتا ہے۔ دنیا تو پہلے ہی دکھ درد سے لبریز ہے اُسکے اتنے بڑے غم کو کیسے سہہ سکے گی۔ وہ دنیا کو فریب دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اتنے بڑے غم کو رازداں کی پژمردگی کے خوف سے اپنے دل میں ہی دبا لیتا ہے۔ اس غم میں خوشی کو تلاش کرتا ہے۔ اور دنیا کو اس بربادی کی تکمیل میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے۔ اُسے ڈھونڈتا ہے۔ اور کامیاب ہو کر پکار اٹھتا ہے :-

غرض وہ حسن جو محتاجِ سنگ و نام نہیں   وہ حسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں

ہے اس کی خاک میں کیف شراب شوق ابھی — اور اب بھی رنگ رہی ہے دلفریب حسین
فضا میں نرمی گفتار کی نوائیں ہیں — ہوا میں شوخی رفتار کی ادائیں ہیں
غرض وہ حسن بھی اس جا کا جزو منظر ہے
نیاز عشق کو اک سجدہ گاہ میسر ہے

جنسی احساسات کے لطیف اور نازک تاروں کو ٹٹولنا اور پھر اُن کو پوری طرح قدرت کے ساتھ سنبھالنا اور اُن کے موزوں اور ہم آہنگ نغمات پیدا کرنا فیض کا خاص آرٹ ہے۔ اُس کی تمام تر شاعری فطری جذبات پر کسی نامعلوم پابندی کے خلاف ایک پیہم احتجاج ہے۔ سنگین لیکن مخمل میں لپٹا ہوا۔ وہ بے اختیار بھیانک قہقہے لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اُسے اپنی تمام زندگی میں جو ایک طویل شب فراق کی مانند ہے۔ خوبی قسمت سے وصل کا ایک لمحہ میسر آگیا۔ اُس کی محبوبہ ماضی کی متواتر ناکامیوں اور مستقبل کے خوف سے سہمی ہوئی ہے۔ شاعر کے دل سے ہوک سی اٹھتی ہے:-

آج کی رات سازِ دردِ نہ چھیڑ
اور کل کی خبر کسے معلوم! — دُکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم! — مٹ چکے ہیں حدودِ فردا و دوش
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات — زندگی ہیچ لیکن آج کی رات
آج کی رات سازِ دردِ نہ چھیڑ

اسکے بعد وہ اپنی محبوبہ کو غم ماضی اور فکر فردا کو بھول جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ اُسے اب ماضی کی رنگین شکایتوں اور شکووں کا بھی ذکر گوارا نہیں کیونکہ یہ بھی تو آخر سازِ درد ہی ہیں۔ اور ان کے چھیڑنے سے اس حسین فضا کے مسموم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ یہ دو بند کی مختصر سی نظم میں حُسن کی مسرتیں، حیات کا اختصار، درد و الم کے طویل عرصہ میں خوشی کی ایک لمحے کی چمک نمایاں ہے یہ تمام باتیں اپنی انفرادی حیثیت میں نہیں۔ بلکہ ایک مجموعی کیفیت کی صورت میں اُسکے احساسات پر چھا جاتی ہیں۔ اور یہی وہ کیفیت ہے۔ جو فیض کے فطری حزن و ملال اور احساس ناکامی کے باوجود اُس کا سرمایہ حیات ہے۔

آج کل حزینہ ادب اور خصوصاً حزینہ شاعری کو کوسنا ایک فیشن ہو گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ آجتک اردو شاعری کا متاعِ حیات صرف آنسو اور آہیں ہی ہیں۔ اگر تبسم کہیں نظر آتا ہے۔ تو محض چشم پوشی کے طور پر بالکل مرجھایا ہوا۔ اور بے جان، اور اس کا بڑا سبب بھی ہمارے ادیبوں کا کشمکش زندگی سے گریز ہے یہی وجہ ہے۔ کہ بعض لوگ فیض کے کلام میں بھی سوائے غم پرستی کے اور کچھ نہیں دیکھتے۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ فیض کیا کوئی بھی صاحب عقل الم فرسائی کے اس انداز کا قائل نہیں ہو سکتا۔ کہ روم تو جل رہا ہو اور نیرو اپنی بانسری کی خوش آئند تانوں سے مسحور ہو کر یہ سمجھ لے۔ کہ دنیا بھی اُس کی طرح غم ماندہ سے فارغ ہے۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ دل رو رہا ہو۔ اور شعر اظہار برائے فن کا ورد کئے جائیں۔ جب ماحول ہی افسردہ اور غمناک ہو۔ تو آپ زندگی کے آئینے یعنی ادب کو کس طرح نوچ کر اس سے علیحدہ پھینک سکتے ہیں۔ اور اگر پھینک بھی دیں۔ تو

اس کی قدر و قیمت کیا باقی رہ جائے گی۔ قنوطیت اور غم پرستی اور شے ہے۔ اور احساسِ زیاں و بے کسی لہو گرمانا اور وہ آپ کو
غم پرستی اور گوشہ گیری کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ تو اپنے کلام کا حسین آئینہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جسکو توجہ نواز کرنے کے لئے
ماضی کے نقش و نگار سے مزین کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے آپ کی نظر ان دلکش نقوش پر پڑتی ہے۔ اور آپ ابھی اُن سے لطف اندوز
ہو ہی رہے ہوتے ہیں۔ کہ یک لخت آپ کو اپنی اور پسِ منظر کے طور پر اس بھیانک ماحول کی تصویر اس میں نظر آنے لگتی ہے۔ اور چونکہ
آپ کی نظروں میں پہلے حسین جلووں کا عکس ابھی تک ہوتا ہے۔ آپ کو یہ تصویر اور بھی کریہہ المنظر نظر آتی ہے۔ اور آپ اپنی زندگی کو بھی
اُن حسین نقوش کی مانند دلفریب بنانے پر تل جاتے ہیں۔ اور اس خوفناک پسِ منظر یعنی سماجی نظام کو بھی بدل دینا اپنا فرض سمجھتے
ہیں۔ یہ طلسمی آئینہ ہفت رنگ ہے۔ یکایک آپ کی نظریں امید کی روشنی سے چمک اٹھتی ہیں۔ اور اس آئینے میں ایک حسین مستقبل
کا خاکہ دیکھتی ہیں۔ آپ اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے اپنے خون کی رنگینیاں دینے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اس تمام دوران
میں ایک پیغمبرِ امید اپنے دل کو گرمانے والے ترانوں سے پیہم آپکا دل بڑھائے چلا جاتا ہے۔ اور آپکو کامیابی کی نوید ان الفاظ میں
دیتا ہے۔ "لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔ اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں"
اور اسکے بعد اپنے مستقل ارادوں کو آپ کے بازوئے عمل میں یوں منتقل کرتا ہے:۔

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں — ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم — آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے۔

کیا یہ قنوطیت ہے؟ کیا یہ ہزیمت خوردہ ذہنیت ہے۔ یہ ذہنیت تو خود ان لوگوں کی ہے۔ جو تلخ حقائق کا مقابلہ تو ایک طرف ان
کا ذکر بھی سن کر کانپ اٹھتے ہیں۔ مصیبتوں اور دکھ درد سے گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن آنکھیں بند کرکے یہ سمجھ لینا چاہتے ہیں۔ کہ سب خطرہ
ٹل گیا اور اب مسرت ہی مسرت ہے۔ اور یونہی آنکھیں بند کئے ہوئے اپنی بے روح خوشی کے نغمے الاپے جاتے ہیں۔ وہ غمِ امروز
سے بچنے کے لئے ان اسباب و علل کو جن کا یہ نتیجہ ہے۔ جڑ سے نہیں اکھیڑ پھینکتے۔ بلکہ خواب بیداری میں پناہ لیتے ہیں۔ اور جب کوئی
عرضِ حال سے اُن کے طلسم کو توڑ ڈالتا ہے۔ تو خواہ مخواہ اُس سے الجھ پڑتے ہیں۔

فیض اپنے اس عنصرِ ندرت اور سوز و گداز کے لحاظ سے جن کو اسکے کلام میں ایک ممتاز رتبہ حاصل ہے۔ غالب کے بہت
زیادہ قریب ہے۔ اور کہیں کہیں اس پر چھا بھی جاتا ہے۔ میرے اس اظہارِ خیال سے چند آنکھوں میں حیرت اور بے اعتباری جھلک
پڑے گی۔ کچھ ماتھوں پر تیوریاں پڑ جائیں گی۔ اور بعض متبرک زبانوں سے ایک دو کلمات خیر بھی نکل جائیں گے۔ اور مجھے ان ماضی
پرست اور جذباتی ہستیوں سے پوری پوری ہمدردی بھی ہے۔ لیکن میں اس حقیر سی برہمی کے ڈر سے حقیقت سے اغماض تو
نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی غالب سے عقیدت ہے۔ اور شاید ان تمام لوگوں سے بڑھ کر لیکن اندھی عقیدت کو تو میں سم قاتل سمجھتا
ہوں۔ غالب اور فیض دونوں کی نظر اپنے ماحول اور مستقبل کی طرف ہے۔ لیکن دونوں میں ایک نمایاں فرق بھی ہے۔ جو شاید
زمانے کا اقتضا ہو۔ وہ یہ کہ غالب کے ہاں صرف فسردگی ہے ارادہ اور امید بالکل نہیں۔ اور فیض کے ہاں یہ تینوں چیزیں ہیں بلکہ
دوسری دونوں پہلی پر غالب۔ غالب کے عہد میں مغلیہ شان و شوکت کی شمع بجھتی نظر آتی تھی۔ تخریب جاری تھی۔ تعمیر کا نشان
تک نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرانی یادگاریں مٹتی جا رہی تھیں۔ وہ حالت تھی۔ جیسے کوئی کسی خوشنما پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر سیر کرتا

نکھتا چلا جائے۔ اور گرتا گرتا آخر اُس مقام پر پہنچ جائے۔ جہاں نیچے گہرائیوں میں گر جائے۔ طبیعتوں میں ایک عام بے چینی اور پریشانی بڑھ رہی تھی۔ وہ بے چینی نہیں جو جستجو پر مجبور کر دے۔ بلکہ وہ بے چینی جو ہر موجود اور آئندہ سے بیزار کر دے۔ ذہنیتیں بگڑ رہی تھیں۔ حوصلے پست ہو رہے تھے۔ غالب خود بے پایاں مصائب میں گھرا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اُس نے اپنے درد ناک نغمے بیچ سروں میں بلند کئے۔ لوگ جد و جہد سے پہلے ہی بیزار تھے۔ صرف بہانے کے منتظر تھے۔ یہ نغمے اُن کو راس آئے۔ اور وہ سو گئے۔ غالب کے کلام میں غم پرستی ایک ضروری عنصر ہے۔ اُس کی شاعری ہلکے ہلکے نالے ہیں۔ اگر قہقہے ہیں۔ تو اسقدر رکھوکھلے اور خوفناک جیسے کوئی شدت غم سے دیوانہ ہو کر ہنسنے لگے۔ اور اگر کہیں تبسم ہے۔ تو اسقدر پھیکا جیسے کوئی غمزدہ ساتھیوں کے مجبور کرنے پر مسکرائے۔ لبوں پر پژمردہ مسکراہٹ ہو اور آنکھوں میں آنسو!

فیض کا انداز موضوع سے بالکل ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کے بے جان پیکر میں اپنے قلم کی ایک ہی جنبش سے ایک بے چین روح پیدا کر دیتا ہے۔ ہر لفظ زندہ ہو جاتا ہے۔ اور نظم کے مرکزی تخیل کو اس طرح جذب کر لیتا ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے۔ فیض نے وہ نظم اسی لفظ سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ الفاظ کی محض ترتیب سے ہی وہ ایک طلسمی اثر پیدا کرتا ہے۔ جس سے پڑھنے والا نہیں نکل سکتا۔ وہ لطیف سے لطیف غیر مرئی اشیا اور اس سے بڑھ کر غیر مرئی احساسات کو بھی اس قطعیت سے واضح اور معین تراکیب میں پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والا اُنہیں دیکھتا ہے۔ محسوس کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے۔ جو مصور اپنی تصویر سے بھی نہیں لے سکتا۔ کیونکہ وہاں ہمارا ذہن مصور کی عاید کردہ پابندیوں میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن شاعر ایک لفظ سے ہمارے تصور کے لئے ایک مرکزی نقطہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور پھر ہمارے تخیل کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کہ اُسکے گرد اپنی بساط کے مطابق بلند پروازی کر سکے۔ لیکن ہمیں اُس نقطے کا پابند رہنا پڑیگا۔ کیونکہ مرکز کے بغیر کوئی دائرہ وجود میں نہیں آ سکتا۔

کارلائل لکھتا ہے۔ کہ حقیقی اور فطری شاعر وہ ہے۔ جس میں دیکھنے کی طاقت ہو۔ جو ایک نظر سے اشیا کے دلوں میں اُتر جائے۔ اور کہہ اُٹھے "نگاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود"۔ حقیقی شاعر اپنے منظر کے اس یا اُس پہلو تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اُسکے دل تک اُتر جاتا ہے۔ کارلائل کے خیال کے مطابق کامیاب شاعر کو ایک "دیدۂ بینا" ہونا چاہیئے۔ لیکن میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہونگا کہ اُسے "دل بینا" ہونا چاہیئے۔ اُسے احساسات اور جذبات کو بھی مادی اشیا کی طرح نہ صرف محسوس کرنا چاہیئے۔ بلکہ دیکھنا چاہیئے۔ فیض "دل بینا" ہے۔ وہ صرف محسوسات کی دنیا تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اس سے آگے گذر کر اُس دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں مادی اور غیر مادی، جاندار اور بے جان سب اشیا ایک ہی سطح پر آ جاتی ہیں۔ سب حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ سب کی کیفیت اُس پر منکشف ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے شاعر کو اپنا محرم بنا لیتی ہے۔ اور اپنے راز جن کو وہ لوگوں کی ظاہر بین نگاہوں سے چھپانے کے لئے کسی اور لقاب میں لپیٹے ہوئے تھیں۔ اسکے دل بینا پر منعکس کر دیتی ہیں۔ وہ ایک کامیاب فنکار ہے۔ وہ ان رازوں کو دوسروں کے دلوں پر نقش کرنا اور اُن کی زبانوں سے کہلوانا جانتا ہے۔ پڑھنے والے کا دل اس عجیب بھید کو اپنی زندگی میں پہلی بار سنکر اچھل پڑتا ہے۔ لیکن جب یہ راز کسی اور کو بتانے لگتا ہے تو منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ یہ راز الفاظ کی قید میں آنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور اس طرح یہ راز عام ہو کر بھی راز ہی رہ جاتا ہے۔ وہ ان غیر مرئی احساسات کو الفاظ کی قید میں لا کر ہماری ظاہر بین آنکھ اور بے حس دل میں اتار دیتا ہے۔ جب تنہائی میں اُسکا دل غمگین ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ ناکام تصور کرنے لگتا ہے۔ تو

قدرت کے مناظر اور ہر وہ چیز جس پر اُس کی مایوس نظر پڑتی ہے اُس کی غمگساری کو پہنچ جاتی ہے۔ ایسے لمحوں میں فیضؔ ایک شاعر اور یا زیادہ موزوں الفاظ میں ایک پیغمبرانہ دل اور آنکھ کا مالک ہوتا ہے۔ اُس کی ہر نظر ان اشیا کی گہرائیوں میں اُترتی جاتی ہے اور وہ ان حقیر غیر جاندار اور بے روح اشیا کو بھی اپنے غم سے متاثر کر دیتا ہے۔ اس کی ایک نظم کے تخیل کی جزئیات کچھ اسطرح ہیں۔ رات ڈھل چکی ہے تارے اوجھل ہو رہے ہیں، ٹمٹماتے چراغ اور خاموش راستے ہاں کبھی کبھی کسی راہرو کے پاؤں کی آواز اس سکوت میں لرزش پیدا کر کے پھر اسی ابدی سکوت کا جزو بنجاتی ہے۔ صرف شاعر کے دل کی پیہم دھڑکن زندگی کی خبر دے رہی ہے۔ اُسے کسی کا انتظار ہے۔ وہ راہرو کے قدموں کی آواز اور اپنے دل کی دھڑکن کو بھی اُسی کی آوازِ پا سمجھ کر چونک اٹھتا ہے اور اپنے آپ سے سوال کرتا ہے "پھر کوئی آیا دلِ زار؟ نہیں کوئی نہیں"، اور مایوس ہو کر پکار اٹھتا ہے "راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائیگا"۔ لیکن وہ شاعرِ اُمید ہے۔ وہ اس غم سے نجات پانے کے لئے ارد گرد کے منظر پر نظر ڈالتا ہے "تاکہ اپنے دل کو بہلا سکے۔ لیکن وہاں تو ایک عجیب ہی سماں ہے۔ ہر شے اُسے اپنے ہی غم میں ڈوبی ہوئی ملتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ رات بھی اُسکے آنے کی خوشی میں اپنے آپ کو چاند تاروں سے مزین کر کے نکلی تھی۔ اب ڈھل چکی ہے تارے بھی رات بھر آسمان پر کسی کی راہ تکتے رہے لیکن مایوس ہو کر اب مٹتے جاتے ہیں۔ اور سنکار مریں غبار فضا میں بکھرتا جاتا ہے۔ چراغ بھی اسی گدازِ فرقت سے تمام رات جلتے رہے۔ لیکن ایوان، سکون سے گویا خوابیدہ ہیں۔ لیکن اب وہ بھی ناامید ہو کر لڑکھڑا رہے ہیں جواب دے چکے ہیں۔ اُن کا چراغِ حیات اب گُل ہونے کو ہے۔ رہگزر تمام دن اور رات قدموں تلے روندی جاتی رہی۔ تاکہ کہیں اُسکے نقشِ پا کی قدمبوسی کا فخر حاصل ہو سکے۔ لیکن اب وہ بھی راستہ تک تک کر سو چکی۔ ہر ایک چیز اسی غم میں ڈوبی ہے۔ وہ اس غم کو برداشت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ مایوس دل سے کہتا ہے۔ کہ اُسکے آنے کی کوئی امید نہیں، اسلئے "گل کرو شمعیں بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ"، اور اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو"، کیونکہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا بے خواب کواڑ اسلئے کہ وہ اُسکے انتظار میں تمام رات چشمِ منتظر کی طرح کھلے رہے ہیں۔ یہاں کواڑوں کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاید اپنی آنکھوں کو کھلے کواڑوں سے تشبیہہ دی ہو۔ کیونکہ آن کے پردے بھی کواڑوں کے پٹوں کی طرح کھلے رہے ہیں۔ یا پھر اپنے دروازوں کو ہی بے خواب کہا ہو۔ کیونکہ وہ تمام رات کھلے رہے ہیں۔ ایک منٹ بھی آنکھ نہیں جھپک سکے۔ تاکہ اگر وہ آئے۔ تو اُن کو غافل یعنی بند دیکھ کر واپس نہ ہو جائے۔ اگر فیضؔ صرف یہی نظم لکھ کر ہی اپنی شاعرانہ زندگی ختم کر دیتا تو بھی مستقبل کا ناقد اُسے کسی بڑے سے بڑے شاعر کے پہلو میں جگہ دینے سے گریز نہ کرتا۔

فیضؔ شعری ادب میں ایک نئے اسکول کا بانی ہے۔ وہ زندگی کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ جس کی حقیقت اور جامعیت کا خود اُسکو پورا پورا یقین ہے۔ وہ توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے خوش پوش لیکن کھوکھلے اور بے روح الفاظ استعمال نہیں کرتا بلکہ اپنا مطلب ان لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ جو آپ کو اپنی روح کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اُسکی زبان الفاظ اور طرزِ بیان ایک ایسے شیشے کی مانند ہیں۔ جو ڈائل کی حفاظت بھی کرے، زینت بھی دے اور نمایاں بھی کرے۔ اُس کی زبان لطیف ہے۔ جو معانی کو دیکھنے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ زبان اُسکے خیالات کے بالکل ہمراہ چلتی ہے۔ اور اُن کی ہر کروٹ پر خود بھی بدل جاتی ہے۔ ایک ہی نظم میں اُسکی زبان اُسکے خیالات کے تغیر کے ساتھ ہی پلٹا کھاتی ہے۔ ابھی تو وہ حسن و عشق کی باتیں کر رہا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہاریں شباب پر ہیں۔ غنچے چٹک رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی نسیم چل رہی ہے۔ لیکن اُسکے دماغی ہیجان کے ساتھ ہی اسکا لہجہ بدل

جاتا ہے۔ وہ زندگی کی گھناؤنی تصویر پیش کرتا ہے جس کی ہم تاب نہیں لا سکتے۔ فیض کی زبان بہت حسین اور پیاری ہے۔ جو دل میں اُترتی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر ایک مصرع میں الفاظ ایک دوسرے میں گھُلتے ہوئے اپنی انفرادی ہستی تقریباً کھو چکے ہیں۔ اور اب وہ مجموعی طور پر صرف ایک مترنم لفظ بن چکے ہیں۔ اُسکے الفاظ خیالات کو ایک دائمی کشمکش میں نہیں رکھتے۔ کہ ایک اپنی طرف کھینچے۔ اور دوسرا کسی اور ہی جانب بلکہ وہ خیالات کے پیچھے پیچھے اُنکے حکم کے مطابق چلتے ہیں۔ اسے الفاظ کو خیال کے سانچوں میں نہیں ڈھالنا پڑتا۔ بلکہ الفاظ خود اُس خیال کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ اسلئے ہمیں خیالات کہیں بھی الفاظ کے کانٹوں میں اُلجھے ہوئے نہیں ملتے بلکہ یہ الفاظ بھی وہی اثر پیدا کرتے ہیں جسکو اُس خیال سے تحریک ہوتی ہے۔ فیض اپنی زبان کو عوام کی زبان کے زیادہ سے زیادہ قریب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسکی شاعری خلوص، سادگی، اور ندرت کا ایک لطیف مجموعہ ہے۔ پڑھنے والے کی ہستی آہستہ آہستہ نظم کی ہستی اور پھر اُسکے خالق یعنی شاعر کی ہستی میں تحلیل ہوتی جاتی ہے اور وہ آخر کار پکار اٹھتا ہے۔

کہنے والے فسانہ میرا ہے   صرف طرزِ بیاں تیرا ہے

فیض کے قطعات بھی اُسکی نظم کی تمام خصوصیات لئے ہوئے ہیں اور روانی، خلوص اور سادگی ایسے عناصر ہیں جو اُسکے قطعات میں انتہائی بلندی کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے موجودہ دور میں اختر انصاری ہی اُسکا ہم عنان نظر آتا ہے۔ اُسکے قطعات خارجی پہلو کی جگہ داخلی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ وہ ان حسین چھوٹے چھوٹے شاروں کو دنیا کی بربادیوں کے تلخ واقعات سے آباد کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ انکو صرف اپنے اور کسی کیلئے وقف کر لیتا ہے۔ اور انکو اپنی آتشناک تمناؤں، بے آواز نالوں، اور شکستِ دل کی صداؤں سے معمور کرنا چاہتا ہے۔ واقعی ان حسین اجسام میں ایسی ہی چمکدار، مختصر لیکن گہری اور پُرسوز مخلوق کی ضرورت تھی۔ وہ انکو جسم کی مایوس پکار سے نہیں بلکہ دل کی بے سود تڑپ سے زندگی بخشتا ہے۔ اُسکے قطعات اُس المناک گیت کی مانند ہیں۔ جو الفاظ کے ساز پر گایا جاتا ہے اور انکے آخری مصرعے اُس لے کی مانند ہیں۔ جہاں ساز کی دردناک تانیں انتہائی بلندی تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور پھر ——— ساز کے تار توڑ کر ایک جاودانی چیخ فضا میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔

(۱) فضائے دل پر اداسی بکھرتی جاتی ہے + فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدعا معلوم + یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

(۲) رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی + جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم + جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

یہ قطعہ تقریباً تمام ادبی دنیا میں اشاعت سے پہلے ہی مشہور ہو چکا ہے۔

وقفِ حرماں و یاس رہتا ہے + دل ہے اکثر اداس رہتا ہے   تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو + ہم کو احساں کا پاس رہتا ہے

مشاہیر کی قدر عموماً انکے مرنے کے بعد ہوتی ہے جسکی چند نفسیاتی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ عین قربت بھی عین قربت نہیں۔ اگر کسی کو بہت ہی قریب سے دیکھا جائے۔ تو ہم اُسکا صرف ایک حقیر سا حصہ ہی دیکھ سکیں گے اور اُسکی عظمت کا صحیح اندازہ بالکل نہیں کر سکینگے۔ دوسرے وہی انسان کی فطری خود پسندی جس نے پیغمبروں کے انکار پر مجبور کیا۔ لوگ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ ہماری ہی دنیا اور ہمارے ہی ماحول میں رہتا ہوا ہماری ہی شکل و صورت کا ایک انسان ہماری طرح ہی کھاتا پیتا ہم سے اسقدر بلند ہو سکتا ہے۔ یہ کوتاہ نظری انکو اس بات پر مجبور کر دیتی ہے۔ کہ اپنے ہمعصروں کی بلندیوں اور پستیوں کو اپنے ہی معیار پر رکھیں۔ اسقدر بلند عظمت کا تصور بھی انکے معمولی ذہنوں میں نہیں سما سکتا۔ لیکن ایک عرصہ گزر جانے پر دوری انکو اس قابل کر دیتی ہے۔ کہ وہ اُن پر ہر پہلو سے ناقدانہ نظر ڈال سکیں۔ نیز اسوقت ہم ادب کو ادیب کی شخصیت سے نہیں۔ بلکہ ادیب کو ادب سے جانچتے ہیں اور ہندوستانی تو فطرتاً مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کہ کسی ہمعصر کو اُن فنکاروں کے برابر جگہ دیں۔ جن کو وہ انسانی دیوتاؤں کے بلند رتبے پر فائز کر چکے ہیں۔ خواہ ان میں ہزار خامیاں موجود ہوں۔

طالب انصاری

غزل ⁂ مسلسل

تصوّر کو رنگیں بناتی چلی آ
کبھی سمت سے مسکراتی چلی آ

لبِ آبِ جو رات کی چاندنی میں
ضیائے قمر سے نہاتی چلی آ

مری آرزوؤں کے ویرانکدے میں
امیدوں کی بستی بساتی چلی آ

الجھتی ہوئی خار و گل سے چمن میں
ہر اک شے سے دامن بچاتی چلی آ

محبت کے نغموں سے سرشار ہو کر
چہکتی ہوئی گنگناتی چلی آ

جماتی ہوئی لب پہ رنگِ تبسم
کلی کی طرح مسکراتی چلی آ

کبھی آن کر مسکراتی ہوئی جا
کبھی لوٹ کر مسکراتی چلی آ

دکھاتی ہوئی مشعلِ روئے روشن
شبِ تار کو دن بناتی چلی آ

اڑاتی ہوئی رنگ و بو گلکدے میں
مہکتی ہوئی گل کھلاتی چلی آ

دکھاتی ہوئی اپنے جلوے قمر کو
ستاروں سے آنکھیں لڑاتی چلی آ

گراتی ہوئی برقِ حسن و تجلی
نگاہوں کو خیرہ بناتی چلی آ

ستاروں کی جاں آفریں روشنی میں
قمر کی طرح جگمگاتی چلی آ

حریمِ محبت میں آوازِ پا سے
کسی کا مقدر جگاتی چلی آ

بجاتی ہوئی بنسری بن کی جوگن
کوئی پیت کا گیت گاتی چلی آ

خدارا شبِ غم کے پچھلے پہر میں
سحر کی طرح جھلملاتی چلی آ

کدھر ہے تو اے عنبریں زلف والی
ہواؤں میں خوشبو اڑاتی چلی آ

راجندر سنگھ بیدی

بُکی

"۹۴۰"

"جی آں — ۱۶، تیسری قطار میں" بُکی نے ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو دباتے ہوئے کہا۔ "آپ تو زحمت اٹھانے کی نوبت ہی نہ آنے دیں صاحب، کنڈکٹر آپ کی مدد کریگا"۔

"شکریہ شکریہ" کہتے ہوئے نوجوان مسکرایا۔ اور مسکراتے ہوئے اس نے ایک اور چونی کونٹر پر رکھ دی۔ چونی جیب میں ڈالتے ہوئے بُکی نے آنکھیں بند کرلیں جیسے اُس کا دماغ بہت تھک گیا ہو۔ وہ دن بھر کلکتہ کی ایک بیمہ کمپنی میں ٹائپ کیا کرتی تھی۔ اور رات کو اس عظیم الشان سینما میں ٹکٹ بیچا کرتی تھوڑی سی تنخواہ کے علاوہ کسی رنگین مزاج نوجوان کے لئے کسی لڑکی کے پہلو میں سیٹ بک کر دینے کے عوض اسے چونی زیادہ ملتی تھی اور اس کی آمدنی پر ایک بڑا کنبہ پل رہا تھا۔ ایک بوڑھی، ہٹیلی ماں تھی۔ جو ذرا سی دیر کے بعد کھانا ملنے پر اپنا منہ آپ ہی نوچ لیتی تھی ماسکے علاوہ ایک بیوہ بہن تھی جسے اسکے خاوند نے بیوگی سے دو برس پہلے محض اسلئے چھوڑ دیا تھا۔ کہ آگ جلانے سے پہلے وہ تمام گھر میں دھواں بھر دیتی تھی۔ اور پھر چھوٹے بھائی تھے اور بھانجے۔ . . .

کچھ دیر بعد موسے کی سی سبک رفتاری کے ساتھ وہی نوجوان کونٹر کی طرف آیا اور آتے ہی اُس نے اپنی انگلیاں لکڑی کی کونٹر پر نچائیں اور بولا "ورلیکن مادم — وہاں تو کوئی لڑکی نہیں" بُکی نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "کہیں باہر ہوگی صاحب . . . اُس نے مجھ سے ٹکٹ خریدا ہے۔ میں ڈرتی ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑیگا"۔

"اُوف!" نوجوان نے بیزاری سے کہا۔ "ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے بس . . . مادم ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے"

پھر وہ لڑکا کچھ دور جاکر سائوان کے خوبصورت چوکھٹوں میں لگے ہوئے سٹلز کو دیکھنے لگا۔ اور ایک اضطراب کے عالم میں اس نے آج شب کو، کے سرخ لیبل پھاڑنے شروع کردئے پھر بُکی کے پاس لوٹتے ہوئے بولا۔ "مایوسی سے تو انتظار اچھا ہے"

بُکی نے اس بے صبر نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور دل ہی دل میں اسکے خوبصورت بالوں کو سراہنے لگی۔ کتنے اچھے ہیں اسکے بال۔ دولت اور فکر میں گھرے ہوئے سیٹھوں کی طرح وہ گنجا نہیں۔ نہ ہی توندیلا ہے اور نہ دبلا۔ بس . . . ٹھیک ہے اور اسکے بال دھان کے ان کھیتوں کی طرح ہیں جنہوں نے مون سون ہواؤں سے پورا فائدہ اٹھایا ہو۔ اس کی وضع قطع اور باتوں سے شراب کی بو آتی ہے حالانکہ شاید اس نے شراب نہیں پی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ جوان ہے جیسے انگور پک جاتے ہیں تو ان سے شراب یعنی تخریب کی بو آنے لگتی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکا پردے اٹھا کر بڑے غور سے سینما کی چھت کا معائنہ کرنے لگا۔ چھت میں مصنوعی ستارے چمک رہے تھے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ جب سینما میں روشنی گل ہو جائے گی۔ تو یہ ستارے اور زیادہ چمکنے لگیں گے۔ اور بہت خوبصورت دکھائی

دیکھے چھت کی طرف نظریں اٹھانے سے آسمان کا دھوکا ہوگا۔ وہ یقیناً اس منظر کو پسند کریگا۔ اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی سے کہے گا — ستارے کتنے خوبصورت ہیں اور . . . اور یہ سچ ہے۔ کہ اس نے تاروں بھرے آسمان پر کبھی نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ اور نہ قدرت کے اس کلکتہ کو جو کہ ہر روز رات کو آسمان پر دکھائی دیتا تھا۔ پسند کیا تھا۔ لیکن چھت پر چمکتے ہوئے ستاروں کو تو وہ اسلئے پسند کرتا تھا۔ کہ ان پر سچ مچ کے ستاروں کا دھوکا ہوتا تھا اور انسان ہمیشہ اصلیت کی نسبت اسکے دھوکے کو پسند کرتا ہے۔

پھر وہ نوجوان برآمدے میں ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ بکی کو یقین تھا۔ کہ وہ اس بیکرے نوجوان کو پسند نہیں کر سکتی البتہ بڑی ہی آسانی سے نفرت کر سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت رحم دل تھی اور شاید اسی لئے وہ اسکے متعلق اپنے تخیل کو محبت کی آلودگی سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی۔ ورنہ اسکے لئے یہ کسقدر آسان تھا کہ شو کے شروع ہو جانے پر بکنگ آفس کے سامنے ہاؤس فل کا بورڈ لگا کر اُس نوجوان کے ساتھ کی کسی سیٹ پر خود جا بیٹھتی۔

برآمدے کی دیوار پر نیا نیا پالش ہوا تھا اسلئے نوجوان کے کپڑے کسی قدر آلودہ ہو گئے۔ لیکن پرے ہٹ کر اس نے پھر اپنی انگلی سے دیوار کو چھوا گویا کپڑوں کے آلودہ ہو جانے سے اسے دیوار کے نئے پالش کئے جانے کا یقین ہی نہ آتا ہو۔ پھر اس نے آوارہ نگاہوں سے سینما کی گھڑی کی طرف دیکھا جو کہ دائیں دیوار سے ہٹا کر منیجر کے کمرے کے اوپر لگا دی گئی تھی۔ اس نے گھڑی کو اپنی اصلی جگہ پر دیکھ کر پھر اُسی جگہ کو دیکھا۔ جہاں سے وہ اٹھا لی گئی تھی بکی سوچنے لگی۔ انسان کی عادت بھی عجیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک چیز اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دی گئی ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں ایک بار پھر اُس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں سے وہ چیز اٹھالی گئی ہو۔ گویا اسکا دل اس تبدیلی کو یک بیک قبول نہیں کرتا اور شاید اسی لئے اسے ۲۴ برس گنے کے دیہات میں گزارے ہوئے زندگی کے دن بار بار یاد آتے تھے وہ دن جبکہ وہ تہذیب سے دور دادا کے ہاں آرام و سکون کی زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن اب کلکتہ کے سے مہذب شہر میں زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اُسے کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔

بکی نے اپنے سامنے پڑے ہوئے سیٹ کے پلین پر نظر دوڑانی شروع کی۔ آخر ایسے ہی بے صبر نوجوانوں کو کسی لڑکی کے پہلو میں جگہ دینے سے اُسے روزی ملتی تھی۔ اُس کی آنکھیں نقشے میں خالی نشستوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ اور نوجوان کو بکی کے ناخنوں پر گلابی پالش چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ نوجوان گھور گھور کر اس چمکتے ہوئے پالش کو دیکھنے لگا۔ جیسے اُسے اُن کے پالش ہونے میں یقین نہ آتا ہو۔ اور وہ اُن ناخنوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا ہو . . . چھبیس . . . ستائیس . . . تیس چوتھی قطار . . . بارہ . . .

— بکی کی نگاہیں ایک سیٹ پر جا رکیں۔ وہ شاید اس سیٹ پر نشان لگانا بھول گئی تھی۔ اس سیٹ کے لئے بھی تو ایک لڑکی نے ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جانتی بھی تو تھی — مسز و، سوزا . . . اخاہ! اُسکے ساتھ مسٹر و، سوزا بھی تو تھے۔ وہ بچے یا نہیں تھے بکی ہلکی ہلکی سردی میں بالکل بھول چکی تھی۔ اُسے تو اُن کی شکل تک یاد نہ رہی تھی۔ بکی نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر زور ڈالنا شروع کیا تھا کہ وہ اس چونی کو کوسنے لگی۔ جو اُسے اس کام کے لئے ملتی تھی۔

"جنٹلمین" بکی نے اس نوجوان کو بلاتے ہوئے کہا: "میں نے آپ کی سیٹ چوتھی لائن میں تیرہ پر رکھی ہے۔ اور بارہ پر مس و سوزا کی جگہ ہے۔" اور بکی نے جان بوجھ کر مسز کو مس کہا۔ قدرت نے عورت کے ماتھے پر تو ایسی تخصیص کا کوئی نشان نہیں رکھا۔

اور پھر بچی کو اپنی چونی عزیز تھی ۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی ۔ اور اپنی بہن پر اسے بہت ترس آتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ نوجوان نے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا "شکریہ" اور ہال کے اندر داخل ہو گیا

بچی نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر ٹپین کا بغور مطالعہ کرنے لگی ۔ جب وہ ایش ٹرے کو اپنے نزدیک سرکا رہی تھی تو ایک بد صورت سا لڑکا آیا اور اسکے پاس آکر کھڑا ہو گیا ۔ بچی غور سے اسکے چہرے کی طرف دیکھنے لگی ۔ وہ ابھی کمسن تھا ۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اسکے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا ۔ البتہ جاننا چاہتا تھا ۔ ماں اور بہن کے علاوہ اس نے دنیا میں کوئی عورت نہیں دیکھی تھی ۔ اور اسکے چہرے پر ہلکی ہلکی شرم کے پیچھے ایک شدید سا ڈر دکھائی دے رہا تھا جو کہ اسکے بھدے نقوش کو اور بھدا بنا رہا تھا ۔

لڑکے نے ٹکٹ کے پیسوں کے علاوہ ایک اور چونی بچی کی طرف سرکا دی ۔ بچی کا منہ کھلا رہ گیا ۔ "تم چاہتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔" وہ بولی اور چونی کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے جیب میں رکھ لیا اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے ٹپین پر جھک گئی ۔ ہاؤس فل تھا صرف سولہ نمبر کی نشست خالی تھی ۔ وہی نشست جو اس نے خوبصورت نوجوان کے لئے پہلے بک کی تھی لیکن ساتھ کی سیٹ میں لڑکی نہ ہونے سے خالی رہ گئی تھی ۔ بچی نے سوچا اب وہ لڑکی ضرور آ بیٹھی ہوگی ۔ کتنی خوبصورت تھی وہ لڑکی ـــ وہ بلانڈ اور اسکے بالوں کی لہریں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے دھان کے کھیت پر سے ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید اس نے بال کسی نوجوان کی توجہ کو کھینچنے کے لئے بنائے تھے ۔ اسکے پہلو میں اس بیوقوف ، بدصورت چھوکرے کو جگہ دینا اس لڑکی کی توہین کرنا تھا ۔ اور یہ چھوکرا تو آدمی ہی نہیں تھا بلکہ بالکل دیہاتی تھا ۔ ۲۴ پرگنہ کی طرف کا رہنے والا ہی تو دکھائی دیتا تھا

اسکے چہرہ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چھت کے ستاروں کی تعریف سے سلسلہ کلام شروع کر سکتا ہے ۔ اور نہ ہی اس لڑکی کے بالوں کو دھان کے کھیت سے تشبیہ دے سکتا ہے وہ گدھا تو اصلی ستاروں کو پسند کرتا تھا ۔ اور کہیں سے دھان کا ٹھا اٹھا کر کلکتہ چلا آیا تھا

نوجوانوں کا غول اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا ۔ لیکن سب نشستیں بک چکی تھیں ۔ ٹپین سارے کا سارا بچی کے ہاتھ سے لگائے ہوئے نشانوں سے سرخ ہو رہا تھا ۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بتا دیا ۔ کہ اب اس درجہ میں کوئی جگہ نہیں ہے ۔ اور وہ نوجوان اپنے اوور کوٹ تھامے اور پتلون کے پائنچے اٹھائے واپس چلے گئے ۔

آسمان سے ننھی ننھی بوندا باندی ہونے پر سینما کے برآمدے پناہ گاہ بنگئے تھے ۔ اسکے بعد مون سون کے بڑے بڑے بارانی ریلے آنے لگے ۔ اور چند چھوکریاں اپنے گون سنبھالتی ہوئی سینما کی ایگزٹ (EXIT) کی طرف آکھڑی ہوئیں ۔ ان لڑکیوں کے ریلے دروازے کی طرف دھکیل دئے جاتے تھے ۔ اور ان بارانی ریلوں سے وہ ریلے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے ۔

اسوقت بچی کے دل میں اس دیہاتی نوجوان کے لئے ایک عجیب مادرانہ جذبہ پیدا ہوا ۔ اس نے اپنے کمرے کے سامنے ہاؤس فل کا تختہ لٹکا دیا اور خود کھڑکی بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی ۔ اور اس چھوکرے کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ٹکٹ دے دیا اور پھر خود اسے کنڈکٹ کرنے لگی ۔ مسلسل کانپتے رہنے سے اس چھوکرے کی بدصورتی کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا کنڈکٹر نے احتیاط سے اس نوجوان کو سولہ نمبر کی نشست پر بٹھا دیا ۔ بچی دروازے میں کھڑی اس چھوکرے اور اس کی رفیقہ کی طرف دیکھتی رہی ۔ بلانڈ نے گھبرا کر اپنے دائیں طرف دیکھا ۔ اور مضبوطی سے اپنی کرسی کی سلاخوں کو پکڑ لیا ۔ اس لڑکی کو اپنی شام کے تباہ ہو جانے میں کوئی شک نہ رہا ۔ بچی نے سوچا شاید وہ لڑکی بھی میری طرح ربط و حسن کی بجائے اپنی چونی باد رکھے

بُٹ کو پسند کرتی ہو۔ اسکے بعد پردے چھٹ گئے۔ اور سینما شروع ہوا۔ انگریزی فلم — "میرا نام مجھ سے پہلے سفر کرتا ہے" شروع ہوئی ... سکو ایک دلفریب ٹیون پر گایا جا رہا تھا —

"تاروں بھری رات کے نیچے..."

بکی نے ایک گہرا، ٹھنڈا سانس لیا۔ اور اپنے دل میں ٹیون کو گنگنانے لگی۔ "تاروں بھری رات کے نیچے" لیکن ابھی دوسرے شو کا میں بناتا تھا۔ اور اُسے تین ساڑھے تین روپے ہاتھ لگ جاتے تھے۔ اب تو وہ بہت ہی تھک گئی تھی۔ اپنی آنکھوں کو شدت کی روشنی سے بچانے کے لئے اُسے ہال کا اندھیرا پسند تھا۔ وہ سوچنے لگی: "تاروں بھری رات کے نیچے" کا دلفریب گانا سنکر اس بدصورت نوجوان کو کیا خوبصورت ستاروں سے بھرا ہوا آسمان یاد آئے گا یا ہال کی چھت۔ یا خوبصورت نشستیں جہاں ہر روز ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ اسکے بعد بکی باہر نکل آئی کنڈکٹر جا چکا تھا۔ کہ بکی اسی جگہ کھڑی ہو کر لمحہ دو لمحہ کے لئے پیچھے دیکھا کرتی ہے۔ اور پھر فوراً ہی وہ مضطرب ہو کر باہر نکل جاتی ہے۔ گویا پردۂ سیمیں پر کوئی بہت ہی خوفناک منظر دکھایا جا رہا ہو۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ وہ سکرین سے ایک گانا بھی نہیں سن سکتی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اُسکے دل کا برتن چھوٹا ہے اور موسیقی کتنا بڑا وہ اُسکے چھوٹے سے دل میں نہیں سما سکتا۔ وہ اپنا چھلکتا ہوا دل لے کر باہر نکل آتی "تاروں بھری رات کے نیچے" ۲۴ پرگنہ کے کسی گاؤں کے تالاب کا کنارہ اُسے یاد آ جاتا۔ جہاں اُس کی محبت پروان چڑھی اور لُٹ گئی۔ جہاں سے ہندو عورتیں اپنا گھڑا بھر کر چلی آتی تھیں اس سے زیادہ جگہ ان کے مٹکوں میں نہ تھی۔ اور اس مٹکے کے پانی سے وہ کھانا بھی بناتی تھیں اور چوکا بھی کرتیں۔ گائے کے گوبر کو مٹی میں ملا کر وہ چوکے کو بڑی صفائی سے پوتا کرتیں اور بکی کا جی بھی چاہتا تھا۔ کہ وہ اتنے بڑے شاندار ہوٹلوں کو چھوڑ کر کسی ایسے علیحدہ کونے میں صبر و سکون سے پڑی رہے۔ اور ان ہی عورتوں کی طرح چارپائی پر لیٹ کر رات کو تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا تماشا کرے۔

وہ منیجر کے کمرہ کے پاس کھڑی ہو کر سگریٹ سلگانے لگی۔

کچھ دیر بعد ہال میں روشنی ہو گئی۔ ہاف ٹائم ہو چکا تھا۔ بکی نے پھر ایک دفعہ پردوں کے پیچھے سے سولہ اور سترہ کی نشست کی طرف دیکھا وہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لئے ویسے ہی اجنبی تھے۔ اور اپنی اپنی جگہ پر سمٹ کر بیٹھے تھے۔ اگر وہ چھوکرا طریقے سے اس خوبصورت ٹیون کی تعریف کر دیتا تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ لیکن وہ تو گم سم بیٹھا تھا۔

اب ہاف ٹائم میں وہ کوئی بات شروع کر سکتا تھا۔ لیکن وہ باہر چلا آیا۔ اس کا چہرہ بہت اُترا ہوا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپکتا تھا اور اپنے لبوں پر بے تحاشہ زبان پھیرتا۔ اور ان سب حرکتوں سے وہ بالکل ایک اُجڈ دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔

"ہلو مس — مادام" اُس نے باہر نکل کر ڈرتے ہوئے کہا۔

بکی نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور بولی "ہلو — برائے، انجائیڈ آ رائیٹ؟ دیکھو، خوب لطف رہا نا؟"

اُس لڑکے نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا "مادام — میں تو کلکتہ دیکھنا چاہتا ہوں اور . . . اور . . ." اسکے بعد وہ ہکلانے لگا "میرا چچا کدارپور میں دوکان کرتا ہے . . ."

بکی کا جی چاہا۔ کہ وہ صاف گوئی سے کام لیتی ہوئی کہہ دے کہ کلکتہ بالکل اس ہال کی چھت کا سا ہے۔ لیکن اس نوجوان نے چھت کو بغور دیکھا بھی نہیں تھا۔ اور بکی بھی یک لخت پریشان اور اُداس ہو گئی۔ اسکے سر میں زیادہ درد ہونے لگی۔ وہ اس دیہاتی نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی۔ وہ بہت رحم دل تھی۔ اسکے بعد جب شو ختم ہوا بکی نے منیجر سے چھٹی لے لی۔ اس وقت وہ دیہاتی، بدصورت نوجوان باہر آیا۔ بکی اُسکے قریب چلی گئی — بولی۔

"ہلو برائے — تم کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"ہرش پور — ۲۴ پرگنہ کا"

"میں جانتی ہوں ہرش پور — میں ایک دفعہ مسٹر رے کے ہاں ایک ماہ ٹھہری تھی"

"سچ؟ ہاں ہاں" لڑکے کا چہرہ چمک اٹھا۔ "مسٹر رے کو جانتا ہوں وہ ہمیں پڑھاتے رہے ہیں"

اسکے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ لڑکا بولا "تم اتنی مہربان ہو — کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں"؟

"نلنی" وہ بولی "لیکن یہاں سب لوگ مجھے مارگریٹ کہتے ہیں۔ مسٹر رے کا بڑا بھائی میرا باپ تھا اسے مرے ہوئے دس برس ہو چکے ہیں۔ اُنہوں نے ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کی۔ وہ لڑکی میری ماں ہے۔ . . اور کیا تم کلکتہ دیکھنا چاہتا ہے؟"

چھوکرے نے سر ہلا دیا۔ مارگریٹ بولی "چلو ہم کافی کی ایک پیالی پئینگے"۔ اور وہ دونو فرپو، کی طرف چل دیئے۔ ہوٹل کے دروازے پر دو بڑے بڑے دو دھیا بلب دور سے چاند کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ مارگریٹ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دور سے اصلی چاند کا دھوکا ہوتا ہے" نوجوان نے فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔ مارگریٹ اُن بلبوں کی طرف اشارہ کر کے کہنا چاہتی تھی۔ بس کلکتہ ایسا ہی ہے۔

پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے اور کافی پینے لگے۔ اُس نوجوان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا۔ کہ اُسے کافی کا تلخ ذائقہ پسند نہیں۔ وہ گنوار تھا۔ شاید دودھ کے مٹکوں سے مٹکے چڑھا جاتا تھا۔ کافی کے بعد مارگریٹ نے کئی چیزیں منگوائیں اور دیہاتی لڑکے کو ان میں سے کئی چیزوں کے نام نہ آتے۔ مارگریٹ پوچھتی

"یہ کیا ہے؟"

"نامعلوم"

"ساسیج — کہو ساسیج"

"ساسیج"

"یہ کیا ہے؟"

"نامعلوم"

"کٹلٹس — کہو کٹلٹس"

"کٹلٹس"

کبھی وہ لڑکا معصومانہ انداز سے کچھ اور کہہ دیتا۔ تو مارگریٹ اسے درست کرتی۔ جیسے بچپن میں ماں بچے کو نئے نئے نام بولنے سکھاتی ہے۔ اور جب وہ الٹا سیدھا نام لیتا ہے۔ تو اُسے درست کرتی ہے کافی پینے اور کچھ کھا چکنے کے بعد مارگریٹ نے پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن اس لڑکے نے تھام لیا۔ اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر بل پر رکھ دئے۔ مارگریٹ کا خیال تھا۔ کہ کلکتہ میں عورت کا بل ادا کرنے کا اخلاق اس نوجوان کو نہ آتا ہوگا۔ لیکن اُس نے دیکھا۔ کہ وہ اس بات سے تو واقف تھا۔ ایسے ہی جیسے سینما میں چونی زیادہ دے کر عورت کے ساتھ سیٹ بک کروا لینے کا طریقہ اُسے کسی نے بتایا تھا۔ اسی طرح عورت کے ساتھ کافی پی کر اُسکے پیسے ادا کرنے کا اخلاق بھی کسی نے سکھا دیا ہوگا۔

مارگریٹ نے بتایا کلکتہ بہت مہذب ہو چکا ہے۔ اور تہذیب بھی انگور کے دانوں کی طرح ہے جب یہ بہت پک جاتی ہے تو اس سے شراب کی بو آنے لگتی ہے۔ اور جب مارگریٹ کو پتہ چلا کہ وہ لڑکا عورت کے متعلق بالکل کچھ نہیں جانتا۔ تو اُس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"بولئے، کیا تم آج شب میرے مہمان بنوگے۔ . . میں آج اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤنگی۔ یہاں گھر سے علیحدہ میرے پاس ایک بہت اچھا فلیٹ ہے۔ . . .

میں تمہیں بتاؤنگی عورت کیا چیز ہے۔ لیکن وہ عورت جس نے تمہیں سینما کے دروازے پر پایا۔ یا جسے تم نے ۲۴ پرگنہ میں دیکھا۔ یہاں تم اسے نہیں پا سکوگے۔ . . . ہاں، تم اُس عورت کو دیکھ لوگے۔ وہ عورت جو کلکتہ ہے"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

منظور الحق کلیم

نواب غلام حسین خاں حسین

نواب غلام حسین نام اور حسین تخلص تھا۔ آپ عمدۃ الملک نواب بہادر خاں بانی شاہجہان پور کے پوتے اور نواب شیر داد خاں صاحب کے اکلوتے فرزند تھے۔ گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ قلعہ میں برابر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اساتذۂ فن شرکت کرتے تھے۔ اور اُن کی قدر ہوتی تھی۔ ناسخ اور آتش جو اُس وقت آفتاب و ماہتاب تھے اکثر شریک ہوتے تھے۔ حسین نے فارسی کی تعلیم اپنے شہر کے استادوں سے حاصل کی اور اس میں فاضلانہ دستگاہ تھی۔ ذہن اور حافظہ غضب کا تھا اس کا پتہ نہیں۔ کہ فنِ شعر میں کسی سے تلمذ تھا یا طبیعت ہی استاد تھی حسین باکمال شاعر ہی نہ تھے۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کے سخن فہم اور برجستہ گو بھی تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ناسخ نے اپنا شعر ؎

دے دوپٹا تو اپنا ململ کا ۔ ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

سنا کر داد کے طالب ہوئے حسین نے کہا استاد اگر یوں کہیں تو کیسا ہو ؎

ڈالدے سایہ اپنے آنچل کا ۔ ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

ناسخ حیرت سے منہ دیکھنے لگے۔ اور کہا نواب یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میرا شعر مشہور ہو گیا ہے۔ ورنہ بدل دیتا۔ اسی طرح آتش نے اپنا شعر ؎ چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ

؎ ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

سنایا۔ حسین نے کہا استاد اگر یوں پڑھیں تو کیسا ہو ؎ چال ہے مجھ نیم جان کی مرغِ بسمل کی تڑپ آتش سنکر تڑپ گئے اور اس اصلاح کی داد دی۔

آتش نے ایک مرتبہ اپنا مطلع ؎

وہ نازنیں یہ نزاکت میں کچھ یگانہ ہوا
جو پہنی پھولوں کی بدھی تو درد شانہ ہوا

سنایا۔ حسین نے فوراً تصرف کر کے یوں پڑھا ؎

ادا و ناز و نزاکت میں وہ یگانہ ہوا
جو پہنی پھولوں کی بدھی تو درد شانہ ہوا

آتش نے ایک مرتبہ اپنا مطلع ؎

ہوس نعمت کی بعد مرگ بھی رہتی ہے انساں کو
لحد میں پاس رکھ دیتے ہیں ورد افتادہ دنداں کو

سنا کر کچھ فخریہ کلمات کہے۔ نواب کو خیال ہوا۔ کہ شاید مجھ پر طعن ہے۔ فوراً فرمایا ؎

مزا ہے حلقۂ وشن دلاں میں قید و تمکیں تک
کیا محروم سو نعمت سے اک جنبش نے دنداں کو

آتش تاڑ گیا اور معافی مانگی۔ کہ روئے سخن آپ کی طرف نہیں تھا۔

ناسخ کا مشہور شعر ؎ مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے
تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

دوسرے مصرع میں یوں تصرف کیا ؎ دبا دو آگ کے نیچے دھواں ہے

مسرت نے ایک مرتبہ اپنا مصرع قیامت ناسخ نے بیدل کے شعر کا بجنسہ ترجمہ کیا تھا۔ اس کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ بیدل کا شعر یہ ہے ؎

مسی آلود بر لب رنگ پاں است
تماشا کن کہ آتش در دھواں است

مسرت نے ایک مرتبہ اپنا مصرع "قیامت سرہی سایہ بزیر نقشِ پا ئے او" سنایا اور خاموشی اختیار کرلی۔ نواب نے فوراً سمجھ کر تین مطلعے فی البدیہہ موزوں کرکے سنائے ؎

مہ نو سر نگوں از ناخنِ انگشت پائے او ٭ شفق راغوطہ درخون میدہد رنگِ حنائے او
سزد آبے بروے گلستاں ہا خاکپائے او ٭ بجاں لالہا منت نہد رنگِ حنائے او
صفا آئینہ را بخشد غبار نقش پائے او ٭ چراغ گل فروزد آتشِ رنگِ حنائے او

مسرت اس برجستگی اور لطافت پر حیران رہ گیا۔

طبیعت نہایت غیور پائی تھی۔ عالی حوصلہ ایسے تھے۔ کہ غدر میں جب یہ گرفتار ہوئے لاکھ کوششیں ہوئیں۔ کہ اور باغیوں کا پتہ بتادیں مگر کسی کو نہ بتایا۔ اس تفتیش سے ان کے احباب پریشان تھے۔ کہ کہیں کسی کا نام نہ بتادیں۔ کچھ لوگ قید میں جاکر ملے اور اسکا پتہ لینا چاہا۔ نواب سمجھ گئے۔ اور دو شعر پڑھ کر خاموش ہو گئے ؎

برس رہی ہے میرے دل پہ بیکسی وہ ہار ٭ شکستہ حال ہوں جڑا ہوا دیا ر ہوں میں
میں وہ نہیں ہوں کہ یار و نکا بار خاطر ہوں ٭ شکستہ دست ہوں اپنے گلے کا ہار ہوں میں

چوتھے مصرع کی تشبیہہ قابلِ صد آفرین ہے "شکستہ دست ہوں اپنے گلے کا ہار ہوں میں" دست شکستگی میں گلے کا ہار ہوتا ہے۔

جوانی میں حسن پرستی کے ہاتھوں تمام علاقے تباہ ہو گئے لکھنو دہلی ایک تھا حسینانِ دہلی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ہم کو جلنے کے سوا کیا حاصل نظارہ تھا ٭ جاکے دہلی میں جسے دیکھا وہ آتش پارہ تھا
ایک دھوبن کو سرخ ساری میں دیکھ کر ؎
دور سے پیرہنِ سرخ دکھاتے نہ چلو ٭ خرمنِ صبر کو یوں آگ لگاتے نہ چلو

ایک جگہ اپنی غیور طبیعت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں

نروم بہ پیش دو ناں نہ ہم وقار خود را
بہ طپانچہ سرخ سازم رخِ اعتبار خود را

آپ کی شاعری کا میدان فارسی تھا۔ اردو میں میر و مصحفی کی روش پسند تھی۔

یاد رکھنا کہ رہ ریختہ گوئی ہے حسین ٭ نار واہے جو قدم بہ قدم میر نہ ہو
اگرچہ نخلِ سخن کے بہت ہیں فرح نگر ٭ اصول میرہے کافی غزل سرا کیلئے

ان دونوں کے بعد ناسخ اور آتش کو سمجھتے تھے۔ یہ لوگ انکے معاصر تھے

بعد میر و مصحفی آمین نہیں تنگ اے حسین ٭ ناسخ و آتش دو نو لکھنو کی جان تھے

آپ کا انتقال ۱۲۸۱ھ میں ہوا موضع مصری پور کے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔ تائب نے تاریخ لکھی ؎

عشق و سرور سے مجھے تائب فروغ ہے ٭ دل محو درد ہے تو جگر محو داغ ہے
اندھیر ہے جہان میں وفات حسین سے ٭ ہاتف پکارتا ہے ہوا گل چراغ ہے

نمونہ کلام اردو

منطقی مظہر ناقص کو اتم سمجھا ہے ٭ یہ معقولہ ہے نیا کیف کو کم سمجھا
عجب طرح کا تقابل ہے لفظ و معنی میں ٭ زباں کو حال نہیں دل کو قال نہیں
آسماں سے اب بلا نازل زمیں پر چاہیئے ٭ ایڑیوں تک تیری چوٹی اے ستمگر چاہیئے
درد نہ چارہ گر و سرزنش خدا کیلئے ٭ مریض ہجر کو تم زہر دو خدا کے لئے

بار احسان سے غیور کو جو تکلیف ہوتی ہے۔ اور کسی چیز سے نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

آسماں ٹوٹ پڑے سر پہ تو اندیشہ کیا ٭ بار احسان یہ نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
گندم کو کھا کے حضرت آدم نے کیا کیا ٭ اپنی تو کیا ہماری بھی مٹی خراب کی
مجھے ہے اپنی مجبوری پہ اب صبر ای آشنا ٭ خدا کو جب ہے قدر دعویٰ ہے اپنی کبریائی کا
قیامت میں بہر صورت اسے گر پڑ کے دیکھونگا ٭ مو پرے ہے ار دہ مجکو قسمت آزمائی کا
حسین سادہ دل نے وقت پیری ہائے نادانی ٭ لگایا دامن عصیاں میں دھبہ پارسائی کا

بعد زمانہ کی ناقدری کو دیکھیئے۔ کہ ایسے استاد کے کلام کا کوئی مجموعہ موجود نہیں۔ خدا بھلا کرے مولوی صبح الدین میاں صاحب کا کہ انہوں نے نہیں معلوم کہاں کہاں سے یہ جواہرات اکٹھے کئے خوردہ تاریخ شاہجہانپور میں تحریر فرماتے ہیں کہ میرے ایک کارندہ منشی احسان خاں صاحب نے ایک بیاض دی تھی جس میں انکی فارسی غزلیں تھیں (مگر اب یہ بیاض بھی مولانا کے یہاں سے غائب ہوگئی) نیاز الدین خاں نیاز کے پاس بھی اردو غزلیات کی ایک بیاض ہے، جسمیں ۲۰ غزلیں تھیں۔ یہ بھی مشہور ہے۔ کہ آپکے کلام کا ایک نسخہ نواب رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

عبدالحمید ایم۔ اے

کرایہ کیلئے خالی ہے

کئی مہینوں سے سامنے مکان پر وہی منحوس فقرہ لکھا ہوا تھا
"کرایہ کے لئے خالی ہے"

جو کرایہ دار اس میں پہلے رہتے تھے۔ انکے ننھے ننھے بچے تھے، وہ سامنے کھڑکی میں آ کھڑے ہوتے۔ یہ ان سے اپنا دِل بہلایا کرتی رات کو جب سامنے کا کمرہ بتی قمقمے سے روشن ہو جاتا۔ اور اس میں وہ کھیلتے۔ شور مچاتے۔ تو یہ اپنے آپ کو ان میں تصور کرنے لگتی۔ جب اِن کی ماما، انہیں دھمکا کر بستر پر لٹا لیتی اسے سامانِ تفریح ملتا رہتا۔ مگر اب اس منحوس فقرے سے گویا تمام سامانِ تفریح اس سے چھن گیا،

یوں تو گھر میں اسکے اپنے بہن بھائی بھی تھے، وہ بھی تمام دن غل کرتے رہتے، کھیلیں کھیلتے، مگر اس کی پروا نہ کرتے، یہ ان کی کھیلوں میں شامل نہ ہو سکتی تھی، بچوں کی شوخ کھیلیں یہ نہ کھیل سکتی تھی۔ اونچ نیچ، کوڑا چھپا کی یا آنکھ مچولی، ایسی کھیلیں جن میں ٹانگوں کا بے تکان استعمال ہو اس کی قسمت میں نہ تھیں۔ قدرت نے اسے ٹانگوں کی طاقت سے محروم رکھا تھا۔

کبھی کبھار لکڑی کا سہارا لے کر یہ ان میں جا ملتی، ایک جگہ بیٹھ آنکھ مچولی میں منصف بنجاتی، اونچ نیچ میں فیصلہ کرتی۔ مگر اس کی ایسی روش سے بچوں کو اتنی نفرت ہو گئی جتنی کسی امتحان میں امیدواروں کو ممتحن سے ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس سے دور رہنے لگے، حتیٰ کہ اسکے لئے تمام دنیا سمٹ سمٹا کر اس کا کمرہ بنکر رہ گئی، اور جب سے سامنے کا مکان خالی ہوا اس کی رہی سہی تفریح بھی جاتی رہی۔

وہ اداس تھی۔ لیکن آخر جوانی نے اسے ایک نیا شغل دے دیا اسکے کمرے میں ایک تصویر لگی ہوئی تھی، شام کے قریب وہ اُسکے سامنے بیٹھ جاتی، ایک لمبا تڑنگا نوجوان کاندھے پہ جال اور ہاتھ میں ایک ٹوکرا لئے تمام دن کی مشقت کے بعد گھر آتا اسے نظر آتا! آہستہ آہستہ مگر اعتبار کے ساتھ قدم اٹھاتا۔ اسے یوں معلوم ہوتا۔ کہ یہ اسکے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اور ایک لمبا چوڑا واقعہ اس کے ذہن میں یاد آنے لگتا! اسے یوں معلوم ہوتا۔ کہ وہ گھر کی صفائی کر چکی ہے، ہر چیز اپنی جگہ پر ہے، ماہی گیر کے لئے بستر لگا ہوا ہے۔ سرہانے موتیے کے چند پھول ہیں، اس نے روٹی تیار کر لی ہے۔ آگ سلگا رکھی ہے، کہ وہ خوب گرم کر کے کھائے، ماہی گیر آتا ہے۔ یہ بڑھ کر اسکے قدم لیتی ہے۔ وہ اسے اٹھا کر ماتھے پر بوسہ دیتا ہے۔ اور اسکے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندر آ جاتا ہے۔ یہ کھانا لا کر اُسکے سامنے رکھتی ہے۔ دونوں کھاتے ہیں، جوں جوں رات گاڑھی ہوتی جاتی ہے۔ ان پر پریم کا نشہ زیادہ چھائے جاتا ہے۔

ابھی ذہن میں خیالات اسی حد تک پہونچتے۔ کہ اسے نیند آ جاتی اور اسکے خوابوں کی دنیا شروع ہو جاتی۔

اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز اپنے یہی رنگین خواب تھے،،

* * * * *

سامنے کے مکان پر سے وہ منحوس فقرہ اٹھ گیا۔
تصویر کے پیچھے چڑیوں نے گھونسلا بنانا شروع کر دیا، بہار کا موسم آ پہنچا تھا،
سامنے کھڑکی کے قریب ایک میز لگی تھی۔ اسپر کتابیں نہایت

نفاست کے ساتھ رکھی ہوتیں۔ سامنے بیٹھ کر نیا کرایہ دار روز شام کو
پڑھنے لگا۔ نوجوان چوڑا چکلا، قدآور تھا، مگر سیاہی مائل اور چیچک
رو، بال سنوارے ہوتے اور کپڑے احتیاط سے پہنتا تھا۔ دور سے
چیچک کے داغ صاف دکھائی نہ دیتے تھے پہلے روز وہ لڑکی کو
اتنا خوبصورت معلوم نہ ہوا؛ البتہ اس کی جوانی تصویر والے ماہی گیر
سے ملتی جلتی تھی، ماہی گیر صرف ایک لنگوٹی سی پہنے تھا۔ اسلئے اس
کے جسم کی ہر لکیر نظر آتی تھی۔ اور طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔ مگر خدا جانے
اس نوجوان کے جسم کی جھریں کیسی تھیں، ہاں چہرے سے نظر آتا تھا
کہ نوجوان باہمت اور گہرے جذبات کا مالک ہے۔

روز شام کو جب وہ پڑھنے بیٹھتا۔ تو وہ اسے دیکھا کرتی،
اپنے کمرے کی روشنی پہلے گل کر لیتی۔ تاکہ وہ اسے نہ دیکھ سکے آہستہ
آہستہ اسے محسوس ہونے لگا۔ کہ وہ بدصورت نہیں۔ خوشرو ہے

ایک روز اس نے اپنے کمرے کی روشنی گل نہ کیا۔ جب وہ کھڑکی
میں آئی۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ نوجوان ایک پاؤں کھڑکی کی دہلیز پر رکھے
ہاتھ میں سگرٹ سلگائے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے جلدی
سے روشنی گل کر دی، کچھ دیر وہ کھڑا رہا، پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے
لگا۔ اس نے پھر روشنی کر لی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، مسکرایا، اور پھر کام
میں مشغول ہو گیا۔ اسی روز اسے محسوس ہوا۔ کہ نوجوان حسین ہے۔
ماہی گیر سے بھی زیادہ حسین!

تھوڑے دنوں میں حجاب اٹھ گیا، روشنی دونوں کمروں میں
رہتی، نوجوان بیٹھا کام کرتا تھا۔ وہ بیٹھی دیکھا کرتی،

آج شام کو بھی وہ روز کی طرح اپنی زیبائش و نمائش کی دھن
سے فارغ ہو کر کھڑکی کا سہارا چھوڑ کر ان کرسیوں کی پشتوں کا
سہارا لیتے ہوئے۔ جو اس نے ایک لکیر میں اپنے شیشے سے لیکر کھڑکی
تک لگائی ہوئی تھیں۔ کھڑکی تک پہنچی۔ مگر سامنے کھڑکی بند تھی شیشوں
میں سے نظر آتا تھا۔ کہ اندر روشنی ہے،

وہ ضرور اندر ہے، مگر اس کے پاس کون ہے۔ جو اس نے
کھڑکی بند کی ہے، کوئی اور ... نہیں نوجوان ایسا نہیں، مگر
اسے کہیں معلوم نہ ہو گیا ہو کہ میں روگی ہوں ... نہیں اسے کیا
معلوم، کھڑکی کی دہلیز کافی اونچی ہے۔ اور میری کھڑکی اس سے نیچی
ہے ... نہیں۔

کسی عزم قوی بندہ کے ماتحت اس نے قریب ہی سے تپائی کا
پھولدان اٹھایا، ایک دو مرتبہ اسے سر کے قریب لا کر ہلایا اور پھر
ایک ایسے جوش میں اس کی کھڑکی کی طرف دے مارا، وہ کھڑکی کے
قریب دیوار پر لگا اور ریزہ ریزہ ہو گیا، کھڑکی کھلی، نوجوان نے سامنے
دیکھا۔ پھر اپنے مکان کی دیوار کی طرف پھر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا
کھڑکی کھلی رہی۔ اور وہ پڑھنے لگا،

"وہ اس نے مجھے تنگ کرنے کی خاطر کیا ہے، اندر کوئی دوسرا
نہ تھا، ہاں ... یہ مجھے پہلے ہی سے امید تھی، وہ ایسا نہیں ہے۔ مگر
مجھے تنگ کیوں کیا، وہ چاہتا ہے کہ میں اسے اپنی ساری محبت یکدم
دے دوں، ایسا نہیں ہو گا، جب تک وہ تمام محبت میرے لئے
وقف نہ کر دے۔ میں بھی اسے تنگ کر سکتی ہوں، کروں گی، میں بھی
کل اپنی کھڑکی کا دروازہ بند رکھوں گی

اس نے مڑ کر دیکھا، تصویر کے نیچے چڑیوں نے گھونسلا تیار
کر لیا تھا۔ ماہی گیر گھر آ رہا تھا، مگر اسکے خوابوں کی دنیا بدل چکی تھی؛
آج کھڑکی بند رہے گی، کل بھی، اور پرسوں بھی،

آج اسے محسوس ہو رہا ہو گا۔ کہ میرا کیا حال ہوا تھا۔ کھڑکی بند
کر لی تھی نا اس نے آج میں نے بھی کر لی ہے، اس وقت وہ کمرے
میں تیزی سے چل رہا ہو گا، کبھی ادھر آتا ہو گا، کبھی ادھر جاتا ہو گا
پھر کھڑکی میں کھڑے ہو کر ایک پاؤں دہلیز پر رکھ کر سگریٹ پیتا ہو گا
جس کا دھواں پیچ و تاب کھاتا ہوا اسکے منہ سے نکلے گا۔

مجھے سگرٹ پینا تو اتنا برا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اس کی بو سے
نفرت ہے، اسے یہ عادت چھوڑنا پڑے گی، اور وہ کیوں نہ چھوڑیگا
میں چھڑا دوں گی "

اب اُس کی بے چینی بھی تو بڑھ رہی ہو گی، پھولدان ابھی میرے کمرے کی دیوار پہ مارے گا، مگر میں تب بھی دروازہ نہ کھولوں گی اس نے سمجھے کیا سمجھا تھا جو مجھے تنگ کرنے کی اسے سوجھی تھی، میں اسے زیادہ تنگ کر سکتی ہوں، مگر، مگر اتنا تنگ نہ کروں گی۔ کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں، نہیں میں اُس کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دوں۔ . . . مگر شاید اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہو کر زیادہ خوبصورت ہو جائیں نہیں مرد کو رونا نہیں چاہیئے: میں اسے رلاؤں گی نہیں، وہ ذرا سا اشارہ کرے تو میں کھڑکی کو کھول دونگی۔ اُس نے بھی تو کھول دی تھی،

کافی وقت گزر گیا

شاید اس کے کمرے میں پھولدان نہیں ہے۔ مجھے کھڑکی بند کرنے سے پہلے اسے کوئی تحفہ ضرور بھیجنا چاہیئے تھا۔ منو پہنچا آئے گا: میں اسے اب بھیج دوں گی، منو کو کوئی چیز دے دونگی۔ اسے خوش کروں گی، وہ خط بھی تو بھیج سکتا ہے۔ مگر پہلے مجھے نہیں لکھنا چاہیئے، پہلے تو اسے ہی لکھنا چاہیئے، اگر وہ لکھے گا۔ تو میں اسپر بگڑ جاؤں گی۔ پھر منت۔ سماجت تو وہی کریگا، تنگ اُسے نہ کرونگی جھٹ مان جاؤنگی، مگر اسنے تو میرے پہلے اشارے پر دروازہ کھول دیا تھا اگر وہ خط لکھے۔ تو مجھے فوراً جواب دینا چاہیئے۔ میں اسے سب کچھ بتا دوں گی۔ اپنے روئیں، روئیں کی ساری محبت اسکے لئے وقف کر دوں گی۔ . . . مگر وہ کھڑکی پر اپنی کتاب کیوں نہیں دے مارتا۔ . . . . . .''

چوکیداروں کی آوازیں آنے لگیں

''میری محبت مانگتا ہے۔ اور خود اپنی محبت دینا نہیں چاہتا، میں کھڑکی بند ہی رکھوں گی۔ کل بھی اور پرسوں بھی، اسے مجبور کروں گی۔ کہ وہ میرا ہو کر رہے۔ . . ''. .

کھڑکی دن بھر بند رہی، شام ہو گئی۔ پہاڑ سا دن کٹ گیا آخر اتنی شام ہو چکی تھی مگر چڑیاں ابھی گھونسلوں میں واپس نہ آئی تھیں ـــــــ میں ابھی تک تیار نہیں ہوئی، اگر وہ ابھی کوئی چیز مار دے۔ تو وہ مجھے ایسی بھونڈی صورت میں دیکھے گا، پاگل ہوں میں بھی، مجھے تیار ہونا چاہیئے تھا، وہ پریشان ہو رہا ہو گا، میں نے زیادتی کی ہے، اسے تنگ نہ کرنا چاہیئے تھا، مرد تو تنگ کرتے ہی ہیں۔ مجھے اس طرح نہ کرنا چاہیئے تھا، مگر . . . مگر اس طرح وہ خیال کریگا۔ کہ میں اسپر مرمٹی ہوں۔ میری کمزوریاں اُس پر ظاہر ہو جائیں گی، اور ابھی میں نے اسے اپنی ٹانگوں کے متعلق بھی نہیں بتلایا۔ . . . . . اسے میری پروا نہیں۔ . کھڑکی تو اس نے کھول دی تھی، ناراض ہو گیا ہو گا، اتنی سی بات پہ ناراض ہو گیا ہے، میری غرض اسے تنگ کرنا تو تھا نہیں۔ . . . مان جائیگا میں مناؤنگی اسے، وہ ایسا نہیں ہے، میں نے خواہ مخواہ اسے حیران کیا ہے، ابھی تنگ کر رہی ہوں۔ . . . .

''کھڑکی مجھے کھول دینی چاہیئے، مگر یہ تو میں نے ہار مان لی میں ہار کیوں مانوں، اگر وہ پریشان ہے۔ تو میں کچھ کم تو نہیں، میں بھی تو حیران ہو رہی ہوں، شائد اس میں اتنی جراٴت نہیں کہ میری دیوار پر کچھ مار دے، ہمسایوں کا ڈر ہو گا۔ ورنہ ایسا ضرور کرتا۔

''مجھے ہار مان لینی چاہیئے، آخر عورتیں کمزور دل ہوتی ہیں وہ مرد ٹھہرا، طاقت ور، بہت ہو چکی۔ اب کھڑکی کھول دینی چاہیئے یہ سوچکر وہ کھڑکی کی طرف بڑھی، مگر اپنی نمائش کا خیال آیا، پھر کیا ہوا، اگر آج میں تیار نہیں ہوئی، اسے معلوم تو ہو جائیگا۔ کہ میری پریشانی کا کیا حال ہے۔ . . بال بکھرے ہوئے ہیں، انہیں چہرے پر اور بکھا لینا چاہیئے اسے یوں معلوم ہوا کہ اسکا دل پھٹ جائیگا، ایک منٹ، ایک منٹ، اگر کھڑکی کا دروازہ نہ کھلا۔ تو وہ مر جائے گی۔

ایک ہاتھ دل پہ رکھے دوسرے سے اس پورے زور سے کھڑکی کے پٹ کھولے تصویر گر کر چکنا چور ہو گئی۔

سامنے مکان میں اندھیرا تھا، پٹ بند تھے۔ سڑک کی روشنی میں بھی منحوس فقرہ دیوانے پر پڑھا جاتا تھا ''کرایہ کیلئے خالی ہے''

دو غزلیں

(یہ غزل ۲۴ جنوری ۱۹۴۱ء کو دیال سنگھ کالج لاہور کے [illegible] انعامی مشاعرہ میں پڑھی گئی۔ اور اسے اول انعام ملا)

بتوں کو کبریائی کیوں نہ آئی
خدا ہو کر خدائی کیوں نہ آئی

نہیں معلوم شیخِ پارسا کو
ابھی تک پارسائی کیوں نہ آئی

مزاجِ یار رنگیں تھا مرے کام
مری رنگیں نوائی کیوں نہ آئی

وفا بھی دلربائی کا ہے انداز
تمہیں یہ دلربائی کیوں نہ آئی

جو تم نے سیکھ لی غیر آشنائی
مجھے دشمن کی آئی کیوں نہ آئی

محبت خاکساری ہے تو پھر اس
مجھے یہ جبہ سائی کیوں نہ آئی

جنہیں وعدوں کی طاقت دی خدا نے
انہیں وعدہ وفائی کیوں نہ آئی

شبِ غم کی نہ صورت دیکھتی میں
"اجل روزِ جدائی کیوں نہ آئی"

سکینہ محمود

ہونے لگا شاید ہمیں عرفانِ محبت
دنیا نظر آنے لگی عنوانِ محبت

اک نسبتِ موہوم کا اعجاز ہے واللہ
ہم جس کو سمجھ بیٹھے ہیں پیمانِ محبت

صدقے ہیں کسی شوخ کی جادو نگہی کے
امڈا ہوا ہر شے میں ہے طوفانِ محبت

اک لطفِ نظر آفتِ جاں باعثِ صد لطف
دل غنچۂ راحت ہے کہ پیکانِ محبت

جل بجھنے کو دل اور رہیں یہ جانبکو آنکھیں
کب دیکھیے لٹ جائے یہ سامانِ محبت

سوزندگی اپنی ہے مجید اس پہ تصدق
تم تھام کے مرجاؤ جو دامانِ محبت

عبدالمجید بھٹی

یت گردن پر پانچ انگلیوں کی گرفت موت بنکر کئی زندگیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

اس کے بعد وہ انگلیوں کے متعلق سوچنے لگی۔ اور اس نے ہاتھ میز پر پھیلا دیا۔ اس کی لمبی انگلیاں کتنی پتلی تھیں۔ ... کتنے خوبصورت تھے۔ ان انگلیوں کی کئی بار تعریف ہو چکی تھی۔ کالج کی محفل سرود میں جب وہ پیانو پر بجلی کی تیزی کے ساتھ رقص کرتیں۔ تو وہ ان پر فخریہ انداز سے نظر ڈال کر دل ہی دل میں خوش ہوتی۔

اور پریشن تھیٹر میں اسے پھرتی سے چیر پھاڑ میں مصروف دیکھ کر ڈاکٹر نے کئی بار "حیرت انگیز انگلیاں" کہہ کر اس کی تعریف کی تھی۔ ایک دن کسی نے یہ بھی کہا تھا۔ "کاش! یہ انگلیاں جراحی کی بجائے مصوری کرتیں"

پشپا کو پامسٹری کا شوق تھا۔ اس نے اس ضمن میں بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ انگلیوں کی ساخت سے وہ بتا سکتی تھی۔ کہ ان کا مالک کس قسم کا آدمی تھا۔ اپنے ہم جماعتوں میں سے اسے کرشن کمار سے بڑی محبت تھی۔ اس کی زیادہ تر وجہ اس کی خوبصورت انگلیاں تھیں۔ اور بنواری لال نے بہت کوشش کی کہ پشپا کے دل میں جگہ حاصل کر سکے۔ وہ جسمانی لحاظ سے کرشن سے کچھ خوبصورت ہی تھا۔ لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کی ساخت کچھ عجیب سی تھی۔ اس کا دل بھی میلا تھا۔ اور دماغ مجرمانہ۔ اسکا ہاتھ دیکھ کر ہی پشپا کو اس سے نفرت ہو گئی تھی۔

کرشن کمار اور پشپا کی دلی مناسبت کا اثر بنواری پر بڑا ہوا اس نے کئی بار کرشن سے شرارت کی۔ اسکے تجربات خراب کروئے اس سے لڑائی مول لینا چاہی۔ اس نے دو دفعہ کو دہشت زدہ کر کے ان کی ملاقاتیں عارضی طور پر بند کرا دیں۔

انگلیاں --- اسکے خیالات اسی نقطے کے گرد گھوم رہے تھے۔ انگلیاں --- وہ اپنی انگلیاں دیکھ رہی تھی۔ پہلی بار جب اس نے ایک مردہ لاش کو چھوا تھا۔ تو اسے ایسے محسوس ہوا گویا وہ ایک برف کا ٹکڑا ہے --- اور جب پہلی بار کرشن نے ایک شام اسکے ہاتھ کو چھوا تو۔ وہ کس طرح چونکی تھی بجلی کی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ انگلیوں کا لمس اسے ابھی تک یاد تھا۔ اسکے چہرے پر ایک سرخی دوڑ گئی۔

مرد کی انگلیاں جب کسی عورت کے جسم کو چھو جائیں۔ تو دل کی ساری باتیں بتا دیتی ہیں۔ ان کا چھونا چھونے والے کی نیت کا حال ظاہر کر دیتا ہے۔ کرشن کا لمس --- وفور شوق میں اس قدر بلند پروازی کرتا کہ پشپا اس کے لیے حسن کی دیوی بن جاتی۔ اور وہ اسکے قدموں کو چھو کر دل کو تسکین دیتا لیکن بنواری --- ہاں ایک دفعہ غلطی سے بنواری کی انگلیوں نے پشپا کے ہاتھوں کو چھو لیا تھا۔ اور چھونے کے اس مختصر سے عمل میں کتنے ہوس کارانہ جذبات نمایاں تھے۔ شاید بنواری کے نزدیک عورت مرد کا مال غنیمت تھا۔ یا محض ایک کھلونا۔

کرشن کی خوبصورت انگلیاں پشپا کا دل چھین کر لے گئیں۔ اور وہ مسرور تھی۔ ان انگلیوں میں دل دے کر وہ بامراد ہو گئی۔ لیکن بنواری کا ہاتھ --- ایک قصاب کا بیرحم ہاتھ تھا جس کے لئے دل صرف گوشت کا ٹکڑا تھا۔ . . . .

دیوار پر ایک قد آدم تصویر آویزاں تھی۔ جو کپڑے پر دھاگے سے کاڑھی گئی تھی۔ پشپا کی نگاہیں اچانک اس پر جم گئیں۔ یہ اس کی مرحوم استانی کی نشانی تھی۔ ایک نوخیز بچہ گھاس کے تختے پر بیٹھا تھا۔ اس کی کتابیں ادھر اودھر بکھری پڑی تھیں اسکے لبوں پر ایک مقدس مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کمال اشتیاق سے اپنی روشن آنکھیں آسمان پر گاڑ رکھی

تھیں۔ جن کی نیلاہٹوں میں سے ایک حسین و جمیل فرشتہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اسکے ہاتھ میں ایک شمع تھی جس کے گرد ایک نورانی ہالہ تھا۔ شمع کی لو میں لفظ "علم" لکھا ہوا تھا۔

نیچے کے دائیں جانب ایک جھاڑی تھی جس کی چوٹی پر دو کوّے بٹھا دئے گئے تھے۔ ایک چھوٹا ایک بڑا۔ بڑے نے چھوٹے کی چونچ میں اپنی ساری چونچ ڈال رکھی تھی۔ دونوں کی آنکھیں بند تھیں۔ .... اس تصویر کے نیچے "طالب علم" لکھا تھا۔

استانی نے ساری عمر اس تصویر پر صرف کر دی تھی۔ وہ بے چاری خوبصورت نہ تھی۔ اس لئے عمر بھر کنواری رہی۔ سکول میں سب اس سے نفرت کرتے۔ اس کا نام "چڑیل" رکھا ہوا تھا۔ لیکن کون جانے کہ اس کا دل کس قدر حسین اور منور تھا۔ بھری جوانی میں ہی گھل گھل کر مر گئی۔ مرنے سے پہلے اس نے لیشیا کو یہ تصویر تحفہ دی۔ آخری نشانی! لیشیا کی ماں نے استانی کو بہن بنالیا تھا۔

تصویر کے شیشے پر لیشیا کو پھر ایک ہاتھ دکھائی دیا۔ نازک نازک انگلیاں سوئی سے کشیدہ کاری کر رہی تھیں۔ انگلیاں پتلی پتلی لمبی لمبی، مگر سیہ فام۔ ان پر گوشت کا نام نہ تھا۔ وہ پھرتی سے اپنا کام کر رہی تھیں۔ شیشہ بتدریج روشن ہوتا چلا گیا۔ اس نے استانی کا پژمردہ چہرہ دیکھا۔ نگاہیں کپڑے پر گڑی تھیں۔ بھاری بھاری پلکیں اس کی آنکھوں کو بوجھل بنا رہی تھیں۔ انگلیاں مشین کے پرزوں کی طرح اپنا کام کئے جارہی تھیں۔ تاریکی میں کئی لمبے لمبے ہاتھ نمودار ہوئے موٹی موٹی بھدی انگلیاں۔ وہ استانی کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن استانی اُن سے بے خبر کام کئے جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ آگے بڑھتے گئے اُسے صرف انگلیاں نظر آ رہی تھیں۔ استانی کا گلا دبایا جا رہا تھا۔ فضا میں ایک طوفان سا محسوس ہونے لگا۔ چڑیل! چڑیل!! چڑیل!!! ایک شور تھا جو چاروں طرف بپا ہوگیا مگر استانی کی زبان بند تھی۔ اسکا پژمردہ چہرہ اور بھی زرد ہوگیا مگر اس کی انگلیاں باقاعدہ حرکت کر رہی تھیں۔

اچانک اسی دھندلکے میں اس نے ہیڈ مسٹرس کا دفتر دیکھا۔ ایک بوڑھی عورت بیٹھی لکھ رہی تھی۔ اور سامنے استانی منتظر کھڑی تھی۔ مایوس اور لاغر۔ بڑھیا نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور بولی۔ "آپ بیمار ہیں۔ میں بچیوں کو بیمار کرنا نہیں چاہتی آج سے آپ کو علیحدہ کیا جاتا ہے۔" استانی نے ڈگمگاتے ہوئے بڑھیا کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو —— اور پھر اُسے بڑھیا کی انگلیاں اور گردن کے گلے میں پڑے ہوئے نیلے نشان نظر آنے لگے۔

اور لیشیا چیخ کر اپنے بستر پر جاگی۔

ایں بادِ خوش وایں چمن وایں مہتاب — ایں سبزہ وایں جوئے رواں دمے ناب

باشی چو تو اینہا ہمہ اسبابِ طرب — لاکن چو نباشی ہمہ یک باطل خواب

سردار انور خاں انور

پروفیسر کنہیا لال کپور ایم اے

نام

(کرشن چندر، حجاب امتیاز علی، منٹو، ایم اسلم سے معذرت کے ساتھ)

میرے دوست کرشن چندر کا قول ہے۔ کہ کتاب لکھنے کی نسبت کتاب کا نام تجویز کرنا زیادہ مشکل ہے۔ ایک عرصہ تک مجھے اِس قول کی صداقت کے متعلق شک رہا۔ لیکن جب پچھلے ہفتہ مجھے ایک کتاب نام تجویز کرنے کی ناگہانی مصیبت پیش آئی۔ تو مجھے اپنے دوست پر ایمان لاتے ہی بنی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ایک کتاب کے لئے جتنے خوبصورت نام تجویز ہو سکتے ہیں وہ تو متقدمین نے پہلے ہی اپنا لئے ہیں۔ "گلستاں"، "کارواں"، "کوثر"، "نرگس"، اور "شعلے" سب کے سب بہت مدت سے کسی نہ کسی مشرق کی زینت بن چکے ہیں۔ اب صرف "جہنم"، "دھواں"، "چنبیلی"، متاخرین کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ آجکل اچھے ناموں کی نہ صرف کمی ہے۔ بلکہ ایک اچھا خاصہ قحط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین نے یہ سازش کر رکھی تھی۔ کہ کوئی اچھا نام اُن کی زد سے نہ بچے۔ منشی پریم چند کو ہی لیجئے۔ اُنکے ہر ایک ناول کے نام میں وہ مقناطیسی کشش ہے کہ انسان اُن کی جانب راغب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "چوگانِ ہستی"، "فردوسِ خیال" جیسے نام ایک خوبصورت شعر کی طرح پڑھنے والے کے دل میں بے ساختہ اُتر جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کی تقریباً ہر تصنیف کے نام میں وہ جاذبیت ہے، کہ ہمیں بے اختیار اُن کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" جیسے ناموں میں ایک نغمے کی شیرینی اور متعدد تلواروں کی جھنکار پوشیدہ ہے۔ اب اُنکے مقابلے میں ہمارے زندہ شاعروں کی کتابوں کے نام ملاحظہ فرمائیے۔ "زیر و زبر"، "صبح و شام"، "سیاہ و سفید"، "این و آں"، "شیر و شکر"، شاید انہی ناموں کے پھیکے پن کو دیکھ کر میرے دوست نریندر ناتھ نے ایک دفعہ کہا تھا، کہ موجودہ زمانے کے شعرا اگر بجائے ایسے نام ایجاد کرنے کے پرانے ناموں کو تھوڑے بہت تصرف کے ساتھ استعمال کریں، تو مناسب ہوگا۔ مثلاً "بالِ جبریل" کی طرز پر "بالِ عزرائیل" یا "بالِ اسرافیل" یا "بالِ ابابیل" وغیرہ مجھے اُن کی اس تجویز سے کلیتاً اتفاق ہے۔ مثلاً حجاب امتیاز علی کے افسانوں کا نام "صنوبر کے سائے" مجھے بہت پسند ہے۔ گو یہ صحیح ہے۔ کہ میں نے آجتک صنوبر کا درخت نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی کبھی اُسکے سائے میں بیٹھا ہوں۔ اب اگر کوئی صاحب اپنی کتاب کا نام "کیکر کے سائے" تجویز کریں تو مجھے از حد مسرت ہوگی کیونکہ پنجاب میں کیکر بکثرت ہوتا ہے۔ اور ہم میں سے تقریباً ہر ایک کو اُسکے سائے میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس جدت کا یہ بھی فائدہ ہوگا۔ کہ ہر ایک نام کا ایک سلسلہ قائم ہو جائیگا۔ مثلاً "کیکر کے سائے" کے بعد "شیشم کے سائے" اور پھر "شہتوت کے سائے" اور پھر "انار کے سائے"۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص "صنوبر کے سائے" کا مطالعہ کریگا یقیناً اُس کی خواہش ہوگی۔ کہ اب "چنار کے سائے" پڑھوں۔ اور اگر اور کسی بات کے لئے نہیں۔ تو صرف اس امر کے لئے کہ اُن دو نو درختوں میں کس کی چھاؤں زیادہ میٹھی اور گھنی ہے۔ نیز مصنفوں کو اپنی نئی کتابوں کے نام تلاش کرنے میں سہولت ہو جائیگی۔ مثلاً کرشن چندر صاحب "طلسمِ خیال" کے بعد "پروازِ خیال"، "نیرنگِ خیال"، "سمندِ خیال" جیسے ناموں کے ماتحت اپنے تمام افسانوں کے مجموعے شائع کر سکتے ہیں اور "نظارے" کے بعد "شرارے" "شرارے" کے بعد "غبارے"

اور غبارے کے بعد ٹلیاڑے، نہایت آسانی کے ساتھ معرضِ وجود میں لاسکتے ہیں۔

آپ کچھ ہی کہیں کسی کتاب کے لئے آجکل ایک اچھا نام تجویز کرنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔ آجکل اچھا نام صرف اتفاق سے رکھا جاسکتا ہے۔ جیسے سعادت حسن منٹو نے اپنے ڈراموں کا نام "آؤ" رکھدیا ہے۔ اپنے ڈراموں کے مجموعے کا نام "آؤ" رکھ کر منٹو نے نہ صرف انتہائی جرأت سے کام لیا ہے۔ بلکہ ہر ایک مصنف کو نام تجویز کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ بتایا ہے۔ بیشک اب اچھے ناموں کی کمی ہے۔ مگر ابھی اردو زبان میں مصادر کی کمی نہیں۔ اور پھر ہر ایک مصدر سے فعل امر بنانا چنداں مشکل نہیں۔ چنانچہ انہوں نے آنا مصدر سے فعل امر بناتے ہوئے "آؤ" سے ابتدا کی ہے۔ اب آپ اُنکے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے "جاؤ" "گاؤ" "کھاؤ" "لڑو" "دوڑو" "بھاگو" وغیرہ متعدد نام سوچ سکتے ہیں۔ ان ناموں میں جہاں سادگی ہے تو وہاں دعوتِ عمل بھی ہے۔ مثلاً پڑھنے والا جب "بھاگو" جیسی کتاب کا سرورق پڑھیگا تو کم از کم مصنف کی ایک بات پر تو عمل کریگا یعنی سر پر پاؤں رکھکر بھاگے گا۔

دوسرے اس قسم کے نام میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ "ہوائی قلعے" کا سرورق پڑھ کر کوئی شخص غلطی سے یہ سمجھ لے کہ شاید اس کتاب میں ہوائی جنگ کے متعلق کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔ یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ "ہوا میں" کس طرح قلعے بنانے چاہئیں اور کس طرح دشمن کو نرغے میں لانا چاہیئے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ "سحرِ فرانس" کو کوئی جادو یا طلسم کی کتاب تصور کرے۔ مگر "آؤ" کا مطلب سوائے "آؤ" کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسکے بعد بھی اگر آپ کو "آؤ" جیسا نام ناپسند ہو۔ تو آپ کم از کم اس بات کا اعتراف تو کرینگے۔ کہ "آؤ" "ایم اسلم" کے "نمستے علیکم" سے بدرجہا اچھا نام ہے۔ "آؤ" جتنا مختصر ہے "نمستے علیکم" اتنا ہی بے ڈھب ہے۔ "آؤ" میں اچھوتا پن نہ سہی۔ مگر اختصار تو ہے "نمستے علیکم" میں ہندو مسلم اتحاد ہو تو ہو۔ مگر ترنم اور اختصار نہیں۔

شاید "نمستے علیکم" کو دیکھ کر میرے دوست مہندر ناتھ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر تو یہ ہوتا، کہ اسلم صاحب اس کتاب کا نام "مسجد و مندر" رکھ دیتے۔ گو میری دانست میں "شیخ و برہمن" زیادہ موزوں رہتا۔ میرے دوست مہندر ناتھ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اگر ہمارے مصنف انگریزی مصنفوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے ناولوں کے نام اُردو کے اچھے شعروں اور مصرعوں سے اخذ کریں۔ تو یہ جدت خوب ہے۔ مثلاً "ٹامس ہارڈی" نے اپنے ایک ناول کا نام (UNDER THE GREENWOOD TREE) رکھا ہے اور یہ مصرع شیکسپیر کے ایک مشہور گیت کا حصہ ہے۔ اسی طرح ہارڈی کے ایک اور ناول کا نام (FAR FROM THE MADDING CROWD) ہے۔ اور یہ مصرع تھامس گرے کی ایک المیہ نظم سے لیا گیا ہے۔ میرے دوست کا خیال ہے کہ اردو ناول نویسوں کو بھی اب اسطرح کے نام رکھنے چاہئیں۔ مثلاً عشق و محبت کی داستانوں کے نام کچھ اس قسم کے ہوں "عشق پر زور نہیں ..." "عشق نے غالب نکما کر دیا" "دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی" "جہاں ریحانہ رہتی تھی" اور رنج و غم کے افسانوں کے نام اس طرح کے ہوں۔ "ہم روتے پہ آجائیں تو" "مجھ غمزدہ کو نیند نہ آئی تمام رات" "تھمتے تھمتے ہی تھمیں گے آنسو" وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ میں نے اُن کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک دوست کی کتاب کا یہ نام تجویز کیا ہے: "شرم تم کو مگر نہیں آتی" یہ مصرع جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ حضرت غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں۔ کہ آپ اس مصرع کی معنوی اور صوری خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میری جدت کی داد دیجئے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

تسکین عابدی

سونے کی چڑیا

افراد

منصور	ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر
شوکت	منصور کی نوجوان بیوی
شریف۔	ایک ملازم لڑکا۔
مقام	ہندوستان کا کوئی ایک شہر
وقتِ شام ——	موسم بارش

منظر

(منصور کا کمرۂ ملاقات معمولی طور پر سجا ہوا ہے منصور اور شوکت آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں بیچ میں ایک خوبصورت اسٹول ہے جس پر ٹیلیفون رکھا ہوا ہے)

شوکت۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی فقیر کسی بخیل کے مکان پر سے گزرتا ہے۔ تو یہ صدا دیتا ہے۔ . . . . . .

منصور۔ (بات کاٹ کر) یعنی وہ کونسی صدا ؟

شوکت۔ یہی کہ —— دل غنی رحمت اللہ، مال غنی لعنت اللہ —— مگر اب تو مجھی کو یہ صدا دینی پڑ رہی ہے

منصور۔ چھی، چھی —— چھی، کیسی واہیات سی باتیں کر رہی ہو! —— بیوی تم نہیں سمجھتیں —— پیسہ بہت بڑی چیز ہے آج جس کے پاس پیسہ نہیں۔ وہ بھی کیا کوئی انسان ہے؟ اسکو انسان تو کیا ایک جانور کا درجہ بھی نہیں دیا جا سکتا —— سمجھیں؟ اُون ہوں، نہیں سمجھیں!

شوکت۔ جی ہاں! ابیں کیوں سمجھنے لگی، سمجھتی اسوقت جب کہ تم بیس ہی روپیہ کی ساری لی ہوتی۔

منصور۔ ہاں، ہاں بیوی! اسی وقت تم کفایت شعار اور معاملہ فہم کہلاتیں،

شوکت۔ مگر میں نے تو آپ کا کوئی ایسا نقصان ہی نہیں کیا جس کی وجہ سے آپ اتنے کھنچے جا رہے ہیں! —— صرف یہی کہ پانچ روپیہ زیادہ قیمت کی ساری خرید لی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا

منصور۔ کیا کہا صرف پانچ روپیہ زیادہ کی ؟

شوکت۔ جی ہاں! صرف پانچ روپیہ زیادہ کی !

منصور۔ (بگڑ کر) اُون ہوں، تم نہیں سمجھتیں! —— بیوی! تم نہیں سمجھ سکتیں، تمہیں معلوم ہے؟ ان پانچ روپیوں سے کیا کیا ہو سکتا تھا ؟

شوکت۔ بس یہی کہ یہ پانچ روپیہ بھی بنک میں جمع ہوتے۔ اور ڈاکٹر صاحب کا توندہ ذرا سا اور بڑھ جاتا۔

منصور۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا واہی تباہی بک رہی ہو! —— بیوی! تم نہیں سمجھ سکتیں الو سنو۔ . . . .

شوکت۔ جی! بہت کچھ سمجھ چکی،

منصور۔ کیا خاک سمجھیں۔ اور میں تمہیں بتاتا ہوں — پہلے تو یہ
کہ اگر کسی مریض کو دیکھنے جانا ہوتا تو ان پانچ روپیوں میں
سے دو روپیہ دو آنہ کا پٹرول موٹر میں ڈلوا کر جاتے
اور آتے ہوئے دس روپے فیس لے آتے۔
شوکت۔ (طنزاً) جی! بجا ارشاد ہوا۔
منصور۔ (خوش ہو کر) لو اور سنو! — اب باقی جو رہے
دو روپیہ چودہ آنے سو انہیں دو روپیہ کا اورنگ آباد
سلک لے آتے۔ اور چودہ آنے اجرت دے کر اس کا
پتلون سلواتے — یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ کہ میرے
پاس سوائے اس ایک پتلون کے (دیکھتے ہوئے پتلون کو
بدلتے ہوئے) دوسرا تو ہے نہیں — ذرا سمجھو تو سہی!
شوکت۔ میرے دماغ میں تو بھس بھرا ہوا ہے۔ سمجھوں کیا خاک
منصور۔ (مناتے ہوئے) نہیں بیوی! — ارے تم تو بگڑی
جا رہی ہو (ٹھوڑی پکڑ کر ہلاتے ہوئے)
ارے بیوی! تمہارا شوہر۔ یعنی وہ ڈاکٹر جواد مرزا
ایم۔ بی، سی، ایچ، بی ہے . . . . . .
یعنی وہ ڈاکٹر جو سول ہسپتال کا سرجن ہے صرف
ایک پتلون —
سمجھیں صرف ایک پتلون آج دو ہفتوں سے پہنے
ہوئے . . . . .
شوکت۔ (جل کر) تو آپ کو منع کس نے کیا۔ کہ دوسرے کپڑے
نہ بناؤ — کیا کبھی میں نے . . . ؟
منصور۔ نہیں، نہیں، یہ میں نے کب کہا۔ کہ تم نے مجھے منع
کیا تھا — نہیں! تم نہیں سمجھتیں — میرا مقصد یہ تھا۔
کہ وہ ڈاکٹر جو اعلیٰ قابلیت رکھتا ہے۔ اور وہ جو اعلیٰ
سوسائٹی میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اس کی بیوی . . . .
شوکت۔ کچھ دماغ اور فضول خرچ . . . .

منصور۔ ہاں ہوں۔ نہیں سمجھتیں — بیوی! تم نہیں سمجھ سکتیں
شوکت۔ کیا ہی بہتر ہوتا۔ کہ آپ کی کوئی بات ہی میری سمجھ میں
نہ آتی۔
منصور۔ بیہودہ واہیات سی باتیں — بالکل واہیات سی
(منصور کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)
(ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہتا ہے)
عورت ہوتی ہی ہے ناقص العقل — ہاں! ہلو — کیا
کہا؟ نہیں عورت ہوں اور نہ ہی ناقص العقل — اجی صاحب
! تو میں نے آپکو ناقص العقل ہی کہا اور نہ ہی عورت! —
جی ہاں! جی ہاں! چونکہ اس وقت میں اپنی بیوی سے گفتگو
کر رہا تھا۔ غالباً وہ آپ کو بھی سنائی دی — خیر کوئی
بات نہیں، ایسی غلط فہمی تو ہو ہی جاتی ہے — آپ
بھی عجیب آدمی ہیں! اچھا اب یہ ارشاد فرمائیے گا۔ کہ آپ
نے کیوں ٹیلیفون کرنے کی زحمت گوارا فرمائی — ہاں،
ہاں تو فرمائیے میں ہوں ڈاکٹر منصور، جناب کا اسم گرامی
— (پریشان ہو کر) کیا کہا۔ لالہ روشن لال، پرائیویٹ
سیکرٹری داؤد بھائی قاسم جی! — آہا — لالہ جی!
آپ ہیں؟ آداب عرض ہے! — بھئی معاف کیجئے گا
میں نے تو آپ کی آواز بالکل ہی نہیں پہچانی —
رائے صاحب مجھے اس گفتگو کا افسوس ہے! —
اوہ! کوئی بات نہیں، یہ تو فرمائیے گا۔ آپ نے مجھے کیسے
یاد فرمایا — کیا کہا داؤد بھائی بیمار ہیں۔ اور بہت
نازک حالت ہے — اجی واہ صاحب! مجھے اور
تکلیف، یہ تو میرا فرض ہے — سمجھئے میں ابھی حاضر
ہوتا ہوں — کیا کہا آپ نے آدمی بھیجا ہے —
میرے لے آنے کے لئے — اجی اس کی کیا ضرورت
تھی؟ صرف آپکا ٹیلیفون کافی تھا۔ جی ہاں، جی ہاں

صرف پانچ روپیہ (رک کر مسکراتے ہوئے شرمندگی سے)
اور ہو معاف کیجئے گا، صرف پانچ منٹ . . . .
(ریسیور رکھتے ہوئے)
بیوی! اسو تو سہی ذرا ہمارا کوٹ لے آنا!
شوکت۔ (مسکراتے ہوئے) بہت خوب! ابھی صرف پانچ روپیہ
—— اور ہو معاف کیجئے گا! صرف پانچ منٹ ہیں۔"
منصور۔ اُوں ہوں، بیوی! تم نہیں سمجھ سکتیں —— یہ وقت
مذاق کا نہیں —— ہاں ہمارا ہینڈ بیگ بھی لیتے آنا، ہاں
اور سنو وہ جو میں نے پرسوں آدھا جلا ہوا سگار رکھا تھا نا
وہ بھی لیتے آنا۔
(شوکت جاتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کوٹ اور
ہینڈ بیگ اور جلا ہوا سگار لے آتی ہے۔ ادھر سے شریف
جلد جلد کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہتا ہے)
شریف۔ سرکار! باہر ایک صاحب آئے ہوئے ہیں۔ اور کہتے
ہیں۔ دادا جی کے نوکر ہیں
منصور۔ (چیں) احمق! دادا جی کہ داؤد بھائی —— اچھا
اس سے کہنا۔ کہ ہم آرہے ہیں —— ارے سُن تو سہی۔
(شریف جاتے ہوئے رک جاتا ہے) اور شوفر سے کہہ موٹر
فوراً لے آئے،
شریف (جاتے ہوئے) اچھا سرکار!
منصور۔ (سگار جلاتے ہوئے) ہاں لو بیوی! ہم تمہاری آج
کی وہ پانچ روپیہ والی خطا معاف کئے دیتے ہیں! —— وہ
بھی صرف اس لئے کہ داؤد بھائی جیسی سونے کی چڑیا جال
میں پھنسی ہے۔ سونے کی چڑیا —— مگر خیال رہے کہ آئندہ
ایسا ہونے نہ پائے —— سمجھیں!
شوکت۔ جو ارشاد حضور کا۔
(منصور خوش خوش ہینڈ بیگ اور ٹائی ٹھیک کرتے
ہوئے جاتا ہے۔ اور شوکت مسکراتے ہوئے کرسی پر
بیٹھ جاتی ہے۔ اور تھوڑی دیر تک کسی خیال میں محو
رہ کر شریف کو آواز دیتی ہے)
شوکت۔ شریف! او شریف!
شریف۔ (تیزی سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے) جی بیگم صاحب!
شوکت۔ ہاں رے شریف! آج تیرے سرکار داؤد بھائی قاسم
جی کے ہاں گئے ہیں —— کیونکہ سیٹھ صاحب بیمار ہیں اور
بہت نازک حالت ہے۔
شریف۔ پھر تو بیگم صاحب! وہ آپ کے بھی خسر ہوتے ہیں
نا، تو آپ کیوں نہیں گئیں؟
شوکت۔ (تعجب سے دیکھتے ہوئے) ابے کیا بک رہا ہے کون؟
شریف۔ وہی قاسم بھائی دادا جی!
شوکت۔ (جھڑک کر) چپ رہ بیوقوف کہیں کا!
شریف۔ (معصومیت سے) کیوں بیگم صاحب! آپ ہی
نے کہا نا کہ سرکار قاسم بھائی دادا جی کے ہاں گئے ہیں۔
شوکت۔ ارے او پاگل! قاسم بھائی دادا جی نہیں ——
داؤد بھائی قاسم جی کے پاس —— وہ جو بڑے سیٹھ اور
ٹھیکہ دار ہیں نا۔ . . .
شریف۔ نہیں بیگم صاحب! ہم سے اور ان سے ملاقات نہیں
—— ہم انہیں نہیں جانتے —— نہ جانے کون بلا ہے!
شوکت۔ (ایک زور کا قہقہہ لگا کر) او ہو معاف فرمائیے گا۔ یہ
تو مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ کہ جناب سے ان کی ملاقات نہیں
ہے (سنجیدہ ہو کر) ارے او گدھے کے . . . .
شریف۔ نہیں بیگم صاحب! یہ گدھے ودھے نہ کہئے، ہم
انسان ہیں!
شوکت۔ ہاں، ہاں اس میں کیا شک ہے۔ اچھا تو جناب
انسان صاحب!

(یہ سنکر شریف خوش ہو جاتا ہے۔ اور شوکت کے
پاؤں کے پاس بیٹھ کر شوکت کو دیکھتے ہوئے کہتا ہے)

شریف ۔ ہاں تو بیگم صاحب! پھر کیا ہوا؟

شوکت ۔ (چڑ کر) ہو گا کیا؟ —— کیا میں کوئی الف لیلے سنا رہی ہوں؟ —— بیوقوف! —— احمق کہیں کا! —— سن ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھنے کے لئے گئے ہیں

شریف (رونی صورت بنا کر) جی!

شوکت ۔ کچھ دیر میں آجائینگے ۔ جب تک تو ذرا باہر ہی بیٹھ۔ اور جس وقت سرکار کی موٹر اندر آئے۔ مجھے فوراً اطلاع کرنا

شریف ۔ کیا وہ سو روپیہ کی ساری پہنو گی؟

شوکت ۔ ہاں!

شریف ۔ (سر کھجاتے ہوئے) مگر —— بیگم —— صا . . . .

شوکت ۔ ارے صاف صاف کیوں نہیں کہتا،

شریف ۔ تو پھر مجھے انعام نہ دینگی آپ؟

شوکت ۔ ہاں ہاں دونگی ۔ مگر دیکھنا اس کی اطلاع ڈاکٹر صاحب کو نہ ہونے پائے ۔

(شریف جانا چاہتا ہے۔ تو روک کر کہتی ہے؛
اور سن! اگر ڈاکٹر صاحب کسی وقت ساری کی قیمت پوچھیں . . . . .

شریف ۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) تو سو روپیہ کہہ دونگا

شوکت ۔ ارے! پاگل! پاجی! —— (منہ بنا کر) تو سو روپیہ کہہ دونگا ۔ (دونوں کان پکڑ کر ہلاتے ہوئے) تیس روپیہ کہہ تیس روپیہ —— آیا خیال میں،

شریف ۔ بہت اچھا ۔ (جاتا ہے ۔ تھوڑا سا وقفہ)

(شوکت ٹیلیفون پر سے رسیور اٹھا کر ڈائیل گھماتی ہے
اور کچھ دیر بعد)

شوکت ۔ ہاں ہلو! کہاں سے —— کیا یونس سیٹھ ہیں —— جی میں ہوں مسز منصور —— آداب، ہاں دیکھئے سیٹھ صاحب! آئندہ مہینے ہمارا بل جو بھیجئے گا نا —— تو اس میں وہ ساری جو آج میں نے خریدی ہے نا —— اس کی قیمت تیس روپیہ لکھئے —— شکریہ! —— اور ہاں ہلو! —— وہ باقی ستر روپیہ کل میں اپنے آدمی کے ذریعہ بھجوا دونگی —— شکریہ! —— مگر دیکھئے بھول نہ جائیے —— اچھا شکریہ ۔ آداب ۔

(شوکت رسیور رکھنے بھی نہیں پاتی کہ شریف دوڑتے
ہوئے کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

شریف ۔ بیگم صاحب! بیگم صاحب! لیجئے سرکار آگئے!

شوکت ۔ ہاں آنے دے آنے دے معلوم ہوا ۔

شریف ۔ ارے! آپ نے وہ ساری ابھی تک نہیں پہنی؟

شوکت ۔ چپ رہ کم بخت! کیا ساری ساری کی رٹ لگا رکھی ہے!

(منصور بڑبڑاتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوتا ہے ۔ اور
شریف چلا جاتا ہے)

منصور ۔ کمینہ! —— بدمعاش! —— ذلیل! —— شہدا!
(ہینڈ بیگ زور سے میز پر رکھ کر کوٹ اتارتے ہوئے)
کمینے نے خواہ مخواہ ہمیں تکلیف دی —— جانے اس موذی کو ہم سے کیا بیر تھا ——

شوکت ۔ (حیرت سے) خیر تو ہے ہوا کیا؟

منصور ۔ بس کچھ نہ پوچھو! یہاں نہ تو خیر ہی ہے ۔ اور نہ ہی برکت

شوکت ۔ ڈاکٹر صاحب کچھ تو کہیئے ۔ آخر یہ گنگا کا الٹا بہاؤ کس لئے ہے؟

منصور ۔ کس لئے ہے! اجی اس بدمعاش نے ہمارا نہ صرف وقت ہی ضائع کیا ۔ بلکہ نقصان بھی کر دیا ۔

شوکت ۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں! میں پوچھ رہی ہوں کہ ہوا کیا!

منصور۔ ہوا کیا! بس یہی کہ وہ پاجی ہمیں یہاں سے لے گیا اور داؤد بھائی کے بنگلہ کے سامنے موٹر روک کر خود اتر پڑا اور یہ کہتے ہوئے اندر داخل ہوا کہ ڈاکٹر صاحب آپ یہیں ٹھیرے رہیئے۔ میں اندر اطلاع کرا کے آپ کو بلاتا ہوں...

شوکت۔ ارے! توبہ! تو اس میں بات ہی کیا تھی؟ اگر اس نے آپ کو باہر ٹھیرا دیا تھا۔ تو اس سے آپ کی شان میں کونسا فرق آگیا۔

منصور۔ (منہ بنا کر) اُونہہ! کونسا فرق آگیا! — اُوں ہوں۔ بیوی تم نہیں سمجھ سکتیں! اسی لئے تو بزرگوں نے کہا ہے کہ عورت ناقص العقل ہوا کرتی ہے۔ پوری بات نہیں سنتیں اور کہدیا۔ کہ کونسا فرق آگیا!

شوکت (جو اب تک مسکرا رہی تھی سنجیدہ ہو کر) اچھا تو اب آپ ہی اپنی داستان کہتے جایئے!

منصور۔ ہاں تو سنو! وہ کم بخت ہمیں باہر ٹھیرا کر خود اندر چلا گیا اور ہم باہر ٹھیرے رہے —— بیوی! خدا غریق لعنت کرے۔ اس مردود کو اس نے نہ صرف پانچ، دس، پندرہ منٹ بلکہ پورا آدھا گھنٹہ انتظار کرایا، جب بھی نہ آیا۔ تو ہم نے کہا کہ چلو ہم خود کیوں نہ جائیں،

شوکت۔ تو کیا وہ آدھا گھنٹہ تک نہ آیا؟

منصور۔ اجی آتا کہاں سے! وہ تو گیا ہے جہنم کو۔ بھلا وہاں سے کون آیا ہے۔ جو وہ آتا۔

شوکت۔ تو پھر خود آپ چلے گئے؟

منصور۔ خود نہ جاتے تو اور کیا کرتے۔ ہاں تو خیر ہم خود اندر چلے گئے — بیوی! غضب خدا کا جب اندر جاتے ہیں۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ داؤد بھائی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اپنے کسی منیجر سے حساب کتاب کر رہے ہیں۔

شوکت۔ (حیرت سے) کیا کہا! حساب کتاب کر رہے تھے؟

منصور۔ ہاں! ہاں! حساب کتاب کر رہے تھے۔ اور ہمیں دیکھتے ہی بہت ہی خلوص سے آگے بڑھ کر ملے۔ اور مزاج پرسی کے بعد ہمارے آنے کی وجہ دریافت کی۔

شوکت۔ پھر آپ نے کیا کہا۔

منصور۔ اجی خدا کا فضل ہوا۔ کہ ہماری زبان سے فوراً نکل گیا۔ کہ سیٹھ صاحب! ہم اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ اور جاتے ہوئے خیال ہوا کہ جب یہاں تک آ ہی گئے ہیں۔ تو چلو آپ سے بھی مل لیں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

بیوی! سنو تو سہی اب کس پاجی نے ٹیلیفون کیا ہے؟

(شوکت رسیور اٹھا کر بات کرتی ہے۔ اور رسیور سے آہستہ آواز آتی ہے)

شوکت۔ ہاں! ہلو!

آواز۔ ہلو! کہاں سے ہے؟

شوکت۔ میں ڈاکٹر منصور کے بنگلے سے۔

آواز۔ کیا ڈاکٹر صاحب اس وقت مکان میں تشریف رکھتے ہیں۔

شوکت۔ جی ہاں، وہ موجود ہیں!

آواز۔ براہ مہربانی ذرا انہیں ٹیلیفون پر بھیج دیجئیگا، ایک ضروری گفتگو کرنی ہے۔

شوکت (رسیور دیتے ہوئے) لیجئے کوئی صاحب آپ سے ضروری گفتگو کرنی چاہتے ہیں۔

منصور۔ (رسیور لیتے ہوئے) کون بولتا ہے؟

شوکت۔ (مسکرا کر) انہیں مریضوں کی روحیں ہونگی۔ جو آپ کے ہاتھ پر چڑھے ہیں۔

منصور۔ لاحول ولاقوۃ! عجیب عورت ہے! — ہاں! ہلو! کون!

آواز۔ جناب کا اِسمِ گرامی؟

منصور۔ جی میں ہوں ڈاکٹر منصور۔

آواز۔ ڈاکٹر صاحب! آداب عرض ہے۔ میں ہوں آپکا ممنونِ کرم

منصور۔ یعنی؟

آواز۔ جی وہی جسکو آپ ازراہِ مہربانی ابھی ابھی داؤ بھائی کے بنگلے تک چھوڑ آئے ہیں۔

منصور۔ (ایک دم بگڑ کر) کمینہ! پاجی! احمق! . . .

آواز۔ (بہت ہی ندو کھسیانہ قہقہہ) اجی ڈاکٹر صاحب سنئے تو سہی

منصور۔ کیا سنیں، خاک سنیں۔ تم کمینے ہو! پاجی ہو! نامعقول ہو!

آواز۔ ڈاکٹر صاحب یہ سب کچھ سہی۔ مگر نیاز مند کا معروضہ تو سنئے گا۔

منصور۔ بولو! جلد بولو! جو کچھ کہنا ہے۔ کہہ ڈالو۔ میرے پاس ایسے کمینے مذاق کے سننے کا وقت نہیں،

آواز۔ ہاں تو سنئے گا۔ عرض یہ ہے۔ کہ میں ہوں یعنی آپکا نیاز مند ایک طالب العلم . . . یونیورسٹی کا اور یہ آپکا بدنصیب نیاز مند اُن چند بدنصیبوں میں سے ایک ہے جنکے والدین اپنے لختِ جگروں کو فردِ جرم لگا کر کسی ایک یونیورسٹی کے اقامت خانہ میں مقید کر دیتے ہیں۔ . . .

منصور۔ (چیخ کر) کیا فضول سی بک بک لگا رکھی ہے!

آواز۔ ادہو، ڈاکٹر صاحب! معاف فرمائیگا اگر بغیر معروضہ سماعت فرمائے جائیگا۔ نہیں۔ ہاں تو قصہ مختصر یہ کہ چونکہ آج روز جمعہ یعنی عید المومنین ہے . . . .

منصور۔ پھر وہی بک بک؟

آواز۔ ڈاکٹر صاحب! معلوم ہو رہا ہے۔ کہ آپ اپنے نیاز مند پر بہت ہی خفا ہوئے ہیں،

منصور۔ اور نہیں۔ تو کیا تم جیسے نالائقوں سے خوش ہوتے؟

آواز۔ اچھا تو ڈاکٹر صاحب! ایک مرتبہ اور معاف فرما دیجئے گا۔ ہاں تو اسلئے ہمارے مہتمم مجلس یعنی نگران صاحب اقامت خانہ نے از روئے ضابطہ فوجداری دفعہ فلاں، فلاں، فلاں،

منصور۔ (بے ساختہ مسکرا کر) پھر وہی؟

آواز۔ اوہو اچوک ہوئی ایک مرتبہ اور معاف فرما دیجئے گا۔ ہاں تو ہمیں اپنے دیدارِ فیض آثار سے والدین اور دوست احباب کی آنکھیں روشن کرنے کی اجازت دیدی، اور یہ آپ کا نیاز مند پہلا طرف گھر کے۔ پھر وہاں سے دوست احباب، اور دوست احباب سے مل ملا کر سینما، چنانچہ انہیں شدید ضروریات کی وجہ سے کیونکہ ایک تو جیب میں پیسہ نہیں تھا۔ دوسرے رات ہو گئی۔ تیسرے بارش اور سردی مارے ڈال رہی تھی۔ چوتھے پاؤں میں درد اور دوری منزل۔ ایسی صورت میں برائے خدا آپ ہی تبلائیے گا۔ کہ اگر میرے بجائے آپ ہوتے۔ تو کیا صورت اختیار کرتے؟ یہاں تو بقول غالب۔

گرسنہ لنگر کشتی و ناخدا خفت

والا معاملہ تھا —

منصور۔ مجھے اگر یہ حال معلوم ہوتا۔ تو تمہیں جہنم واصل کر آتا۔

آواز۔ شکریہ! اگرچہ ایسا زریں موقعہ آپ کے ہاتھ سے نکل گیا بہر حال جناب کا بہت بہت شکریہ! — ڈاکٹر صاحب افسوس نہ کیجئے جو کچھ ہونا تھا۔ ہو گیا — اچھا شب بخیر — آداب عرض ہے!

منصور۔ (ریسیور زور سے رکھتے ہوئے)۔ احمق! پاجی! ذلیل خدا تجھے . . . .

شوکت۔ ارے ارے یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! — یہ عورتوں کی سی بددعائیں کب سے سیکھیں آپنے۔ طالب العلم نے ایک سنجیدہ مذاق کر ڈالا،

منصور۔ جی! طالب العلم نے سنجیدہ مذاق کر ڈالا! بیوقوف!

شوکت۔ (ایک خاص انداز سے) اوں ہوں، بیوی! انہیں سمجھتیں ابھی سونے کی چڑیا ہے! اوں ہوں، نہیں سمجھ سکتیں۔ . .

روش صدیقی

باغِ نشاط

(کشمیر کا خوابِ رنگ و بو)

خوابِ رعنائیِ فردوس کی تعبیر کہوں
غازہ افروزِ رخِ شاہدِ کشمیر کہوں
میں تجھے معجزۂ عشقِ جہانگیر کہوں

بے حجابی میں بھی اک جلوۂ مستور ہے تو
شاید الفاظ کے جادو سے بہت دور ہے تو

سرو و شمشاد و صنوبر کی قطاروں میں نہیں
گل و ریحاں کی جنوں خیز بہاروں میں نہیں
دلربائی تری محدود چناروں میں نہیں

حسن روپوش ہے بیگانہ اظہار ترا
ماورائے نگہِ شوق ہے دیدار ترا

آتشِ لالہ و گل آبِ رواں سے ہمدوش
سایۂ آب کبھی خوابِ گراں سے ہمدوش
اور ہر خوابِ جہانِ دگراں سے ہمدوش

زندگی نغمۂ خاموش سنا جاتی ہے!
ترے آغوش میں احساس کو نیند آتی ہے!

وہ تری صبح وہ آئینۂ تصویرِ نشاط
وہ نسیمِ سحری آہ وہ زنجیرِ نشاط
دوشِ شمشاد پہ وہ پرچمِ تنویرِ نشاط

کاروانِ شفقِ سرخ اترتا ہے نہیں
ڈل میں ڈوبا ہوا خورشید ابھرتا ہے نہیں

پیر گردوں کو تمنائے تکلم تجھ سے
کہکشاں کرتی ہے باتیں بہ تبسم تجھ سے
آہ! مانوس بہت ہے دلِ انجم تجھ سے

جستجو میں تری آوارہ ہے مہتاب ابھی
رفتۂ حسرتِ نظارہ ہے مہتاب ابھی

تری چھاؤں سے ہیں انوارِ لطافت پیدا
نکہتوں سے تری صد عالمِ نکہت پیدا
تیرے ہر جلوۂ پنہاں سے ہے جنت پیدا
اپنے دامن میں لئے آتشِ شاداب ہے تو
جس نے بیدار کیا روح کو وہ خواب ہے تو

وہ لبِ جو کہیں رخشندہ جبینوں کا ہجوم!
فرشِ کمخواب پہ وہ عرش نشینوں کا ہجوم!
زیرِ شمشاد وہ معصوم حسینوں کا ہجوم!
مہ و پروین کہیں زہرہ کہیں ناہید کہیں
اور کھوئے ہوئے کچھ حیرتِ دید کہیں

خلوتِ شوق کہیں انجمنِ ناز کہیں
نکہتِ راز ہے آمادۂ پرواز کہیں
داستانِ غمِ دل مائلِ آغاز کہیں
نہ ملا آہ کبھی انجمن آرائی میں
روح نے کیف جو پایا تری تنہائی میں

تیرے سینے میں محبت کا فسوں ہے آباد
درد ہی درد سے آغوشِ سکوں ہے آباد
تجھ سے خلوت کدۂ ہوش و جنوں ہے آباد
گیت جب سوزِ محبت کے صبا گاتی ہے
آتشِ شوق چناروں سے برس جاتی ہے

آبشاروں سے رواں زمزمۂ سوزِ وفا
نفسِ لالہ و ریحاں تپشِ اندوزِ وفا
سروِ آزاد سراپا ادب آموزِ وفا
ہمہ تن دردِ محبت کا فسانہ ہے تو
کسی گم گشتۂ الفت کا فسانہ ہے تو

ہر ادا میں تری پاتا ہوں ادائے محبوب
ہر نفس سے ترے سنتا ہوں صدائے محبوب
آہ! کیا تیرے لبوں پر بھی ہے ہائے محبوب
تو بھی اُس شمعِ دل افروز کا پروانہ ہے
کیا اُسی شاہدِ معصوم کا دیوانہ ہے

کھانڈیکر

نئی دُنیا

سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس کو دیکھ کر وامن کو یکایک اپنی موت کا خیال آگیا۔ اُس کی نظر سے کہیں یہ گزرا تھا کہ انسان کو سولی پر چڑھاتے وقت اسکے چہرے پر سیاہ نقاب ڈال دیتے ہیں۔ اس مہلک منظر کے تصور سے اسکے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر تک اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ موت، پھانسی، وغیرہ اس قسم کی باتیں شام کے وقت اسکے دل میں کیوں آتی ہیں۔ اس خوفناک خواب سے بیدار ہونے کے لئے اس کا دل مضطرب ہونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ شام ہمیشہ ہی دلفریب ہوتی ہے جس وقت میں پانچویں جماعت میں تھا بالکی کا وہ شعر کس قدر گنگناتا تھا۔ اور کتنا لطیف خیال ہے کہ سورج پوجا کے رنگ محل میں گیا ہے۔ اور وہاں۔ . . . . . " وہ شعر وامن نے ذہن میں لانے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ ایک پرانی تصویر کی طرح مٹے ہوئے خطوط کی طرح اُسکے ذہن سے مٹ چکا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ مجھے دسویں جماعت کا امتحان پاس کئے تین برس گزر چکے چار دن تک موٹر کے کارخانہ میں کلرک رہا۔ کچھ دن ڈیری کے حساب کتاب میں گزارے۔ اور بقیہ ایام بیروزگاری میں بسر ہوئے۔ اشعار ایک ہی دفعہ پڑھ لینے سے حفظ نہیں ہوسکتے۔ انہیں بار بار یاد کرنا پڑتا ہے۔ لیکن تین سال سے تو میں صرف ایک ہی بات کو دھرا رہا ہوں۔ ملازمت، مستقل ملازمت جو گزر اوقات کے لئے کافی ہو۔ مجھے کہیں جانا پڑے۔ صرف پچیس روپے ماہوار کے لئے بھی تیار ہوں۔ وامن کو اس بات کا بھی تجربہ تھا کہ اس زمانہ میں ملازمت ملنا مشکل تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر کے سفارشی خطوط کے ذریعے انتھک کوششیں کی تھیں۔ لیکن جن کنوؤں میں اس نے اپنی امیدوں کے ڈول بڑی آرزوؤں اور بڑی تمناؤں سے ڈالے تھے۔ اُن میں سے صرف کھڑکھڑ کی آواز سنائی دی اور بس! عجیب عجیب واقعات اسکے دل میں خار کی طرح کھٹکنے لگے تھے۔

"میٹرک پاس انسان کو ہنسی خوشی سے زندگی بسر کرنے کیلئے اس قدر ہاتھ پیر مارنے کی کیا ضرورت ہے؟ چار چھوٹے چار بھائی ہیں تو ہم کیا کریں؟ اس کی تو تیرے والدین ہی کو فکر کرنی چاہیئے تھی۔ بچے سے جوان ہونا ہی بہت بڑا گناہ ہے۔ خوبصورت گھوڑا ہوتا تو چاندی کے ڈبے میں چندی کھانے ملتی، کتا ہوتا تو سینما کی ایکٹرسوں کی جارجٹ کی ساڑھیوں پر لوٹتا۔ تو جوان ہوا یہی تیری بہت بڑی غلطی ہوئی۔ اور غربت میں کوشش کرکے میٹرک پاس کرنا تو گویا بڑا گناہ کیا۔ اور اس گناہ کے عوض تجھے یہی سزا . . . ."

اُس نے دیکھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ اب میرے زندہ رہنے کی آرزو بھی اسی طرح غروب ہو رہی ہے زندہ رہیں۔ تو کس لئے؟ کن کے لئے؟ دفعتہً اُسکی آنکھوں کے سامنے پانچ معصوم چہرے کھڑے ہوگئے۔ ہمیشہ بیمار رہنے والی ماں اور چھوٹے چھوٹے چار بھائی۔

سال گزشتہ جب وامن دو دن کے لئے ماں سے ملنے گیا تھا۔ تو بہن نے اُس سے پھولوں کی ساری کے لئے ضد کی تھی۔ . . . چھوٹا بھائی روتا ہی رہا۔ اُسکو زمین پر دوڑنے والی ننھی موٹر درکار تھی۔ اس نے اسکو یہ کہہ کر تسلی کردی تھی۔ آئندہ سال جب آؤنگا تیرے لئے ضرور ایسی موٹر لے آؤنگا۔ اور "لیکن

اس آئندہ سال میں خود اس کا پیٹ اسکے لئے وبال جان بن
گیا تھا۔ دس پانچ روپے تو ماں کو بھیجنا ورنہ کنارا سی کے پاس سے
اور منگوانے کی باری آتی تھی۔ مدرسکی زندگی میں اس نے اپنے
مستقبل کے لئے کتنے اعلیٰ خیالات کی پرورش کی تھی۔ مگر تجربات
کی حرارت سے جلا ہوا دل کہہ رہا تھا کہ یہ سب خیالات ہی خیالات
تھے۔ یہ چند چیزیں نا پیٹ بھر سکتے ہیں۔ لیکن میں ۔ ۔ ۔ ۔"

اپنے گھونسلے کی طرف لوٹنے والے کوّے کو دیکھ کر دامن
کو حیرت ہوئی کہ یہ کوّا کہیں نہ کہیں سے اپنے بچوں کے لئے غذا
لاتا ہوگا۔ لیکن میں؟ وہ یہاں گھر میں اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں
کو صورت بھی نہیں دکھا سکتا۔ اُسے یاد آیا کہ میرا گھر اب میرا نہیں

دامن نے جیب میں سے اپنی ماں کا خط نکال کر پھر پڑھا
وہ پھر بھی اسکو پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے
چند قطرے ہی گر سکے۔ لیکن ان آنسوؤں سے اسکے حروف
تو دُھل سکے۔ دو سو روپے قرض اور اسکے سود کے عوض اُسکا
گھر ساہوکار کے قبضہ میں جا رہا تھا۔ اگر کوئی ظالم و جابر انسان
درخت سے گھونسلا اتار کر بے بال و پر بچوں کو زمین پر پھینک دے
تو اس کی ماں کا دل کس طرح دکھے گا۔ اسکا اندازہ اُسے ماں کے
خط کے ایک ایک لفظ سے ہو رہا تھا۔ مگر اس خط کا کیا جواب
دیا جائے۔ دو سو پائیوں کا محتاج انسان دو سو روپے
کہاں سے بھیجے؟ دامن کا دل مضطرب تھا وہ کہہ رہا تھا "پرشنڈیہ
کے زمانہ میں تو بھی انسان کی کچھ نہ کچھ قیمت تھی۔ وہ غلام بنایا جاتا
تھا۔ مگر اب ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

—— قریب کے کارخانے کی گھنٹی بجی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہی
مزدوروں کے ہجوم کے ہجوم جانے لگے۔ عورتیں، مرد، ہر
ذات اور ہر قسم کے لوگ اس میں دکھائی دے رہے تھے دامن
متعجب ہو کر اس نئی دنیا کی طرف دیکھنے لگا۔ عورتوں کی پھٹی پرانی
ساڑیاں، مردوں کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی صورتیں۔ کسی کے
پیر میں نہ چپل نہ جوتا۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر کسی اور ہی دنیا کے
تصور میں کھو گیا۔

چند لمحوں کے بعد رات کے مزدور کارخانہ کی طرف آنے
لگے ان کی حالت بھی ویسی ہی تھی۔ ان کے ہنسنے اور مسکرانے
سے دامن بہت متاثر ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔
وہ ابھی ڈیڑھ فرلانگ بھی نہ جانے پایا تھا کہ اسکو ایک مجمع دکھائی
دیا۔ وہ مجمع میں گھسا۔ دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی کی نعش ریل کے
پٹڑوں پر ابھی لا کر رکھی گئی ہے۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اس نے خودکشی
کی تھی۔ وہ لوگوں کی سرگوشیاں سنتا رہا۔ ساس کی سختیوں سے
تنگ آ کر اس نے اپنی جان دی تھی۔

دامن نے نعش کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ چونکا۔ اُسے
ایسا معلوم ہوا کہ گویا اسکے پاؤں سے چھو کر ابھی کوئی سانپ نکل
گیا ہے۔ اُسے اس نوجوان لڑکی کی نعش میں اپنی مردہ زندگی کا
عکس دکھائی دیا۔

اس خوفناک حادثہ کو بھول جانے کے لئے وہ تیز تیز چلنے
لگا۔ دُور جانے کے بعد اُس نے مڑ کر دیکھا۔ اسے اردگرد کا وہ
ہجوم اب دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک افسوس کرتا
رہا۔ مگر فوراً اس کو اس مصیبت کی ماری لڑکی کا چہرا دکھائی دینے
لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اُسکے چہرے کی جگہ اپنی تصویر صاف
دکھائی دینے لگی۔ وہ سہم گیا۔ اُسکا دل کہہ رہا تھا کہ اس لڑکی
کو اس کی ساس تکلیف پہنچاتی تھی۔ اور مجھے اب دنیا ستا رہی
ہے۔ اس نے خودکشی کر کے تو نجات پالی مگر تو ۔ ۔ ۔ ۔

دامن کی حالت اس وقت ایسی ہی تھی۔ جس طرح کہ کوئی
موٹر ڈھلان پر ہو۔ اور اس کا بریک یکایک خراب ہو گیا ہو!

اس نے خیال کیا۔ کہ ان مصیبتوں اور تکلیفوں سے نجات
پانے کے لئے بجز خودکشی کے کوئی چارہ نہیں۔ جس طرح بارش کے
موسم میں بعض دفعہ تھوڑی ہی دیر میں سیاہ بادل گھر آتے ہیں

اور اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خودکشی کے خیالات نے اسکے دل کو گھیر لیا، اسکے پاؤں ریل کی پٹڑی کی طرف خود بخود بڑھنے لگے

وُہ پٹڑی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ مسکراتے ہوئے تارے دور سے گاؤں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ، جسم کو گدگدی کرنے والی ہوا یہ سب اُسے یہی کہہ رہے تھے کہ زندہ رہنے ہی میں دنیا کا لطف ہے مگر اسکا دل کہہ رہا تھا۔ کہ کس کے لئے زندہ رہیں؟ ہر روز پیٹ کی فکر کرنی پڑتی ہے۔ قضا بیکس کے بوڑوں کو بالآخر ایک ہی دن تو مشکل سے کاٹنا پڑتا ہے۔ مگر سدا مصیبت میں گرفتار رہنے اگر زندگی کے لئے اس قدر کشمکش اور جدوجہد سے کیا حاصل؟

اسکے کانوں میں چیخیں سنائی دیں۔ گاڑی قریب آ رہی تھی وامق دل کو مضبوط کر کے اس پر لیٹ گیا۔ فوراً ہی اس کو ایسا معلوم ہوا، کہ کوئی اُسے پیچھے کھینچ رہا ہے۔ اُس نے پیچھے دیکھا، وہی کنوئیں میں جان دینے والی جوان لڑکی کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اسکو پسینہ آنے لگا، وہ چاہتا تھا کہ اٹھ کر دور بھاگے۔ مگر اس پر بھی اس نے اپنے عزم کو قائم رکھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ میری ماں دوسروں کے پاس مزدوری کرتی ہے۔ اسکو ان آنکھوں سے دیکھنے سے بہتر تو یہی ہے۔ کہ دنیا سے ہمیشہ کے لئے چل بسیں؟ میں نہ تو بہن اور بھائیوں کو تعلیم دلوا سکتا ہوں۔ اور نہ انہیں اچھے کپڑے پہنا سکتا ہوں۔ اُن کو خواب میں بھی اچھی غذائیں نہیں مل سکتیں۔ میں ان سب کو کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟

دل کو پتھر بنا کر وہ پٹڑی پر پڑا رہا! اپنے اطمینان پر وہ خود متحیر تھا۔ وہ موت کے بعد کی زندگی کے تصور میں کچھ دیر کھو سا گیا لیکن فوراً ہی اسکے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے! سگنل نہ گرنے کی وجہ سے یا اسٹیشن قریب آنے کی وجہ سے ریل نے زور سے سیٹی دی یہ سنتے ہی اُس کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ فوراً پٹڑی پر سے اٹھ کر بلند کھڑا ہو گیا۔

کھاڑ کھاڑ، دھاڑ دھاڑ کرتی ہوئی گاڑی اسکے سامنے سے جانے لگی، تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کئی لوگ تھے۔ بعض سامان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک عورت اپنے ننھے بچے کو سینے سے لگائے کھڑکی کے قریب کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اسکے بعد سیکنڈ کلاس کا ڈبہ آیا۔ اس میں ایک بھیم شحیم مرد سگار پیتا ہوا بیٹھا تھا۔ گاڑی چلی گئی، وامق ویسا ہی کھڑا تھا۔ رہ رہ کر اس کھڑکی کے قریب کی عورت کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگی۔ نہ معلوم وہ عورت کب سے اس طرح کھڑی تھی۔ اسکا جسم کس قدر دُکھتا ہو گا مگر وہ تکلیف کو کتنی خوشی سے برداشت کر رہی تھی۔ تو پھر میں ہی۔ . . . .

اُسکے پیر اُسکو گاؤں کی طرف کشاں کشاں لے جانے لگے تھوڑی دور جانے کے بعد گاؤں کے باہر ایک بنگلہ میں کچھ شور غل کی سی آواز سنائی دی۔ اُس نے خیال کیا کہ شاید کسی معزز مہمان کی آمد کی تیاریاں ہیں۔ راستہ کی جانب کی کھڑکی میں سے اس نے دیکھا ... صاحب سوٹ پہنے ہوئے ہیں، عورتیں ریشمی ساریوں میں ملبوس ہیں، دوسری طرف گراموفون بجنے کی آواز آ رہی ہے . . .

وامق حیرت و استعجاب سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ کارخانے کی چمنی سے نکلنے والا دھواں یہ بتلا رہا تھا۔ کہ مزدور کس قدر جانفشانی سے اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اسکو ان عیش پرستوں کے بنگلوں کے پاس ٹھہرنا بالکل پسند نہ آیا، وہ تیز تیز جانے لگا۔ باجے کی آواز ابھی اسکے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ اس نے خیال کیا۔ کہ صحنوں میں خوشنما گلاب کے پھول لگانے والوں کو اس بات کی خبر کہاں، کہ اس کی سرخی کتنے غریبوں اور مزدوروں کے خون کی مرہونِ منت ہے؟"

اب وہ مزدوروں کی آبادی میں سے گزرنے لگا۔ مٹی کے چھوٹے سے گھر۔ اس میں صحن کہاں؟ اور پھر صحن میں گلاب کھلنے کی بات تو دور ہی رہی۔ ایک گھر کے سامنے پانچ چھ آدمی گرمی کی وجہ سے باہر ہی سو گئے تھے۔ ان کے پھٹے پرانے کپڑے دیکھ کر وامق کو

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس کا سینہ چوڑا تھا اور مونچھیں منڈی ہوئی تھیں۔ اس کی عمر پچیس سال تھی۔ مگر اس کا سن اسکے بیضوی چہرے کو دیکھتے ہوئے کم معلوم ہوتا تھا۔ وہ جنسِ لطیف کی موجودگی کافی فاصلہ سے محسوس کر لیا کرتا تھا اور یہی اس صفت کے لئے بریگیڈ میں مشہور تھا۔ وہ گھوما اور گویا ہوا۔

"وہاں مجھے یقین ہے۔ کہ یہاں قریب ہی مستورات ہیں میں بغیر دیکھے ہوئے کہہ سکتا ہوں"

دروازہ پر خان زبک بنفسِ نفیس پذیرائی کے لئے موجود تھا اس کی عمر کوئی ساٹھ سال کی ہوگی وہ اس وقت سادہ لباس میں ملبوس تھا۔ اس نے مہمانوں سے مصافحہ کیا اور کہا میں آپ صاحبان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور ساتھ ہی معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ حضرات سے شب باش ہونے کے لئے نہیں کہا وجہ یہ ہوئی۔ کہ میری دو بہنیں اُن کے بچے بھائی اور کچھ پڑوسی آئے ہوئے ہیں۔ اسلئے سارا مکان گھرا ہوا ہے۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔

نواب خوش اخلاقی کا مجسمہ تھا۔ تاہم اسکے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنے مہمانوں کی آمد کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی سال گذشتہ کے نواب کو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس نے محض اخلاقی طور پر مدعو کیا ہے۔ یہ بات افسروں پر اس وقت ثابت ہوگئی جب وہ زینہ میں سے جہاں چادر بچھی ہوئی تھی۔ اپنے میزبان کی گفتگو سنتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ملازمین ہال اور زینہ میں لیمپ روشن کرنے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے محسوس کیا۔ کہ ان کی آمد باعثِ مسرت نہیں ہے۔ اس مکان میں جہاں بہن بھائی جمع ہوں۔ اور جہاں انکے اپنے احباب آئے ہوئے ہوں وہاں انہیں اجنبیوں کی موجودگی کب قابلِ مسرت ہو سکتی ہے

مہمان جب نشستگاہ کے دروازہ پر پہنچے۔ تو اُن کا استقبال ایک بزرگ خاتون نے کیا۔ خاتون کے بشرہ سے بزرگی ٹپکتی تھی۔ ان کا چہرہ کتابی تھا اور بھویں سیاہ وہ ہو بہو شہزادی یوجین معلوم ہوتی تھی۔ اس نے حسین تبسم کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہی۔ اور معذرت چاہی۔ کہ وہ شب میں انہیں مہمان نہ رکھ سکی۔ جیسے ہی وہ وہاں سے گئی۔ اسکے لبوں سے مسکراہٹ مفقود ہوگئی۔ اس سے صاف ظاہر تھا۔ کہ خاتون کو اپنے مہمانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مکان پر افسروں کو مدعو کرنا اور پھر معذرت چاہنا۔ یہ صرف اس لئے تھا۔ کہ اخلاق اور عز و وقار اسکے متقضی تھے۔

افسر جب طعام گاہ میں داخل ہوئے۔ تو قریباً ایک درجن ذکور و اناث ایک طرف بیٹھے ہوئے چاء پی رہے تھے نائی کرسیوں کے پیچھے کچھ مردوں کا ایک گروہ سگار کے دھوئیں میں چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ ان میں ایک تیلا دبلا آدمی انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔ اور اس مجمع کے پس پشت روشنی سے منور کمرہ تھا۔ جس میں ہلکے پیلے رنگ کا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔

"معزز دوستو۔ آپ حضرات اتنے ہیں۔ کہ سب کا تعارف کرانا مشکل ہے" نواب نے مسکراتے ہوئے کہا "بلائے عنایت تکلف برطرف کر کے آپس میں خود تعارف کیجئے"۔

افسر بیٹھ گئے۔ بعض کے چہروں سے متانت و خاموشی ظاہر تھی۔ اور کچھ زبردستی کی ہنسی ہنس رہے تھے۔ وہ سبکے سب بڑی بے آرامی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ریبووچ ناظم علد جو پستہ قد اور گول شانوں کا آدمی تھا۔ بہت زیادہ کوفت محسوس کر رہا تھا۔

اس وقت جبکہ افسروں نے اپنے چہروں کو متین بنا لیا تھا اور بعض نے مصنوعی مسکراہٹ پیدا کر لی تھی۔ ریبووچ کا بد حواس چہرہ۔ بن بلاؤ کی طرح مونچھیں۔ عینک یہ سب زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں۔ کہ تمام بریگیڈ میں سب سے زیادہ شرمیلا باحیا اور بد مذاق ہوں" وہ کمرہ میں کسی چیز کو اپنی توجہ کا مرکز نہ بنا سکا حسنا کے شگفتہ چہرے عمدہ پوشاکیں شیشہ کا سامان مے ناب کی

عاملیاں جھاڑ فانوس وغیرہ یہ سب مل کر ریبو وچ کے لئے باعث پریشانی بن گئے۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ کہیں اپنا منہ چھپالے۔ اس کی گھبراہٹ بالکل اس مقرر کی طرح تھی۔ جو پہلی بار مجمع میں تقریر کرے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ اپنے گرد وپیش سے قدرے مانوس ہوا۔ تو اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ شرمیلا اور علم مجلسی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ اپنے میزبان کی جرأت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وان رابک اس کی بیوی دو بزرگ خواتین ایک سبز پوش لڑکی اور رابک کے چھوٹے لڑکے نے جس کی مونچھیں سرخ تھیں۔ نہایت سرعت سے اپنے آپ کو آفیسروں میں تقسیم کرلیا۔ گویا کہ وہ پہلے سے اس کی مشق کر چکے تھے۔ اور مہمانوں سے باتیں کرنے لگے۔ سبز پوش دوشیزہ گرم جوشی سے بحث کر رہی تھی۔ کہ توپ خانہ میں زندگی بہ نسبت گھوڑے سوار یا پیدل کے زیادہ آسائش سے گزرتی ہے۔ برخلاف اس کے رابک اور دونوں خواتین اسکے خلاف کہہ رہی تھیں۔ ریبو وچ نے دیکھا۔ کہ لڑکی کا بحث ایسا ہے۔ جسکے متعلق وہ خود کچھ نہیں جانتی اور یہ کہ اسے خود اس بحث میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف افیسروں کی دلچسپی و دلبستگی کے لئے گفتگو کر رہی تھی۔ ریبو وچ اس مصنوعی شگفتگی اور مسکراہٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جو حسینہ کے رخ رنگین پر جلوہ افروز تھی۔

خان رابک اور اس کی بیوی نے مہمانوں کو نہایت ہوشیاری سے باتوں میں لگایا اور ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھا کہ کسی کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں اور سب کے سب اکل و شرب میں مشغول ہیں ریبو وچ تمام گفتگو اچھی طرح سن رہا تھا۔ جس قدر وہ سنتا تھا اسی قدر اپنے دل میں مہذب خاندان کے لئے محبت پاتا تھا۔ وہ پر تصنع گفتگو کو بہت پسند کرتا تھا۔

چائے کے بعد آفیسران نشست گاہ میں گئے۔ لفٹنٹ لوبکو کا خیال صحیح نکلا۔ کمرہ میں بہت سی لڑکیاں اور خواتین تھیں۔ لفٹنٹ ایک سیاہ لباس والی حسینہ کے پاس کھڑا ہوا اور اس کی طرف ایسے جھکا۔ جیسے کسی نادیدہ تلوار کے بل پر جھکا ہو۔ وہ مسکرایا۔ اپنے شانوں کو کرپانہ انداز میں جنبش دی۔ لا ابیب وہ اس دوشیزہ سے کوئی دلچسپ گپ ہانک رہا تھا۔ ہر چند حسینہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر اس سے اصلاً التفات ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اس نے بالآخر نہایت سرد مہری سے کہا۔ "ہو واقعی"۔ اگر لفٹنٹ کچھ بھی زیرک ہوتا۔ تو اس "سرد مہر" واقعی" سے سمجھ جاتا۔ کہ وہ کچھ محظوظ نہیں ہو رہی ہے

کسی نے پیانو پر نغمۂ جانگداز چھیڑ دیا۔ دریچہ میں ہوا چل رہی تھی۔ جس سے ہر ایک کو معلوم ہوا کہ مئی کا مہینہ ہے۔ موسم خوشگوار اور گلاب و سوسن کی خوشبو سے ہوا معطر ہے

ریبو وچ جو موسیقی سے مسحور اور شراب کے نشہ میں چور تھا مسکراتا ہوا دریچہ کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور کافرادا حسن کی کرشمہ سازیوں کو دیکھنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گلاب و سوسن کی جانفزا خوشبو باغیچہ سے نہیں آرہی ہے بلکہ یہ تعطر بیزی انکے جسم و لباس سے ہو رہی ہے

خان رابک کے فرزند نے ایک دراز قامت اور نازک تن لڑکی کو رقص کی غرض سے بلایا۔ اس نے کمرہ میں دو تین چکر لگائے لوبکو سبز پوش حسینہ کے پاس پہنچا اور اسے کمرہ کے وسط میں لے آیا۔ اور رقص شروع ہوگیا۔ ریبو وچ دروازہ کے پاس کھڑا تھا۔ وہ ناچنے والوں میں سے نہ تھا۔ اس کی حیثیت محض تماشائی کی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی رقص نہیں کیا تھا۔ اور نہ کبھی اسے ایسا موقعہ ملا تھا۔ کہ اپنی باہوں کو کسی پری جمال کی کمر میں رقص کی غرض سے حمائل کردے۔ ریبو وچ کے لئے یہ امر نہایت فرحت بخش تھا۔ کہ مجمع عام میں کسی مرد۔ عنا کے ہاتھ کسی نازنین کی کمر کے گرد حمائل ہوں۔ اور اسکے دست نازک جوان شخص کے شانوں پر رکھے ہوں۔ لیکن وہ یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ کبھی اس کی قسمت بھی ایسی ہوگی۔ اکثر اس نے اپنے ساتھیوں کی

جرأت و ہمت پر رشک کیا۔ اور جب اسے یہ احساس ہوتا کہ وہ نہایت ہی شرمیلا اور کم ذوق واقع ہوا ہے۔ اور یہ کہ اس کی مونچھیں بن بلاؤ کی طرح ہیں۔ تو اسکا دل غم سے بیٹھ جاتا لیکن جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی گئی۔ اس کی جھجک میں بھی کمی ہوتی گئی۔ اب جب اس نے مرد اور عورت کے جوڑوں کو رقص کرتے اور لوگوں کو ہمکلام دیکھا۔ تو اسکے دل میں کوئی حسد نہ پیدا ہوا ہاں وہ غم کے احساس سے ضرور متاثر ہوا۔

رقص شروع ہوا تو ریبوویچ نہ ناچنے والوں میں آملا۔ کچھ افسران بلیرڈ کھیلنے کے لئے باہر آگئے۔ ریبوویچ کو کوئی کام نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس جشن و سرور میں وہ بھی حصہ لے چنانچہ افسران کے ہمراہ وہ بھی باہر چلا آیا۔ وہ سب کے سب ایک تنگ برآمدہ اور بے شمار کمروں میں سے ہوتے ہوئے بلیرڈ روم میں داخل ہوئے۔ ایک کمرہ میں تین اشخاص کوچ پر خوابیدہ ان کے چلنے کی آہٹ محسوس کرکے چونک اٹھے۔ مگر وہ ان کی بغیر پرواہ کئے ہوئے بلیرڈ روم میں داخل ہوکر بلیرڈ کھیلنے لگے۔

ریبوویچ جو ما سوا تاش کے اور کوئی کھیل نہ جانتا تھا۔ میز کے پاس کھیل دیکھنے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ وہ اسے بڑی بے توجہی سے دیکھ رہا تھا۔ کھلاڑیوں نے کوٹوں کے بٹن کھول دیے۔ اور ہاتھوں میں بلیرڈ کھیلنے کی لکڑی لئے ہوئے ہنسی مذاق کرتے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کھلاڑیوں نے ریبوویچ کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ ہاں کھیل کے دوران میں جب کبھی کبھار ریبوویچ کو اتفاقیہ لکڑی لگ جاتی۔ تو وہ اخلاقی طور پر معاف کیجئے گا۔ کہہ دیتا۔ ابھی پہلا کھیل ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ریبوویچ اکتا گیا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی وہاں ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ انکے کھیل میں مخل ہو رہا ہے۔ وہ باہر چلا آیا۔ اور رقص گاہ کا رخ کیا

اسے واپسی میں ایک واقعہ پیش آیا۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا۔ کہ وہ گم کردہ راہ ہے۔ اسے یاد آیا۔ کہ ات اُس کمرہ میں سے گزرنا چاہیئے تھا۔ جہاں تین آدمی سو رہے تھے وہ حالانکہ چھ کمروں میں سے گزر چکا تھا۔ مگر خوابیدہ اشخاص اسے نظر نہ آئے۔ اپنی غلطی کا احساس کرکے وہ کچھ دور واپس گیا۔ اسی طرف مڑا۔ اور ایک کمرہ میں جس میں دھندلی دھندلی روشنی تھی عمداً داخل ہوا۔ بلیرڈ روم کو جاتے ہوئے اس نے یہ کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ ایک ثانیہ کے لئے وہ کھڑے ہوکر سوچنے لگا اور پھر سامنے کا دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوا۔ کمرہ بالکل تاریک تھا ان دروازہ کی دراز میں سے روشنی کی کرن آتی معلوم ہوتی تھی۔ کمرہ کے عقب میں ایک نغمہ حزیں سنائی دے رہا تھا۔ رقص گاہ کی طرح یہاں بھی پھولوں کی خوشبو مہک رہی تھی۔

ریبوویچ حیران و پریشان کمرہ میں کھڑا ہوگیا۔ اس وقت اس نے عجلت میں کسی کے آنے کی پیروں کی چاپ سنی۔ کسی کے لباس کی سرسراہٹ محسوس کی۔ اور عورت کے جذبات سے مملو آواز گوش گذار ہوئی "پایانِ کار"۔ اور دو نرم خوشبو سے معطر بازو جو بلا یقین ایک عورت کے ہی بازو تھے۔ اس کی گردن کے گرد حمائل ہوگئے۔ گرم رخسار اسکے رخسار سے مس ہوا اور اسی لمحہ ایک بوسہ کی آواز سنائی دی۔ لیکن فوراً ہی اس عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ریبوویچ نے محسوس کیا۔ کہ وہ خوفزدہ ہوکر اس سے علیحدہ ہوگئی۔ ریبوویچ کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ اور وہ دروازہ کی طرف جس کی دراز سے روشنی آتی تھی۔ جھپٹ کر گیا۔

وہ جب رقص گاہ میں پہنچا۔ تو اس کا دل بُری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ اور ہاتھ ایسے نمایاں طور پر کانپ رہے تھے۔ کہ اس نے فوراً انہیں پسِ پشت چھپا لیا۔ کچھ دیر تک وہ خود کو بہت خوفزدہ اور شرمسار تصور کرتا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ہر شخص

کو علم ہے۔ کہ کسی عورت نے اسے سینہ سے لگایا ہے۔ اسے پیار کیا ہے۔ اس کا بوسہ لیا ہے۔ اس نے اپنی پریشان نگاہیں چاروں طرف ڈالیں۔ لیکن اسے یقین ہو گیا۔ کہ سب رقص میں مشغول ہیں۔ انہیں کچھ پتہ نہیں۔ اور وہ پھر اس لذتِ خاص کا مزہ لینے لگا۔ جو اسے زندگی میں پہلی بار حاصل ہوئی تھی۔

یہ کچھ عجیب و غریب حادثہ تھا۔ رخسار پر جہاں اسے چوما گیا تھا۔ وہ پیپر منٹ جیسی سنسناہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اور گردن میں جہاں گدرائے ہوئے بازوؤں نے حلقہ کیا تھا۔ تیل کی خشکی سی محسوس کر رہا تھا۔ جتنا زیادہ وہ اپنے گال کو ملتا تھا۔ اسی قدر سنسناہٹ پیدا ہوتی تھی۔ سر سے لے کر پیر تک جسم میں عجیب اور نئے قسم کا احساس ساری تھا۔ جو برابر بڑھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ باغ میں چلا جائے۔ وہاں ناچے اچھلے۔ کودے اور زور زور سے بولے۔ اور باغ میں ادھر ادھر دوڑتا پھرے۔ اور قہقہے لگائے۔ وہ اس امر کو بالکل بھول گیا۔ کہ اسکے شانے گول ہیں۔ اور وہ کور ذوق و بدشکل ہے۔ بیگم خان رابک اس کے قریب سے گزریں۔ وہ انہیں دیکھ کر متبسم ہوا۔ وہ ٹھہر گئیں اور اس کی طرف حیران ہو کر دیکھنے لگیں۔

"مجھے آپ کا دولتکدہ بہت زیادہ پسند ہے" اس نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

بیگم خان رابک نے جواب دیا۔ کہ یہ مکان ان کے والد کا تھا۔ پھر انہوں نے دریافت کیا۔ آیا اسکے والدین بقیدِ حیات ہیں اور وہ ملازمت میں کب سے ہے۔ اس قدر دُبلا کیوں ہے۔ وغیرہ کچھ دیر بات چیت کر کے وہ آگے بڑھ گئیں۔ گفتگو کے بعد ریبوروچ پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں احسان شناسی کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ نواب اور ان کے گھر والے نہایت شریف لوگ ہیں۔

دعوت میں جو کچھ ریبوروچ کے سامنے آیا۔ وہ بے خبری کے عالم میں کھاتا چلا گیا۔ اس نے اس گفتگو کا لفظ تک نہیں سنا جو دورانِ دعوت میں ہوتی رہی۔ وہ اپنے رومان کے لطف کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ حادثہ بالکل پُراسرار تھا۔ لیکن اس کا سمجھنا کوئی مشکل نہ تھا۔ کسی نوخیز لڑکی یا شادی شدہ خاتون نے اپنے محبوب سے اس تاریک کمرہ میں ملنے کا وعدہ کیا ہوگا۔ چونکہ خاتون نے اپنے ملاقاتی کا بہت زیادہ انتظار کیا۔ اور اس سے ملنے کے لئے پریشان تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ عالم سراسیمگی میں وہ ریبوروچ کو اپنا ہیرو سمجھی۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ریبوروچ خود کسی کی تلاش میں تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسے بھی کسی کا انتظار ہے۔ ریبوروچ نے بوسہ کی تاویل نکالی

"لیکن وہ تھی کون؟" اس نے سوچا۔ اور مستورات جو وہاں تھیں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ نوخیز نوجوان ہونی چاہیئے کیونکہ ڈھلی ہوئی عمر کی عورتیں زمان و مکان کے اقرار نہیں کیا کرتیں۔ وہ کوئی ذہین ہوگی میں نے اسکے لباس کی سرسراہٹ نکہت پاش جسم اور لوچدار آواز سے معلوم کر لیا تھا۔ کہ وہ ذکی ہے

اس کی نگاہ ایک سبز پوش لڑکی پر جم گئی۔ وہ اسے بڑی دلکش نظر آئی۔ اسکے شانے و بازو نہایت خوبصورت تھے۔ اسکے بشرہ سے ذہانت اور آواز سے شیرینی ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر ریبوروچ نے کہا۔ "یقیناً سوائے اس دوشیزہ کے کوئی دوسری لڑکی مری نہ معلوم ...... نہیں ہو سکتی" لیکن وہ پُر تصنع انداز میں مسکرائی اور ناک سکوڑی۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ کافی سن و سال کی ہے۔ اس نے پھر سیاہ پوش لڑکی پر نگاہ ڈالی۔ وہ کمسن اور سادہ لوح لڑکی تھی۔ اس کی کنپٹیاں نہایت خوبصورت تھیں۔ اسکے برعروشی کا انداز غایت درجہ حسین تھا۔ ریبوروچ نے خیال کیا۔ کہ یہی اس کی نہ معلوم ..... ہے۔ "لیکن یہ امر اسپر جلد ہی منکشف ہو گیا۔ کہ اس کا چہرہ چپٹا ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنی توجہ دوسری لڑکی کی طرف منعطف

کرلی۔

"مگر" اس نے کہا۔ "کوئی سبزپوش حسینہ کے خوبصورت شانے وبازو ہے اور دوسری حسینہ کی کنپٹیاں اور وہ لڑکی جو ڈیلا کے پاس بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھیں اور پھر ....."

طعام نوش جاں کرنے کے بعد افسروں نے اپنے میزبان سے اجازت طلب کی۔ نواب اور اس کی اہلیہ نے ایک مرتبہ اور معذرت خواہی کی۔ کہ وہ انہیں رات میں نہ ٹھہرا سکے

"معزز دوستو۔ میں آپ سے ملکر بہت خوش ہوا،" نواب نے سنجیدگی سے کہا۔ "امید ہے آپ حضرات واپسی پر پھر اس بندۂ ناچیز کو شرف نیاز بخشینگے۔ آپ راستہ تو نہ بھولے ہونگے۔ کیا گھوڑوں پر جائینگے۔ اگر نہیں تو پھر باغ میں ہوتے ہوئے جائیے اقامت گاہ بالکل قریب ہے۔"

افسر باغ سے ہوتے ہوئے چل دیئے۔ وہ نور ونغمہ سے نکل آئے تھے۔ اسلئے باغ میں تاریکی تر نظر آرہی تھی۔ وہ ساکت وصامت پھاٹک تک آئے۔ انہوں نے خوب سیر ہو کر شراب وطعام نوش جان کیا تھا۔ وہ کافی مسرور تھے۔ لیکن باغ میں چاروں طرف چھائے ہوئے سناٹے وظلمت نے انہیں قدرے آزردہ کر دیا۔ ریبووچ کی طرح انکے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ رابک کی مانند کاش انکے پاس ایک محل عظیم وسیع خاندان اور شاندار باغ بھی ہو۔ اور مہمانوں کی خاطر تواضع کی خوش نصیبی بھی حاصل ہو۔ خواہ ظاہرداری کے طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں انواع واقسام کے کھانوں اور آتش سیال سے خوب سیر کریں

پھاٹک سے باہر نکل کر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اور بلاوجہ وبلاسبب زور زور سے ہنسنے لگے۔ وہ لب جو چل رہے تھے۔ جسکے ہر دو جانب خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ لمبے لمبے نرکل استادہ تھے۔ تاریکی کی وجہ سے راہ اور کنار دریا میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ اور دوسرا کنارہ تو بالکل ظلمت میں ملفوف تھا۔ پانی میں کہیں کہیں انجم خوشتاب کا عکس پڑتا تھا۔ انکی تابندگی کی جھلملاہٹ سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ دریا نہایت آہستہ خرامی سے رواں ہے۔ ہوا بند تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر طیور خوشنوا چہچہ زن تھے۔ ایک جھاڑی پر ایک عندلیب آفیسران کی موجودگی سے بے پرواہ درد بھرا نغمہ الاپ رہی تھی۔ افیسران میں سے ایک نے جھاڑی کی ایک شاخ ہلائی۔ مگر بلبل برابر نغمہ سنج رہی۔

"کتنا جری فقیر ہے" ایک آفیسر نے سر راہ بیٹھے ہوئے فقیر کو دیکھ کر کہا۔ "ہم کھڑے ہیں اور اسے کچھ پرواہ نہیں۔ بدمعاش کہیں کا۔"

چڑھائی آگئی۔ یہ راستہ گرجا کے پیچھے سے ہوتا ہوا سڑک میں ملجاتا تھا۔ چڑھائی پر چڑھنے سے آفیسراں کا سانس پھول گیا۔ وہ آرام کے لئے ٹھہر گئے۔ اور سگریٹ کے کش ہوا میں چھوڑنے لگے۔ دریا کے اس پار انہوں نے مدھم روشنی دیکھی۔ وہ سوچنے لگے آیا یہ آگ کیمپ میں روشن ہے۔ یا کسی دور دریچہ میں چراغ جل رہا ہے۔ یا کوئی اور شے ہے۔ ریبووچ نے بھی روشنی کو دیکھا اس نے محسوس کیا۔ کہ وہ اس پر خنداں ہے معلوم ہوتا ہے کہ بوسہ کے راز سے وہ بھی آگاہ ہے

اقامت گاہ پہنچ کر ریبووچ نے اپنا لباس اتارا اور بستر پر دراز ہو گیا لوبکو اور لفٹنٹ مرسلیا کو بھی اسی کمرہ میں تھے مؤخرالذکر خاموش کم گو اور نہایت مہذب انسان متصور ہوتا تھا۔ وہ عموماً "پیغام یورپ" رسالہ پڑھا کرتا تھا۔ اس رسالہ سے اسے اتنا انس تھا۔ کہ اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا۔ لوبکو نے بھی لباس اتارا اور کمرہ میں پریشان وافسردہ ٹہلنے لگا۔ اس نے اردلی کو شراب ناب کی ایک بوتل لانے کے لئے کہا مرسلیا کو نے موم کی شمع روشن کی اور سرہانے رکھکر وہ بستر پر دراز ہو کر رسالہ کا مطالعہ کرنے لگا۔

"مجھے تو حیرت ہے۔ پتہ نہیں کون تھی"۔ ریبوورچ نے میلی کچیلی چھتری پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

وہ ابھی تک گردن پر تیل کی ٹھنڈک اور رخسار پر پیپرمنٹ کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سبز پوش لڑکی کے بازو و شانے سیاہ لباس لڑکی کی کنپٹیاں انکے معطر ملبوس اور خوبصورت زیورات کی تصویریں انکے دماغ میں منقش تھیں وہ حسن و عشق کے تصورات میں اپنا ایک صنم خانہ تعمیر کر رہا تھا۔ اس کی چشم تصور کے سامنے شعر و شباب کے مناظر رقص کرتے۔ اور غائب ہو جاتے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب اسے کسی کے پیروں کی چاپ لباس کی سرسراہٹ اور بوسہ لینے کی آواز سامعہ نواز ہوئی۔ اس پر فرحت و محبت کے جذبات مستولی ہو گئے۔ اس وقت جب کہ وہ خود کو سپرد جذبات کر چکا تھا۔ اس نے اردلی کو جو واپس آگیا تھا۔ کہتے سنا کہ "ناب دستیاب نہیں ہوئی۔ ٹونکو شراب کے نہ ملنے سے بہت آزردہ ہوا۔

"یہ احمق نہیں تو اور کون ہے"، اس نے ریبوورچ کے بستر کے قریب ٹھیرتے ہوئے کہا۔ "انسان ایسا بھی کیا کوئی ہو اور بیوقوف کہ شراب تک نہ لاسکا۔ بدمعاش کہیں کا"

"واقعی یہاں شراب نہیں مل سکتی"، مرسلیا کو نے رسالہ پر سے بغیر نظریں ہٹائے کہا۔

"آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا"۔ ٹونکو نے کہا، "میں آپ سے شرط باندھتا ہوں۔ کہ شراب کیا یہاں تو عورتیں بھی مل سکتی ہیں اور میں لا سکتا ہوں۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ اب خواہ مجھے گالیاں ہی کیوں نہ دیں۔ مگر میں پرواہ نہیں کرتا۔ میں ضرور جاؤنگا"

اس نے کپڑے زیب تن کئے اور لمبے جوتے بھی پہنے۔ اور پھر بغیر کوئی لفظ کہے ہوئے وہ باہر چلا گیا۔

"رابک گریبک لیبک" اس نے یہ نام پکارے۔ اور باہر آن کر کھڑا ہو گیا۔ "بھاڑ میں جائے شراب میں اس وقت تنہا جانا نہیں چاہتا۔ ریبوورچ کیا تم بھی اس وقت سیر کو آؤ گے؟"

اسے جب کوئی جواب نہ ملا۔ تو پیچھے سے واپس آیا پوشاک اتاری اور بستر پر جا پڑا۔ مرسلیا کو نے ٹھنڈی سانس بھری اور رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور چراغ گل کر کے سونے کے لئے آنکھیں موند لیں۔

"ہاں"، ٹونکو نے جو اندھیرے میں سگریٹ پی رہا تھا کہا

ریبوورچ نے چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔ اور منتشر تصورات کو جو دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ پھر مجتمع کرنے کی سعی کرنے لگا۔ لیکن سب لا حاصل وہ جلد ہی سو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی نے اسے محبت کے خزانہ بے بہا سے سرفراز کیا۔ اس کی زندگی میں کوئی نہایت خوش کن و فرحت بخش کیفیت پیدا ہو گئی۔ حالانکہ ایسی چیز کا نہ سر تھا نہ پیر۔ اسکے اس تخیل نے اسے عالم خواب میں بھی نہ چھوڑا

وہ جب بیدار ہوا۔ تو پیپرمنٹ کی کیفیت اور تیل کی ٹھنڈک معدوم ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ مانند ویروزہ کے مسرت در آغوش تھا۔ وفور شوق میں اس نے کھڑکی کے چوکھٹے کی طرف جو ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی میں زرنگار ہو رہا تھا دیکھا اور گلی میں کسی کے بولنے کی آواز سنی۔ اسکے اپنے دریچے کے نیچے سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ کمانڈر ریبنڈسکی سارجنٹ کو کسی قصور پر ڈانٹ رہا تھا۔

"اور"، کمانڈر نے چیخ کر کہا۔

"حضور گل پشکا زخمی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کچھ مٹی اور شراب طلب کی۔ گذشتہ شب میکنک آرٹیو نے بھی صہبا پی اور لفٹننٹ صاحب نے حکم دیا تھا۔ کہ اسے علیحدہ گول انداز و قفس رکھا جائے"

"ہاں حضور کاریو نے جھنڈے بھی نہیں لگائے۔ اور یہ کہ آفیسران نے شام وہاں رابک کے یہاں گزاری"، کمانڈر باتیں کرتا ہوا دریچہ کے پاس آگیا۔ اس نے افیسران کے مخمور چہرے

کو دیکھا اور پوچھا۔

"خیریت ہے۔"

"گھوڑی کے دونوں پہلو زین سے رگڑ کھا کر زخمی ہو گئے"۔ رنگپکو نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

کمانڈر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ کچھ دیر ٹھہرا اور پھر کہا۔ مجھے الیگزنڈر کے پاس جانا ہے۔ اس سے ملنا ضروری ہے۔ اچھا الوداع میں شام تک آپ صاحبان سے آملوں گا"۔

پندرہ منٹ میں بریگیڈ روانہ ہو گیا۔ وہ جب وان رایک کے خرمن کے پاس سے گزرے۔ تو ریبوروچ نے اسکے مکان پر نگاہ واپسیں ڈالی۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور لوگ تا ہنوز محو خواب تھے۔ وہ لڑکی جس نے کل ریبوروچ کا بوسہ لیا تھا۔ خواب شیریں میں سرمست تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ کیسے سو رہی ہوگی۔ اسکے سونے کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ شاخہائے سبز دریچہ میں سے جھانک رہی تھیں۔ نسیم صبح گاہی گلاب و سوسن کی مست خوشبو۔ نرم بستر۔ خوبصورت کرسی۔ جس پر وہ لباس جو وہ کل زیب تن کئے ہوئے تھی۔ پڑا تھا سلیپر اور میز پر ایک خوبصورت گھڑی یہ تمام چیزیں اس نے صاف طور سے دیکھیں۔ لیکن لڑکی کا چہرہ اس کا خواب آسا تبسم آہ یہی کچھ تو تھا جس کی دید کے لئے وہ بیتاب تھا۔ مگر یہ سب کچھ اسکے تخیل سے ایسے نکل گیا۔ جیسے انگلیوں میں سے سیماب۔ قریب نصف فرلانگ تک وہ مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ پیلے رنگ کا گرجا قصر عظیم دریا باغ نور و ضیا میں غسل کر رہے تھے۔ دریا بمعہ اپنے سبز پوش کناروں کے نہایت حسین دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس پر آسمان کا عکس اور آفتاب عالمتاب کی روشنی سونے پر سہاگہ تھی۔ ریبوروچ نے ایک مرتبہ اور قریہ پر نظر ڈالی۔ اس کا دل غم و اندوہ سے مملو ہو گیا۔ جیسے وہ اپنی نہایت عزیز و قریبی چیز چھوڑے جا رہا ہے۔

سڑک پر بھی حسین و جمیل مناظر جلوہ افروز تھے۔ لیکن ذہنیت

سے۔ اور دائیں جانب رائی اور گندم کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ سامنے گرد و غبار آگے چار چار کر سپاہی کا دستہ چلا جا رہا تھا اسکے پیچھے باجے والے تھے۔ یہ لوگ ایسی خاموشی سے جا رہے تھے کہ دھوکا ہوتا تھا۔ کہ کسی جنازہ کے پیچھے چل رہے ہیں۔

شہری شخص کے لئے فوجی مارچ ایک نہایت عجیب و دلچسپ نظارہ ہوتا ہے۔ ان کے لئے یہ سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ کہ ایک بندوق کو اکثر کئی آدمی کیوں اٹھا کر چلتے ہیں۔ یا ایک توپ کے کھینچنے کے لئے بہت سے گھوڑے کیوں درکار ہوتے ہیں۔ لیکن ریبوروچ ان تمام باتوں سے بخوبی واقف تھا۔ اسکے لئے یہ سین نہایت بے مزہ اور غیر جاذب تھا۔ اسے اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ کہ گاڑی پر سپاہی کیوں بیٹھا ہے۔ اس کی گردن کل کے گرد و غبار سے کیوں اٹی ہوئی ہے۔ ریبوروچ کے لئے یہ نظارہ نہایت بے معنی تھا۔

ریبوروچ نے نہایت لاپرواہی سے اپنے سامنے کے آدمیوں کی گردنوں اور پس پشت آنے والوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ اور پھر اپنے خوشگوار تخیلات میں محو ہو گیا۔ بریگیڈ کی روانگی کے وقت اس نے یقین کرنے کی کوشش کی تھی کہ بوسہ کا واقعہ ایک معمولی واقعہ تھا۔ اور یہ کہ قابل توجہ نہیں۔ لیکن جلد ہی اس نے تمام منطق کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور پھر سنہری سپنوں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ اس نے خود کو وان رایک کی نشستگاہ میں تصور کیا۔ اور یہ کہ اسے اس نادرہ جمال کی معیت کا جو سبز لباس زیب تن کئے ہوئے تھی شرف حاصل ہے۔ اور کبھی وہ سیاہ لباس والی حسینہ کے پاس استادہ ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور ماضی کے دھندلکے میں اسکی چشم تصور نے دوسری لڑکی کے نقش و نگار دیکھے۔ تصور ہی تصور میں وہ اس سے ہمکلام ہوا پیار کیا۔ پھیلے ہوئے بازوؤں میں لے کر خوب بھینچ بھینچ کر سینہ سے لگایا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ وہ جنگ پر جا رہا ہے۔ اور اپنی محبوبہ

کر جھیلنے جا رہا ہے یہاں تک کہ وہ جنگ سے واپس آیا۔ اور
اہل وعیال کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھایا۔

"بریگیں کو ہاتھ میں رکھو۔" پہاڑی کی ترائی پر کمانڈر نے
کہا۔ ریبوروچ نے بھی کمانڈر کے الفاظ دہرائے۔ گو اسے خوف
تھا کہ بولنے سے اسکے تصور کا طلسم ٹوٹ جائیگا۔ اور وہ پھر
حقائق و اصلیت کی دنیا میں آ جائیگا۔

راستہ میں انہیں ایک دیہاتی مکان ملا۔ ریبوروچ نے باغ
کے خوشنما پودوں پر نظر ڈالی۔ باغ میں ایک لمبا راستہ جس کے
گرد و نواح اشجار تھے۔ وہ دیکھنے لگا۔ خواب و خیال کی دنیا
میں رہنے والے شخص کی طرح اس نے تخیل ہی تخیل میں صنفِ
نازک کے ننھے پیروں کی تصویر جو کہ باغیچہ کی روشوں پر محوِ خرام
ہو کھینچی۔ اور پھر غیر متوقع طور پر اس دوشیزہ کا نقشہ جس کا اس
نے بوسہ لیا تھا۔ سامنے آ گیا۔ اسی لڑکی کا نقشہ جس کی شکل و
صورت وہ کل شام باوجود سعی بسیار کے نہ یاد کر سکا تھا۔ اب
اسکے پیش نظر تھا۔ یہ صورت اسکے دماغ میں منقوش ہو کر
رہ گئی۔ اور پھر کبھی محو نہ ہوئی۔

دوپہر کے وقت بریگیڈ کے آخری حصہ سے آواز آئی۔

"ہوشیار باش۔ افسروں پیش ہیں"

سفید رنگ کے گھوڑوں والی گاڑی میں جنرل سوار تھا
وہ دوسرے دستہ کے پاس آن کر ٹھیرا۔ اور کچھ دھیمی آواز میں کہا
جسے کوئی سمجھ نہ سکا۔ کچھ افسران جن میں ریبوروچ بھی تھا۔
آگے بڑھتے چلے گئے۔

"یہ کیسے چل رہے ہیں کیا کوئی بیمار ہے" جنرل نے پلکیں
جھپکاتے ہوئے کہا۔

جنرل مسکرایا اور ایک دوسرے آفیسر سے مخاطب ہو
کر کہنے لگا۔

"آپ کی گاڑی عقب کے گاڑیبان نے بیوپر سے پٹی اتار کر
گاڑی کے ڈنڈے پر لٹکا دی ہے۔ اسے سزا دیجئے" اس نے
ریبوروچ کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔ "آپ کی بندوق کا فیتہ بہت لمبا
ہے"

دو چار جملے اور کہہ کر وہ مسکراتا ہوا ریبوروچ سے مخاطب ہوا
"لفٹننٹ ریبوروچ آپ آج کیسے اداس ہیں" اس نے پوچھا
"کیا مادام لوپوخوفا کے لئے ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں؟ آہا
دوستو! ریبوروچ مادام لوپوخوفا کے لئے آہیں بھر رہے ہیں"

مادام لوپوخوفا دراز قامت اور باوقار عورت تھی اس
کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ جنرل جو علو مرتبت و معزز
عورتوں کی طرف خواہ ان کی عمر کچھ بھی ہو مائل ہوا کرتا تھا
اپنے ماتحتوں کو بھی ویسا ہی اپنی طرح سمجھتا تھا۔ افسران مسکرائے
جنرل بھی اپنی خوش ذوقی پر ہنسا اور زور کا قہقہہ لگایا۔ اس
نے گاڑیبان کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور گاڑی آگے نکل گئی۔

"میں خوب سمجھتا ہوں۔ کہ یہ محض خواب تھا اور امکانات
کی حدود سے دور۔ لیکن ایسے واقعات اکثر ظہور پذیر ہو جاتے
ہیں" ریبوروچ نے دل میں کہا۔ "یہ عام بات ہے اور ہر شخص اپنی
عمر میں ایسے حادثہ سے دوچار ہوتا ہے۔ جنرل کو ہی کیوں نہ دیکھو
اسے پہلے عشق ہوا پھر شادی کر لی۔ اب اسکے اپنے بچے ہیں
کپتان باکر کو لے لو حالانکہ اس کی شکل صورت نہیں ہے۔
اور کر تو ہے ہی نہیں۔ تاہم اس سے محبت کی گئی اور پھر اس
کی شادی ہو گئی۔ سالموں کو دیکھو کتنا اجڈ انسان بالکل تاتاری
معلوم ہوتا ہے۔ اس نے بھی ایک عورت سے محبت کی جو شادی
پر منتج ہوئی۔ میں بھی آخر دوسرے انسانوں کی طرح ہوں جلد
یا بدیر میرا نصیبہ بھی جاگیگا"

وہ خود کو عام انسانوں کی طرح خیال کر کے بہت زیادہ
محظوظ و مسرور ہوا۔ اس نے اپنے اسپ تخیل کو بے لگام چھوڑ
دیا۔ اپنی خیالی محبوبہ اور مستقبل کی پر مسرت زندگی کے خیال

میں کھو گیا۔

بریگیڈ جب منزل گاہ پہنچ گیا۔ اور افسر چھولداریوں میں ٹھہر گئے۔ تو ریبوورچ بمعہ مرسلیا کو کھانے میں مشغول ہو گیا۔ مرسلیا کو پیغام پر پ گھٹنوں پر رکھے پڑھ رہا تھا۔ اسلئے بہت آہستہ آہستہ کھا رہا تھا۔ ونٹکو مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا۔ اور جام پر جام چڑھائے جا رہا تھا۔ ریبوورچ جس کا دماغ تمام دن کی تھکن آرائی کے سبب چکرا رہا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی پی رہا تھا تیسرے جرعہ کے بعد وہ مست اور نحیف ہو گیا۔ اسپر ایسا جذبہ طاری ہوا۔ کہ اپنا راز اپنے ساتھیوں پر ظاہر کرنے کے لئے بیتاب نظر آنے لگا۔

"وان رابک کے مکان پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس نے اپنی آواز میں بے توجہی و عدم التفاتی پیدا کرتے ہوئے کہا "آپ کو معلوم ہے نا۔ میں بیڈروم میں گیا تھا۔ پھر اس نے پوسکی ساری کہانی بالتفصیل سنا دی۔ اسے حیرت ہوئی۔ کہ اتنی دلچسپ کہانی کو اس نے ایک منٹ میں ختم کر دیا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ اس رومانوی افسانے کو بیان کرتے ہوئے صبح ہو جانا چاہئے تھی۔ ونٹکو نے جو تسلیم شدہ دروغ گو انسان تھا۔ ریبوورچ کی طرف ایسے انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھا گویا اسے ریبوورچ کے بیان پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ مرسلیا کو نے بھی رسالہ پر سے بغیر نظر ہٹائے کہا۔

"واقعی عجیب قصہ ہے۔ وہ عورت منہ سے ایک لفظ کہے بغیر اجنبی مرد سے بغلگیر ہو گئی۔ میرا خیال ہے۔ کہ لڑکی بڑی عاشق مزاج ہو گی،،

"بیشک،، ریبوورچ نے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے کہا

ایک مرتبہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ پیش آیا تھا،، ونٹکو نے کہا سال گزشتہ میں سیکنڈ کلاس میں جا رہا تھا گاڑی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں سونا ممکن تھا۔ میں نے ٹی ٹی ای کو ایک روبل دے دیا اور سامان لے سونے والے ڈبہ میں آگیا جہاں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کمرہ خواب میں کیسی تاریکی ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میرے شانوں کو ہلایا اور اپنے چہرہ پر کسی کے گرم تنفس کو محسوس کیا۔ اور پھر کمبل میں سے ہاتھ نکالا میری گرفت میں کسی کی کہنی آگئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں یقین مانئے میرے سامنے صنفِ نازک کا موہوم پیکر تھا۔ سیاہ آنکھیں ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح سرخ و نازک اور سینہ کا مدوجزر۔ آہ کچھ نہ پوچھو،،

"یہ چیزیں سینہ کے مدوجزر کے متعلق یقین کئے لیتا ہوں لیکن یہ تو فرمائیے۔ آپ نے تاریکی میں ہونٹوں کی رنگت کیسے دیکھ لی" مرسلیا کو نے کہا

ونٹکو مرسلیا کو کی موٹی عقل پر بہت ہنسا۔ گو وہ مذاق نہ سمجھ سکا۔ ریبوورچ نے برا محسوس کیا۔ وہ دل میں کہتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ کہ آئندہ وہ ان سے پھر کبھی اپنا راز نہاں بیان نہ کریگا

فوجی زندگی کا آغاز ہوا۔ دن پر دن گزرنے لگے۔ ریبوورچ کو ایک ہی خیال گھیرے رکھتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات مبتلائے محبت کی طرح تھیں۔ ہر صبح جب اردلی منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی لاتا۔ تو وہ محسوس کرتا۔ کہ اسے زندگی میں نہایت خوشگوار اور قیمتی چیز حاصل ہو گئی ہے۔

بعض اوقات جب اسکے احباب عشق و محبت کے موضوع پر گفتگو کرتے تو وہ قریب ہو بیٹھتا۔ غور سے سنتا۔ اسکے چہرہ پر مسرت و بہجت کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ جیسے اس سپاہی کے جو اس فتح جنگ کا قصہ سنتا ہو۔ جس میں وہ خود شریک رہ چکا ہو وہ اکثر رات بھر جاگا کرتا۔ خلوت میں اپنے بچپن والدین اور قریبی اعزا کو یاد کرتا۔ بیگم رابک جو شہزادی یوجین سے مشابہ تھی تاریک کمرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ویرانہ مدہوش آن تمام

باتوں کی یاد اسکے دماغ میں گھنٹوں قائم رہتی۔

اسے الگمست کردہ دوستوں کے ہمراہ واپس ہوا۔ تمام راستہ وہ ایسا خوش و شاد کام تھا۔ گویا اپنے وطن کو مراجعت کر رہا ہے اس کی آرزو تھی مگر ایک مرتبہ اور گرجا ایک کے گنبد اور تاریک کرہ دیکھے۔ اسکے دل سے آواز آئی۔ ایسی آواز جو عشاق کو مبتلائے فریب رکھتی ہے "اے نادان تو اسے دیکھ سکتا ہے" وہ دل میں سوچنے لگا۔ وہ اسے کیسے سلام کریگا۔ اس سے کیا کہے گا۔ کیا وہ بوسہ کے واقعہ کو بھول چکی ہوگی۔ اگر وہ نہ مل سکی۔ تو وہ اس کرہ میں جائیگا۔ اس میں گھوم کر چلا آئے گا۔ کرہ میں جانے سے بوسہ کا لطف از سرِ نو تازہ ہو جائیگا۔

بوقتِ شام افقِ بعید میں گرجا و خرمن نظر آئے۔ ریبوورچ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے برابر سے گزرتے ہوئے افسر کی گفتگو بھی نہ سنی اس نے ہمہ تن تمنا بنکر دور چمکتے ہوئے دریا کو دیکھا۔ اس نے رابک کے سقفِ مکان اور کبوتر خانہ پر بھی نگاہ ڈالی۔

آفیسر گرجا پہنچے۔ پادری وعظ کر رہا تھا۔ ریبوورچ کو امید تھی کوئی اسپ سوار گرجا کے پس پشت سے آئیگا۔ اور چائے پر مدعو کرے گا پادری نے اپنا وعظ بھی ختم کر دیا۔ افسیران شب باش ہونے کے لئے کیمپ کی طرف بڑھے۔ مگر کوئی اسپ سوار نمودار نہ ہوا۔

"رابک کو کسی کسان سے پتہ لگ جائیگا۔ کہ ہم یہاں ہیں پھر وہ مدعو کریگا"۔ ریبوورچ نے ایک کرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا "یہ آفیسران اور اردلی کیسے بیوقوف ہیں۔ کہ لیمپ روشن کرتے پھر رہے ہیں۔ اور اردلی کو دیکھو سماوار گرم کر رہا ہے"

وہ بہت زیادہ کبیدہ خاطر ہوا۔ وہ لیٹ گیا۔ پھر دریچہ میں سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ آیا کوئی اسپ سوار آیا ہے۔ لیکن کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ اپنی بے چینی و بے قراری پر وہ قابو نہ پا سکا۔ وہ اٹھا۔ باہر آیا اور سوئے گرجا چل دیا۔ گرجا کے سامنے میدان بالکل تاریک اور ویران پڑا تھا۔ پہاڑی کی ایک چٹان پر تین سپاہی استادہ تھے۔ ریبوورچ کو دیکھ کر انہوں نے سلام کیا اور چل دئے۔ ریبوورچ نے سلام کا جواب دیا اور پہاڑی سے اترنے لگا۔

دریا کے دوسرے کنارہ پر شفق کے بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ بہار دکھا رہا تھا۔ چاند ضیا باری کر رہا تھا۔ دو عورتیں زور زور سے باتیں کرتی ہوئیں باغ والے باورچی خانہ میں گوبھی کے پھول لئے جا رہی تھیں۔ باغ سے پرے کچھ جھونپڑیاں تھیں بالکل مئی کے مہینے کا منظر تھا۔ وہی راستہ وہی جھاڑیاں وہی نرکل مگر صرف بلبل کا نغمہ ہی نہ تھا۔ گلاب و سوسن کی خوشبو بھی نہ تھی۔

ریبوورچ باغ میں داخل ہوا اور پھاٹک کے پاس کھڑے ہو کر دیکھا۔ اندر بالکل اندھیرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے درختوں کے تنے اور وسیع راستہ کا کچھ حصہ ضرور دکھائی دے رہے تھے باقی ہر چیز ظلمت میں ملفوف تھی۔ ریبوورچ نے کان لگائے اور اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھا۔ مگر آدھ گھنٹہ انتظار کرنے دیکھنے اور سننے کے بعد بھی اسے کچھ نہ دکھائی دیا۔ اور نہ کچھ سنائی دیا بالآخر وہ واپس ہوا۔

وہ کنارِ دریا کھڑا ہو گیا۔ تاریکی میں دور نواب کا غسل خانہ جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ دکھائی دیا۔ پل کے جنگلہ پر کوئی کپڑا لٹکا ہوا تھا۔ وہ پل کے پاس آیا۔ اور بغیر سوچے سمجھے کپڑا مس کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پھر جھک کر آبِ رواں دیکھنے لگا۔ پانی مدھم سروں میں نغمہ جانفزا گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ماہِ عالم تاب دریا میں عکس ریز تھا۔ سبک لہریں رواں دواں تھیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ قمر زرپاش کو وہ اپنی آغوش میں بہائے جانا چاہتی ہیں

"کتنا غیر جاذب کتنا غیر دلکش سین ہے۔ سب فضول بے معنی" ریبوورچ نے دریا کی بیتاب لہروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ بوسہ کا واقعہ اسکا مضطرب

ހަވީރު

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گرد و پیش

ہندی تھیٹر

دیومالا رکھنے والی اقوام ڈرامہ اور اس کی ضروریات بھی رکھتی ہیں۔ ہندوستان قدیم سے اس فن میں درک رکھتا ہے۔ پروفیسر کیتھ کا یہ خیال کہ ہندوستان میں ڈرامہ اور ڈرامہ کی تمثیل کے لئے گھر کا باقاعدہ رواج یونانیوں کی آمد سے ہوا۔ قرین قیاس ہے۔ اس سے کہ یونانیوں کی آمد و فتح سے بہت پہلے بھی ہندوستانی ادب اور دوسرے ذرائع سے ہندوستانی ناٹک اور اس کی عمارت کا پتہ ملتا ہے۔ موجودہ تحریر میں میں صرف اس فن کے ایک پہلو پر روشنی ڈالوں گا۔ اور وہ ناٹک کی تعمیر کاری ہے

ظاہر ہے کہ ہر عمارت اپنی مدنی ضرورت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہندوستانی ناٹک کے تین مقام ہیں۔ ایک کھلی فضا دوسرا کھلی فضا اور کچھ عمارت اور تیسرا ناٹک کی عمارت۔ ہندوستان اپنے موسم کے لحاظ سے کم از کم سال کا ایک حصہ ایسا رکھتا ہے۔ جس کے لئے معاشرتی اشغال دھوپ اور بارش سے محفوظ رہ کر بھی کھلی فضا میں ہو سکتے ہیں۔

کھلی فضا کی ناٹک دراصل ہندوستان کی قدیم ترین تمثیل گاہ ہے۔ جس کے نہایت ہی پست اور مبتذل شدہ نمونے اب بھی ہمیں اور گاؤں کے بھاگوت وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ یہ طریقے کسی زمانہ میں بہت پاکیزہ باقاعدہ اور حسن کارانہ تھے۔ مثال کے طور پر آپ آج سے دو ہزار سال قبل کے ہندوستان کو تصور کی آنکھ سے دیکھئے۔ تاروں بھری رات ہے۔ موسم گرما اور سرما کے درمیان کا ہے۔ ایک اونچے چبوترے کے اطراف مختلف حصوں پر نشستیں بنی ہوئی ہیں۔ کہیں پر گاؤں کے بڑے لوگ براجمان ہیں۔ کہیں عورتوں کی نشست ہے۔ اور کہیں اعلیٰ ذات کے تماشائی ہیں۔ اس میں کہیں دور پردہ مفتوح قوم بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ جسکو اچھوت کہتے ہیں۔ سامنے اونچے مقدم پر پھول پات کی تزئین سے ایک ناٹک کا منڈوہ ڈالا گیا ہے۔ جس کے پردوں کو رنگ برنگ کے کپڑے اور ملبوس خوبصورت بنائے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کا پروسیلین د RROCELENE) نظارہ گاہ۔ دو طرف موز کے تنوں پتوں اور ناریل کی ٹہنیوں سے قائم ہے۔ جس پر خوبصورت پھول اور پتوں کے بار آویزاں ہیں۔ صرف اسٹیج مشعلوں کی آڑی ترچھی روشنی سے منور ہے۔ جس کی بھولی بھٹکی روشنی تماشائیوں کے سروں پر بکھری ہوتی ہے۔ انہیں مشعلوں کو کم یا زیادہ کر کے روشنی کے تاثرات میں کمی بیشی کی جا رہی ہے۔ غم کے منظر میں دو دھندلے میں روشنی پیدا کر رہے ہیں۔ خوشی کے منظر میں چھ مشعل منور کر رہے ہیں۔ اسی طرح مختلف مناظر کے پس منظر رنگین کپڑوں کے الٹ پھیر ردو بدل اور کمی زیادتی کے ذریعہ سے تنوع پیدا کیا جا رہا ہے۔ یہ اسٹیج انتہائی سادہ اور پرکار ہے۔ اس میں دماغ اور تخیل کا زور زیادہ اور ظاہری اعمال کی نمائش کم ہے۔ اکثر چیزیں مفروضات پر ہیں۔ زیادہ تر اعمال تصور کے زور سے تماشائیوں کے دل کی آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ بہت سی چیزیں پہلے سے مانی ہوئی ہیں۔ اور کچھ ان دیکھے منوائی گئی ہیں۔

ہندی ناٹک کا بیرونی نقشہ

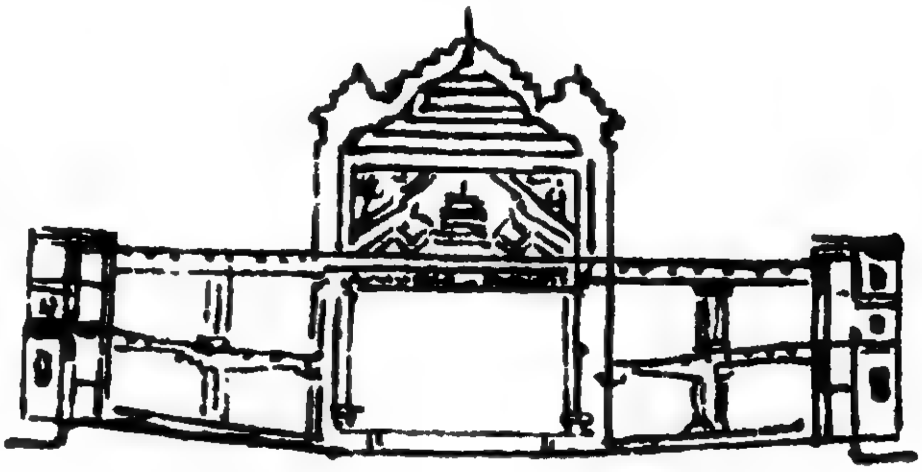

دوسرے قسم کا اسٹیج اور تھیٹر کم و بیش یونانی طرز کا ہے۔ جس میں اسٹیج پر ایک مستقل عمارت ہے۔ اور اطراف تماشائیوں کا میدان
اس کی صورت شکل زیادہ تر دیہات کے قصبوں کے لئے موزوں ہے۔ جہاں کا قول ایسی مستقل چیز کے لئے اجازت دے سکے۔
اس میں پہلی قسم کے اسٹیج سے کچھ زیادہ ظاہری سہولتیں ہیں۔ لیکن سادگی میں دونوں تقریباً برابر ہیں۔ تاہم اس سے ایک فائدہ

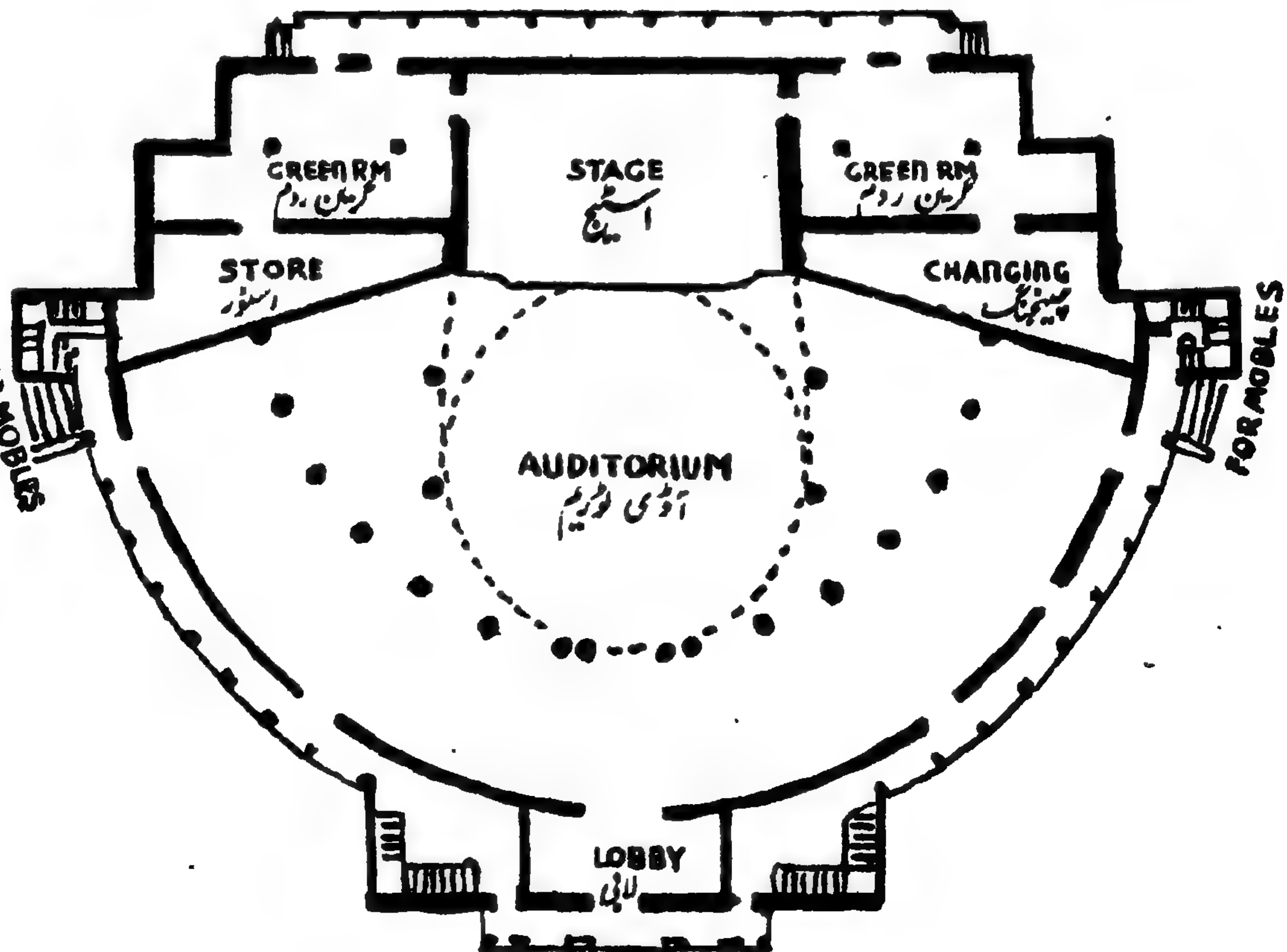

نقشہ ہندی ناٹک گھر نیم دائری

اداکار اور ادا آموز کو پہنچتا ہے۔ کہ وہ اس مستقل عمارت کے سایہ میں اچھی طرح سے نظر بندی OPTICAL ALLUSION پیدا کر سکتا ہے۔

تیسرا طریقہ تیسرے طریقے کو بیان کرنے سے پہلے چند علمی باتیں کہہ دینا ضروری ہیں۔ ہندوستانی ناٹک گھر اہلِ ہنود کے دوسرے فنون کی طرح مذہب ہی کی ایک شاخ ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں۔ کہ ناٹک گھر کی تعمیر کو بھی ایک مستقل فن کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ جس کو سنسکرت میں "رنگیہ شاستر" کہتے ہیں۔ اس پر سنسکرت کے مستشرق اور ہندی پنڈتوں نے خاصی تشریح کی ہے چنانچہ قدیم ہندوستانی تعمیر کاری کے متعلق جو کتاب مسٹر ویریا گھونڈ نے لکھی ہے۔ اس میں "بھارتہ" کی کتاب "رنگیہ شاستر" کے دوسرے باب کو اس فن کے اصول بیان کرنے کے لئے نقل کر دیا ہے۔ چونکہ ہم اس وقت ایک عام فہم اور مختصر مضمون لکھ رہے ہیں۔ اس لئے اس فن کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک مختصر خاکہ ہماری اس تحریر کے لئے کافی ہے۔

مستقل ناٹک کو ہندوستانی اہلِ فن نے بڑی تفصیل کیساتھ پیش کیا ہے۔ جس میں دیہات، قصبہ اور شہر تینوں کی ضروریات کے لحاظ سے عمارتوں کو تجویز کیا ہے۔ اسی طرح ضروریات کے لحاظ سے بھی خاکوں میں تبدیلی ہوئی ہے۔ مثلاً مذہبی ناٹک گھر، معاشرتی ناٹک گھر، اور فنی ناٹک گھر ظاہر ہے کہ ناٹک ایک مقام ہے۔ جہاں انسانی تخیل کے اُن اعمال کو عملی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو ادبی زبان میں ڈرامہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ جو ڈرامہ کے علاوہ ناچ مذہبی نظم خوانی، بھجن کے گیت اور بلا الفاظ کے ڈرامہ غرض مختلف اور چیزیں بھی داخل ہیں۔ تعمیر کار نے ہر ضرورت اور ہر مقام اور ہر موضوع کے لئے گنجائش رکھی ہے۔

جو فرق عمارتوں کا آبادی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ اسی میں صرف گنجائش کی کم و بیشی کے لحاظ سے عمارت کی کیفیت اور کمیت کو تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن ضروریاتِ فن کے لحاظ سے اس کی تین قسمیں ہیں۔ ایک نیم دائری ناٹک دوسری مستطیل ناٹک۔ تیسری مثلثی ناٹک۔ اب ہم ان تینوں کو الگ الگ بیان کرینگے۔

پہلی (نیم دائری) ناٹک میں اسٹیج سے نیچے ایک نیم دائرہ بنایا جاتا ہے۔ اور اسٹیج کے دونوں جانب سنگھار گھر وغیرہ ہوتے ہیں۔ اسٹیج کہیں پر مقام تماشا میں گھس آتا ہے۔ اور کہیں پر نہیں۔ چھت ستونوں پر قائم کیا جاتا ہے۔ جو نیم دائرہ میں اس طرح تقسیم کئے جاتے ہیں۔ کہ تماشائیوں کی نظر میں حائل نہ ہوں۔ اسی طرح تماشہ گاہ میں آنے کے لئے سات دروازے رکھے جاتے ہیں۔ جن میں سے بڑا دروازہ بالکل وسط میں ہوتا ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہوتی ہے۔ کہ نیم دائرے کے اطراف ایک کھلا برآمدہ ہوتا ہے۔ تاکہ تماشائیوں کو انتظار کے وقت ٹھہرنے کی جگہ ملے۔ اور ہال میں ہوا کی کافی گنجائش رہے۔ سیدھی جانب اسٹیج سے ملا ہوا آخری دروازہ بادشاہ یا سب سے بڑے امیر کے لئے ہوتا ہے۔ اور بائیں جانب کا اسٹیج سے ملا ہوا آخری دروازہ امرا کے لئے ہوتا ہے۔ باقی دوسرے دروازوں سے چاروں جاتی کے لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھتے ہیں۔ اور اسی طرح ایک دروازہ اس قوم کے لئے ہوتا ہے۔ جس پر آریہ حکمران ہیں

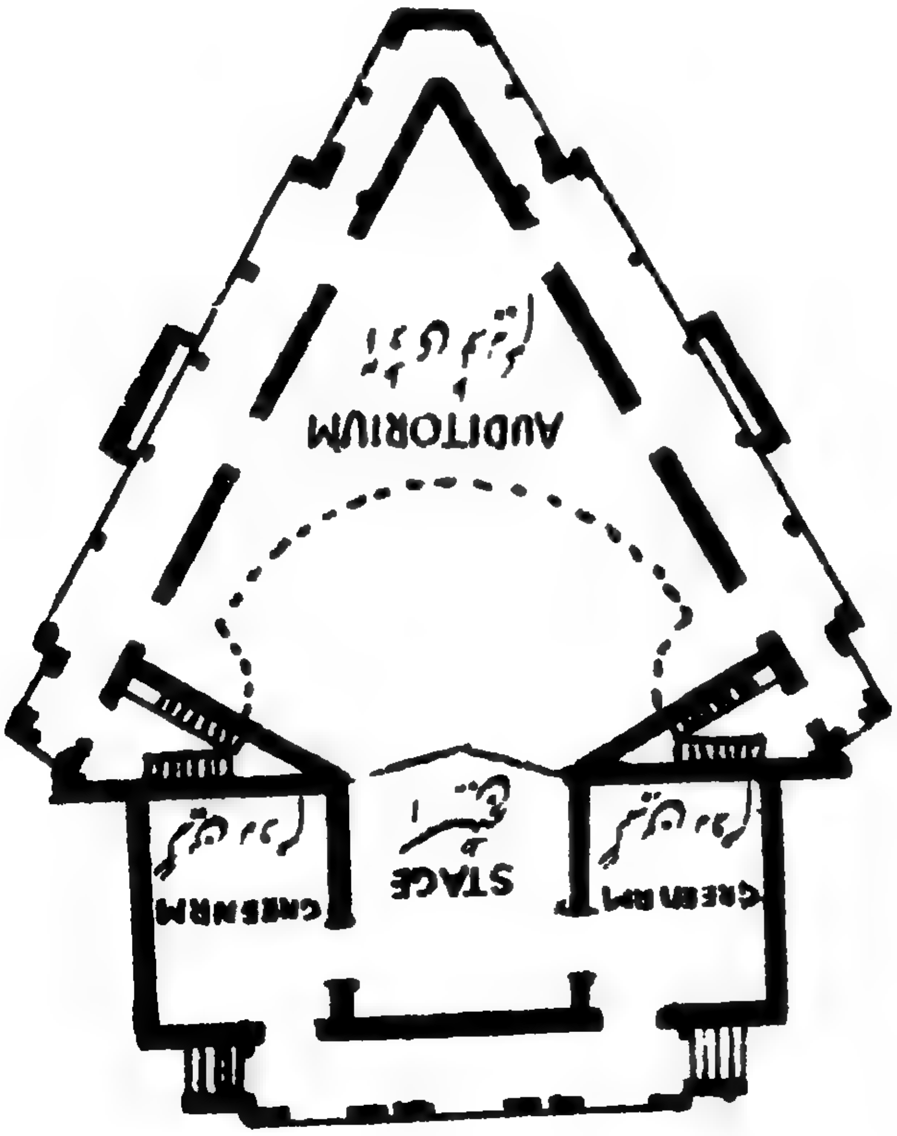
AUDITORIUM
STAGE
GREEN RM
GREEN RM

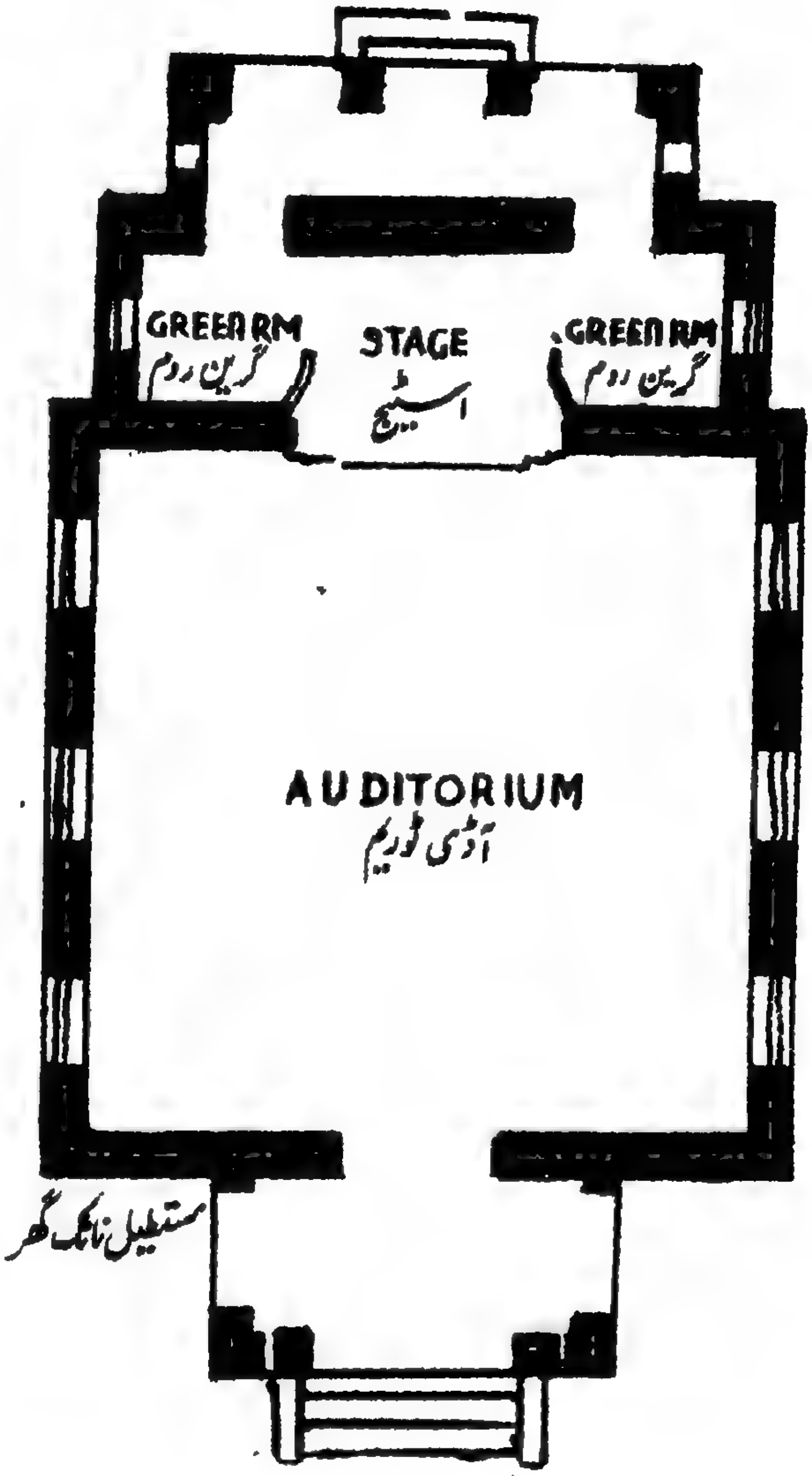

تیسری قسم کا ناٹک مثلثی ناٹک ہے۔ یہ چونکہ ایک انوکھی طرز ہے۔ اس لئے زیادہ عام نہیں۔ ایک مستطیل چبوترے پر اسٹیج اور اس کے ایک بڑے رخ کو قاعدہ مان کر ایک مثلث مساوی الاضلاع اور اسی مثلث کے اندر تماشہ گاہ ہے۔ یہاں دروازے چھ ہیں لیکن اسٹیج کی طرف دو دروازوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ جو ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ اسٹیج کے نظارہ گاہ سے آگے بڑھا کر ایک قوس بنایا گیا ہے۔ تاکہ اسکی وسعت کو اداکاروں کے عمل کے لئے میدان بنایا جاسکے۔ اور اس طرح ناظرین کی تماشہ بینی میں کوئی فرق نہ آئے۔ ہمارے خیال میں یہ ناٹک گھر اپنی نوعیت کی سب سے انوکھی تعمیر ہے۔ اور چھوٹے مقام کے لئے بہترین نمونہ ہے

نوٹ:۔ یہ مضمون بی۔ کے اچاریہ پروفیسر جامعہ الہ آباد کے ایک مضمون THE PLAYHOUSE OF HINDU PEIOD سے ماخوذ ہے۔

اکبر وفا قانی بی۔ اے

(مجلہ عثمانیہ)

عہد حاضر

علی سردار جعفری

دنت کی پلکوں پہ اک آنسو چمکتا ہے مگر
تھرتھرا سکتا ہے عارض پر ٹپک سکتا نہیں

ہ کی بوڑھی رگوں میں نوجوانی کا لہو
دوڑتا پھرتا ہے چہرے پر چھلک سکتا نہیں

آج انگریزی میں اک ہیرا ہے مثل آفتاب
ہند کے بے نور ماتھے پر چمک سکتا نہیں

نیچے چھلکے کھل رہا ہے عہد نو کا سرخ پھول
مسکرا سکتا ہے زیر لب مہک سکتا نہیں

رات کے آنچل میں پنہاں ہے سحر کا زرد نور
صبح کے زریں ابرو پر چمک سکتا نہیں

ایک انگارہ چھپا ہے زندگی کی راکھ میں
راکھ کے نیچے سلگ سکتا ہے دہک سکتا نہیں

ناتمام

ادب اور کلیم دسمبر [illegible]

پنڈت ٹھاکر دت شرما ویدیا لاہور جنہوں نے امرت دھارا
اوشدھالیہ سنہ ۱۹۰۱ء میں قائم کیا۔ جس کا ۴۰ واں
سالانہ جلسہ منایا جا رہا ہے

بال عمر بھر نہ اُگے

آج ہی ایک بوتل ہیر ڈسٹرائر کی منگا لیجیے
لگا دیجیے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ کیلئے دور ہو جاتے ہیں پھر زندگی
بھر دوبارہ اس جگہ کبھی پیدا نہیں ہوتے۔ اور جگہوں کی جلد کی مانند صاف اور
خوبصورت دکھائی دیتی ہے دونوں فلم ایکٹر اور ایکٹریس بھی سٹیج پر استعمال کرتے
ہیں آپ بھی استعمال کیجئے۔ قیمت فی بوتل اڑھائی روپے صرف محصول ڈاک معاف
ناپسند ہونے پر واپسی کی شرط۔

اصلی کالا تیل درجہ اول

آپ ہر چیز استعمال کر سکتے ہیں لیکن سفید بالوں کو جڑ سے اصلی رنگ میں لانے کیلئے
مستقل اور یقینی ذریعہ بال کالا تیل کا استعمال کرنا ہے بغیر کسی نقصان کے قیمت
فی بوتل رعایتی اڑھائی روپیہ محصول ڈاک معاف۔

واحد تقسیم کنندہ منیجر ساہنی سٹورز ۸۰/۲۴۱ پشاور (سرحد)
PESHAWAR (N.W.F.P)

امرت دھارا فارمیسی کے
چالیسویں سالانہ جلسہ
کی خوشی میں
مارچ
کی آخری رعایت یعنی

امرت دھارا اور اسکے ۳۲ مرکبات و امرت کا پا کلپ ۳/۴ قیمت پر اور
باقی تمام ادویات و طبی کتب نصف قیمت پر دیجاوینگی

جو اصحاب اس رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں بہت جلد ایک کارڈ لکھکر

رعایتی فہرست

منگوالیں۔ اس میں سب باتیں مفصل لکھدی ہیں۔ ابھی کارڈ لکھدیں۔ ایسی رعایت پھر کبھی نہ ہوگی۔ مبادا بھول جائے۔

پتہ:- امرت دھارا ۱۲۲ لاہور

المشتہر منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاک خانہ۔ لاہور

چودھری برکت علی بی۔اے پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ادب لطیف سرکلر روڈ لاہور سے شائع ہوا

عنقریب

نئے زاویے

مرتبہ حبیب اشعر

جس میں مندرجہ ذیل ترقی پسند ادیبوں کے شاہکار ہونگے

راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر ایم اے، علی عباس حسینی، احمد علی، احمد ندیم قاسمی، احمد عباس، موہن سنگھ، دیوندر ستیارتھی، ملک راج آنند، پریشں، اختر اورینوی، ممتاز مفتی، سہیل عظیم آبادی، سنت سنگھ سیکھوں، ایس ایچ وانتسائن اور مندرجہ شعراء کا کلام ہوگا۔

راشد، فیض، گوپال متل، سلام مچھلی شہری، روش صدیقی، احسان دانش

سب نظمیں اور مضامین خاص طور پر لکھے گئے ہیں۔ اور بہترین گٹ اپ کے ساتھ کتاب شائع ہوگی

اپنا آرڈر مقامی ادارہ یا ہمیں بھیج دیں تاکہ دوسرے ایڈیشن کی انتظار نہ کرنی پڑے قیمت عہ

چھپ گئے

سستی کتابوں کا خاص سلسلہ

زیر ترتیب

مختلف علوم کی ابتدائی کتابیں —— آسان اور عام فہم زبان میں

مکتبہ اردو نے ایک سال سے سستی کتابوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یہ کتابیں مختلف علوم و فنون کے ابتدائی مطالعہ کے لئے بہترین ثابت ہوئی ہیں۔ ذیل میں ان کتابوں کی فہرست دی جاتی ہے۔

				زیر طبع	
سوشلزم	فریڈرک اینگلز	عصمت انوز	ثریا اندریانی		
کارل مارکس	باری	سرمایہ داری	عبداللہ ملک		
انقلاب فرانس	باری	جاگیرداری	"	محمد عربی	باری
راجہ اور کسان	لیونارڈ ام شٹ	مشین اور مزدور	باری	رضا شاہ پہلوی	محمد اشرف عطا
سٹالن	مارشل وارشلوت	پھول کانٹے	گوپال متل	ٹراٹسکی	نریندر ناتھ سیٹھ
عناصر تہذیب	ول ڈیورنٹ	شہنشاہ حبشہ	اختر اورینوی	ہندوستان کے لیڈر	یوسف مہر علی

مکتبہ اردو سے آپ کو مکتبہ جامعہ، انجمن ترقی اردو، مکتبہ برہان کے علاوہ تمام کتب خانوں کی کتب اکٹھی مل سکتی ہیں جس سے آپ ڈاک خرچ اور دیگر مصارف سے بچ سکتے ہیں۔

(مینیجر)

پتہ:۔ مکتبہ اردو لاہور

مطبوعات

مکتبہ اُردو لاہور کی سب کُتب آپ مندرجہ اداروں سے مقامی طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔

راولپنڈی۔ نیشنل بک شاپ۔ بازار [illegible]
سرینگر۔ محمد صدیق نیوز ایجنٹ۔ فسٹ برج
حیدر آباد۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ
دکن بک ڈپو " "
[illegible] کوتوالی۔
پٹنہ۔ نیا سنسار کتاب گھر، بانکی پور۔
گونڈہ (اودھ) اسلامی کتب خانہ
نئی دہلی۔ مکتبہ برہان۔ قرول باغ
دہلی۔ اردو کے معلّے بک ڈپو اردو بازار
ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ رام لال [illegible] نیوز ایجنٹ
گوجرانوالہ۔ نیشنل نیوز ایجنسی۔ بالمقابل اڈہ نندہ بس سروس
احمد آباد۔ آفتاب بک ڈپو۔ محمد علی روڈ
لکھنؤ۔ انوار بک ڈپو۔ امین آباد پارک
بریلی۔ قومی کتب خانہ۔ بازار [illegible]
کلکتہ۔ نبی بخش نمبر 8-6-12 اَم ہرسٹ سٹریٹ
پشاور۔ سرحد بک ایجنسی۔ قصہ خوانی بازار
صادق کمیشن ایجنسی۔۔۔

ترقی پسند افسانوی لٹریچر

نئے زاویے	کرشن چندر	[illegible]
طلسم خیال	" "	[illegible]
[illegible]	" "	[illegible]
نظارے	" "	[illegible]
محبت نفرت	اختر حسین رائے پوری	[illegible]
اندھی دنیا	اختر انصاری	[illegible]
نیا ادب	مترجمہ حلقۂ ادب	[illegible]
عورت	رشیدہ جہاں	[illegible]
کونپل	اوپیندر ناتھ اشک	[illegible]
داچی	" "	[illegible]
آتش پارے	سعادت حسن منٹو	۱۲ر
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	[illegible]
باسی پھول	علی عباس حسینی	[illegible]
شعلے	احمد علی ایم اے	[illegible]
سرکش روحیں	مترجمہ ابوالعلاء چشتی	۱۲ر
چوپال	احمد ندیم قاسمی	[illegible]
جواہرات	چوہدری فضل حق	[illegible]
آزادی ہند	" "	[illegible]
رنگ دار	فیاض محمود	[illegible]
واردات	پریم چند مرحوم	[illegible]
بگولے	احمد ندیم	[illegible]
بڑی دیدی	شرت چندر	[illegible]
[illegible]	میرزا ادیب	[illegible]

مکتبہ اردو لاہور

طنز و ظرافت

پرواز لق لق	حاجی لق لق	[illegible]
حاجی لق لق کے افسانے	" "	۱۲
[illegible] مزاحیہ نظم	" "	[illegible]
درانتی	" "	[illegible]
جدید جغرافیہ پنجاب	سندباد جہازی	[illegible]
کیلے کا چھلکا	" "	[illegible]
دو ڈاکٹر	" "	[illegible]
مطائبات	" "	[illegible]
مضامین پطرس	احمد شاہ بخاری	[illegible]
خندان	رشید احمد صدیقی	[illegible]
مزاحیات اول	ایم اسلم	[illegible]
" " دوم	" "	[illegible]
مضامین اسلم	" "	[illegible]
کمزوری	عظیم بیگ چغتائی	[illegible]
شہ زوری	" "	[illegible]
[illegible]	" "	[illegible]
خطوط کی ستم ظریفی	" "	۸ر
شریر بیوی	" "	[illegible]
کھرپا بہادر	" "	[illegible]
ماہ و پرویں	میر ولی اللہ	۱۲ر
نانی عشو	راشد الخیری	۱۰ر
تمغۂ شیطانی	" "	۱۲ر
ولایتی [illegible]	" "	۸ر
[illegible] لال بجھکڑ	" "	۸ر
چچا چھکن	سید امتیاز علی تاج	[illegible]
میونسپل الیکشن	خواجہ محمد شفیع	[illegible]
فرشتوں کی نمائش	[illegible] قریشی	۱۲ر

اپنے بچوں کے لئے

نئی دلچسپ و باتصویر کتابیں خریدیئے اُنکی زبان نہایت سادہ اور کہانیاں بیحد دلچسپ ہیں جن کے سرورق لکھائی، چھپائی بہت بہتر ہے۔

سر اقبال	۲ر	عثمان کا خواب	۲ر	جنگل کی بلی	۲ر
کیوں اور کیونکر	۲ر	جادو کا برتن	۲ر	دنیا کے نیچے	۵ر
انوکھی باتیں	۲ر	تدمیر کی سرزمین	۲ر	دنیا کے بسنے والے	۵ر
برف کا بیٹا	۲ر	شہزادہ عبدالرحمن	۲ر	تاریخ سندھ کی کہانیاں دو حصے	۱۰ر
ہنسی کا جوسن	۲ر	شیخ ادریس	۲ر	محنت کا پھل	۴ر
مغرور چوہا	۲ر	خلیفہ عبدالرحمن	۲ر	ننگا پربت	۵ر
بیلوں کا بادشاہ	۲ر	وزیر منصور	۲ر	ایورسٹ کی کہانی	۳ر
پیچھی نکلنا	۲ر	المغزل	۲ر	دو دوست	۴ر
گھاس کی گڑیا	۲ر	بگڑا ماموں	۲ر	شاعر مشرق	۴ر
چالاک لومڑی	۲ر	سرخ رومال	۲ر	ترکوں کا باپ	۴ر
کھیل کھلونے	۲ر	نیت کا پھل	۲ر	قائد اعظم	۴ر
گھر گھر گھوں	۲ر	سشیلا	۲ر	عقلمند لڑکی	۴ر
شیطان کی ساس	۲ر	چندو	۲ر	شیر دل لڑکی	۴ر
قسطنطنیہ کی فتح	۲ر	دو بھائی	۲ر	بہادر لڑکی	۴ر
طرابلس کی شہزادی	۲ر	بچوں کی کہانیاں	۲ر	سچا لڑکا ۱ر — چھوٹا لڑکا	۱ر
دکھیارا شہزادہ	۲ر	لال مرغی	۲ر	بہادر لڑکا ۱ر — اچھے افسانے	۴ر

ACNEES CREAM REGD

ایکنیز کریم رجسٹرڈ

قیمت فی شیشی سوا روپیہ ۱؎

Price:- 1/4/-

مس۔ سی کے مہتمند انی مجسٹریٹ کراچی سے تحریر فرماتی ہیں
میں نے ایکنیز کریم کو استعمال کیا۔ اور کیلوں
اور چھائیوں کے لئے بے حد مفید پایا۔
ترجمہ انگریزی چٹھی

ایکنیز کریم رجسٹرڈ
واقعی کیلوں چھائیوں جھریوں بدنما داغوں کو دور کر کے
چہرے کو ملائم اور خوبصورت بناتی ہے ترقی حسن و صحت جلد کا
نہایت ہی کامیاب اور بہترین نسخہ ہے ہر ایک جنرل
مرچنٹ اور کیمسٹ سے خریدیں۔

وی پی منگوانے کا پتہ: پیرس ہاؤس برانڈرتھ روڈ لاہور

نادرن انڈیا سٹوڈیوز کا دوسرا
شاہکار

قسمت

ڈائرکٹر:- روپ کے شوری
اداکار:- ایلا دیوی - راگنی منورما

نمائش کار
نادرن انڈیا سٹوڈیوز لاہور

امرت دھارا فارمیسی کی دو تین جو امرت دھارا کے علاوہ ایک ایک بہت سی امراض کا علاج ہیں ہر ایک کو ہر وقت ہر جگہ پاس رکھنے چاہئیں

(یہاں پوری قیمتیں درج ہیں) ماہ مارچ میں نصف قیمت

امرت گولی ۔ قبض کشا ہے دمہ کھانسی پیٹ درد تپ لرزہ یا اور سر درد وغیرہ کو بھی مفید ہے۔ قیمت ۔ تولہ صرف ۔

امرت روگ ۔ ہیضہ ۔ دمہ ہر قسم بخار ہڈی کی بادی ۔ سنیپات قبض ۔ بواسیر سانپ بچھو وغیرہ کا ڈنک ۔ کرم شکم ۔ بدہضمی ۔ سنگرہنی ۔ کالوٹ اور ذیابیطس ۔ پیپیہ ۔ بدبوئے دہن ۔ درد سر یرقان ۔ جلودھر مرگی ناسور ۔ گنج اسہال پیچش ۔ درد گوش ۔ درد دندان ۔ شبکوری ۔ بندش حیض سستی ۔ درد مقعد تمام درد ناف ۔ تنگی تنفس ۔ سنگ مثانہ ۔ ڈبہ الطفال وغیرہ پچاس مرضوں میں مفید ہے ۔ قیمت ۔ گولی ایک روپیہ نمونہ ۔

شمکارک ۔ ہر مرض جو گرمی سے ہو اس کو یہ دوائی دور کرتی ہے ۔ دھڑکن خفقان ۔ مالیخولیا ۔ ضعف و کمزوری دماغ ۔ نسیان ۔ درد سر ۔ دوران سر جریان احتلام ۔ سرعت ۔ ذکاوت حس ۔ سیلان الرحم ۔ کثرت طمث ۔ بواسیر دست پیچش ۔ نفث الدم ۔ قے الدم ۔ نکسیر ۔ مسوڑوں کا خون ۔ پیشاب میں خون قے ۔ جلن ۔ نزلہ ۔ زکام کھانسی ۔ دمہ ۔ بچوں کی گرمی کے دست وغیرہ ۔ تشنج ہسٹیریا وغیرہ وغیرہ سب گرم امراض کا قلع قمع ہوتا ہے ۔ قیمت ۔ گولی ۔

کرم رنگ ۔ تمام امراض بادی و بلغمی میں بلا خوف اس کو شہد یا گرم پانی سے دیتے جاویں ۔ بادی یا ریح کی سخت درد ۔ پیٹ ۔ نمونیا ۔ بادی ۔ بلغمی بخار عورتوں کا کثرت حیض ۔ ہسٹریا ۔ گنٹھیا ۔ درد رگ ۔ سردی کا زیادہ لگنا ۔ زکام ۔ کھانسی ۔ دمہ ۔ بادی بواسیر ۔ کمر درد ۔ گھٹنوں کا درد جسم کا کانپنا یا بے حس ہونا جسم کا اکڑنا ۔ گردن توڑ بخار کو اکسیر ہے ۔ قیمت ۲۴ گولی ایک روپیہ ۔

بلیو ہوروٹی ۔ دائمی سر درد ۔ بدہضمی دود ہضم نہ ہونا ۔ پرانا سوزاک آتشک ۔ درد قرحہ ۔ درد شکم ۔ اپھارا ۔ گراگراہٹ ۔ اروچی ۔ قبض ۔ درد گردہ ۔ جذام خنازیر ۔ گنٹھ مالا ۔ بھگندر ۔ ناسور ۔ برص ۔ داد ۔ چنبل کھجلی ۔ بخار ۔ جریان ۔ ذیابیطس پلیگ ۔ کمزوری دماغ ۔ مرگی ۔ بواسیر ۔ عادت منشیات ۔ دست پیچش سنگرہنی ۔ ضعف جگر ۔ یرقان ۔ تلی ۔ بادگولہ ۔ دھڑکن ۔ لقوہ ۔ گنٹھیا ۔ درد پسلی نمونیہ ۔ کھانسی ۔ دمہ ۔ زہر ہا حیوانی و نباتی سل و دق ۔ ہیضہ ۔ قے ۔ نامردی کمزوری ۔ کثرت حیض کمی و درد حیض و سیلان الرحم کو نافع ہے قیمت ۲۴ گولی ایک روپیہ

سدھا بلیلش ۔ ہر قسم کے بخار کے واسطے بچوں سے بوڑھوں تک دے سکتے ہیں دمہ کھانسی ۔ زکام ۔ انفلوئنزا ۔ ذات الجنب ۔ نمونیا کے واسطے بھی اکسیر ہیں ۔ اور سستی اتنی کہ ایک سو گولی کی صرف ایک روپیہ قیمت رکھی ہے

امرت چورن ۔ یہ چورن بدہضمی و سر درد کا کام دیتا ہے اور ساتھ ہی نشے

اکسیر ورم ۔ خون حیض یا خونی بواسیر بند ہوتا ہو پیشاب کے ساتھ خون آتا ہو خون کی قے ہوتی ہو کھانسی کے ساتھ خون آتا ہو جس کو پتا اور پتھری ۔ پتھر وغیرہ ملکہ نفس سے خون بہتا ہو ۔ اس دوائی کے کھلانے سے فائدہ ہوتا ہے ۔ قیمت فی شیشی ۲ ماشہ ۔

حیات افزا ۔ بلڈ پریشر ۔ دل کی دھڑکن ۔ خفقان ۔ کمزوری دل و دماغ ۔ مالیخولیا ۔ خرابی خون ۔ استسقا ۔ کثرت طمث و سیلان الرحم ۔ ایام حمل میں خون جانا ۔ بچوں کی کھانسی قے ۔ دست وغیرہ کو مفید ہے ۔ قیمت خوراک ۔ دن دو روپے نمونہ ۔

سلفری قرص ۔ دائمی قبض ۔ ضعف جگر ضعف معدہ کو دور کرتی ہے ۔ اور فساد خون ہونے جلدی امراض پھوڑا پھنسی نکلتے رہتے ہوں سواد چنبل ۔ داغ پرانا آتشک ۔ ناک بہنا وغیرہ کو مفید ہے ۔ قیمت ۔ گولی صرف بارہ آنے

دت شفا دوٹی ۔ یہ مسہل دوائی نرم و سرد و دو قسم کی چند امراض کو اکسیر ہے ۔ پرانا بخار روزانہ ۔ تیسرا یا چوتھیہ کے واسطے اکسیر ہے ۔ درد سر پرانا ہو ۔ نزلہ ۔ زکام پرانا ہو ۔ تو کچھ دنوں تک روزانہ کھلاویں ۔ مرگی کے واسطے بھی اسکو دینا چاہئے ۔ نشہ پینے والوں کو اگر نشہ ٹوٹنے پر درد سر ہوتی ہے ۔ اسکو بھی اکسیر ہے ۔ قیمت ۳۲ گولی ایک روپیہ

اکسیر نمبر ۲۳ ۔ یہ گولیاں مقوی باہ ۔ دافع جریان و احتلام و سرعت پیدا کنندہ خون صالح مقوی اعضائے رئیسہ ہیں ۔ اور دافع وجع المفاصل ۔ درد کمر درد گھٹنہ ۔ درد پسلی ۔ درد چھاتی ۔ درد رگ ۔ تشنج ۔ بادی وغیرہ کل امراض بادو بلغم میں ۔ نیز ذیابیطس ۔ یرقان ۔ کمی خون ۔ استسقا ۔ سوجن ۔ جلودھر کشودھر ۔ چوہے کا زہر ۔ کمی حیض ۔ کثرت طمث ۔ سوجن فوطہ وغیرہ میں قیمت ۴۶ گولی چار روپے نمونہ ۔ گولی ۔

جیسٹ رس ۔ یہ نکیہ سر درد ۔ دانت درد وغیرہ ہر درد کو آدھ گھنٹہ میں دور کرتی ہیں ۔ مگر خوبی یہ ہے ۔ کہ اسپرین کی طرح سے کمزوری نہیں ہوتی بلکہ چستی پھرتی آتی ہے ۔ جب کام کاج سے تھکے ہوں ۔ تو پھر ویسے ہی تیار ہو جاتے ہیں ۔ درد گنٹھیا درد کمر وغیرہ میں بھی بہت مفید ثابت ہوئی ہیں ۔ جب سر بھاری ہو کسی کام کو دل نہ چاہتا ہو ۔ ۲ گولی کھا کر دیکھئے ۔ کتنی فرحت آجاتی ہے ۔ نزلہ و زکام کو مفید ہیں ۔ قیمت ۔ ۲۴ گولی ایک روپیہ

المشتہر :- منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ

امرت دھارا بھون ۔ امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ

Regd. L. No. 3521

کونپل اوپندر ناتھ اشک کی پہاڑی منتخبہ معاشرتی سماجی
کہانیوں کا مجموعہ ہے

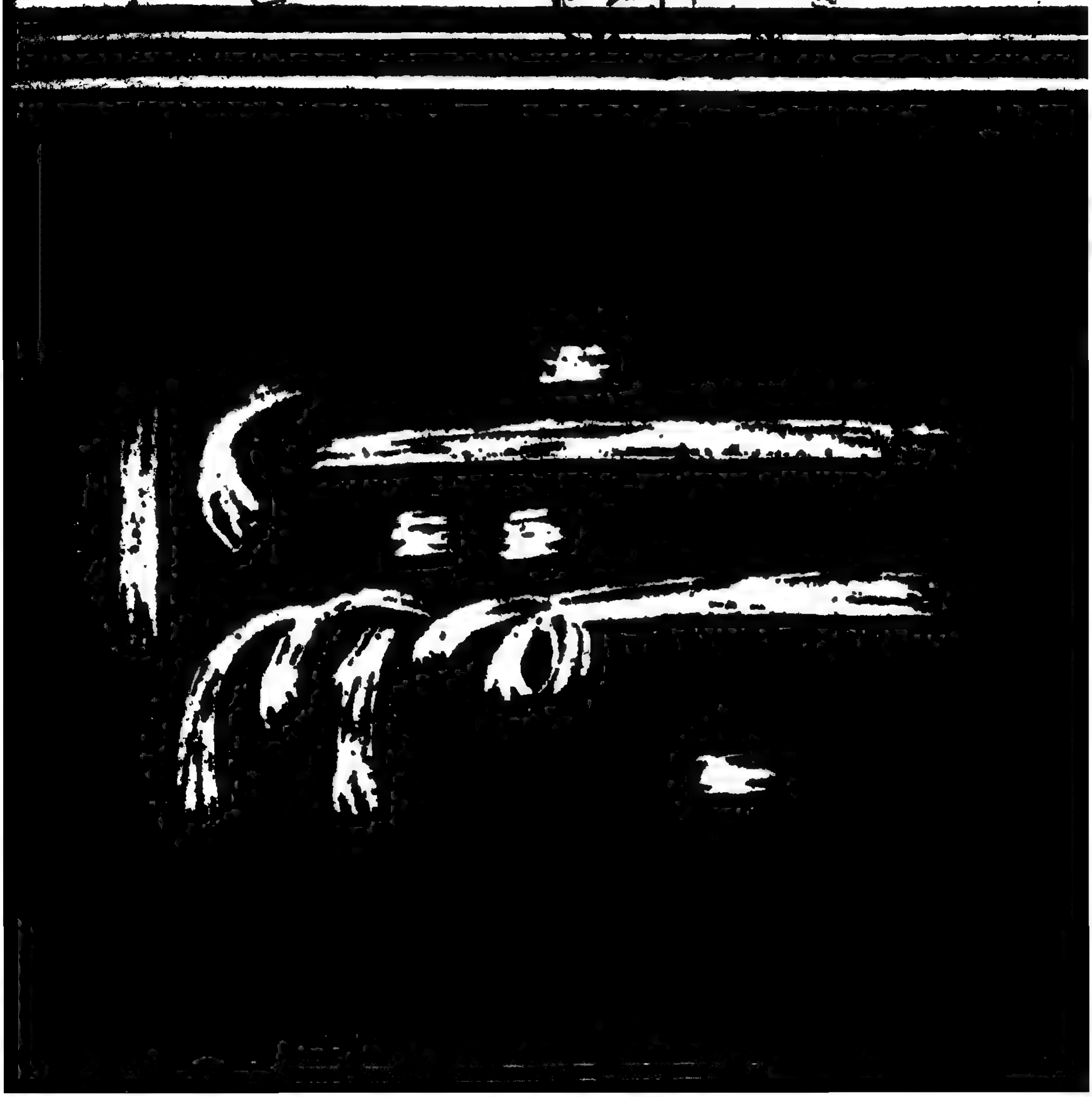

فلم کا مقصود اب مجنوں کی صحرا نوردی اور فرہاد کی کوہ کنی نہیں رہا

ملک و ملت اور دین و دنیا کے اہم مسائل کے حل فلم میں پیش کیے جاتے ہیں

شانتارام کے سال بھر کی دماغی کاوشوں

محبت اور قربانی کا حامی

نفرت اور خود غرضی کا دشمن

پڑوسی

اپنے شہر میں نمائش کے منتظر رہیے

سنت سکھو

"بہت تیزی سے فلمایا جا رہا ہے" ہنسا واڈکر

اس کا مرکز ہے

عمر خیام

کی مہورت بہت جلد ہونے والی ہے۔ اس فلم میں شانتارام ہدایات کا

فتح لال آرٹ کا اور ڈاکٹر عابد حسن مکالمے کا کمال دکھائیں گے۔

نمائش کار: **فیمس پکچرز لمیٹڈ بمبئی۔ دہلی۔ مدراس**

افسانہ نمبر

سنہ ۱۹۴۱ء

ادب لطیف

ملک کے ممتاز ترین افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں، وجد آفرین نظموں، بہترین ڈراموں اور معلومات سے لبریز مقالوں کے گرانمایہ ذخیرہ کے لحاظ سے ایک انسائیکلوپیڈیا ہوگا۔

چند اہل قلم حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں

احمد علی، علی عباس حسینی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، محترمہ عصمت چغتائی، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر فیاض محمود، فیض احمد فیض، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مسعود جاوید، اختر اورینوی، باری، احسان، امین حزیں، سہیل عظیم آبادی، ماہر القادری، گوپال متل، نریندر ناتھ، ڈاکٹر محمد نصیر اللہ، محمد امین شرقپوری، سدرج ماتھر، یہ عدیم المثال نمبر پہلے تمام نمبروں سے ہر لحاظ سے بہتر ہوگا

قیمت فی پرچہ ۱۲ آنے۔ مستقل خریداروں کو مفت۔ مکتبہ اردو لاہور

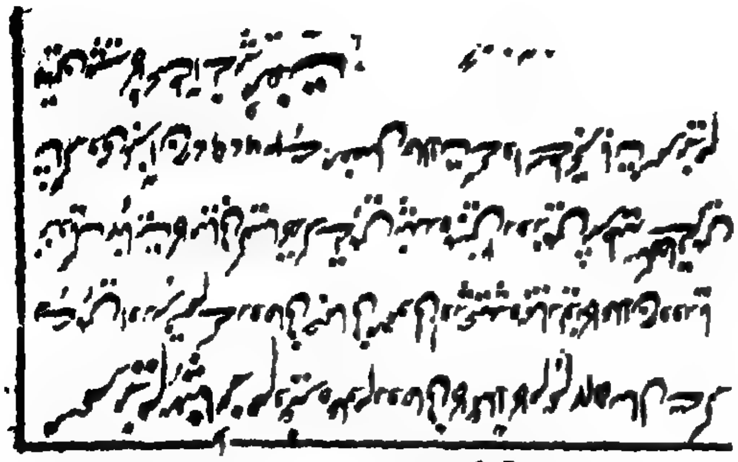

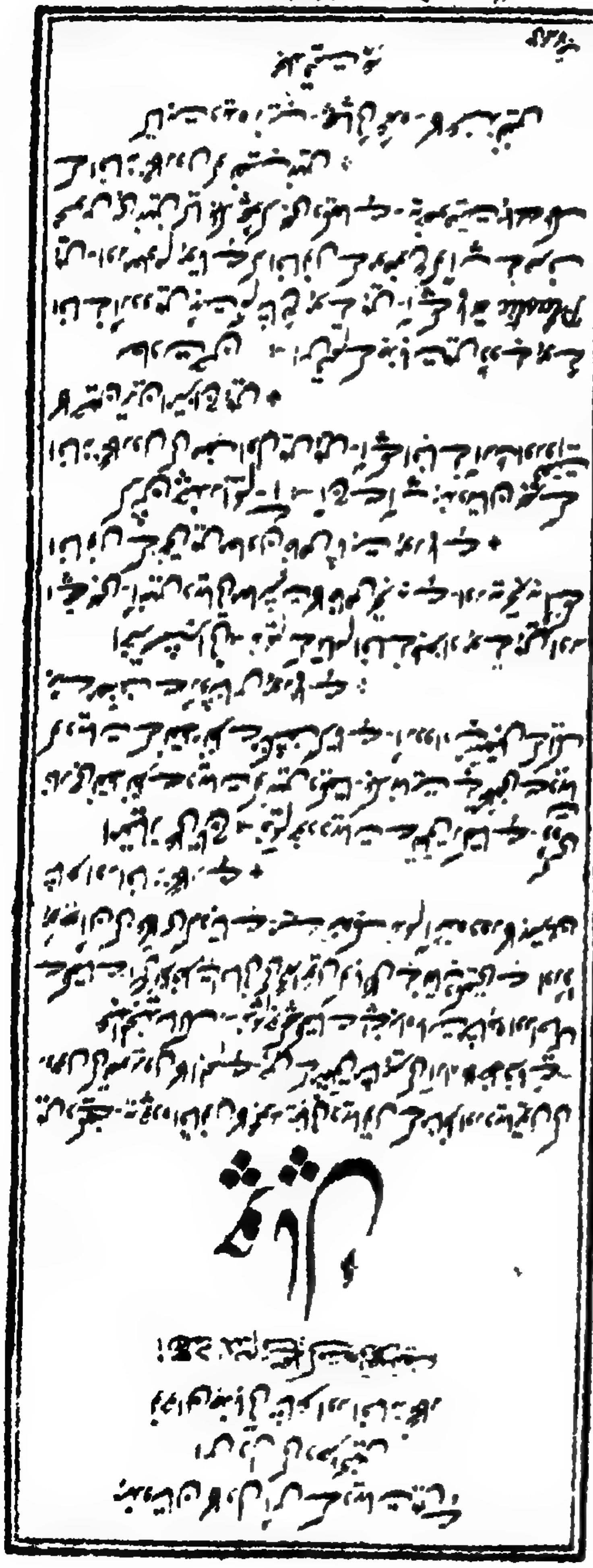

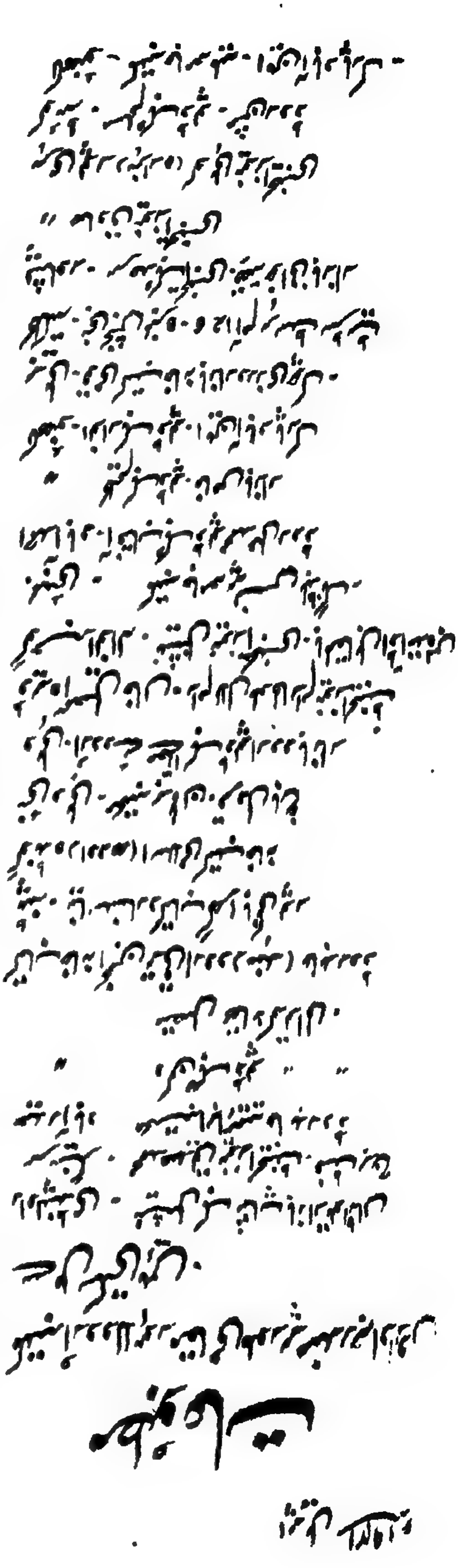

بگولے

دیہاتی زندگی کے مشہور عکاس

احمد ندیم قاسمی کے قلم سے

جس نے ہندوستانی اور خصوصاً پنجابی دیہات کے ہر رُخ کو چھو کر دیکھا ہے اور اپنی بے پناہ قوتِ احساس سے دیہاتی زندگی کو البیلی اور صاف ستھری زبان میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ بڑے بڑے اہل الرائے اُس کے کمال کے معترف ہو رہے ہیں۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اُسے نہایت بے تکلفی سے الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے اور چونکہ وہ ایک شاعر بھی ہے اس لئے اپنے افسانوں میں بھی الفاظ کے زیر و بم اور نشست و برخاست کا حسن قائم رکھتا ہے۔ اُس کے افسانے نفسیات نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ آرٹ اور ٹکنیک کے لحاظ سے اُسے نوجوان افسانہ نگاری میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ بہت تھوڑے عرصے میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں اُس کے افسانوں کے چرچے ہونے لگیں گے۔ بگولے اُسکے پندرہ منتخب افسانوں کا ایک بے نظیر مجموعہ ہے جسکا دیباچہ ہندوستان کے بہترین نوجوان افسانہ نگار

کرشن چندر ایم۔ اے

نے لکھا ہے۔ اور ایک نوجوان فنکار نے دوسرے نوجوان فنکار کو جن ادیبوں سے پرکھا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ہر اہلِ ذوق پر اس مجموعے کا مطالعہ فرض ہے جو اردو افسانہ نگاری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت مجلد عہ

(زیرِ طبع)

حال کے افسانے ماضی کی داستانوں سے پیدا ہوتے ہیں!

ابنِ آدم کی داستانِ تہذیب

ایک اتفاقی عمل ہے تاریخ عالم کے اہم حادثہ کو بھی دوسرے کار فرما عناصر سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہندوستان کی تاریخ بھی اسی عمل اتفاقی کا ایک نقش ہے۔ ہماری موجودہ سیاست میں ان حوادث کے نتائج کی جھلک صاف طور پر دکھائی دے رہی ہے جو ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئے۔

کمپنی کی حکومت (دوسرا ایڈیشن)

کا عہد ہندوستان کی تاریخ کے ایک پُر آشوب دور کی دردناک اور حیران کر دینے والی داستان ہے۔ اس دور کے اہم ترین حوادث کو اس زمانہ کے یورپی حوادث کے نتائج سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے اس تاریخی دور کے واقعات کو فلسفی مورخ باری نئے انداز میں پیش کرتا ہے!

سو صفحوں کا اضافہ ——— قیمت دو روپے

مکتبہ اردو لاہور

نارورن انڈیا سٹوڈیوز لاہور کے دو فلمی شاہکار

ہنسی مذاق سے لبریز

قسمت
افسانہ

ڈائرکٹر
روپ کے شوری

اداکاران
مجنوں ۔ رادھا منورما ۔ کملا
سندر سنگھ

شہری اور دیہاتی زندگی
کا موازنہ

میرا ماہی

اداکاران
ظہیر ۔ راگنی ۔ کرن دیوان
منوہر ۔ بیگ منورما ۔ سندر سنگھ

جگت ڈسٹری بیوٹرز لاہور دہلی ایسوسی ایٹیڈ فلم ڈسٹری بیوٹرز لاہور

ACNEES CREAM

ایکنیز کریم رجسٹرڈ

قیمت فی شیشی سوا روپیہ ۱/۴

PRICE 1/4

مس سی کے مینجدالی مجسٹریٹ کراچی سے تحریر فرماتی ہیں
میں نے ایکنیز کریم کو استعمال کیا۔ اور کیلوں
اور چھائیوں کے لئے بے حد مفید پایا
ترجمہ انگریزی چٹھی

ایکنیز کریم رجسٹرڈ
واقعی کیلوں چھائیوں جھریوں بدنما داغوں کو دور کر کے
چہرے کو ملائم اور خوبصورت بناتی ہے ترقی حسن و صحت جلد کا
نہایت ہی کامیاب اور بہترین نسخہ ہے۔ ہر بڑے جنرل مرچنٹ
اور کیمسٹ سے خریدیں۔

وی پی منگوانیکا پتہ: پیرس ہاؤس برانڈرتھ روڈ۔ لاہور

اقبال اور اُس کا پیغام

اقبال کا پیغام مشرق اور مغرب کی روحوں کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ انہوں نے برگساں۔ میک ٹیگرٹ اور نیٹشے کے افکار کو مشرق کے الٰہین کے تصورات سے اس طرح شیر و شکر کیا ہے۔ کہ ہم اس مرکب میں ایک نئی لطافت اور تازگی محسوس کرتے ہیں۔ فلسفہ خودی کیا ہے۔ اس کے عناصر کیا ہیں۔ جدید علمی انکشافات کی روشنی میں یہ فلسفہ کس حد تک قابل اعتنا ہے۔ اسکے ماخذ کیا ہیں۔ نوع انسان کے مجموعی افکار میں اس کی اہمیت کیا ہے۔ اس گراں قدر تصنیف میں ان تمام مسائل پر نہایت مدلل اور عالمانہ بحث کر کے ایسے اہم نکات کا انکشاف کیا گیا ہے۔ جس کا اکثر ناقدانہ تصانیف میں فقدان نظر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر زیر بحث تصنیف انتہائی اختصار کے باوجود اقبال سے متعلق تمام علمی و فنی مسائل کی بسیط اور جدید ترین تشریح پر مشتمل ہے۔ جو اصحاب اقبال مرحوم کی شاعری اور ذہنیت میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لوازمات سے ہے۔ یہ مختصر مگر جامع تصنیف اردو کے دو نامور نقادوں ڈاکٹر میاں تصدق حسین خالد اور میاں محمد شفیع خان ایم اے کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔

قیمت مجلد ۸/

مکتبہ — اردو — لاہور

دس ہزار روپیہ مفت انعام

امرتسر میں سونا دو (۲) روپے تولہ ہو گیا

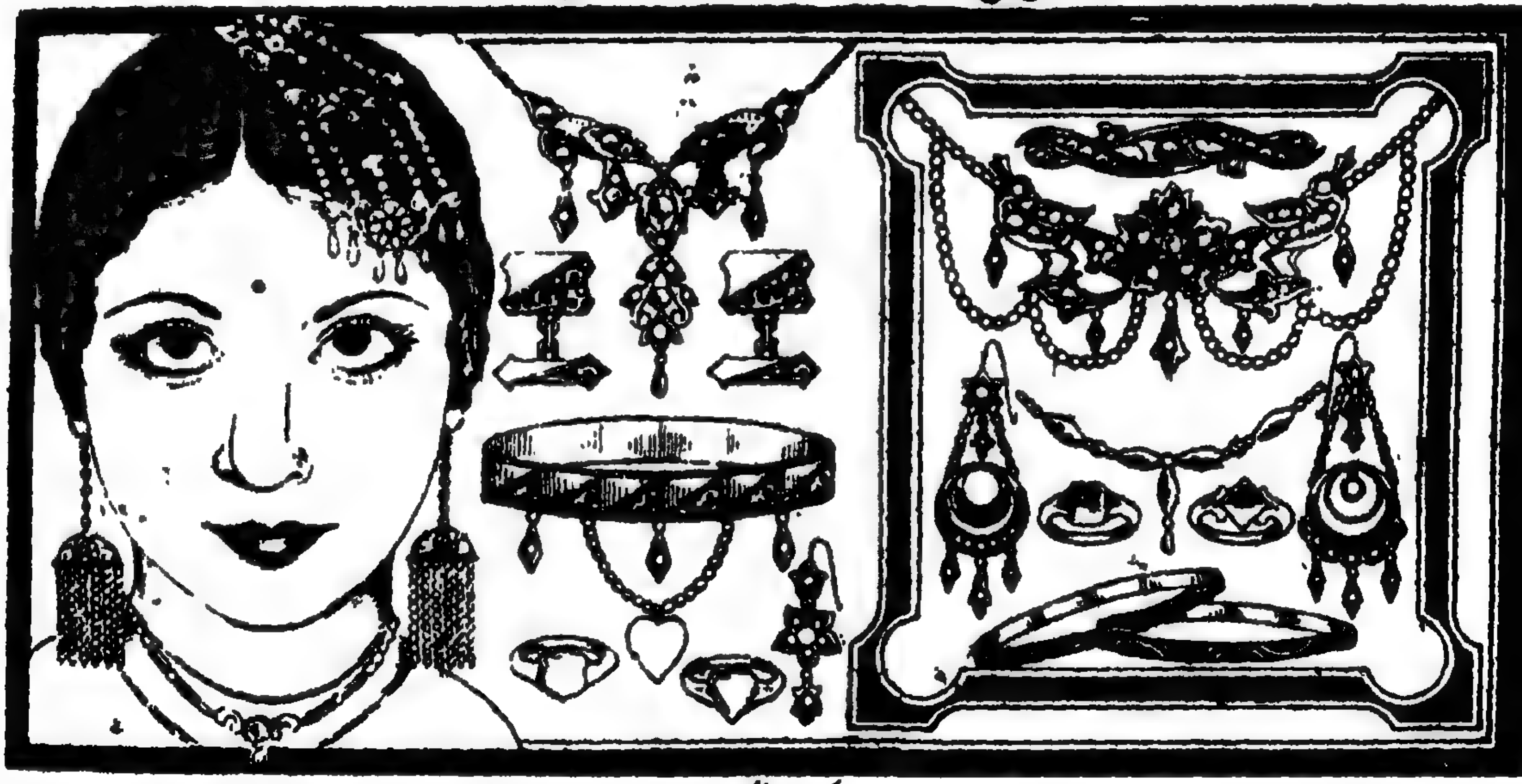

ملاحظرین دیکھئے اس سونے کے متعلق دنیا کیا کہتی ہے۔ جس گھر میں یہ اصلی امریکن نیو گولڈ گیا وہاں سے دوبارہ سہ بارہ فرمائش آئی۔ یہ سونا ایک اعجاب چیز ہے۔ اصلی سونے اور اس سونے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

جناب لالہ رام پرکاش صاحب ساکنی دہلی سے ۲۵ نومبر کو تحریر فرماتے ہیں آپ کا امریکن نیو گولڈ کا پارسل ملا۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی چیز واقعی کمال کی ہے آپکے امریکن نیو گولڈ اور اصلی سونے میں کوئی فرق نہیں آپنے اس نئی چیز کو تیار کر کے دنیا کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کر دکھایا ہے پندرہ تولہ سونا فوراً میرے دوست کیلئے ارسال کر دیں۔ اس کے بعد آپ کو اور بھی آرڈر دیا جاویگا۔ یہ سونا کسوٹی پر اصلی سونے کا رنگ دیتا ہے اصلی سونے کی طرح کوٹا اور پگھلایا جاتا ہے۔ بالکل اصلی سونے کے برابر ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار صراف بھی مشکل سے پہچان کر سکتا ہے۔ اس کے نئے بنے زیورات ہر جگہ پسند کئے جاتے ہیں۔ اس سے ہر قسم کے زیورات آجکل کے فیشن کے مطابق تیار ہو سکتے ہیں مندرجہ بالا فرمائش کو غلط ثابت کرنے والے کو دس ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائیگا۔ قیمت صرف مشہوری کی خاطر ایک تولہ دو روپیہ (۲) تین تولہ پانچ روپے آٹھ آنہ۔ چھ تولہ دس روپے۔ پندرہ تولہ بائیس روپیہ چالیس تولہ پچاس روپیہ (ضروری نوٹ) بارہ تولہ کے خریدار کو پیکنگ خرچ مفت۔ چھ تولہ یا اس سے زیادہ منگوانے والے خریدار کو محصول ڈاک و پیکنگ دونوں بالکل معاف۔ پندرہ تولہ کے خریدار کو ایک عدد اصلی گھڑی بالکل ٹھیک وقت دینے والی چابی ۲۴ گھنٹہ گارنٹی دس سال مفت بطور انعام دی جاوے گی۔

گارنٹی:۔ اگر پسند نہ ہو تو قیمت فوراً واپس ہوگی۔ جلدی منگائیں ورنہ ختم ہونے پر افسوس کرنا پڑے گا۔

ملنے کا اصلی پتہ:۔ میسرز امریکن بپلی ۔ کمپنی بپلی ۔ او بکس $\frac{27}{24}$ A.L ۔ امرتسر (پنجاب)

[illegible]

اشارات

ادبِ لطیف کے شمارہ مارچ میں مئی کے افسانہ نمبر کا اعلان ہو چکا ہے۔ یہ اعلان کے بعد کا خیال ہے کہ افسانہ نمبر میں ڈرامے بھی شامل کرلئے جائیں۔ اس لئے مئی کا شمارہ افسانہ اور ڈرامہ نمبر ہوگا۔

اس نمبر کے لئے ہمیں چند افسانے اور ڈرامے موصول ہو چکے ہیں جن میں ابوسعید قریشی کا "نفشی شعاعیں" پنجابی افسانہ نگار کرتار سنگھ کا "ماموں ٹھنگن" اور ڈراموں میں ہندر ناتھ کا "ایثار" اور سید بادشاہ حسین کا "ریل کی زنجیر" قابلِ ذکر ہیں۔ اسکے علاوہ بہت سے اچھے اچھے ادیبوں کے افسانے دفتر میں پہنچے ہیں لیکن اپریل کے شمارے کی تاخیر کی وجہ سے انہیں دیکھا نہیں جاسکا۔

اُن اہلِ قلم حضرات کا جنہوں نے افسانہ اور ڈراما نمبر میں تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ ادارہ ممنون ہے۔ ہمیں فقط یہی عرض کرنا مقصود ہے کہ اپنے وعدے جلد وفا ہو جائیں۔ تاکہ ترتیب و تدوین میں آسانی رہے اسلئے قلمی معاونین سے گذارش ہے۔ کہ وہ اپنے افکار اپریل کے تیسرے ہفتہ تک دفتر میں بھیج دیں۔ تاکہ حسبِ کتابت اور ترتیب کی دیکھ بھال ہو سکے

جن حضرات نے افسانہ نمبر کی ترتیب میں حصہ لینے کا وعدہ کیا ہے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں ــــ

اختر انصاری، اختر اوریوی، احمد ندیم قاسمی، ابن شرقپوری، ابو محمد امام الدین، آسی رام نگری، احمد علی، اوپندر ناتھ اشک، بسمل عظیم آبادی، سعادت حسن منٹو، سورج مامنز، شکیلہ اختر، شفیق الرحمان علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، منوہر لال ہکاج، مسعود، کرشن چندر، غلام عباس، ڈاکٹر محمد نصیر الدین، خواجہ غلام السیدین

پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر فیض احمد فیض، پروفیسر فیاض محمود،

مکتبۂ اردو: نئے زاویے اور راشد کی نظموں کا مجموعہ "ماورا" زیرِ طباعت ہیں۔ مکتبۂ اردو جلد ہی ان دو معرکہ خیز کتابوں کو دنیائے ادب میں پیش کرے گا۔ ان دونوں کتابوں کے بعد بھی مکتبہ کی اشاعت کا پروگرام کچھ کم شاندار نہیں۔ جناب سعادت حسن کے افسانوں کا مجموعہ، جناب احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا مجموعہ "بگولے" جناب کرشن چندر ایم۔ اے کے افسانوں کا مجموعہ "ٹوٹتے ہوئے تارے" جناب علی عباس حسینی کے افسانوں کا مجموعہ "رفیق تنہائی" جناب بیدی کا دوسرا مجموعہ "گرہن" یہ تمام مجموعے جلد ہی دنیائے ادب میں پیش کرے گا۔

افسانہ نمبر ۱۹۴۱ء

امسال بھی حسبِ سابق دو مہینوں کا مشترکہ پرچہ ہوگا جو کہ ۲۵ مئی تک شائع ہو جائیگا۔

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے خاص نمبر ہمیشہ ڈاک میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسلئے اطلاعاً لکھا جاتا ہے کہ جو حضرات اپنا پرچہ بحفاظت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ موازی تین آنے کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے بھیج دیں اور اپنا مکمل پتہ و خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں افسانہ نمبر انشاءاللہ تعالیٰ ۲۵ مئی تک قارئین کی خدمت میں پہنچ جائیگا۔ ادارہ

ایک غلطی کا ازالہ } سالنامہ ۱۹۴۱ء میں جناب طلیع اللہ صاحب راشد برہانپوری کا ایک مضمون "شہزادہ خسرو" کے عنوان سے صفحہ ۲۴۱ پر شائع ہوا ہے جس پر سہو کتابت سے صاحب مضمون کا نام طلیع اللہ راشد کے بجائے رفیع اللہ راشد شائع ہو گیا۔ ہم صاحب مضمون سے معذرت خواہ اور ناظرین سالنامہ سے تصحیح کیلئے ملتمس ہیں۔

[illegible]

(EUGENE HIMMELMAN)

[illegible]

...SA DE MITSAN...

[illegible]

زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ لوگ جو اُس پر خدا کی دی ہوئی
زندگی پر ہاتھ صاف کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ انہیں یہ ضرور
یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اس المناک سانحہ میں اُن کی دنیا کا بھی
ہاتھ ہے۔ اس نے تمام دنیا کا رنج و غم اپنے سر لیا اور مصلوب
ہوگیا اور شاید ٹالر کا یقین تھا۔ کہ حضرت عیسٰے مسیح کو کسی نے
صلیب پر نہیں لٹکایا۔ بلکہ اُنہوں نے خود اپنے آپ کو مصلوب
کرلیا۔ ٹالر کے نزدیک شاید خودکشی ہی ایک ایسی طریقہ
نجات تھا —

"مصلوب ہو کر ہی ہم
اپنے آپ کو نجات دلا سکتے ہیں
صلیب ہی ہماری آزادی کی سیڑھی ہے"

حضرت عیسٰے مسیح کی طرح ٹالر بھی (TRANSFIGURATION)
میں ایک ایسے بیمار انسان کو دکھاتا ہے جس نے دنیا کی نجات
کے لئے کوشش کی تھی۔ لیکن بالکل ناکام رہا — "میں کہتا ہوں
دنیا کی جملہ بیماریوں کا ایک ہی تیر بہدف علاج ہے —
ایک عالمگیر خودکشی۔ . . . محبت سے اسکا علاج بے فائدہ
ہے — قطعاً بے فائدہ . . . . میں نے یہ علاج کیا ہے اور
میں جانتا ہوں . . . . ."

اسلئے وہ بیمار آدمی دوسروں کے لئے نجات کی تلاش
میں اپنے آپ کو مار ڈالتا ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ ایسا جذبہ نہ
مذہبی طور پر احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ نہ فلسفیانہ طور
پر لیکن اس بات کی صداقت سے منکر نہیں ہوا جا سکتا۔ کہ ٹالر
نے ایک شفاف، جوشیلے لیکن دبے ہوئے تخیل کی بنا پر مذکورہ
نتائج اخذ کئے تھے۔ اور یہ نتائج ہمارے تخیل کے اس حصے
کو بیدار کردیتے ہیں۔ جن کا تعلق براہِ راست اخلاق سے ہے
مصیبت میں ہم ایک ہوتے ہیں۔ اور ہمیں یہ محسوس کرنے کی
ضرورت ہوتی ہے۔ کہ زمین ایک عزن میں لتھڑی ہوئی زخمی

گو کھر ہے۔ جو اپنے بیٹوں کا اکٹھا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے
ٹالر ایک (EXPRESSIONIST) تمثیل نگار تھا۔ اور وہ
اپنے ڈراموں میں واقع اور کردار کی نسبت خیالات اور جذبات
پر زیادہ زور دیتا تھا۔ وہ تشبیہ و استعارہ، چھوٹی چھوٹی علامتوں
اور رکاوٹوں، آوازوں اور خاکوں اور رمز و کنایہ سے اپنی تمثیل
کی دنیا بساتا تھا۔ انفرادی طور پر اسکے کردار کوئی وقعت نہیں
رکھتے۔ درحقیقت ٹالر سا تمثیل نگار ایک کردار کو بنانے سے
نفرت کرتا تھا۔ اُسکے افرادِ تمثیل کے ہجوم میں انفرادی حیثیت
گم ہو جاتی تھی۔ اُسکے کردار بطور جماعت کے پیش ہوتے تھے
مثلاً خاوند، بیوی، طالب علم، پروفیسر، انقلاب پسند، بیمار
آدمی، عورت، پہلا مزدور، دوسرا مزدور، تیسرا مزدور وغیرہ
وغیرہ۔ اس طرح کا طریقہ تمثیل نگار کو محض اسلئے مرغوب تھا
کہ وہ آسانی سے یہ دکھا سکتا تھا۔ کہ تمام لوگ ایک بہیمانہ نظام
کے شکار ہیں۔ ٹالر کے ڈرامے عموماً المیہ ہوتے تھے۔ لیکن
دگالزوردی کے معاشرتی اور گھریلو ڈراموں کی طرح کشمکش
ہیرو اور بدمعاش (VILLAIN) میں یا انسان اور مقدر
میں نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ایک فرد کی ایک جماعت کے
ساتھ ہوا کرتی۔ سرمایہ داری کو ایک خوفناک دیو دکھایا جاتا
فوجی طاقت کو ایک طوفان اور مروج قواعد کو زنجیریں۔ زندگی
ایک ایسا بیکار کاروبار دکھائی جاتی۔ جسکا اصل مقصد
تصادم اضداد میں فوت ہو جاتا۔ ٹالر اپنی ہی ایک تخلیق کے
ساتھ ہمنوا ہو کر کہتا ہے:۔

"وہ زندگی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اُسپر تھوکتے ہیں،
اسے کوڑے لگا کر پھانسی دے دیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے
ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ ایسی حرکات جس میں ادراک کو کوئی
دخل نہیں اُنہوں نے اپنے آپ کو تباہ حال بنایا۔ جب کہ
ان کے صرف اعمال ہونے کا امکان تھا۔ حقیقتاً اُنہوں نے

آسمانی بادشاہت کے لئے کبھی بھی دعا نہیں کی
ان میں کچھ تو پیدائشی اندھے ہیں۔ اور بعض کی آنکھوں
میں تپتی ہوئی سلائیاں پھیر دی گئی ہیں۔ ایسا ہزاروں
برسوں سے ہوتا آیا ہے . . . ان جہازوں کی طرح
جو ایک ہی رو میں بہہ کر ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش
پاش ہو جاتے ہیں"۔

ٹالر ایک یہودی جرمن تھا۔ چونکہ وہ یہودی ہونے کے علاوہ جنگ و جدل کے خلاف تھا۔ اس لئے نازیوں نے اسے ملک بدر کر دیا۔ جب ایک انسان — ایک ایسا مطلق العنان انسان برسرِ حکومت آیا۔ جس کی کہ خواہش تھی کہ جو وہ چاہتا تھا وہ لکھا جائے۔ اور مصنف اس کی آنکھوں سے دیکھیں۔ تو ٹالر کو نہ صرف جلاوطن کیا گیا۔ بلکہ اُس کی قیمتی تصنیفات کو شاہراہ عام پر سپردِ آتش کیا گیا۔ تعصب و تنگ ذہن کی اس پیدائش کو جلانا اس بات کا بدیہی ثبوت ہے۔ کہ آمر جرمنی نے ادب کی گرانبہا طاقت کو تسلیم کیا۔ اور فن کی اخلاقی قوتوں سے گھبرا گئے۔ لیکن امراء کی طاقتیں بھی حدود رکھتی ہیں اور آرٹ وقت اور زمین کی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ کسی سرزمین میں ایک خاص وقت کے لئے آرٹ کو تباہ کر دیا جائے۔ لیکن اس زمین کی حدود کے اوپر انسان کے منہ سے نکلا ہوا لفظ گونجتا رہے گا۔ انگلستان جو کہ اس قسم کے جلاوطنوں کا میزبان رہا ہے۔ اس نے ٹالر کو پناہ دی۔ اور اس کے ڈرامے شیکسپیئر اور شیلے کی سرزمین میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اور یہی سرزمین ٹالر کا دوسرا گھر ہو گئی۔

تحریر و تقریر میں ٹالر ہمیشہ عوام کا نمائندہ رہا۔ جب زندان خانے میں مزدور کام کرتے تھے۔ تو ٹالر بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتا تھا۔ عوام اُس کے نزدیک محض ایک ہجوم نہیں ہیں۔ ان میں بھی ان کی انفرادیت بیانگ دہل پکارتی نظر آتی ہے۔ کہ آزادی اور خوشی ہمارا پیدائشی حق ہے ایک قسم کی تہذیب، تنہائی جو کہ آرام و آسائش کی زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اُس کی سمجھ سے باہر تھی۔

"امراء! تمہیں ان تیلیوں، تیزلیوں، ان دھنیوں
جلاہوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔
رذیلیں، کہ یہ اژدہام تمہارے کھیتوں کی کاشت کرتا ہے
یہ اژدہام تمہارے تاج گھروں میں تمہاری خدمت پر کمربستہ
ہے۔
یہی اژدہام فوجی صورت میں تمہاری آسائش کا محافظ ہے
یہی ایک مضبوط بازو ہے۔ جس نے تمہیں طاقت کی
گدی پر بٹھایا ہے۔ اور صفِ اعداء سے لڑتا ہے"

مشین ریکرز (MACHINE WRECKERS) کی تمثیل میں ٹالر انگلستان کی لڈایٹ (LUDDITE) بغاوتوں کا ذکر کرتا ہے۔ یہ تمثیل ان مصائب کی تصویر ہے۔ جو کہ مشین نے انسان کے لئے پیدا کی ہیں۔ ٹالر مشین سے سخت متنفر ہے کیونکہ مشین ہی انسان کی مالک ہو گئی ہے۔ ٹالر اس بات پر موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ کہ اس نے جا و بیجا طور پر مشینی صنعت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور اس ضمن میں نامناسب طور پر اسے گالزوردی سے ملا گیا ہے۔ حالانکہ گالزوردی کی سٹرائف (STRIFE) محض ایک بعید از حقائق بحث ہو کر رہ جاتی ہے۔ ڈرامے کے طور پر مشین ریکرز عوام کی زیادہ صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

ٹالر کے آرٹ کا بہترین نمائندہ اُس کی کتاب عوام اور انسان (MASSE MENSCH) ہے یہ کتاب اس کا بہترین ڈرامہ ہے۔ یہ تشدد اور مشینی تہذیب کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ اور تصوری اور علامتی کرداروں کی حامل ہے حقیقت اور خواب کو یکجا کرنا۔ ٹھوس وقائع نگاری کی بجائے ایک

روحانی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ لیکن اس طریقہ سے مجموعی طور پر ایک گہرے اندرونی مشاہدے کا ثبوت ملتا ہے یہ ڈراما ٹالر نے قید خانے میں لکھا تھا جب کہ اُس کا دماغ مجروح کن روحانی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ اور اُسکے ذہن میں شیطانیت کے مجسمے۔ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بے معنی قلابازیاں کھاتے ہوئے دکھائی دیا کرتے تھے ایک قسم کے بخار میں مبتلا ٹالر لکھتا چلا گیا حتےٰ کہ اُسکی انگلیاں اکڑ گئیں۔ اور سپاہیوں نے ٹالر کی مزید خدمت سے انکار کر دیا۔ درحقیقت اس تمثیل میں انسان نہیں ہیں۔ مصنف ان کی انسانی شناخت سے پرے چلا جاتا ہے اور انہیں حیات و ممات کی علامتوں کی صورت میں دیکھتا ہے۔ اس عمل کو ٹالر نے یوں بیان کیا ہے۔

یہ ایک (کردار) شاید مزدور ہے، دوسرا کسان اور تیسرا ایک کلرک ۔ ۔ ۔ میں کشادہ پشت کسان اور بھینچی ہوئی چھاتی والے کلرک دونو کو اپنے سامنے صاف طور پر دیکھتا ہوں ۔ ۔ ۔ یکایک وہ اپنی انسانی قیمت کھو بیٹھتے ہیں۔ اور اپنے بے رحم نظام کا جزو نظر آنے لگتے ہیں۔

اس ڈرامے کا بڑا کردار ایک عورت ہے۔ جو کہ برسر اقتدار حکومت کی پیدا کی ہوئی جنگ کے خلاف بغاوت کرتی ہے وہ کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے غلاموں اور اسلحہ خانہ میں کام کرنے والے مزدوروں سب کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے بغاوت آخر کار کامیاب ہوتی ہے۔ لیکن باغی کامیابی کے نشہ میں چور حکومت کے خلاف ایک اور جنگ شروع کر دیتے ہیں وہ عورت انہیں اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔ جب بغاوت فرو کی جاتی ہے تو وہی عورت ان سب باتوں کی مجرم قرار دی جاتی ہے۔ اور پھانسی پر لٹکا دی جاتی ہے۔ ڈراما ہر قسم کے تشدد کے خلاف بغاوت ہے۔ خواہ وہ تشدد سرمایہ دارانہ ہو یا کمیونسٹ یا کسی اور نوعیت کا۔ انصاف سے بعید حکومت اور وحشی ہجوم دونو ایک جیسے ہی سونیا ــــ اُس عورت کو نہیں سمجھتے اُس عورت کو جو کہ روحانی قوتوں کی علامت ہے ڈرامے میں دکھائی گئی محبت ایک عالمگیر محبت ہے۔ جس میں موجودہ دور کے لوگوں کو یقین نہیں اور جس کی اشاعت دنیا کے بڑے آدمیوں مثلاً بدھ، مسیح ٹالسٹائی اور گاندھی نے کی ہے۔ اگر حکومت کا ظلم ٹالر کو پسند نہیں۔ تو ہجوم کا غیض و غضب بھی اُسے راس نہیں۔ ہجوم کا ذہن بعض وقت محض ایک ابن الوقت جوشیلے مقرر کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اُس کے ڈرامے میں سونیا بے سود طور پر چلاتی ہے ــــ

"مجھے سنو
ظلم و استبداد کو بنیادوں سے ہلا دو۔
اور غلامی کی پوشیدہ زنجیروں کو توڑ ڈالو۔
لیکن پھینک دو ــــ
اُس ہتھیار کو جنہوں نے صدیوں سے کام کو ریزہ ریزہ کر دیا
نئی پود اور نئی تشکیل کے لئے انتقام کے جذبہ کو دبا لو
انتقام انقلاب نہیں ہے۔
انتقام ایک ایسا تیشہ ہے۔ جو کہ سُرخ تپتے ہوئے
انقلاب کے لوہے کو پھاڑ دیتا ہے"

ٹالر کے نزدیک بہترین انقلاب وہ ہے۔ جس سے انسانی دل محبت کی لڑی میں منسلک ہو جائیں۔ اسکے ایک ڈرامے میں ایک وانا گر کہتا ہے۔

"میں تین حکومتوں کے سائے تلے رہا ہوں۔ تمام حکومتیں لوگوں کو کم و بیش دھوکا دیتی اور لوٹتی ہی ہیں۔ اور ایسی حکومتیں اچھی نہیں ہو سکتیں"

جنگ کا موضوع اور اس کی تباہی اور بدحالی کو

ٹالر نے ٹرانس فگریشن (TRANSFIGURATION)
عوام اور انسان (MASSES & MAN) ہنکیمن (HINKEMANN)
اور نو مور پیس (NO MORE PEACE) میں عیاں کیا ہے۔ ٹالر
اس جذبہ کی قدر نہیں کرتا۔ کہ ہمیں اپنے فادر لینڈ کے لئے لڑنا
چاہیئے۔ جنگ سے صرف سرمایہ داروں کے حقوق محفوظ ہوتے
ہیں۔ فریڈرک ایک یہودی ہے۔ اور اس کی حالت بالکل ٹالر
کی حالت سے ملتی جلتی ہے۔ وہ جنگ میں حصہ لینے سے انکار
کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

"پاگل پن — مرکز پاگل پن۔ ۔ ۔ کہاں۔ ۔ ۔ ؟
کہاں جاؤں؟ کونسی جگہ ایسی ہے۔ جہاں میں چھپ
سکتا ہوں۔ کروڑوں نیم شکستہ بازو میری طرف بڑھ
رہے ہیں۔ لاکھوں ماؤں کی دردناک چیخ و پکار میرے
کانوں میں گونجتی ہے۔ ۔ ۔ مقدس رونا! —
۔ ۔ ۔ ملک کی خاطر! ۔ ۔ ۔ او میرے خدا یہ کیا ہو رہا
ہے کیا یہ ہمیشہ ہوتا رہیگا؟ نہیں۔ ۔ ۔ نہیں —
ہزار مرتبہ نہیں۔ اس سے تو یہ اچھا ہے۔ کہ بے امید اور
بلا آرام جیا جائے!

ہنکیمن ایک زبردست ٹریجیڈی ہے۔ جس میں انسان لڑائی میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھا ہے۔ اپنی مردمیت بھی اور ہمیشہ کے لئے پریشان حال ہو کر کہتا ہے "دنیا نے اپنی روح کھو دی ہے۔ اور مجھے بے جنس بنا دیا ہے"

"ہوپلا، زندگی یونہی ہے" ایک اچھا ڈرامہ نہیں۔ لیکن اس کا بنیادی خیال اچھا ہے۔ برنارڈ شا کے بہت سے ڈراموں کی طرح اس میں بھی یہی دکھایا گیا ہے۔ کہ بسا اوقات دیوانہ بزعم خویش ہی ہشیار نہیں ہوتا۔ بلکہ فی الحقیقت ہشیار ہوتا ہے کم از کم اپنے وارڈروں سے زیادہ عقلمند۔ "آندھی و لوی" بھی ایک نہایت عمدہ تمثیل ہے۔ جس میں انصاف کا جنازہ اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس میں نیک و بد کے لطیف امتیاز کو عیاں کیا گیا ہے۔ اس تمثیل میں بھی ٹالر نے اپنے دوسرے ڈراموں کی طرح ایک زبردست مکالمہ دیا ہے۔ اور جذبات کا نہایت جوشیلے طریق سے اظہار کیا ہے۔

ٹالر کے ڈراموں میں رنج و غم کی تلقین یا افلاس کی تعریف نہیں کی گئی۔ کیونکہ یہ مصنوعی چیزیں ہیں۔ اور معنوی سماج کی پیدا کردہ۔ اور اُسے یقین ہے۔ کہ ان کا علاج ہو سکتا ہے۔ اپنے ایک مشہور دیباچے میں ٹالر رنج و محن کی دو قسمیں بیان کرتا ہے۔ ایک وہ جس کا درماں ہے یعنی ایسی تکالیف جنہیں ہم سفلی کہہ سکتے ہیں۔ جو کہ غیر متناسب معاشی و سیاسی تقسیم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور دوسری تکلیف کو وہ شخصیت کے درد۔ کا نام دیتا ہے۔ جو سفلی ضروریات پوری ہونے کے باوجود زندگی اور موت سے ایک انسان کے حصے میں آتی ہے۔ اور وہ ایک خاص قسم کی تنہائی اور اجنبیت سی محسوس کرتا ہے۔ یہی ایک تڑپ اور جلن ہے۔ جو کہ ہمیشہ رہتی ہے۔ اور جس کا مظہر آرٹ ہے۔

ٹالر اپنی زندگی میں اس رنج و محن کے خلاف جنگ کرتا رہا جس کا کہ درماں ممکن ہے۔ ٹالر کے تئیں آرٹ زندگی کی حقیقتوں سے بعید ایک عشرت نہیں۔ بلکہ وہ اسے ہمیشہ ایک ہتھیار سمجھتا رہا۔ جس سے کہ زندگی کی مذمت کرنے کے علاوہ اس میں پیدا شدہ برائیوں کے خلاف لڑا جا سکے اُس کا قول تھا۔ "اس وحشی جوتے کے نیچے ہمیں مطلقاً خاموش نہیں رہنا چاہیئے۔ اس حالت میں جو شخص بھی خاموش رہتا ہے۔ وہ انسانیت کے ساتھ غداری کرتا ہے۔"

احمد ندیم قاسمی

تاثرات

ہائے یہ کالی گھٹاؤں کا گرجنا بار بار ۱ ہائے یہ کھپریل کے چھپر پہ بوندوں کا ملہار
ہائے یہ بھیگے ہوئے آنچل میں سمٹی بجلیاں تن گئے ہیں یک بیک میرے شکستہ دل کے تار

روح کے پُرہول ویرانوں میں پچھلی رات کو ۲ تیرتی ہے ایک دوشیزہ کی یہ موہوم لے
راہ تکتی ہوں تیرا بیٹھی ہوئی پردیس میں تو مجھے دھوکا نہیں دے گا — مجھے معلوم ہے!

ہائے وہ سارنگیوں کے تار — وہ تانیں تیری ۳ اُف حنا آلود پوروں کا وہ رقص بےخودی
چھا رہی ہے چرخ کے تاروں پہ بنکر موجِ نور زندگی — موسیقیوں کے جال میں لپٹی ہوئی

کس قدر بدنام ہیں میری جنوں سامانیاں ۴ اور کتنی مختصر سی داستانِ عشق ہے
وہ نگاہوں کا تصادم - وہ لبوں کی کپکپی اور وہ کانسی کی گاگر کا چھلکنا پے بہ پے

کیا ہوئیں اے دوستو میلے پہ جانے والیاں ۵ میں کجاوے کس کے بیٹھا ہوں اندھیری رات میں
کاش کہہ آنا صبوحی کو کہ میں باہر ہوں آج ہائے یہ دس کوس کا لمبا سفر برسات میں
ہائے یہ میری جنوں سامان محبت کے کھنڈر جیسے اک بوسیدہ ایواں کے شکستہ بام و در

ہائے یہ گزری ہوئی گھڑیوں کا لحنِ دلخراش
جیسے اُلو کی صداؤں کا فضاؤں پر اثر

محترمہ سرج ماتھر

دھوپ اور بارش

جاگنے پر اس نے اپنے دماغ کو ایک عجیب کشمکش میں مبتلا پایا سردی کا دن تھا اور دھند فضا میں معلق تھی۔ اور ان سب باتوں سے نہ جانے اُسے یہ کیوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔

یہ بات اُسے تب بھی محسوس ہوتی تھی جب کہ وہ اپنے وطن گجرات کاٹھیاواڑ میں رہا کرتا تھا۔ یہ احساس عجیب قسم کا تھا۔ ایک قسم کی تنہائی، غمگینی اور غربت کا ملا جلا احساس۔ اور وہ اپنے آپ سے سوال کرتا۔ آخر میں پنجاب میں کیوں آیا؟ اور پھر اُسے خیال آتا — ابھی کچھ ہوگا، ابھی . . . لیکن کیا ہوگا؟

دوپہر کے وقت وہ پنڈی کے سٹیشن پر گیا اور کالا شاہ کاکو کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہوگیا۔ کالا شاہ کاکو کہاں ہے وہ اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ ٹرین میں مال گاڑی کے ڈبے بھی تھے۔ اور مسافروں کی بوگیاں بھی۔ اس نے ایک تیسرے درجے کا ٹکٹ خریدا اور ایک ڈبے میں داخل ہوگیا۔ اسکے بعد ایک بڑی تیز سی سیٹی ہوئی اور گاڑی شہر سے نکل کر دیہات میں چلی گئی۔ چھک چھک، چھک چھک کرتی ہوئی، ایک عام ہندوستانی گاڑی کی طرح، جس سے اُسے سخت نفرت تھی۔ اگرچہ اس نے ولایتی گاڑیوں میں کبھی سفر نہیں کیا تھا۔

کھیتوں پر کہر کی ایک ہلکی، سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اور درختوں کے قریب دھند کے گالے سے دکھائی دیتے تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے قدرت کی بڑھیا ایک مہین سا سوت کات کر زمین کے اردگرد لپیٹ رہی ہے۔ کبھی کبھی اس سوت میں سے زمین کا سبز ننگا جسم دکھائی دینے لگتا۔ اور اُس پر بنا ہوا کوئی جھونپڑا یوں نظر آتا جیسے نوجوان زمین کا کوئی ابھرا ہوا عضو ہو۔ یہ زمین کاٹھیاواڑ کی زمین سے مختلف تھی۔ موٹے آدمی کے جسم کی چربی کی طرح اس پر بھی سبزی کا موٹاپا تھا۔

اسکے ڈبے میں تین آدمی بیٹھے تھے، ایک بوڑھا مسلمان جاٹ تھا، اُس کی بیوی تھی، اور ایک لڑکی تھی۔ کسان کی بڑی بڑی مونچھیں اُسکے لبوں کی حد سے گزر کر منہ میں پڑ رہی تھیں اس کا چہرہ موسم زدہ تھا۔ اور اسکے اٹھنے بیٹھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے گنٹھیا کی شکایت ہو۔ اُسکے ہاتھ کھردرے اور بڑے بڑے تھے۔ اُس کی بیوی کا چہرہ قدرے ملائم و نفیس تھا۔ اور زمانے کی مکڑی نے اس پر جھریوں کا جالا بن رکھا تھا — لڑکی کا رنگ قدرے سیاہ تھا۔ جیسے اُس جاٹ اور اُس کی بیوی کے رنگ کو ملا دیا گیا ہو۔ لڑکی کی حرکتوں سے یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بورڈ کے کسی پرائمری سکول میں پڑھ جانے سے وہ اپنے باپ اور ماں دونوں کے وجود سے سخت شرمندہ ہے

ڈبے کے اندر داخل ہوتے ہی اُس جاٹ نے اس نوجوان کے ساتھ باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ وہ جاٹ ہنستا تھا۔ اور اپنے میلے میلے، زرد دانت دکھا دیتا۔ وہ نوجوان جانتا تھا۔ کہ وہ دیہاتی اُس کی بات کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن برابر یوں ظاہر کر رہا تھا۔ جیسے اُسے سب کچھ سمجھ آ رہا ہے۔

جاٹ نے اپنے کرتے سے بہت میلا سا تمباکو نکالا۔

اور اُسے ہتھیلی پر مسلنے لگا۔ پھر اس نے اپنا حقہ قریب سرکایا
وہ اس تمباکو کو گھبرڑ کہتا تھا۔ نوجوان نے اپنی جیب سے کیونڈر
کا ڈبہ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ اس کسان کو پیش کیا
"سگریٹ لوگے — میاں" اُس نے کہا۔
جاٹ نے رضامندی کے اظہار میں بڑے زور زور سے
سر ہلایا اور بولا۔ "ہاں ہاں"
پھر اس کسان نے سگریٹ کو انگلیوں میں پکڑنے کی بجائے
مٹھی میں پکڑ لیا۔ جیسے یہ اُسکے چیتنا سے پر لینے والا کوئی باعث
کبوتر ہو اور بڑی مشکل سے اُسکے ہاتھ آیا ہو۔ پھر اس نے نوجوان
کی نقل میں سگریٹ کو دو انگلیوں کے درمیان تھاما اور اس
کے بڑھے ہوئے شعلے کے نزدیک لا کر منہ سے سانس اندر کو
کھینچی۔ تمام ڈبے میں بے تحاشہ دھواں بھر گیا۔ اس کے
بعد وہ بڑی حیرانی سے سگریٹ کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس پر لکھے
ہوئے لفظوں کو پڑھنا چاہتا ہو۔ پھر اس نے بیوی کی طرف
رُخ کیا۔ جو کہ اس مختصر سے لین دین کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی
تھی۔ دیہاتی سگریٹ کو اُسے دکھاتے ہوئے بولا۔

"یہ ولایتی ہے۔"

"بہت اچھا ہے" اُس کی بیوی نے کہا۔

"ہاں بہت ہی عمدہ ہے"

"ادھر تو دکھاؤ"

جاٹ نے سگریٹ کو اپنی بیوی کے ناک کے پاس رکھ دیا۔
بڑھیا نے اپنا سر قدرے پیچھے سرکا لیا۔ اور وہ دونوں کرسخت
حیرت سے سگریٹ پر لکھے ہوئے مدہم سے الفاظ کو گھورنے لگے۔
"اسے کیا کہتے ہیں؟" جاٹ نے نوجوان سے سوال کیا
"کیونڈر... کے... ون... ڈر" نوجوان نے
ایک ایک ہند پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"کے... ونا" دیہاتی نے پُر شکوک لہجہ میں کہا۔ اور اپنی
بیوی سے گویا ہوا۔ جانتے ہو اسے پوٹھوہاری میں کیا کہتے ہیں؟

"چڑیٹ"

دیہاتی اپنی بیوی کی حاضر جوابی پر بہت خوش ہوا۔ اور
نوجوان سے پوچھنے لگا۔ "تم کدھر جا رہے ہو؟"
"کاٹھیاواڑ" — نوجوان نے کالاشاہ کاکو کی بجائے
کاٹھیاواڑ کہا۔
"کیا؟" جاٹ نے پوچھا، گیا وہ اس عجیب سے نام سے
بہت گھبرا گیا ہو۔
"کاٹھیاواڑ" نوجوان نے دہرایا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا۔"
"کاٹھیاواڑ... کاٹھیاواڑ" اُن کی نوجوان لڑکی نے
درست نقل کرتے ہوئے کہا۔ وہ نہایت خشمگیں ہو کر بولی۔ "وہ
کہ رہے ہیں۔ کہیں کاٹھیاواڑ جا رہا ہوں۔"
"اچھا، اچھا" دیہاتی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ گویا وہ سب
کچھ سمجھ گیا ہو اور اپنی بیوی کو مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ
چھوکرا بہت دور کے دیس میں جا رہا ہے۔" اور اسکے بعد دونوں
حیرت زدہ ہو کر نوجوان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اپنی چندھیائی
ہوئی آنکھوں کو ملتے ہوئے وہ نوجوان سے گویا ہوا "آپ کس
دیس کے رہنے والے ہیں؟"
لڑکی بہت تیزی سے بولی "وہ پنجاب کے رہنے والے
نہیں ہیں۔ کیا تمہیں شکل و صورت سے کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا"
نوجوان نے لڑکی کی بے صبری کو ناپسند کرتے ہوئے
کہا۔ "میں مارواڑی ہوں"
بوڑھے نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "وہ
مار... مارواڑی ہے"
"اچھا اچھا" عورت بولی جیسے ہندوستان کا سارا نقشہ اُسکے
ذہن میں پھر گیا ہو۔ اور اُن کی لڑکی بڑے غصے سے ایک

چنگاری کی طرح سلگتی ہوئی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

اسکے بعد دیہاتی بڑے غور سے اس نوجوان کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا حتٰے کہ اُس کی وحشیانہ نگاہوں کے نیچے نوجوان تلملا اُٹھا۔ اُسے یوں ایذا پہنچتے دیکھ کر لڑکی بھی کھسیانی ہوگئی۔ اور جب اُسکے ماں باپ بہت دیر تک اُس نوجوان کی طرف دیکھتے رہے۔ تو لڑکی کے ماتھے پر پسینہ کے قطرے اُمڈ آئے۔ اس لڑکی کا چہرہ سخت سردی میں پیدا ہونے والی زرد گھاس کی طرح تھا۔ جس پر سرِ شام اوس پڑنی شروع ہوجاتی ہے۔ . . . دیہاتی نے پہلے نوجوان کے بوٹوں کی طرف دیکھا پھر کپڑوں کی طرف اور آخر میں . . اوورکوٹ پر نگاہ دوڑائی۔ پھر اُسکے سر کے نزدیک ریک پر پڑے ہوئے چمڑے کے سوٹ کیس کو دیکھا۔ اور بولا -

" چمڑے کا ہے . . . "

اُس کی بیوی بولی: "کس جانور کا چمڑہ ہے ؟ "

" اصلی چمڑہ — ولایتی ہے "

عورت نے ہاں میں ہاں ملادی۔ اور وہ دونوں کچھ دیر تک سوٹ کیس کی طرف دیکھتے رہے۔ اور جب سیر ہو چکے تو پھر نوجوان کو گھورنا شروع کیا۔ نوجوان نے گھبرا کر پھر اپنا سگرٹ کیس آگے کر دیا اور بولا - -

" اور لیجئے — "

جاٹ نے نہایت ممنونانہ انداز سے سگریٹ اٹھالیا۔ ایک ہاتھ سے سگریٹ تھامے اور دوسرے ہاتھ کی انگلی سے سگریٹ کو چھوتے ہوئے بولا: "یہ بہت مہنگا ہے کیا ؟ "

" بہت مہنگا ہے "

دیہاتی اپنی آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے پھر سے سگریٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا اُسکے دل میں پہلے کی نسبت دوسرے سگریٹ کے لئے زیادہ عزت پیدا ہوگئی ہو۔ پھر بولا -

" وہیں کے بعد پھر کہاں جاؤ گے "

" بمبئی "

" بمبئی ؟ . . . بمبئی کیوں، کیا تم وہاں کسی کو جانتے ہو ؟ "

" نہیں — یونہی عید گاہ دیکھنے جاؤں گا "

" کیسے ؟ . . . " بوڑھے نے کہا۔

" میں شہر دیکھونگا — اور بس "

" میری سمجھ میں نہیں آیا " دیہاتی نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا "کیا کوئی دکان ہے ؟ "

لڑکی نے زور سے چلاتے ہوئے کہا: "وہ تو کہہ رہے ہیں کہ شہر دیکھنا ہے اور بس . . . تمہیں تو خاک بھی سمجھ نہیں آتا "

جاٹ نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے کیا معلوم — وہ کوئی پوٹھوہاری تھوڑے ہی بولتا ہے "

لڑکی اور بھی زیادہ سلگنے لگی۔ بولی "وہ صاف تو کہہ رہے ہیں۔ فقط تمہارے ہی دماغ میں بھس بھرا ہوا ہے "

جاٹ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا اور دھوئیں کے بڑے بڑے بادل اُڑانے لگا۔ شاید وہ اُس نوجوان سے بہت سے سوال پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ اُس سے کئی باتیں سیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن محض اپنی لڑکی کی وجہ سے خاموش ہو رہا۔ کئی بار اُس نے کوشش بھی کی۔ مگر الفاظ جیسے اُس کی زبان پر آکر رُک گئے

گاڑی کے باہر بارش ترچھی دھاروں میں پڑ رہی تھی۔ اور پرے دور دھیا سفید آسمان میں جہاں سورج تھا۔ وہاں ہلکا قرمزی سا رنگ دکھائی دیتا تھا۔ جیسے سورج بادلوں کو پھاڑ کر باہر نکلنا چاہتا ہو۔ جب کسان نے سورج کی طرف دیکھا تو اُسکے گھٹنوں کو اپنی بڑی بڑی اور سخت انگلیوں سے چھوتے ہوئے اس طرح بولا۔ جیسے کوئی بچے کو پڑھا رہا ہو۔

" وہ رکھا جھوسڑا " اور پھر اُس نے سورج کی طرف اشارہ کیا

" وہ رکھا . . . جھوسڑا " نوجوان بولا -

"نہیں نہیں،" کسان اور اُس کی بیوی ہنستے ہوئے بولے۔

"وڈکا جھبڑا۔"

اور جب نوجوان نے قدرے درست تلفظ ادا کیا۔ تو جاٹ اور اس کی بیوی بہت خوش ہوئے۔ لڑکی کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوگئی۔ اسکے باپ نے بیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا — ہے نا۔

"ہاں، ویسے ہی جیسے پوٹھوہاری کہتے ہیں۔"

پھر جاٹ نے بارش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ہاتھ اٹھائے اور انہیں ترچھے انداز میں بار بار نیچے پھینکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "وجوپنیری"

"وجوپنیری،" نوجوان نے دہرایا۔

"ٹھیک ہے... بالکل ٹھیک... تم بہت اچھا بولتے ہو۔ تم بہت جلدی پوٹھوہاری سیکھ جاؤگے۔ پھر اس نے باہر بارش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وجوپنیری"

میں کہتی ہوں وہ پوٹھوہاری پہلے سے ہی جانتے ہیں — لڑکی نے اپنے باپ سے کہا۔ تمہارے دماغ میں اللہ جانے کوئی بھس بھرا ہوا ہے۔"

جاٹ خاموش ہوگیا۔ لیکن ایک مادرانہ جذبے کے ساتھ اُس نوجوان کی طرف دیکھتا رہا۔ اسکے بعد سب سورج تھوڑا سا باہر نکلا آیا اور بارش بدستور جاری رہی جاٹ بولا۔ "یہ گیدڑ گیڈی کا بیاہ ہے، اور وہ نسبتاً بلند آواز سے بولا۔

"وڈکا جھبڑا... وجوپنیری... گیدڑ گیڈی
وڈکا جھبڑا... وجوپنیری... گیدڑ گیڈی"

اور نوجوان اُن کی نقل میں ان الفاظ کو دہراتا رہا کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ صرف گاڑی کی چھک چھک پھک پھک سنائی دیتی رہی۔ اور لڑکی ویسے ہی خشمگین نگاہوں سے کھڑکی کے باہر جھانکتی رہی۔ اور ترچھی بارش بدستور جاری رہی۔

دوپہر کے قریب گاڑی ایک گاؤں کے سٹیشن پر ٹھہری اور بہت سے مسافر اترنے کے لئے اٹھے۔ جاٹ، اسکی بیوی اور اُن کی لڑکی کا سفر بھی یہیں ختم ہوتا تھا۔ دراصل انہوں نے یہاں سے گاڑی تبدیل کرنی تھی۔ انہوں نے اپنا حقہ اور دوسرا سامان اٹھایا۔ اور اُسے پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ نوجوان نے سگرٹوں کا باقی پیکٹ بوڑھے کو دے دیا۔ جاٹ نے کھڑکی کے قریب کھڑے ہوکر کہا۔

"وزیرآباد ہے — وزیرآباد،"

نوجوان نے دیہاتی کا شکریہ ادا کیا۔ بوڑھے نے جلدی سے سگریٹ اپنی جیب میں ڈالے اور نہایت تیزی سے [illegible] بارش اور فضا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وڈکا جھبڑا... وجوپنیری... گیدڑ گیڈی"

اور نوجوان نے سر ہلایا جیسے اُسے سب کچھ یاد ہوگیا ہو۔ اور اُسے اب تک نہیں بھولے گا۔ اور کسان کی بیوی نے جدا ہوتے ہوئے کہا۔ تم بہت جلدی پوٹھوہاری سیکھ لوگے بیٹا،"

اور ان سب باتوں کے دوران میں لڑکی ایک طرف کھڑی رہی اور اپنے ماں باپ کے وجود سے شرمندہ خاطر ہوکر اپنے وجود کے متعلق سوچنے لگی۔ پھر وہ یک لخت دوسرے پلیٹ فارم کی طرف چل دی۔ اور پیچھے دیکھتی ہوئی بولی۔

"میں کہتی ہوں —— وہ سب کچھ جانتے ہیں، اور پھر یہ بڑے بڑے حروف کو کیا نہیں پہچانتے۔ کیا تم لوگ اُن کی خلاصی نہیں کروگے؟ تم محض اپنے آپ کو احمق بنا رہے ہو۔"

اور جب اُس کے ماں باپ اُس کی طرف آنے کے لئے بڑھے۔ تو لڑکی نے مسکرا دیا۔ اس کے بعد گاڑی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پروفیسر رشید احمد صدیقی

تباہی میں تفنن

ٹرین لڑنے کا حادثہ

فرض کر لیجئے ٹرین کا حادثہ ہو گیا۔ تو میں خود فرض کر لینے پر نہایت بدمزگی کے بعد ہی آمادہ کیا جا سکتا ہوں۔ اس کا یہ سبب ہے کہ میں حساب میں ہمیشہ کمزور رہا۔ اور فرض کرنے سے میرا بدگمان ہونا یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ بھلا مانس سے بھلا مانس شخص بھی مجھ کو سوال سمجھانے کی کوشش کرتا تو شروع یہیں سے کرتا کہ فرض کرو۔ اس کا جواب میں یہ دیتا۔ کہ کیوں فرض کروں اس میں تو میں ہمیشہ حق بجانب ہوتا۔ اس لئے کہ جو کچھ فرض کر لیا جاتا۔ وہی آخر میں صحیح ثابت ہوتا۔ میں اس کو بڑی نازیبا بات سمجھتا ہوں کہ آپ سوال سمجھانے کے بجائے آنکھوں میں دھول جھونکیں۔ فرض کر لینا آنکھوں میں دھول ہی جھونکنا تو ہوا۔ اقلیدس میں اس سے بڑھ کر اندھا دھند دیکھی۔ وہاں فرض کر کے مسئلہ کو ثابت بھی کر دیتے ہیں۔ اور فرض ہی کر کے اُسے غلط ثابت کر دیتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ آخر میں اس کا اعلان علیحدہ سے کراتے۔ کہ یہی ثابت کرنا تھا۔ بقول ایک صاحب کے سخن بجتہ کے، "واہ بھئی واہ"!

چنانچہ اوائلِ عمر میں مجھے جو سکھایا گیا۔ وہ اس عمر میں آپ پر آزمانا چاہتا ہوں۔ یعنی فرض کر لیجئے۔ کہ ٹرین کا حادثہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جب حادثہ ہو گیا۔ تو پھر رہ کیا گیا۔ بشرطیکہ فرض کرنے میں آپ ہی نے کوئی کور کسر اٹھا نہ رکھی ہو۔ اب جب کہ آپ فرض کرنے پر اُتر ہی آئے ہیں۔ تو ایک بار اور فرض کیجئے کہ ٹرین کے حادثہ کی خبر بغیر کسی تفصیل کے آئی۔ بوڑھوں، مراقیوں اور بیے فکروں کی بن آئی۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی بساط کے مطابق حاشیہ آرائی شروع کر دی۔

ایک نے کہا۔ گاڑی کیوں نہ لڑے۔ نہ خالص گھی ملتا ہے۔ نہ خالص آدمی۔ امتحان ہر جگہ، ایمان کہیں نہیں۔ نہ لڑکی کو شوہر ملتا ہے۔ اور نہ شوہر کو کمیشن۔ دوسرے سورما بولے گاڑی لڑی تو تعجب کیا۔ اونٹ بیل گھوڑے کو آدمی کے داموں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ جب تک ان سواریوں پر لوگ آتے جاتے رہے۔ کبھی کوئی آفت نازل نہ ہوئی۔ نہ گاڑی لیٹ ہوتی تھی۔ نہ پھاٹک بند ملتا تھا۔ آپ نے کبھی اونٹ گاڑی کو بھی لیٹ ہوتے سنا ہے؟ ایک طرف سے آواز آئی، ہمیشہ کہتا رہا بھائی کیا آفت آئی ہے۔ سنبھل کر چلو بدحواسی کیا ہے۔ نہ دن کو دن سمجھو۔ نہ رات کو رات۔ دو انگل کی پٹڑی کی بساط ہی کیا جس پہ آفت جوت رکھی ہے۔ ٹھیک کہا تھا مرحوم نے

تو سہی عمرِ رواں آہستہ چل تھک کے مر جاتا ہے گھوڑا ڈاک کا!

ایک اور درویش بولے، میاں کیا بکتے ہو۔ اگلے وقتوں میں یہ ہوتا تھا کہ کشتی پر سفر کرتے ہیں مثلاً بسم اللہ مجریہا و مرسیہا۔ طوفان آ گیا۔ یا کشتی بھنور میں پھنسی تو اس کا کھلا ہوا نسخہ تھا۔ یعنی کوئی نہ کوئی منحوس آدمی کشتی پر سوار ہے۔ قرعہ

ڈھل لیا، منوس پڑ گیا اور پانی میں پھینک دیا گیا۔ کشتی مل کھڑی ہوئی۔ آج کل اس کا کوئی لحاظ نہیں۔ معلوم نہیں کتنے تیرہ نمبر سفر کرتے ہیں۔ اور اول درجہ کا سفر خرچ وصول کرتے ہیں۔ کچھ اس فکر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ کہ کب کوئی اپنی کتاب یا اخبار پر سے نگاہ ہٹا سکے۔ اور یہ مانگ بیٹھیں۔ جب سے آبادی بڑھی اور حیا گھٹی کوئی منحوسوں کا خیال تک ذہن میں نہیں لاتا اور کوئی مانے یا نہ مانے۔ میرا تو ایمان ہے۔ کہ جب سے ہم نے منحوسوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم آئے دن مصیبتوں میں گرفتار رہنے لگے ہیں۔

ایک بزرگ نے یوں گلفشانی شروع کی گاڑی لدی تو کیا برا ہوا۔ آخر یہی کوئی بات ہوئی۔ کہ ٹکٹ کے منہ مانگے دام لیں گے۔ سفر آرام کا ہو تو ہوا کرے، خرید و فروخت کا مزا جاتا رہا۔ ترکی کی ایک ٹانگ اور ٹکٹ کے ایک دام۔ جب چیز زیادہ خریدی جاتی ہے۔ تو محصول ڈاک یا کرایہ ریل معاف کر دیا جاتا ہے۔ یہاں اسکا کوئی سوال ہی نہیں۔ ٹکٹ کی تعداد کو دام سے ضرب دیتے جایئے حاصل ضرب ریلوے کا ۔ دام ادا کر دیجئے گاڑی پر بیٹھ جایئے۔ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ طہارت کے آداب سے بھی واقف ہو یا نہیں۔ یا کبھی آدمیوں میں بیٹھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے یا نہیں۔ جب تک آدمی نہیں دام دیکھ کر گاڑی میں جگہ ملتی رہے گی۔ گاڑی لڑتی رہیگی۔

ایک صاحب نے جماہی لے کر آنکھ کے کونے سے کیچڑ صاف کرتے۔ اور پھر اُسے دیکھتے ہوئے بولے بلوں تو بڑا بنوں۔ نہ بلوں تو مغز استخواں سوزو۔ غضب خدا کا انجن اور گاڑیوں پر دنیا بھر کے نمبر اور نشان ہونگے۔ نہ ہوگا تو نقش سلیمانی۔ دو پیسہ کی دوا بندھانے جاؤ۔ تو بھی نسخہ پر ہو الشافی لکھ دیں گے۔ یہاں لاکھوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے اور کلمہ خیر زبان پر نہ آنے دیجئے۔ (بڑبڑاتے ہوئے) قہر درویش برجان درویش۔ پہچاننے کی تمیز نہیں ہنی مون پر مستعد اسپیشل بھاگتے شلوک کے نام سواہا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ جھوٹے جاؤ گوٹھ اور دکھاتے جاؤ لالٹین۔ مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود

ایک بڑھیا جو بنئے کی دوکان پر سودا خرید رہی تھی، کہنے لگی، ارے موسیٹھو تم جانو ہیں تکی لپٹی رکھتی نہیں۔ اس گاڑی میں ضرور کوئی بارات ہوگی۔ سارے لڑائی جھگڑے کی جڑ بس یہی بیاہ بارات ہے۔ تم ہی بتاؤ کوئی گاڑی آج تک ایسی لڑی ہے۔ جس میں کوئی بارات سفر نہ کر رہی ہو۔ نہ براتی کا کھانا دیجئے۔ نہ پرجوں کا حق بانٹیں گے۔ نہ دولہن گھونگھٹ کاڑھیں گی نہ دولہا سہرا باندھیں گے۔ شادی کی نے بھاگے! ایک سادھو کو جاتے دیکھ کر، ٹوک کر کیوں بابا ٹھیک کہتی ہوں نا؟ بابا بولے۔ مائی جی سب مایا ہے، کچھ سادھو کو دے کلیان ہوگا۔ بڑھیا بولی، بابا تمہارے دیدے پھوٹ کر مسجد ہو گئے ہیں! مائی جی ہو گی کوئی اور۔ چل دور ہو، گاڑی لڑنے کتنے لال ٹھنڈے ہو گئے۔ اس مشٹنڈے کو کسی نے نہ پوچھا، بڑا آیا ہے مائی کہنے والا!

ایک طرف دو چار بابو قسم کے لوگ جا رہے تھے۔ پیچھے پیچھے ایک خلاصی، خلاصی کے سر پر بوجھ، بابوؤں میں سے کسی کے ہاتھ میں گوبھی کے پھول اور کسی کے ہاتھ میں لکڑی اور ہر ایک کی زبان پر گاڑی لڑنے کا واقعہ، ایک نے کہا۔ ۵۰ اپ ہوگا۔ دوسرے نے کہا ساڑھے پانسو ڈاؤن تھا۔ تیسرے نے کہا۔ اپ ڈاؤن، جو تھا بولا نہیں ڈاؤن اپ۔ تھوڑی دیر تک سب اپ اپ، ڈاؤن ڈاؤن کہتے رہے۔ ایک نے خلاصی سے بڑی طلب کی، بحث موقوف ہو گئی۔ ہر ایک نے

ایک ایک بیڑی سلگائی۔ بحث پھر شروع ہوگئی۔

ایک بولا۔ مسٹر اسسٹنٹ ڈرائیور ہوگا۔ بچا کا مزاج ہی نہ ملتا تھا۔ کھا گئے نہ چرخچے۔ ایم (۴۸) گریڈ میں تھا۔ پٹو جی کو جگہ ملے گی۔ دوسرے نے کہا گھاس کھا گئے ہو۔ پٹو جی زرا جونیئر ہے۔ اور کیوں وہ جو مسٹر بھونفر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو ٹی پی ڈی کے چلتے ہیں۔ دوسرے نے کہا۔ کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ اور وہ جو ٹی پی ڈی کے چچا ڈبلیو وائی زینڈ بیٹھے ہیں وہ شیخ جی کو آگے نہ بڑھائیں گے۔؟ خلاصی نے پوچھا اور کیوں بابو جی گارڈ بابو کون تھے سب مل کر بولے۔ ارے ہاں خوب یاد دلایا۔ گارڈ بابو! اگر کہیں ۲۰۰ اپ کو ۲۰۰ آپ نے پیچھے سے آکر دھکا دے دیا ہو تو مزا ہی آجائے۔ بھاجی بابو کا تو سوا ہا ہوگیا ہوگا۔ پھر تو بھائی نتھو خیرے تمہارے پوبارہ ہیں۔ نتھو خیرے ایک دفعہ دم دیر ہی میں تو آگئے، گو بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی بولے ملنگ جی تمہارے منہ میں گھی شکر (اور خلاصی سے مخاطب ہوکر) لاؤ ایک بیڑی۔ خلاصی نے آخری بیڑی ان کے سپرد کی، پیشانی سے پسینہ پوچھا اور —— بیڑی کا خول پھینک دیا۔

کئی سال گزرے۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں سے قریب ہی ٹرین کا ایک بڑا سخت حادثہ گذرا۔ جس گاڑی پر آفت آئی اس پر ایک صاحب تشریف لانے والے تھے۔ جس اسٹیشن سے سوار ہونے والے تھے۔ وہاں پلیٹ فارم پر آمنے سامنے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے اپنا سارا اسباب ایک گاڑی پر رکھا۔ اور دل بہلانے کے خاطر ٹہلنے لگے۔ گاڑی نے سیٹی دی۔ یہ بدحواسی میں پاس ہی والی گاڑی میں جو چھوٹ رہی تھی۔ بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ اصل گاڑی جس میں اسباب رکھا ہوا تھا۔ انکے بغیر روانہ ہوئی۔ اور حادثہ سے دوچار ہوئی۔ منزلِ مقصود پر لوگ ان کے منتظر تھے ان کا اسباب پہنچا تو کہرام مچ گیا۔ یوسف گم گشتہ کو ٹرین کے حادثہ کی خبر نہ ہوئی۔ اس لئے گھومتے پھرتے تیسرے دن وطن پہنچے۔ گھر پر ان کے سیوم کا کھانا ہو رہا تھا جس میں انہیں بھی شریک ہونا پڑا۔

ایک صاحب ریل میں بے ٹکٹ سفر ہی اس لئے کرتے ہیں۔ کہ ریل پر سفر کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس لئے کہ معلوم نہیں کب گاڑی لڑ جائے۔ یا غسلخانہ میں قتل کر دئے جائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص اتنے بڑے خطرہ کا مقابلہ کرے اسکے لئے جائز ہے۔ کہ وہ ریل کا کرایہ نہ ادا کرے۔ پھر اس میں لطف یہ ہے۔ کہ گاڑی لڑ جائے۔ تو تاوان وصول کیجئے پوچھا اور کیوں جناب بے ٹکٹ سفر کرتے پکڑے جائے تو کیا ہو۔ بولے یہ تو معمولی بات ہے۔ اول تو سب سے ہلکی سزا بے ٹکٹ سفر کرنے کی ہے۔ دوسرے یہ کہ سادھو یا لیڈر سمجھ کر لوگ عقیدہ کچھ نہ کچھ کھلاتے پلاتے ہیں اور معافی بھی مانگتے ہیں۔ پھر یہ کیا کم ہے کہ سفر میں انتقال کر جائے تو تجہیز و تکفین مفت ہو جاتی ہے۔ تصویر اوپر سے چھپتی ہے۔ پوچھا گیا اگر ٹرین لڑ جائے۔ تو کیا ہو۔ فرمایا ہو کیا ٹکٹ بے ٹکٹ دونوں برابر اور تمام منفعتیں وہی جو ابھی عرض کیجا چکی ہیں!

اس سلسلہ میں بے موقع نہ ہوگا۔ اگر ایک بڑے تجربہ کار حضرت کے اصول سفر کا اظہار کر دیا جائے۔ فرمایا، ٹرین لڑنے سے سراسیمہ نہ ہونا چاہیئے۔ صرف تھوڑی سی احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ یعنی کوشش کر کے بیچ کے ڈبہ میں بیٹھ جانا چاہیئے۔ ٹرین آگے سے لڑے یا پیچھے سے دھکا کھائے۔ مسافر کو گزند پہنچنے کا امکان نہیں۔ دوسرے طرف ریلوے سے تاوان لینے کا حق ہو جاتا ہے۔ وہ ٹوٹے کرنا چاہیئے۔ کہ دماغی صدمہ پہنچا ہے۔ بہکی بہکی باتیں کیجئے۔ ڈاکٹروں سے

سارٹیفکیٹ لکھا دیجئے اور دوسروں کو تکلیف بتائیے۔ کسی شریف آدمی کو آتے جاتے دیکھئے تو لیٹ جائیے۔ اما خبار کا نمائندہ مل جائے تو بغلگیر ہو جائیے۔ اور مجبوراً کسی سے ملنا ہی پڑے۔ تو زبان سے کچھ نہ کہئے۔ بلکہ اُس کا بشرہ اس طور پر دیکھئے۔ جیسے آپ کچھ وصیت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن صحت یاب ہو جانے کے امکان سے ڈرتے ہیں۔ یا فکر شعر فرما رہے ہیں۔ لیکن سفر خرچ کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔ دیکھتے ہی ہر شخص پکار اٹھے گا۔ کہ آپ کے ذہن کی چولیں کھسکی ہوئی ہیں۔ اور آپ کو معاوضہ مل جائے گا۔

خاکسار یہاں مراد صرف واحد متکلم سے ہے۔ بعض ایسے بزرگوں سے نیاز حاصل ہے۔ جو اس بات کا پتہ لگانے رہتے ہیں کہ گاڑی کہاں لڑی۔ اسکے بعد ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ یا تو خود اپنے آپ کو مجروحین میں شامل کرکے تاوان وصول کریں یا اسکا امکان نہ ہو تو تحقیقاتی کمیٹی میں شامل ہو جائیں۔ یا گواہی دینے والوں میں نام لکھا لیں۔ ایک بار انہوں نے تاوان یا معاوضہ کا مطالبہ ایسی جگہ کیا۔ جہاں کے طور طریقوں سے یہ ناواقف تھے۔ ان کا مطالبہ اس بناء پر نامنظور کیا گیا کہ یہ غیر ملکی تھے۔ انہوں نے مزید چیخ پکار کی۔ تو جواب ملا کہ تم آنجہانی ہو جاؤ۔ تو مزار یہاں بنوا دیا جا سکتا ہے معاوضہ کے لئے کوئی اور گھر دیکھو۔

ٹرین کا کوئی زبردست حادثہ ہو یا کوئی اور وقوعہ۔ اس کے اسباب دریافت کرنے کے لئے بالعموم ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ کمیشن بجائے خود ایک حادثہ ہوتا ہے۔ تحقیقات اکثر سیلون میں کی جاتی ہے۔ رپورٹ پہاڑ پر لکھی جاتی ہے صدائیں پنڈال میں سنی جاتی ہیں۔ عاد لانہ پرورش کی جاتی ہے۔ اور نمونہ اخبارات میں ہوتا ہے۔

اب میں آپ کے سامنے ایک فرضی رپورٹ کی تنقیحات یا نتائج پیش کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ کوئی گاڑی انجن یا دونوں پٹڑی سے اُتر گئے۔ جان و مال کا شدید نقصان ہوا۔ چنانچہ ہندوستان میں جتنی انجمن اور ادارے ہیں۔ سب نے ریزولیوشن پاس کر دئے۔ جس جس کو جس جس قسم کی شکائتیں تھیں ان سب کا اعادہ کر دیا گیا۔ کچھ لوگ جائے وقوع پر پہنچنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ جن کے ساتھ زادِ راہ کافی تھا۔ وہ انٹرویو دیتے اور بیانات شائع کرتے منزل مقصود تک پہنچے۔ جن کے پاس اس کی کمی تھی۔ انہوں نے جہاں رُکے وہیں سے ریلیف فنڈ کا کاروبار شروع کر دیا اور جو جگہ سے ہلنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے ممالک غیر کو تار بھیج دیئے۔ کچھ ایسے بھی تھے۔ جنہیں روانہ نہیں ہونے دیا گیا۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرکے بیٹھ رہے!

کچھ عرصہ بعد ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا جس کی رپورٹ کا خلاصہ سناتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ گاڑی گری کیوں۔ کیا اکثر گاڑیاں گرتی رہتی ہیں اگر نہ گریں۔ تو کیا ہو اور گر گئیں تو کیا کیا جائے اگر ان کے جوابات تشفی بخش ہیں۔ تو کیا کیا جائے۔ اور تشفی بخش نہ ہوں۔ تو کیا کیا جائے۔ اور کچھ بھی نہ کیا جائے۔ تو کیا حرج اور سب کچھ کر دیا جائے۔ تو کیا حاصل! ان میں سے کسی کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ کون سی بات کلیۃً صحیح اور کون سی بات کلیۃً غلط ہے۔ صحیح صرف اتنا ہے کہ گاڑی گری انجن گرا۔

ممکن ہے انجن بہت زیادہ تھکا ہو۔ اور رغنودگی یا تکان کے باعث اُس نے ٹھوکر لی ہو۔ یا دوا اپنی اوقات سے

اس درجہ مایوس و متنفر ہو۔ کہ خودکشی کر لی ہو۔ خودکشی کا امکان اس لئے ضعیف ہو جاتا ہے۔ کہ انجہانی ہونے سے پہلے بالعموم اسے مایوس یا متفکر نہیں دیکھا گیا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ بعض نئے اور نوجوان انجنوں کے آجانے سے متوفی کو ہمیشہ اس کا اندیشہ رہتا تھا۔ اور کبھی کبھی یہ اندیشہ حق بجانب بھی ثابت ہوا کہ متوفی کے بعض افراد خاندان نو واردوں سے زیادہ مانوس و ملوث ہوتے جا رہے ہیں۔ اور متوفی کے بارہ میں اکثر منصوبے ہوتے رہتے۔ کہ اس کو آنریری حیثیت دیکر صرف ہواخوری پر رکھ لیا جائے۔

دوسرے یہ کہتے تھے۔ کہ یہ مسئلہ خودکشی کا نہیں ہے۔ شباب کی بے اعتدالی کا ہے۔ یہاں سے تحقیقات کی نوعیت بدلتی ہے۔ یعنی جس انجن کے یہ کرتوت ہیں۔ وہ کار آزمودہ یا خدا رسیدہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک نئے قسم کے انجنوں میں سے تھا بڑا فتنۂ منہ زور اور بدلگام۔ اس کو پہلے سے نکالا نہیں گیا تھا جیسا کہ گھوڑوں کو نکالتے ہیں۔ چنانچہ یہ کبھی کبھی اڑنے اور الف ہونے لگتے تھے۔ کسی نے یوں نہیں خیال کیا۔ کہ جوانی کا زور ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ سنجیدگی اور بالآخر سعادت مندی آ جائے گی۔ لیکن زمین نرم تھی اور خون گرم۔ قلابازی لگ گئے۔

متوفی کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ انجن بنائے تو گئے تھے معمولی ہی لیکن جس کارخانہ میں یہ بنے تھے وہاں ہوائی اور آبی تارپیڈو بنانے کا بھی شعبہ تھا۔ غلطی سے مختلف پرزے کچھ اس انداز سے ان انجنوں میں فٹ ہو گئے۔ کہ یہ ایک دوسری چیز بن گئے۔ یعنی زمین توڑ تارپیڈو۔ چنانچہ ایک دن نگہبانوں کی غفلت سے یہ سنپلے اصطبل سے تڑا بھاگے اور دندناتے ہوئے زمین کے اندر گھس گئے۔ بقول ؎

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ٹھیک نہیں یاد کہ بہار اور کوئٹہ میں زلزلے کب آئے۔ البتہ بعضوں کا خیال ہے۔ کہ زمین کے اندر انہیں مفرور انجنوں نے ادھم مچا رکھی ہے۔ اور ان زلزلوں کا سبب یہی انجن ہیں۔ ہندوستان میں تو ان کا اشتہار دیدیا گیا تھا۔ ہر طرف پولیس اور والنٹیر ڈنڈے اور پھندے لئے موجود تھے۔ اس لئے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے زمین کے اندر ہی اندر یورپ کا رخ کیا۔ اور وہاں جو قیامت آجکل بھی ہوئی ہے۔ وہ انہیں انجنوں کے کرتوت ہیں!

بعض گواہوں (زبان کی لغزش سے میں گمراہوں لکھنے جا رہا تھا) کا بیان ہے۔ کہ اس حادثہ کا سبب ستاروں کا قران اور مسافروں کا ہجوم بھی ہو سکتا ہے۔ بعض اس حادثہ ہی کے منکر ہیں۔ چنانچہ فلکیات طبیعیات اور ریاضیات کے ماہرین بروایت حکم آئن اسٹائن یہ بیان کرتے ہیں کہ جس فاصلہ پر اور جس تیزی سے یہ گاڑی جا رہی تھی۔ اس کا اقتضا ہے۔ کہ اس کی ہیئت ترکیبی یا ترتیبی مختلف نظر آنے لگے۔ بجائے خود کوئی فرق کہیں نہیں آیا ہے۔ گاڑی ہنوز چلی جا رہی ہے۔ یہ ہماری نظر کا فتور ہے۔ کہ ہم اسے حادثہ سے دوچار پاتے ہیں۔

اس نظریہ سے بعض ایسے لوگوں میں سخت برہمی اور سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے۔ جو اس امر کا دعوے دائر کر چکے تھے۔ کہ اس حادثہ سے ان کو جسمانی یا دماغی صدمہ پہنچا ہے۔ ایسا صدمہ جس کا علاج بوعلی سینا کے پاس ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اس کی تلافی ریلوے کمپنی کو بہرحال کرنی پڑے گی!

(بقیہ صفحہ ۴۲ سطر ۱۰ پر ملاحظہ فرماویں) *

سمجھی جاتی تھی! معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ ہمارے ملک کی وباشیاں
حلق میں انگلی ڈال کر نہ جانے اسے کتنا چوڑا کر دیتی ہیں!
جودھا کا حلق اگر وائی پھیرتی نہ تب بھی اسکے ڈیل ڈول
کے مطابق آواز اونچی ہی ہوتی۔ اور اس کی آواز کی پوری گونج
اس وقت سنائی دیتی تھی۔ جب وہ گاؤں سے باہر نکل کر اپنے
گڈریوں کو پکار کر بلاتا تھا۔ لیکن جب وہ مجھ سے بات کرتا
تو بہت دھیمی آواز میں اور بڑی دھیرے سے کرتا تھا۔ اور یہی
بات تھی۔ کہ جس سے وہ بات کرتا۔ اس کی سمجھ میں جودھا کا ایک
ایک لفظ بیٹھ جاتا۔ غرض یوں سمجھئے کہ جودھا ایک گیانی گنوار تھا!
صبح سے شام تک وہ اپنے دروازے کے سامنے نیم
تلے بیٹھا ٹوکریاں بنتا اور وہیں بیٹھے بیٹھے گھر باہر کی باتوں کا
فیصلہ چکاتا اور گاؤں والوں کی گتھیاں سلجھاتا تھا۔
اس سے ایک دفعہ ملنے کے بعد میرا کوئی دورہ ایسا نہ
ہوا جو شانتی سے شروع نہ ہوا ہو یا وہاں ختم نہ ہوا ہو۔
ایک بار میں اسکے پاس بیٹھا تھا۔ اور وہ ٹوکریاں بیچنے شہر
کو جانیوالا تھا۔ گاؤں کے دو ایک آدمی شہر سے پلٹے تھے۔ انہوں
نے سنایا۔ کہ وہاں ہندو مسلمانوں میں لڑائی ہو گئی ہے۔ انہوں
نے جودھا سے کہا۔ دادا آج شہر کو نہ جاؤ! مگر جودھا میں
اتنی دیر کے لئے رکا کہ اس لڑائی کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتا
ہے کہدے۔ وہ بولا۔
"بالو ہو یا دنگا پھساد (فساد)، کا کارن؟" ایک نے جواب
بھی دینا چاہا پر جودھا نے اسکے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور خود ہی
جواب بتایا۔ "یا بیر کا کارن اسپیٹر جی تمہارے اسکول اور پٹھشالیں
ہیں! جب لو (تک) جب تک، اسکول اور پٹھشالیں نا آئی تھیں۔ سب
بھائیوں کے سمان رہتے بستے تھے۔ پر جب سے اسکول کھلے
اور پٹھشالیں آئیں، بس کاندے کانون (قاعدے قانون) ہونے
لگے۔ اور جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ پھر تم جانو جب جھگڑا آ گیا۔ تو جھوٹ

کو آنا ہی تھا۔ اور جب جھوٹ آ گئی۔ تو جھگڑا کون نبٹنے جاتا ہے!
سنو، میاں جی نے ایک بات کہی! لالہ جی نے بھی ایک بات کہی
وا کی یا نا سمجھو، یا کی وا نا سمجھو ——— چلو چھٹی ہوئی! اب تنی سو تو
—— اور تنتی ابھی چلی گئی! تم مانو کرنا مانو، یا تنا تنی کی جڑ اسکول
اور پٹھشالیں ہیں!"
میں جودھا کی نرالی صورت کو دیکھتا۔ اور اس کا فیصلہ
سنتا تھا۔ جودھا میں ایک اور بھی نرالی بات تھی۔ وہ جب بات
کرتا تو اسکے ہونٹ اتنے نہ ہلتے تھے جتنی وہ بات کرتا تھا میری
طرف دیکھ کے وہ بولا۔
"اسپیٹر جی میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ اب جو یہ گالی گلوچ
کاڑھیں (نکالیں) تو وہ بات تو میری سمجھ میں آ جائیگی پر جب
بابوؤں کی سی بات پیٹ بھر کے نہ کرینگے تو ماننا اسپیٹر جی ندی
کے اس پار کھڑے ہو نگے اور جودھا واندی کے اس پار!
وا وخت (وقت) میں ان کی بات نا سمجھ پاؤنگا، وا وخت وہ پنڈت جی
کی کتھا بھانتے نگھنڈے جا کو کوئی نا سمجھ پاوے ہے! بھائی یا اسکول
پٹھشالوں میں تو لٹھ پونگا ہی لکھا ہووے ہے! بھلے کو ہمارے
گاؤں کے موڑا دلڑکے پڑھا لکھا بھلا وہ پایا ہیں، اور نا تو یا گاؤں
میں بھی لٹھ پونگا ہو رہتا!
میں نے اس سے کہا کہ تمہارے وچار نا سمجھی کے ہیں۔ تعلیم
سکھشا تو انسان کو اونچا انسان بنا دیتی ہے
"یا دیکھو! اب انہوں نے جو کچھ کہی ہماری سمجھ میں نہ بیٹھی۔
اونچا آدمی کیسے بنا دے ہے؟ کوئی گواہی شاہدی دگواہی شہادت؟"
میں نے اسے بتایا۔ کہ لٹھ پونگا اسکول اور پٹھشالیں نہیں
سکھاتی ہیں۔ یہ لڑائی جھگڑے تو بے پڑھے لکھے، جاہل اور
کنڈ آدمیوں کا کام ہے۔ اسپر جودھا دادا بہت چمکے اور بولے
"اسپیٹر جی، یا ای بات ہماری سمجھ میں نا بیٹھے ہے۔ کنڈ
لڑیں ہیں پر کنڈ بات ہی پر لڑیں ہیں۔ پر یہ لڑائیاں تو پڑھے

نصوں کی ہیں۔ میں پوچھوں ہوں کہ ملک بار سماچار کون چھاپے
ہے؟ بھاشن اور وہ پالکھیاں کون دے؟ پڑھے لکھے کبنڈ آدمی کو ریا
مت دیں نہیں۔ وہ لڑتا مائیں ہیں! دریا بابو لوگ گھروں میں بیٹھے
چیں کریں ہیں! بھگوان، سنسار کبھی مت کھڑے ویرے! یا
سنگھشا ہے کہ سنگھشا!"

ایک دفعہ میں شانتی پور شام کے وقت پہنچا تو دیکھا کہ "دادا"
نیم تلے بیٹھے ہریا کام کی لووں الگ الگ کر رہے ہیں۔ انکے مونہہ پر
مچھروں کا جھنڈ بھن بھنا رہا تھا اور سامنے کے تالاب میں مینڈک
تال دے رہے تھے۔ جے رام جی کی ہوئی۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ
"دادا" کے جیسے کسی نے چٹکی لے لی ہو، میرے اوپر آنکھیں
گڑا کر بولے۔

"اسپیشٹر جی، بھلا مانس کوئی بھی نا ہے۔ مرے کو لوگ بھلا مانس
کہ دیں ہیں۔ جیا کا کارن یہ ہے کہ اب وہ بڑا مانس بڑائی نہ کر پائیگا!
بھل مناہت تو یا ئی ہے۔ نا کہ آدمی اپنا کام محنت سے کرے۔ گھر میں
پھر سے بیٹھے، دوسرے کی چیج دیکھ نہ سکے، اور اپنی کی رکھوالی کرنے
تھالی چاٹ نا ہو، کچھ کر کرا دکت، کے کا جے رلتے، بھی چھوڑتے
غریب اور پڑوسی کا دھیان رکھے؟ اب بتاؤ ایسا کون ہے؟
ٹوٹا ہے! بس مر گئے تو بھلے مانس بن گئے!

"اسپیشٹر جی، اب بتاؤ میں تو تمہارا ایک اکھر (حرف) بھی
نا مانوں ہوں، تمہاری پستکیں اور کون سی بھل منساہت
سکھا دیں ہیں؟"

میں نے اس سے کہا کہ اس زمانے میں بھلا آدمی بیوقوف کہلاتا
اور ہمیشہ مصیبت جھیلتا ہے۔ وہ جو کچھ کہے کوئی نہیں سنتا! اور
کوئی سنتا ہے تو اسے جیل یا پاگل خانے میں رکھا جاتا ہے!

"دادا" نے گردن ہلا کر کہا:

"ہاں، ہاں! کتنی برس ہو گئے یا اسکول میں ایک ماسٹر جی
آئے۔ چھوکری پڑھاتے پڑھاتے بڑے ودوش میں ہر دو چار
برس میں ایک کال پڑ جائے ہے۔ مجھے سے میں سو پچاس برس
میں کبھی پتہ نا تھا۔ اس کا کارن بدیسی راج ہے ——— انگریج ہے!
پٹواری کے چھوڑ لئے گھر آ کے اپنے باپ کبھی! اس نے تحصیلدار
تھانہ دار کو رپٹ پہنچائی۔ ملک باچلا اور ماسٹر جی کو جیل ہو گئی ——
نہ جانے کتنے دنا کی۔ پٹواری کی تنخا بڑھ گئی۔ ماسٹر جی کی پستکوں
نے یا کام کیا!"

ایک دوسرے چکر میں میں بیٹھا تھا، لوٹ پھر کے "دادا" وہی
اسکول اور پستکوں پہ آ رہے۔ بولے!

"اسپیشٹر جی، میں یہ تو کہوں ہوں کہ اسکول اور پستکیں دیس
کو کھراب کر رہی ہیں۔ تم میں کوئی کھوٹ دکھائی نہ پڑت۔ تم گاؤں
والوں کے رنگ ڈھنگ تو سمجھ بھی گئے ہو اور ان سے پیار بھی
کر لو ہو۔ پر تم سے اب بھی ڈر لاگے ہے! کچھ کھبر نا ہیں، تم سنگھشا والے
کیا بنا دو گے! میں تو یا جانوں ہوں کہ بابو لوگن کے پاس پیسا
سستا آوے ہے۔ بس یہی وا کا کارن بھی یا ہے! اچھلے
بات اونچی ہو جائے، اور گاؤں لوٹی! اسپیشٹر جی، تم سنگھشا والے
گلیوں اور پگڈنڈیوں میں پھنسے ہو ——— گاؤں کی جنتا سیدھی
ڈگر چلے ہے!"

ایک اور پھیرے میں میں نے "دادا" کے سامنے ذکر کیا کہ زمین
کی گیند ہر وقت گھوما کرتی ہے۔ "دادا" نے تیکھے پن سے جواب دیا:

"ہوں، اسپیشٹر جی جمین ناگھومت یا تمہارا تو دماغ بالچھے
بالچھے گھوم جات ہے۔ باپ رے ——— جھوٹ سی جھوٹ! جمیں
جولے ہے تو اپت دیج جائے ہے! ہر وقت گھومے جائے
تو کیا انتر ہو! آدمی، جنار، پیڑ گھر سے کیسے رہیں اور ہیں!؟
اسپیشٹر جی تم نے یا تو بانچ لیا کہ جمیں گھومے ہے، یا بھی جانو
ہو کل رت کیسی رہے گی؟ نا، تم نا بتا سکت ہو۔ گاؤں کا گڈریا بتا
دیگا۔ سنو کل من بھر پانی کا ہوگا!"

تھوڑی مدت میں "دادا" سے میرا جی بھر گیا۔ اب میں ان

کی وجہ سے شانتی نگر نہ جاتا تھا۔ مگر جب جاتا تھا۔ تو ان سے ضرور ملتا تھا۔ یاد نہیں سکنے، پڑوسی نے بتایا۔ کہ دادا نے اپنے بے ماں باپ کے بچے کو گود لیا اور راجپوت اسکول کے بورڈنگ میں بھرتی کرایا ہے۔ یہ سنکر میں سیدھا شانتی نگر گیا اور دادا کے پاس پہنچکر کہنے لگا۔

"وہ جودھا دادا، تم مجھ سے ہمیشہ جھوٹ بولے اور بڑی مکاری کی۔ سکھشا اور پیٹکوں کی برائی تو اتنی کرتے تھے اور للو کا اسکول کے بورڈنگ میں رکھ چھوڑا ہے!"

میں نے دیکھا کہ دادا، کو کسی قسم کی شرم یا جھینپ نہ تھی کہنے لگے۔

"اسپنٹر جی، جھوٹ تو میں بولوں نا ہوں۔ میں نے کبھو کہا کہ للو اسکول میں نا پڑھت ہے؟ اور مکاری سو یہ تو سب کریں ہیں۔ میری بہن کہہ رہی تھی کہ للو کو سکھشا کھوب دیو میرا۔ اب تم جانو پتا کھون ہے! انہوں کی رکھشا سب کرتے ہیں!"

میں نے دادا کو بتایا کہ سب آدمی بھائی ہیں۔ کوئی پرایا نہیں تو بولے۔

"بات تو ٹھیک ہے پر جگت بھائی چارہ جہد سے تب نا پا جی اسپنٹر جی گانوں کی پیچھے پڑی ہوئی تھی اور باہر سے تبھی ہوگا!"

• ایک خیال یہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ریل کی پٹڑیاں جس پلیٹ میں جڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض کے اسکرو اور ڈنٹ میں فلزاتی ہم آہنگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ جس کا سبب یہ بتایا گیا کہ ان میں سے کسی کا لوہا تو ایسی کان سے برآمد ہوا تھا جو ایک ہزار فٹ گہری تھی۔ اور کسی کا ایسی کان سے جو صرف ایکہزار ایک سو ننانوے فٹ گہری تھی۔ ایک پرزہ خوب اعتبار بخطِ مستقیم پڑتی تھی۔ اور دوسرے پر کسی قدر ترچھی ہو کر اسلئے جوڑوں کی گرفت میں استواری نہ پیدا ہو سکی۔ بعضوں نے یہ بھی بیان کیا کہ اس دن ان میں جو کوئلہ جھونکا گیا۔ وہ معدنی نقطۂ نظر سے نیم برشت تھا۔ جس کی حدت میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ یہ بھی قرین قیاس ہے۔ کہ جس دن یہ حادثہ ہوا ہے اس دن آفتاب کے دھبے بعض طوفانی سیلانات کے وجہ سے زیادہ دھندلے یا دھادھند ہوگئے ہوں جس سے جانے وقوع کی ورنیلیٹی (VULNERABILITY) خراب ہوگئی ہو اور زمین کے ذرات، مقناطیسی دباؤ کے برہم ہونے سے ڈھیلے ہوگئے ہوں۔ احتیاطاً آس پاس کی نباتات کا روحانی خوردبینی معائنہ بھی کیا گیا۔ ان میں پژمردگی پائی گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ بعض حیوانات کی مانند نباتات کو پیش آنے والے حادثہ کی خبر پہلے سے لگ گئی تھی۔ البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ پژمردگی حادثہ سے پہلے واقع ہوئی یا بعد میں۔

تحقیقات کے دوران میں اسباب حادثہ کے بعض اور پہلوؤں پر بھی روشنی پڑی۔ لیکن چونکہ اسباب کمیشن کے سامنے صحیح اور ضروری شمار و اعداد نہیں ہیں۔ اسلئے قطعیت کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کیجا سکتی۔ مثلاً کتنے لوگ ادب و زندگی کے باہمی تعلق کو مدنظر رکھ کر اپنے ٹکٹ سفر کر رہے تھے اور کتنے لوگ آرٹ برائے آرٹ کے نقطۂ نظر سے بے ٹکٹ تھے۔ کتنے لوگ ایسے تھے۔ جن کے پاس روپئے تھے۔ لیکن ناشتہ اور کھانا وہی بڑے کا کرتے تھے۔ اور کتنے ایسے تھے جو دوسروں کے ناشتہ کے بھروسہ پر گھر سے ننگے بھوکے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ اب چونکہ حادثہ کو گزرے ہوئے بہت دن ہو لئے۔ تحقیقات بھی کافی ہو چکی۔ اس لئے خرچہ فریقین ذمہ فریقین اس قصہ کو ختم کر دینا چاہیئے!

مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی!

(باجازت اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی)

رشید صدیقی

فلسفہ احساس

ایک علمی مقالہ

تمام طبعی حالتیں اور قدرتی مناظر جہاں تک وہ پسندیدہ اور ناپسندیدہ شکل وصورت کے حامل ہیں قوتِ احساس سے متعلق ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کہاں تک یہ موافق اور ناموافق صورتیں طول پکڑتی ہیں یا کس طرح قابل پیش کش اجزا اور ہمارے ضمیر آپس میں متحد ہیں۔ اور آیا یہ سب ایسی چیزوں پر حاوی ہیں جنہیں ہم قوتِ حس کہہ سکیں۔

تجربات کا دلچسپ پہلو احساس کے زیر اثر ہے۔ بیرونی چیزیں ہم پر اسی وقت اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ جب ہمارے احساسات تک اُن کی رسائی ہوتی ہے۔ کسی چیز سے متعلق محض واقفیت یا علم ہمیں اگرچہ خاموش رکھے لیکن اُس کی رعنائی اور خوبصورتی کی تعریف ہمیں ابھار کر بے چین کر سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہماری خوشی اور ہمارے رنج و محن قوتِ حس کے اجزا ایک مجموعہ ہیں۔ پس اشیا اور حیاتِ انسانی کا تخمینہ ہمارے تجربات زندگی پر منحصر ہے۔ جو قوتِ حس سے متعلق ہیں۔ کسی خوشی یا غم سے متاثر ہو جانا، خوف کھانا یا امید رکھنا بھی ایک تجربہ ہے۔ جو ہم دنیائے مناظر سے حاصل کر کے اپنے ضمیر کی دنیا کے سپرد کر دیتے ہیں۔

احساسات کی نشوونما اعصابی تعلق کی بنا پر قوائے عقل وفہم کے پہلو بہ پہلو ہے۔ مشاہدہ اور خیال کی بلندی اور اُس کا بڑھاؤ ہماری دلچسپیوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اور یہ نشوونما ہمارے اختیار و پسند کو وسیع بنا دیتی ہے

صحیح طور پر قوتِ حس کی تعریف کسی جلن کی درد۔ یا پیاس کے بجھ جانے کی خوشی کا اظہار ہے۔ پس دماغی ارتقائی بلندیوں میں جذبہ۔ کامیابی کی خوشی یا تنہائی کی اداسی ہی کا نام احساس ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ احساسات کے بارے میں ہم خوشی اور غم کو زیادہ پیش کر سکتے اور وہ اس لئے کہ ہمارے روزمرہ کے تجربات میں ان ہی کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ ان دونوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے۔ اور وہ بے ذوقی، خالی اور بے اثر جوش یا جذبہ ہے۔ یہ بھی قوتِ حس کے تحت میں ہے۔ کسی چوٹ کا حقیقی تجربہ جو کہ آسانی سے محسوس کیا جائے۔ اس قسم کے جوش یا جذبہ یا بین کی ایک خوبصورت دلیل ہے اور ایسے نکات کو مدِ نظر رکھنا علمِ روحانی کی ایک جانچ ہے۔

یہ بحث اگر بغیر تفصیل سے بیان کی جائے تو بھی معاً گمان ہوتا ہے کہ اس تحریک کے دو روشن پہلو ہیں۔ سب سے پہلے اس کا استعمال شدت اور سختی یا خیالی حدود کا بیان کرنا ہے یعنی ایک اونچی آواز کو جو محض اتفاقاً سنا پیدا کر سکے۔ تحریک یا جوش کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ

کہا جائے گا۔ کہ تحریک کے کئی معلوم شدہ اجزا محض بےرنگ اور بے ذوق ہو سکتے ہیں۔

تحریک کے متعلق جو کچھ بھی ہم کر سکیں۔ اُن میں سے سب سے زیادہ باتیں خوشی اور سرور کی حامل ہوتی ہیں۔ سب کہ تحریک محبت کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور خاص کر جب عوام اس رو میں ناواقف نظر پر بہہ جاتے ہیں۔ ہمیں ہرگز نہ بھولنا چاہیئے کہ احساس کی حالتیں خالصتاً غم یا کلیتاً خوشی میں بہت کم تبدیل ہو سکتی ہیں۔ ہماری دماغی زندگی کی بناوٹ ہمیشہ اثر انداز اجزا کی ساخت میں صرف ہوتی ہے اس لئے حیرانی عام طور پر بیک وقت پسندیدہ بھی ہو سکتی ہے اور ناپسندیدہ بھی۔ پس تمام احساسات خوشی یا غم میں فرداً فرداً تبدیل ہو جانے کی خاصیت رکھتے ہیں۔

ہماری روزمرہ کی زندگی میں خوشی اور غم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور ہماری عقل ان کی تمام حالتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں۔ مشاہدہ سے صاف ظاہر ہے۔ کہ بچہ اپنی معصومیت کی حالت میں بھی خوشی اور غم کے لمحات کا اندازہ ..... اپنے چہرہ یا اپنی حرکات سے ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کی حقیقت سے قطعاً بےبہرہ ہوتا ہے۔ خوشی اور غم کا مقابلہ بجائے کسی اور چیز کے ہماری زبان اور ہمارے خیال پر زیادہ اثر ڈالتا ہے اشعار یا کلام موزوں اس مقابلہ کی تفصیلاً شرح ہیں۔ ہر خوشی اور غم ضمیر کی تہذیبی حالتوں سے ملحق ہیں۔ بلکہ حقیقت میں اُن ہی سے ماخذ ہیں۔ اس مسئلہ پر مزید غور و خوض سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ احساسات ہماری دماغی مشینری کی کاوشوں کے پس منظر ہیں۔ یا خوشی اور غم سوائے اسکے کہ ہماری زندگی کے نشیب و فراز سے واقفیت کا دوسرا نام ہوں۔ اور کچھ نہیں۔

یہ صحیح ہے۔ کہ احساس کے ساتھ خوشی اور خوشی میں خودی ہے اسی طرح خم اور غم میں ضمیر کی بلندی کا کسی حد تک کافی تعلق ہے۔ جیسا کہ پیشتر کہا گیا ہے کہ احساس ہمارے تجربات کی فاعلی حالت ہے۔ اور اس صورت میں احساس کسی ظاہری دباؤ یا اثر سے بالکل تعلق نہیں رکھتا بلکہ اندرونی کیفیات سے اثر پذیر ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔ احساسات بلاواسطہ اولاً حس سے اُٹھ کر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔

خوشبو یا کسی لطیف سُر کی مستیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ اور نہ ہی ایک قوتِ حس سے دو شخص یکساں اثر پذیر ہو سکتے ہیں۔ ہر قسم کا احساس ایک خاص قسم کے اعصابی اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ظاہراً کسی چیز کے محسوس کرنے سے برقی رَو کی طرح یہ اثر اندرونی کیفیات کو تبدیل کر دیتا ہے

ہماری سب سے بڑی خوشی پُرشوق اور مستعد حرکات سے ہی ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض مسرتیں خاموش بھی ہوا کرتی ہیں۔ جو کم و بیش ترغیب کے سبب یا تنہائی میں خیالات کی لطف اندوزیوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اکثر حالات میں بلا شبہ یہ چند وجوہات پر مبنی ہوتی ہیں۔ نرم آوازیں۔ ہلکے ہلکے نغمے آہستہ حرکات نباتِ خود قیمتی خوشبوؤں کی حامل ہوتی ہیں بہت ہی نرم اور نازک ابھار۔ مثلاً پیانو کے ہلکے ہلکے سُر۔ مختلف رنگوں کے خاموش سائے خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ کسی راگ یا گیت کے جاذب فقرات بھی اپنے اندر جادو رکھتے ہیں۔ بعض اوقات تصورات میں واقعات کا نقش اتنا مدھم سا ہوتا ہے۔ کہ عام حالتوں میں وہ معدوم ہو جاتا ہے۔ لیکن لطیف دماغ اس ڈر سے کہ وہ نقش محو نہ ہو جائے۔ جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی جذب و شوق کا نام خوشی ہے۔

محض ساکن اور غیر متحرک حالات یا سستی اور کاہلی ہیں خوشی پہلے پہل انسانی زندگی کی ایک جھوٹی تصویر ہمارے

[illegible]

ڈاکٹر نے اپنی سرگزشت کے چند ہیبتناک واقعات بیان کرتے ہوئے کہا تھا "اور عموماً سفر بارہ میل پر ختم ہوگا۔ کیونکہ گنوار لٹیرے جتنے سادہ لوح نظر آتے ہیں۔ پیشوائی میں اتنے ہی چالاک مکان کے سوا کوئی مردِ خدا ایسا نہیں۔ جو منزلِ مقصود تک جلدی پہنچنے کی راہ بتائے ——— اور پیچیدہ جھاڑیوں کا دشوار گزار راستہ، دو ہزار میل چلتے رہنے کے باوجود ایسا معلوم ہوگا۔ کہ ایک قدم بھی طے نہیں کر سکے!

مصائب کا تلخ تجربہ ڈاکٹر ——— جگن ناتھ داس بڑبڑایا اگر آدمی میں تھوڑی سی بھی سمجھ ہو۔ تو یقیناً اسکے لئے اپنا راستہ نکال لینا مشکل نہیں۔

جگن ناتھ داس نے دیگر امور کی طرح جنگل کے طول و عرض میں چلنا بھی آسان خیال کیا اور بحیثیت انسپکٹر اراضی ضلع، شہر سے گاؤں کے خودسر چودھری (جس نے چالاکی اور چھل سے مالیہ میں خورد بُرد کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا) کی گوشمالی کو روانہ ہو ہوگیا۔

جب انسپکٹر اور چپراسی چودھری کے گاؤں کے قریبی اڈہ پہ اترے۔ تو مہم کے خلاف چودھری سربراہی کے لئے موجود نہ تھا چونکہ بس پندرہ منٹ پیشتر پہنچی تھی۔ اسلئے انسپکٹر چودھری کی غیر حاضری کو خاطر میں نہ لایا۔ وہ بلاشرکت غیرے گاؤں میں داخل ہونے پر خوش تھا۔ اس نے دیہاتیوں سے چند سوال پوچھے۔ اڈہ پر کھڑے ہوئے لوگوں نے بتایا۔ کہ گاؤں "برابر دو میل ہے"، دو مختلف راہوں میں جو نسا راستہ بہتر خیال فرمائیں۔ اختیار کریں، ایک نسبتاً خشک جنگل کا تھا۔ جگن ناتھ نے جوتوں کے نئے جوڑے کو بچانے کے لئے ارتفاعی، خشک تر، جنگلی راستہ سے جانا تجویز کیا:

"راستے پر کھڑے فلاں نازک اور بل دار جھاڑ سے گاؤں صرف چند قدم کے فاصلہ پر ہے"، کار مذکور بس نے کہا تھا۔

جگن ناتھ اور چپراسی بغیر کسی مزاحمت کے درخت تک پہنچ گئے۔ پھر یادداشت کے مطابق بائیں جانب کی تنگ اور ناہموار سڑک کی راہ لی۔ ناگہاں جنگل پر سیاہی پھیل گئی۔ موسلا دھار بارش ہونے لگی بجلی کی سنسنی خیز چمک اور بادل کی صدائے باز گشت سے گنبد نما بابرگ جنگل گونج اٹھا۔ بائیں طرف کا موڑ مڑتا اور مڑتا گیا۔ حتیٰ کہ خادم اور آقا چھ بار بائیں رُخ مڑے۔ چھ مرتبہ راستے سے منحرف، ڈانوا ڈول، مضحکہ خیز بدشکل شاخوں نے قہقہا

ساتویں دفعہ کوشش کی جگہ: ہمت تھی اور نہ ارادہ آقا اور خادم دونوں درخت کی شاخوں کے نیچے دبک کر بیٹھ گئے: ہوا کے جوش و غضب سے لرزہ براندام، چار گھنٹے کی کٹھن مسافت اور شدتِ بھوک سے عاجز، راستے کی سختیوں کے خوف سے ناامید اور لاتعداد کانٹوں کی چبھن سے کبیدہ خاطر ——— بارش کے چھینٹے راستے کے نوکیلے پتھر بدن کے جسم کو ایذا پہنچا رہے تھے۔

جگن ناتھ داس نے چودھری اور اس کی چودہ پشت کے آبا و اجداد کو دل کھول کر کوسا اور مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ اگلے دن چودھری کو ایسی عبرتناک سزا دے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ لیکن یہ سب کچھ اگلے دن کے لئے تھا۔ بہر صورت جگن ناتھ اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے بیرونی مدد کا محتاج تھا۔ مصیبت زدہ نوجوان نے اپنا بڑا کوٹ پھاڑ کر نچلی شاخوں پر پھینک دیا۔ تاکہ عارضی چھاتا بنجائے کوئی وحشت زدہ جنگلی دلدوز مہیب لہجہ میں چلایا۔ ایک لمبی دردناک چیخ ——— گویا طوفان بلا کی شکایت کر رہا ہو۔ جگن ناتھ اور چپراسی نے محسوس کیا۔ کہ کوئی پر کھڑا شیطان انہیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ وہ بے بس و حرکت تھے۔

سیاہ آسمان پر پھر بجلی چمکی۔ اور چند گزوں کے فاصلے پر درختوں کے نیچے چھپ گئی۔

انھوں نے حیرت و استعجاب سے دیکھا ———
شاخوں کے درمیان، درخت کے نیچے، کینہ ور زشت

طینت اور ملعون صورت، شیطانی چہرہ دکھائی دے رہا تھا کوئی آدمی دوسری ٹہنی سے گلے میں پھانسی لے کر لٹک رہا تھا۔ چپراسی نے بے اختیار ہو کر چیخ ماری اور تیزی سے جھاڑیوں کی طرف بھاگا۔ آقا نے بھی سہم کر دیوانہ وار خادم کا تعاقب کرنا شروع کیا، انہی خاردار جھاڑیوں اور تیز رو جھرنوں کے درمیان انہی پتھروں پر لڑھکتے ہوئے اندھا دھند شب ظلمات میں وہ دونوں بھاگتے رہے۔

آخر دس فٹ گہری دلدل میں گرنے پر ایک اندوہناک شور و غل بلند ہوا۔ متعدد آدمی کوہستانی دیوار کے دامن میں نصف درجن جھونپڑوں سے دقیانوسی لیمپ، مشعلیں لیکر نکل آئے اور بدنصیب جوڑے کو دلدل سے نکالا۔ انسپکٹر اور چپراسی میں دہقانی گرم جوشاندہ کو حلق میں اتارنے کی ابھی کافی طاقت تھی، تھوڑی دیر بعد نیند نے بن بلائے مہمانوں اور تمام گاؤں کو اپنے آغوش میں لے لیا۔

دوسری صبح، انسپکٹر نے گزشتہ شب کی آفات کا ذکر کیا دیہاتی نہایت مودبانہ طریقے سے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے سے غیر محدود ہمدردی ظاہر تھی۔ اور وہ آپس میں معنی خیز نظروں سے بات چیت کر رہے تھے۔ انسپکٹر چڑ گیا۔

"تم اس طرح بُت بنے کیوں کھڑے ہو۔" انسپکٹر نے ایک آدمی کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "چودھری کہاں ہے؟"

جواباً اس نے جھونپڑی کی کھڑکی کا اشارہ کیا۔ پہاڑی ڈھلوان کے اختتام پر جہاں سے پچاس فٹ پر گزشتہ شب کے سودا گر تھے وہاں اُس خوفناک درخت کی قوی شاخ پر خوفناک انسانی پھل لٹک رہا تھا۔ "وہ آپ کی آمد کی اطلاع پا کر استقبال کر گیا تھا۔ انسپکٹر سوامی!"

اُس آدمی نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ کی ملاقات سے پیشتر وہ خدا سے ملنے کا ارادہ رکھتا تھا!"

---

۶ روالی

سستی کتابوں کا خاص سلسلہ

مختلف علوم کی ابتدائی کتابیں ـــــ آسان اور عام فہم زبان ہیں

مکتبہ اردو نے ایک سال سے سستی کتابوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یہ کتابیں مختلف علوم و فنون کے ابتدائی مطالعہ کے لئے بہترین ثابت ہوئی ہیں۔ ذیل میں ان کتابوں کی فہرست دی جاتی ہے

سوشلزم	فریڈرک اینگلز	عناصر تہذیب	ول ڈیورنٹ	پھول کانٹے	گوپال متل	رضا شاہ پہلوی	محمد اشرف عطا
کارل مارکس	باری	عصمت الوٹو	ثریا نفیسیان	شہنشاہ حبشہ	اختر اور ینوی	ٹراٹسکی	زبیدہ ناناسیٹھ
انقلاب فرانس	باری	سرمایہ داری	عبداللہ ملک	ہندوستان کے لیڈر	یوسف ظفر	میکسیم گورکی کی آخری ملاقاتیں	
راجہ اور کسان	لیونارڈ واشنف	جاگیرداری		نہر طبع		بالڈون صاحب	لیونارڈ ایلم شیف
سٹالن	مارشل وارشلوف	مشین اور مزدور	باری	محمد عربی	باری	مذہب اور صاحب	

مکتبہ اُردو سے آپ کو مکتبہ جامعہ، انجمن ترقی اردو، مکتبہ برہان اور دوسرے تمام کتب خانوں کی کتب اکٹھی مل سکتی ہیں جس سے آپ ڈاک خرچ اور دیگر مصارف سے بچ سکتے ہیں پتہ :- **مکتبہ اردو لاہور**

سلام مچھلی شہری

سماج کے دِل نشیں محل میں

ندی کے پورب میں فاصلے پر
بڑی عقیدت سے گا رہی ہو
خیال یہ ہے کہ پا رہی ہو
سماج ہی کو سُنا رہی ہو

"سماج کے دلنشیں محل میں"
ستار لیکر "دعا کے گانے"
"پتی کو اپنے اسی بہانے
سماج کے ظلم کے فسانے

ہنسی میں مورت کی کھو نہ جائے تمہاری "پوجا" حسین محل میں

پرستشوں کی ہر ایک شے پر
بھجن کی اس خلوص لے پر
کرشن جیسے تمہاری نے پر

تمہارے غم خوار ہنس رہے ہیں
ستار کے تار ہنس رہے ہیں
ندی کے اُس پار ہنس رہے ہیں

یہی کہ مذہب کے جھوٹے معنی کوئی بھی دیوتا نہیں سکھاتا
کسی کو دوشیزگی کے رنگین دنوں میں "بیوا" نہیں بناتا

کسی سے بچپن کے دن [illegible]
تمہاری معصومیت کا بدلا
مگر تصور بھی اب نہیں ہے
تمہیں بتاؤ تمہیں یقیں ہے

تمہاری شادی کا فیصلہ تھا
سماج کا ایک قہقہہ تھا
کہ کس سے باندھا تھا اپنے رشتہ!
کہ وہ "ہیں اس مورتی میں زندہ؟"

قسم ہے تم خود سمجھ رہی ہو، قسم ہے تم کو یقیں نہیں ہے
میں جانتا ہوں، تمہاری خاطر یہ مورتی دلنشیں نہیں ہے،
مگر پرستش کی کوششوں میں خیال اپنا بٹا رہی ہو
سمجھ رہی ہو "دعا کے گانے" بڑی عقیدت سے گا رہی ہو!
تمہارا کہنا کہ یہ ہے مذہب، تمہارا کہنا سماج یہ ہے
تمہارا کہنا کہ عورتوں کے بلند رتبے کی لاج یہ ہے
غلط ہے، دھوکا ہے — عورتوں پر یہ قہر ہے، ظلم ہے، ستم ہے
معاف جس کو نہ کر سکے گی کبھی بھی "انسانیت" قسم ہے!

اگر ضروری ہے — ایسی مورت
اگر ضروری ہے — یہ نزاکت

"اور اس پہ یہ گیروا دوشالا"
اور اس پہ اتنی طویل مالا

اگر ضروری ہے —— تو عبادت
تو آؤ "مالا" یہ توڑ بھی دو
کہ "پھول کا ہار" آگیا ہے
تو آؤ مندر کو چھوڑ بھی دو
تمہیں بتاؤں دھرا ہی کیا ہے
ندی کے پورب میں، فاصلے پر

تمہاری خواہش کا پاٹ شالا"

"سماج کے دل نشیں محل" میں

مٹھائی

وہ بالکل تنہا تھا اور اس لئے اداس، اُسکی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔

صبح سے اسکا بیٹا بھوک سے تڑپ رہا تھا اور اُس بے ماں کے بچے کی ہچکیاں اُس کا گلا گھونٹ رہی تھیں۔

شہر میں چاروں طرف خاموشی تھی، کوئی بلوہ، کوئی پلیگ، کچھ بھی نہ تھا ۔ ۔ ۔ اور چونکہ وہ کفن فروش تھا۔ اسلئے یہی بات یہی خاموشی اُسے ایذا رساں ثابت ہو رہی تھی!

—— اُس کی دکان پر لگا ہوا سائن بورڈ خراب ہو رہا تھا۔ اسپر لکھا تھا۔

"تجہیز و تکفین کا سامان یہاں ملتا ہے"

لیکن چند دنوں سے اس بورڈ کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

بھوکے بچے نے بلکتے ہوئے کہا۔ "بابا، مجھے ایک دھیلا ہی دے دو"

کفن فروش نے اپنے سامنے گلی کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "اچھا بیٹا"

بہت سے مغموم چہروں والے لوگ سامنے گلی میں نہایت تیزی سے اندر جاتے اور باہر آجاتے۔ اس بڑے مکان میں آج ڈاکٹر کئی مرتبہ جا چکا تھا۔ اور اُسے مکان کے سامنے نالی میں خون کی طرح کا سرخ پانی بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔

ایک بہت گہرا ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کفن فروش نے کہا۔ "ایشور نے چاہا —— تمہیں بہت جلدی پیسہ ملجائیگا، عزیز"

لیکن یہ گہرا ٹھنڈا سانس بچے کے دل پر مطلقاً اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ مایوس ہو کر بچہ بازار کے ایک کونے کی طرف سرک گیا اور وہاں کھڑا ہو کر سسکنے لگا۔

چار گھنٹے بعد سامنے گلی میں ماتم کی چیخ پکار سنائی دینے لگی۔ اسکے بعد چار آدمیوں نے ایک نوجوان آدمی کی ارتھی اٹھائی۔ ایک نوجوان عورت جسکے ساتھ دو بچے تھے اپنی چھاتیاں پیٹتی ہوئی ارتھی کے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی ۔ ۔ ۔ اور مکان کے دروازے پر ایک بوڑھا آدمی غش کھا کر گر پڑا تھا۔

وہ نظارہ ناقابل برداشت تھا —— اور انسانی آنکھوں کے لئے بہت اندوہناک اور جب کفن فروش نے دوبارہ اپنی دکان کے اندر جھانکا تو اُس کا بیٹا بڑے مزے سے مٹھائی کھا رہا تھا۔

(مرسلہ: ۔۔)

رابندر ناتھ ٹیگور

محمد رشید الدین

ناچ والی

رات کی تاریکی چاروں طرف چھا چکی تھی۔ اگست کے دھندلے آسمان میں ستاروں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ شہر میں روشنی کا کوئی نشان نہ تھا۔ گھروں کے کواڑ بند تھے۔ لوگ میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ ایسے میں متھرا کی شاہی چار دیواری کے نیچے ایک سادھو رات گزارنے کے لئے ننگی زمین پر پڑا تھا — یہ اپاگپتا تھا، مہاتما بدھ کا چیلہ ——

اور یہ نازک پائل کس کے تھے؟ وہ کون تھا جس نے اپنے پائل کی ٹھوکر سے اس نیک دل کے سینے کو ٹھکرا دیا، جیسے پائل کی اچانک ٹھوکر نے سادھو کو بیدار کر دیا؟ —— سادھو گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اس نے کچھ دیکھا اس کی آنکھوں میں رحم دلی کی ایک جھلک آئی۔

اس کے سامنے ایک عورت کھڑی تھی، ہاتھ میں دیا لئے ہوئے۔ دیا ٹمٹما رہا تھا۔ یہ ناچ والی تھی۔ قیمتی لباس زیب تن کئے، بیش قیمت زیورات سے لدی پھندی، ہیرے جواہرات اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے تھے۔ اور اس پر مخمور جوانی غضب ڈھا رہی تھی۔ اس نے اپنا دیا نیچے جھکایا، جس کی روشنی اس نیک سادھو کی نورانی پیشانی پر پڑنے لگی، اس نوجوان سادھو کا خوبصورت چہرہ ناچ والی کی آنکھوں میں سما گیا۔

"معاف کیجئے گا ٹھاکر"، اس عورت نے کہا، "آپ میرے غریب خانہ پر تشریف نہیں لے چلتے؟ آپ کی دیا ہوگی۔ اس خاک آلود زمین پر لیٹنا آپ کو زیب نہیں دیتا ٹھاکر"

سادھو نے آہستہ سے جواب دیا، "نیک عورت اپنا کام کئے جا، جب بھگوان کی مرضی ہوگی، میں تمہارے ہاں ضرور چلونگا . . . "

یکایک اندھیری رات میں بادل کی گرج سنائی دی اور بجلی چمکنے لگی۔

. . . .

سڑک کے دورویہ درختوں کی ٹہنیاں کلیوں کی کثرت کے مارے جھکی پڑی تھیں —— دور سے بانسری کی دلنواز تانیں موسم بہار کی تند ہواؤں میں گونج رہی تھیں۔ شہر کے لوگ پھول کے تہوار پر جنگلوں میں جا چکے تھے۔ آسمان کے وسط سے چودھویں کا چاند شہر کے مکانات پر اپنی چاندنی بکھیر رہا تھا۔

جوان ٹھاکر سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ آم کے درختوں سے کوئل کی کوک سنائی دے رہی تھی، ہجر کی ستائی ہوئی کوئل شکوہ کر رہی تھی۔

اپاگپتا شہر کے دروازے میں سے گزرا۔ شہر پناہ کے پاس اچانک ٹھہر گیا۔ اس کے پاؤں کسی چیز سے ٹکرائے —— یہ ایک عورت تھی، جو شہر پناہ کے باہر فصیل کے سایہ میں پڑی تھی۔ اس کا بدن پھنسیوں سے بھرا پڑا تھا، وہ کسی سخت مرض میں مبتلا تھی، شہر والوں نے اسے شہر سے باہر نکال دیا تھا۔ وہ بھلا ایسی بیمار عورت کو اپنے شہر میں کیوں رکھنے لگے تھے۔

ٹھاکر اس کے پاس بیٹھ گیا، اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اس کے منہ میں پانی ٹپکایا، اور اس کے ناسور پر مرہم پوتنے لگا۔

"تم کون ہو دیالو؟" اس عورت نے پوچھا۔

یہی وہ ناچ والی تھی۔

سادھو نے جواب دیا، "آخر وہ وقت آ گیا نادری! جب مجھے تمہارے پاس آنا پڑا۔ میں وہی ٹھاکر ہوں دیوی . . . "

برجموہن دتاتریہ

عنبر گورکھپوری

اس وقت منشی سنت لال صاحب عنبر کانستھ سری واستو وکیل ورئیس گورکھپور کے کلام منظوم کی دو جلدیں (۱) کلیاتِ عنبر (۲) تتمہ کلیاتِ عنبر میرے سامنے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ میں اس کلام پر کچھ لکھوں۔

ان نظموں کے عنوان اور ان کے تحتی مندرجات کو دیکھ کر وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جب اردو بلا قیدِ مذہب و ملت ہندوستان کے شرفا کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ جب باہم ربط وضبط مروت اور رواداری ہمارے کلچر کا امتیازی نشان مانے جاتے تھے۔ جب ہندو مسلمان میں واقعی چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اور شہریت آپس کے اُنس اور رفاقت واخلاص سے جلا پاتی تھی۔ جن لوگوں نے موجودہ ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں۔ انہیں یہ باتیں کہانی معلوم ہوں گی۔

لیکن منشی سنت لال عنبر اگرچہ آج ہم میں موجود نہیں ہیں۔ مگر ان کا کلام اس کا زندہ ثبوت پیش کرتا ہے۔ کہ وہ اوصاف جن کا ابھی ذکر ہوا ہم میں موجود تھے۔ اور ابھی تک باقی ہیں۔ اگرچہ اب بعض لوگ ان کو نیست ونابود کرنے کی فکر میں ہیں۔ مولانا ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی نے کلیات پر تقریظ لکھتے ہوئے واقعی دل کی بات کہدی کہ:

"زمانہ وہ رنگ اختیار کر رہا ہے۔ کہ دو آدمیوں کا ایک جگہ بیٹھ کر ہنس بول لینا عنقا ہو جائیگا۔ ہم آج کی صحبت اور ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ یہ دور آخر ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی منشی سنت لال عنبر کا مقلد ہوگا۔ نہ سید کرار حسین سدھانی کا پیرو کار رہے گا۔"

جس خوف کا اظہار کیا گیا تھا۔ وہ اپنی پوری شکل نکالتا ہوا ہمارے سامنے آرہا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کچھ آس بندھتی ہے۔ کہ اردو ادب اور زبان کے فدائی اب بھی اپنی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ عنبر مرحوم بھی انہیں نیک نفسوں میں سے تھے۔

منشی سنت لال عنبر فروری ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے اور جولائی ۱۹۲۰ء میں بیکنٹھ کو سدھارے۔

آپ کی زندگی کا قریباً تمام زمانہ گورکھپور ہی میں گذرا۔ ان کی تعلیم وتربیت اسی طرح ہوئی جس طرح اب تک شریف زادوں کو دی جاتی تھی۔ معنی ذہانت اور فطانت ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ عنبر مرحوم نہایت بے تعصب تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں مذہب وملت کا امتیاز نہ تھا۔ وکالت کے ساتھ سخنگوئی میں بھی انہوں نے نام پیدا کیا۔ جو اب تک گورکھپور اور اس کے نواح میں عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

جیسے ان کی طبیعت تصنع اور تکلف سے مبرا تھی۔ ویسا ہی ان کا کلام ہے۔ مگر فصاحت اور سلاست کی جان ہے۔ جن موقعوں پر لوگ نثر میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ وہ نظم سے کام لینے ہیں۔ اور لطف پیدا کرتے ہیں۔ کوئی جلدی سے یہ کہدیگا۔ کہ عنبر کا کلام قریباً سارے کا سارا خارجی موضوعوں پر ہے۔ اسی طرح کہہ سکتے ہیں۔ کہ میر تقی کا کلام قریباً سب کا سب داخلی موضوعوں سے وابستہ ہے۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے۔ کہ شاعر کس طرز سے لکھتا ہے اور کیا اثر پیدا کرتا ہے۔ عنبر مرحوم موقعوں اور مختلف تقریبوں پر جو کہتے ہیں۔ اسے حسنِ تخئیل سے سجاتے ہیں۔ عرب کے قدیم شعرا بھی یہی کیا کرتے تھے۔

پہلے حضرت عنبر کے فارسی کلام کی سیر کیجئے۔ مختلف غزلوں سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:۔

صحبتِ ہم نفساں داغ نہد بر دلِ من
چہ عجب گر بروم سوئے بیاباں بے تو

زاں دم کہ رفت دلبر من از کنارِ من
ایں آرفتہ ہوش و شکیب و قرارِ من

جز خاطر حزیں نہ دگر ہمدم من است
بنگر چساں ہمی گزرد روزگار من !

من بود و شب تار زدئے لطف دارم از در گہ خود مگر مراسنے خوارم
وہ بستہ دل مرادوا از قست ! گمزار کریم من حسزیں ونزارم

اردو کلام کی خوبیاں ملاحظہ ہوں۔ ذیل کے قطعہ سے شاعر کے دل کا سوز کس شدت سے ٹپکا پڑتا ہے۔

عزیز بچھڑ جائینگے ملنے والے
بکھد دیج دل پہ یہی قول عنبر
بس اک روز مرجائینگے کھلنے والے
چراغ آہ بجھ جائیگا داغ دے کر

ایک دوست "قاضی شمس الضحیٰ" کی وفات پر جو ترکیب بند لکھا ہے۔ وہ ایک مخلص ماتم زدہ کے دلی احساسات کی کس خوبی سے عکاسی کرتا ہے۔

یہ ستم کا فلک تیر کریں تجھ سے گلہ تو بھلا دوست زمانے میں ہوا ہے کسی کا
یہ بتا تو کہ شمس الضحیٰ صاحب کو چھوڑ گئے وہ رزبہا تا سوئے ملک بقا
سر کو نگاہ ہے اسبار لگام رقد میں زندگی نے نہیں مرحوم کی کچھ بھی وفا
ہنسا دن ابھی کچھ آپ کے کھلنے بھی نہ تھے حیف بیوقت مگر تاک لگائے تھی قضا

چل بسے آپ رہا آپ کا ماتم باقی !
اور اب نوحہ گری کو رہے بس ہم باقی

ایک مثنوی کی تمہید ملاحظہ ہو

کہ لاساقی سے ٹیکہ میں کیا سے کلفام کہ میں لینے نہیں دیتا ہے غم ایام
زمانہ رنگ بدلتا ہو تو ہو ہر روز بشرکے ساغر تر ہو گئے ہیں سو ہر روز
لبیں خوشی سے کہیں غم کا کارخانہ ہے اسی کا نام تو نیر نگیٔ زمانہ ہے
اب ایک مسرت افروز تقریب کی نسبت سنیئے۔

بھری ہے آج کس طرح یہ انجمن ہے مسرت کا گیا کہ جھولا چمن ہے
زمانے سے اب دُور رنج و محن ہے اشکوں سے طبع رسا موجزن ہے

برستاہے باران رحمت جھما جھم !
ہیں گردش میں پیمانہ و جام پیہم !

عجیب کیا فیض ہے ممدوح کے ہنر سے اختر ہو زمین چرخ بریں ہو نہ تنگ وقعہ ہو
ضیائے شہرت ممدوح کا پرتو سراسر ہو تجلی جس کی چمک سے سپہر پرتو شیفتہ ہو

قادر کلامی کا یہ حال تھا۔ کہ ۱۹۱۲ء میں کانپور۔ آگرہ۔ دہلی وغیرہ شہروں کا سفر کیا تھا۔ اس سفر کا حال ایک قصیدہ کی شکل میں نظم کر دیا۔ یہ ایک رواں دواں نظم ہے۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ایک قصیدے کی تشبیب ملاحظہ ہو۔ زمین کا بھی خیال رہے۔ کہتے ہیں:-

آج وہ دن ہیں کہ کچھ بھی غم ایام نہیں کون ہے اتنے میں جس کے مئے گلفام نہیں
رات دن صبح و مسا دور ہوا کرتے ہیں آج ان روز کی صبح نہیں شام نہیں
آج ہے صبح شگفتہ گل امید کی طرح شام ہے شام اودہ کچھ غم والام نہیں

قصیدہ جس کا عنوان "فطرت" ہے۔ عجب شان رکھتا ہے اول سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔ اور ظاہر کرتا ہے۔ کہ ہمارے شاعر کو مناظر قدرت کی نقش طرازی میں کہاں تک کمال حاصل تھا بارش کی سینری کو کس خوبی سے شعر کا جامہ پہنایا ہے۔

بخارا ٹھا زمیں سے ابر بن کر چرخ پر پہنچا ہوئی کایا پلٹ اسکی تو پھر باران رحمت ہے
نکلتی ہے نطق انسان کو بہ پرواز ہو گر صلابت سنگ کو اکرم دہشی کو وحشت ہے
تماشا ہے نظر افروز کثرت میں ہے وحدت کا اسی کا جلوہ ہر سو دیکھتا اہل بصیرت ہے

قومی سوز سے بھی شاعر کا دل خالی نہ تھا۔ ایک نظم ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "قومی حالت"۔ اس کی ذیل میں تشریح فرماتے ہیں:-

طبیعت موجزن ہے دل میں ذوق خوش بیانی ہے
نصیحت سے بھری میری یہ تقریر زبانی ہے
نہ حسن و عشق کا قصہ، نہ ہجر و وصل کا جھگڑا۔
غزل کے طرز میں قومی جہالت کی کہانی ہے۔
تجارت کی طرف مائل نہیں ہوتے یہ کہتے ہیں۔
کہ ہم کو زور قلم کے زور سے روٹی کمانی ہے۔
ہمیشہ خدمت قومی پہ اپنا دل رہے مائل
کہ عنبر قوم کی خدمت سعادت جاودانی ہے *

اردو کلام ملاحظہ ہو:-

* آپ کو معلوم ہوا ہوگا۔ کہ عنبر مرحوم جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے۔ اسے بطرز احسن نباہتے تھے۔ جبھی تو اکبر مرحوم جیسے مقدس صاحب نظر کو کہنا پڑا کہ "۔ نظم عنبر بزم میں جب عنبر افشاں ہو گئی۔ و لوے خوشی سے ... [illegible]

سری کرشن سنہا

نیا نظم عالم اور تعلیمی تنظیم

لارڈ اسکوتھ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ دنیا میں سب سے زیادہ آشتی پسند انسان کون ہوتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہی لوگ آشتی پسند اور مطمئن الطبع ہوتے ہیں جن کا پیشہ وکالت یا سیاسیات ہو۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ تعلیم یافتہ بے روزگار لوگ شاید وکلا اور سیاست والوں سے زیادہ آشتی پسند اور مطمئن الطبع ہوتے ہیں ۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ مجھ جیسا مطمئن انسان ہراساں دنیا کے متعلق کیا کہہ سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں۔ جس کے بسنے والوں کے لئے امن و آسودگی ایک سوپن ہو گیا ہے۔ ان کی زندگی ایک درد انگیز نغمہ —— ایک مچلتا ہوا احتجاج ہے۔ جو قدم قدم پر تپش آمادہ ہستی سے ٹکرا جاتا ہے۔ اور ٹکرا ٹکرا کر اس کو غارت کرنے کی کوشش کرتا ہے —— ایک بل کھاتا ہوا کا جھونکا ہے جو شمع مسرت کو بجھانے پر آمادہ ہے —— کیا یہی زندگی ہے؟ اور اگر یہی زندگی ہے تو ہم میں سے کوئی عمر خیام کے مقصد زندگی کہ "خوش باش دمے کہ زندگانی این است" کو حقیقت بنا نہیں سکتا۔ سقراط کی طرح آپ کسی راستہ چلنے والے کو پکڑ لیں۔ اور اس سے دریافت کریں کہ کیا انسان ایک مرغ خوشنوا ہے میرا دعویٰ ہے کہ شاید ہی کوئی آدمی ہو جو زندگی کو مسرت بھرا نغمہ کہے خواہ آپ کسی سیاست دان سے دریافت کریں یا سائنس دان سے، معاشیات کے بڑے محقق سے یا کسی فلسفی سے۔ سب کے سب دنیا والوں کی روش و عمل سے نالاں ہو گئے۔ ان کی خود زندگیاں یاس و حرماں کی تصویر ہو گئی الجھی ہوئی بدی کا ایک شوالہ۔ اسکروا ایلڈ کی ایک نظیر (PARABLE) مشہور ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ حضرت مسیح ایک عقاب بنکر دنیا کی سیر کے لئے نکلے۔ اور پہلے زمین پر اترآئے۔ ان کے لئے کرہ زمین کی نگارش نئی تھی۔ لیکن اب بھی ان کے پہچان کے لئے لوگ زندہ تھے جنہوں نے پاک زندگی بسر کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک تو وہ شخص تھا جو کسی زمانے میں اندھا ہو گیا تھا لیکن حضرت مسیح کے فیض سے بینائی حاصل ہو گئی تھی۔ دوسرا کسی مرض خبیث کا شکار تھا جس کو حضرت مسیح کی توجہ سے شفا حاصل ہو گئی تھی۔ اور تیسرا وہ شخص تھا۔ جو عدم علاج کے باعث کسی زمانے میں انتقال کر چکا تھا۔ لیکن صورت حال پر پہنچ کر حضرت مسیح نے اس کو کرامات سے زندہ کر دیا تھا۔ الغرض حضرت مسیح ان تینوں پرانے دوستوں کو پہچان تو گئے۔ لیکن تینوں کی زندگیوں کو گناہوں میں آلودہ دیکھ کر ان کو سخت صدمہ ہوا جب سوال کیا گیا تو جواب ملا۔ کہ اسکے سوا دنیا میں اور کوئی عمل کا راستہ نہیں۔ غور کیجئے کہ جب حضرت مسیح کے خاص لوگ جنہوں نے گناہ نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا ان کے لئے زندگی بسر کرنی مشکل تھی۔ تو آپ کا ہمارا کیا شمار۔

یہ اصل میں ایک لطیفہ نہیں ہے۔ بلکہ ہماری حالت کی سچی تصویر ہے۔ انسانی زندگی کے کسی شعبے پر نظر دوڑایئے

زخستہ حالی نمایاں ہوگی — کمزوریاں قدم قدم پہ اپنا روپ دکھائیں گی — اور آپ یہ محسوس کرینگے کہ واقعی اقبال نے جب دنیا کے متعلق یہ کہا تھا کہ "چمن خار خار ہے دنیا" تو کوئی مبالغہ آمیزی نہیں کی تھی۔

سیاسی حالت ملاحظہ فرمایئے۔ سارے کا سارا یورپ جنگ کے دہکتے ہوئے شعلوں کا شکار ہو گیا ہے۔ علمی پیرائے میں توضیح کریں تو روشنی کی طاقتوں اور تاریکی کی طاقتوں میں جنگ ہو رہی ہے یا اور کسی پیرائے میں سننا چاہیں تو یہ جنگ اصل میں نصب العینوں کی جنگ ہے — ایک طرف مطلقیت اور دوسری جانب جمہوریت برسر آزما ہیں۔ مطلقیت اپنے سائے کو عالمگیر دیکھنا چاہتی ہے۔ یورپ ہی نہیں۔ بلکہ ساری دنیا کو اپنا پرتو بنانا چاہتی ہے۔ اور یہ منوانا چاہتی ہے کہ آمریت کے قول میں جان ہے انہیں خود داری، خود اعتمادی اور روزی عمل کی قوت مضر ہے یہ جمہوریت کو ایک عضو سے معطل کر کے مملکت کو افراد مملکت پر ترجیح دے کر مشیت عامہ کو مفلوج کرنا چاہتی ہے۔ اسکے برخلاف حفظ ماتقدم کے تحت جمہوریتیں الفاظی برقعوں کو اوڑھ کر اپنی اصل صورت بتلانے سے احتراز کر رہی ہیں۔ اسکے باوجود ان کو ہر مہذب کرہ دنیا سے مدد مل رہی ہے — تھوڑی دیر کے لئے آپ اپنی موجودہ حالت کو بھول جائیں۔ اور یہ خیال کریں کہ کسی ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے یورپ کی رزم گاہ کی سیر کر رہے ہیں — دیکھئے وہی فرانس جو دو مہینے قبل... تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا — جس کی خوبصورتی زبان زد خاص و عام تھی وہ آج ترقی کے اونچے مینار پر سے گر پڑا ہے۔ اور تہذیب و تمدن کی ڈور اسکے ہاتھ سے نکل گئی ہے — ہر مقام پر بے کس عورتوں کی آہوں سے آپ کا خیر مقدم ہوگا۔ مظلوم بچوں کی دکھ بھری بپتا جو اپنی آپ کہانی کہہ لیتی ہے۔ آپ کا استقبال کریگی۔ یہ افلاس و نکبت کا دھواں کہاں سے اُٹھ رہا ہے — شاید جرمنی اور اٹلی سے۔ اس لحاظ سے اقبال نے سچ کہا تھا کہ

ہیں یہاں کو غنوں کے خار پسند
اس چمن کو نہیں بہار پسند!

جنگ کو بھول جایئے۔ اور ہمارے معاشی نظام کا جائزہ لیجئے۔ جو ناانصافیوں سے بھرپور ہے۔ ایک چھوٹا سا طبقہ ہے۔ ان لوگوں کا جو شام کے وقت دن بھر بیکار بیٹھے بیٹھے تھک کر ہوا خوری کو نکل جاتے ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی ہے۔ اور وہ بڑے خوش ہیں۔ دنیا انہی کے لئے ہے اور وہ امکانی طور پر اپنی دولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز ان کے لئے بکتی ہے اور وہ فرط مسرت میں خریدتے ہیں۔ محض ان لوگوں کی صورت دیکھنے سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کہ اس ملک کے یا ساری دنیا کے لوگ اس طریقہ سے فارغ البال ہیں۔ فیصلہ انسان غریب ہیں۔ اور ان کی غریبی جیسے برنارڈ شا لکھتا ہے۔ ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

"غریب کو غریب رہنے دو" کے کیا معنی ہیں؟ اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ کمزور رہے۔ وہ جاہل مطلق رہے — ساری بیماریوں کا مرکز رہے۔ اور مستقل نمائش رہے۔ غلاظت اور میلے پن کی۔ اسکے بچے کمزور اور لاغر ہیں — وہ اپنے کو ارزاں قیمت میں بیچ دے اور تمدنی نظام پر اپنے پورے خاندان کو اسی معیار پر لائے — اس کی لڑکیاں ہمارے نوجوانوں کو بگاڑیں اور اسکے لڑکے غلاظت زدہ ہو کر چوری کریں اور ڈاکے ماریں۔"

یہی مصنف زر کے متعلق لکھتا ہے ۔

"زر دنیا میں سب سے اہم چیز ہے۔ وہ تندرستی، قوت، عزت، سعادت اور حسن کا نمائندہ ہے"۔

غرض اسکے معنے یہ ہیں۔ کہ غربت و افلاس کو دور کیا جائے۔ اور ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے۔ جو سب طبقوں کی مرفہ الحالی کا باعث ہو۔

سائنس نے جہاں ہماری لامتناہی ضروریات کی تکمیل کی صورتیں پیدا کیں۔ وہاں بہت سے نقائص بھی پیدا کئے۔ نقائص اتنے بڑھ گئے ہیں۔ کہ ان کی وجہ سے انسانی برادری کو بہت نقصان پہنچا۔ شاید اسی کے مدنظر ایک مصنف نے کہا تھا کہ سائنس نے ہمارے ہاتھوں میں دیوتاؤں کی قوت دے دی ہے۔ لیکن ہم اسکو اسکول کے بچوں کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔ سائنس کے فوائد مسلم ہیں۔ لیکن نقصانات بھی قابل لحاظ ہیں۔ سائنس کی ترقیات نے انسانی کوشش اور انسانی محنت کے ہر شعبہ میں تعطل پیدا کر دیا۔ ہم میں زندگی کا احساس گھٹتا جا رہا ہے۔ کیونکہ ہم نے چلنا بند کر دیا اور موٹر میں سواری شروع کی۔ ہم نے اوپر چڑھنا چھوڑ دیا۔ اور جھولے میں بیٹھ کر اوپر پہنچے ـــ ہم نے بحث و مباحثہ بات چیت کرنا چھوڑ دیا۔ اور ریڈیو لگا لیا ـــ ہم نے گانا بند کر دیا۔ اور آہستہ سے ریکارڈ لگا لیا۔ "غرض مشینری نے ہمارے احساسات کے ابھار کو کم کر دیا حتیٰ کہ وہ زمانہ قریب ہے۔ جب کہ انسان کی زندگی کی بیشتر حرکتیں بندھی بندھائی اور جاپانی گڑیا کی طرح زندگی بسر کی جائے۔ کارل شپیک نے ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا ڈرامہ آر۔ یو۔ آر لکھا ہے جس میں انسانی سماج کا خاکہ یوں کھینچا گیا ہے کہ انسان آدھا انسان رہتا ہے اور آدھا میکانی پتلا۔۔۔

۔۔۔۔ کیسلے نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ پیشگوئی کی ہے۔ کہ میکانی فطرت انسانی فطرت کو بدل دیگی۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو یقین ہے کہ انسان کو زمین پر رہنا راس نہ آئیگا۔ اور اگلے ہاتھوں کہیں ہوا میں اپنا مقام تجویز کریگا۔ اور بقول ولز کے ہر اٹھویں دن ہواخوری کے طور پر شاید اس چھوڑی ہوئی بستی کی طرف رخ کرے۔

سماجی حالت کو دیکھئے۔ ہم جس تہذیب کے نام لیوا ہیں۔ اس کی بنیاد اصل میں ناانصافی اور بے ایمانی ہے۔ سرمایہ داری کی وبا سے سماج بھی شکار ہے۔ اور ہر سماج کا اصول سرمایہ دارانہ مفاد کے تحفظ کے لئے گھڑ لیا گیا ہے۔ تاکہ اقلیت کا فائدہ ہو اور اکثریت کا نقصان۔ جتنے بھی سماجی اصول ہیں۔ ان کی تہ میں کسی نہ کسی فرقے کی خودغرضی کھیلتی رہتی ہے مثلاً اگر ایک فرقہ علم کی خدمت کرنے کا اجارہ لئے علم کے دروازے دوسروں کے لئے بند کر دے۔ تو میں ایسے فرقے کو انسانیت کا دشمن سمجھتا ہوں ـــ قومی ارتقا اور علمی ترقی کا حریف۔ اگر یہ فرقہ خودساختہ سماجی قانون کے ذریعہ دوسروں کو علم سے بے نیاز کر دے۔ اور پھر اتنا بے نیاز کہ اگر کسی کے کان میں وہ اکشر پڑ جائیں۔ تو اس میں گرم سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایسے سماجی قانون کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ کسی فرقے کے اس تسلط کو جائز قرار دے کر مہر سکوت ثبت کی جا سکتی ہے۔ اس پر لطف یہ ہے۔ کہ ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ اس طرح سے اور بھی سماج کی بہت سی مسلمہ روایات ہیں۔ جو صاف طور پر جہالت اور خودغرضی پر مبنی ہیں۔ موجودہ زمانے کی ساری اخلاق سازی ایک ڈھکوسلا ہے ـــ ایک آہنی طوق ہے۔ جو مسکینوں کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے، کہ وہ کبھی

پھڑپھڑا نہ سکیں۔

غرض اس خستہ حالی کی وجہ سے انسانی ذہن اپنے سیدھے اور صاف راستہ سے ہٹ گیا۔ انحطاط کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ انسان ہر نقطۂ نظر سے کمزور ہو گیا۔ فیلڈنگ نے اپنی کتاب ٹام جونس میں موجودہ انسان کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔

"انسان نے جو اس کرہ کا بادشاہ ہے۔ اپنی فطرت کو بری طرح برباد کر دیا ہے۔ بے ایمانی بے رحمی اور ریاکاری سے خالقِ حقیقی کو بدنام کرنے کا موجب ہوا ہے۔ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایک اشرف المخلوقات نے اپنا چولا بدلا اور بدنیتی و بربریت کی مجسم تصویر ہو گیا۔"

تعجب اس امر کا ہے کہ فیلڈنگ جیسا ہمدردِ انسان عام انسانوں کے متعلق ایسا کیونکر لکھ سکا۔ سوئفٹ بھی ہم لوگوں کے متعلق کوئی زیادہ اچھا خیال نہیں رکھتا ہے۔ بروبڈنگنیگ کے بادشاہ کے منہ سے گلیور اور اس کے ہم جنسوں یعنی عام انسانوں کے متعلق کہلوایا ہے کہ ——

"مجھے یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ تمہارے ہم جنس ایک مہلک قسم کے کیڑوں کی برادری پر مشتمل ہیں۔ جنہیں خدا نے سطحِ خشکی پر ہمیشہ رینگنے کے لئے بنایا ہے۔"

یا برنارڈ شا کی رائے سنئے۔ اپنے ایک ڈرامے میں انہوں نے ایک قدیم زمانے کے انسان سے ہماری حالت کا خاکہ کھنچوایا ہے۔ موجودہ انسانوں کو دیکھ کر وہ اپنے نوکر کو حکم دیتا تھا۔ "لیجاؤ ان دونوں نفرت انگیز مجسموں کو چمٹین کے تجربے خانے میں اور وہاں تجربے خانے کے کچرے سے ان کو غارت کر دو۔ لیکن دیکھو ان کے جسم کو چھوؤ نہیں۔ کیونکہ یہ مہلک ہے —— ان کو کپڑوں کے سہارے سے اٹھانا۔"

یہ گویا ہماری موجودہ کیفیت ہے۔ کیا غالب نے ہمارے متعلق صحیح نہیں کہا تھا —— "آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔"

یہاں آ کر ہم اپنے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے تعلیم کا یہی مدعا ہونا چاہیئے۔ کہ ہم لوگوں کے دلوں میں اپنی بے بسی کا احساس پیدا کرے۔ اور ایسے ہتھیاروں سے ہم کو مزین کرے کہ ہم ان خطرناک حالتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کے نئے نظم کے قیام میں تعلیم کو اتنا ہی دخل ہے۔ جتنا کہ دوسرے شعبہ جات کو ہے۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں یہ کہوں کہ اصل میں دنیا کے نئے نظم کی بنیاد تعلیمی تنظیم ہونی چاہیئے۔ ان برائیوں کا اوپر اعادہ کیا جا چکا ہے۔ جن کی وجہ سے ہماری پچھلی دنیا کی ساکھ ختم ہو گئی۔ ان برائیوں کا واحد حل تعلیمی تنظیم ہے اگر اربابِ فکر جنگوں کا سدباب چاہتے ہیں —— عالمگیر امن کے خواہاں ہیں۔ تو ان کو چاہیئے۔ کہ ہماری جنگجو جبلتوں کی تعلیم سے اصلاح کریں۔ جن کی وجہ سے جنگیں معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ نفسیات کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔ کہ دنیا کی سب جنگیں خودغرضی یا حرص کی جبلت کے تحت ہوئی ہیں۔ اگر صحیح تعلیم سے ان جبلتوں کی اصلاح کی جائے۔ جو ممکن بھی ہے۔ تو ہمیشہ کے لئے تاریخ جنگوں کی آلائش سے پاک ہو سکتی ہے۔ بعض منکرین کا یہ صحیح خیال ہے۔ کہ موجودہ جنگ میں جو ہٹلر کو کامیابی ہو رہی ہے۔ اور ساری کی ساری جرمنی کی مدد حاصل ہے۔ وہ بڑی حد تک نازی طریقہ تعلیم کی

وجہ سے ہے۔ وہاں کے طریقہ تعلیم نے نوجوانوں کی فطرت میں ہیجان برپا کر دیا۔ اور انہیں سکھایا گیا کہ مملکت انسانوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ ہٹلر ان کا سچا آسمانی باپ ہے۔ اور بقا کے لئے جنگ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ غور کیجئے۔ کہ جب تعلیم کے ذریعہ نوجوانوں کو جنگ کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں۔ کہ ان کو عدم جنگ کے لئے بھی تیار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

معاشی اور معاشرتی برائیوں کو بے نقاب کرنا اور ان کے سدباب کی امکانی کوشش اس وقت ممکن ہے جب کہ ہمارے تعلیمی اقدار بدل جائیں۔ جس کی وجہ سے ہمارے مقصد زندگی میں نمایاں تبدیلی واقع ہوگی۔ اگر تعلیم کا فیض اثر یہ ہے۔ کہ ہماری گمراہ کن جبلتوں کی اصلاح ہو جائے۔ انصاف اور ایثار کے جذبات ہمارے دلوں میں پوری قوت کے ساتھ موجزن ہوں۔ تو یقیناً انسانیت کا مستقبل درخشاں ہے۔ اگر ہمارا معاشی نظام بے انصافی پر دلالت کرتا ہے۔ اکثریت کو مفلس کر رکھا ہے۔ تو اس کی سدھار ضروری ہے۔ لیکن سدھار اس وقت ممکن ہے۔ جب کہ لوگوں میں اپنے حق کے مانگنے اور منوانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ۔۔ جب کہ لوگوں کے دلوں میں انصاف کا تخیل اس طرح جاگزیں ہو کہ وہ دوسروں کی حق تلفی سے احتراز کریں ۔۔ ایک نیکی دوسری نیکی کو پیدا کر سکتی ہے۔ تعلیم کی نیکی سے انصاف کی نیکی پیدا کرنا مشکل نہیں ہے۔ اسلئے میں ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ ہمارا تعلیمی نظام اعلیٰ اقدار کا حامل ہو۔

حضرات اگر حضرت انسان سائنس کے کرشموں کے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہیں ۔۔ سائنس کے تخریبی پہلو کو تقویت دینے پر مصر ہیں۔ تو یہ ان کی ذہنیت کی خرابی کا نتیجہ ہے ۔۔ ذہنیت کو بدل دیجئے ۔۔ فطرت کو خود غرضی کے شکنجے سے نکال دیجئے۔ تعلیم سے انسانیت کے مذہب کی عالمگیر تشہیر کیجئے۔ تو ان برائیوں کی بیخ کنی ہو سکتی ہے۔

غرض تعلیم کو میں شعور کی ترقی کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک یہی وہ واحد ذریعہ ہے۔ جو آدمی کو انسان کے درجے سے سرفراز کرتا ہے ۔ لیکن یہ صورت اس وقت ممکن ہے ۔ جب کہ ہمارا تعلیمی نظام بے نقص ہو اور اس کا نصاب اس خیال کے تحت مقرر کیا گیا ہو۔ اگر تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم میں اتنی اہلیت پیدا کر دے کہ وہ کسی دفتر کی اہلکاری آسانی سے کر سکے۔ تو میں کہونگا۔ کہ تعلیم کے دروازے یک لخت بند کر دیئے جانے چاہئیں۔ اگر تعلیم ہم جنسوں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے۔ اور اپنے دیرینہ بھائیوں کو دشمن بتلاتی ہے۔ تو اس قسم کی تعلیم سے بھٹیارپن اچھا ہے۔ میں تعلیم یافتہ ہو کر متعصب بننا نہیں چاہتا۔ میں تعلیم یافتہ ہو کر انسانوں کا دشمن بننا نہیں چاہتا۔ مبادا کہ تعلیم کے منہ پر برہم کریں۔ تقدس ختم ہو جائے اور اپنی روحانی ماں یونیورسٹی کے سامنے منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہوں۔ اگر ہر طالب علم اور ہر تعلیم یافتہ انسان کے پیش نظر یہی کا انسانی تخیل رہا۔ تو وہ زمانہ دور نہیں۔ جب کہ ہندوستان ہی کیا بلکہ پوری دنیا کی طوطی پھر بولنے لگے۔ اور جس طرح کے برنارڈ شا نے اشتراکیت کے متعلق کہا تھا ویسے ہی ہم تعلیم کے متعلق کہیں کہ "اس نے مجھے انسان بنایا"

سعید احمد اعجاز

رُباعیات

خوشتر زگل و بہار کیا ہے ساقی!
لا بادہ کہ انتظار کیا ہے ساقی!
دو چیز جو کرتی ہے ارم کی تفسیر
جز بادۂ خوشگوار کیا ہے ساقی!

اک موج صبا ہے عمرِ فانی ساقی!
از بس ہے گریز پا جوانی ساقی!
لا بادۂ گلرنگ صراحی سے انڈیل
ہو وہمِ حیاتِ جاودانی ساقی!

اُٹھ دوست کہ نالوں میں اثر تازہ کریں
اُٹھ دوست کہ پھر آہِ سحر تازہ کریں
اُٹھ دوست کہ پھر حسن ہے بیگانۂ عشق
اُٹھ دوست کہ پھر زخمِ جگر تازہ کریں

اُٹھ دوست کہ پھر سوزِ جگر تازہ کریں
اُٹھ دوست کہ پھر سازِ نظر تازہ کریں
اُٹھ دوست کہ پھر یادِ سلیمیٰ آئی
اُٹھ دوست کہ پھر عزمِ سفر تازہ کریں

سرشار و غزلخواں ہیں ہوائیں ساقی!
فردوس بداماں ہیں فضائیں ساقی!
لا مے کہ جنوں خیز ہے اندازِ بہار
میخانۂ لرزاں ہیں گھٹائیں ساقی!

غوغائے طرب بلند کر اے ساقی!
ہنگامۂ مے دوچند کر اے ساقی!
فریاد کہ ہو گیا تڑپ کر خاموش
فکرِ دلِ دردمند کر اے ساقی!

اس کاکل و رخسار کا صدقہ ساقی!
اِس نرگسِ بیمار کا صدقہ ساقی!
تھوڑی سی پلا دے مجھے صہبائے ناب
اس دیدۂ سرشار کا صدقہ ساقی!

آ حسن کی آرزو کریں اے ساقی!
آ عشق کی گفتگو کریں اے ساقی!
نظارہ کریں عکسِ رخِ جاناں کا
اُٹھ جام کو روبرو کریں اے ساقی!

سعادت حسن منٹو

اُلّو کا پٹھا

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا۔ راستے میں، یہ اُسکو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، سونے والے کمرے میں صحن میں یا غسل خانے کے اندر اُسکے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو اُلّو کا پٹھا کہے۔ بس صرف ایک بار غصے میں یا طنز یا انداز میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کہدے۔

قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی بڑی انوکھی خواہش پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی وہ بہت خوش تھا رات اُسکو بڑی پیاری نیند آئی تھی۔ وہ خود کو بہت تر و تازہ محسوس کر رہا تھا لیکن پھر یہ خواہش کیسے اُسکے دل میں داخل ہو گئی۔ دانت صاف کرتے وقت اُس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جسکے باعث اُسکے مسوڑھے چھل گئے۔ دراصل وہ سوچ رہا تھا کہ یہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا بیوی سے وہ بہت خوش تھا۔ ان میں کبھی لڑائی نہ ہوئی تھی نوکروں پر بھی وہ ناراض نہیں تھا۔ اسلئے کہ غلام محمد اور نبی بخش دونو خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار تھا۔ فروری کے سہانے دن تھے۔ جن میں کنوارپنے کی تازگی تھی۔ ہوا خنک اور ہلکی۔ دن چھوٹے نہ راتیں لمبی۔ نیچر کا توازن بالکل ٹھیک تھا اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش اُسکے دل میں کیوں کر پیدا ہو گئی۔

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برسوں میں متعدد لوگوں کو اُلّو کا پٹھا کہا ہوگا اور بہت ممکن ہے۔ کہ اس سے بھی کڑے لفظ اُسنے بعض موقعوں پر استعمال کئے ہوں اور گندی گالیاں بھی دی ہوں مگر اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اُسکے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر اب اچانک طور پر اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو اُلّو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اُس نے اگر کسی کو اُلّو کا پٹھا نہ کہا۔ تو بہت بڑا ہرج ہو جائیگا۔

دانت صاف کرنیکے بعد اُس نے چھلے ہوئے مسوڑھوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا۔ مگر دیر تک اُنکو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دبی جو ایکا ایکی اُسکے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا۔ وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا۔ آئینہ میز پر رکھکر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔

"مان لیا کہ میرا کسی کو اُلّو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ مگر یہ کوئی بات تو نہ ہوئی۔۔۔ میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کیوں کہوں؟۔۔۔ میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں۔۔۔"

یہ سوچتے سوچتے اُسکی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں رکھے ہوئے حقے پر پڑی۔ ایک دم اُسکے دل میں یہ باتیں پیدا ہوئیں "عجیب واہیات نوکر ہے۔ دروازے کے عین بیچ میں یہ حقہ رکھ دیا ہے۔ میں ابھی اس دروازے سے اندر آیا ہوں، اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی۔ تو پا انداز جو کہ مونج کا بنا ہوا ہے۔ جلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی۔۔۔"

اُسکے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے۔ جب وہ بھاگا بھاگا اُسکے سامنے آ جائے۔ تو وہ بھرے ہوئے حقے کی طرف اشارہ کر کے

اُس سے صرف اتنا کہے، "تم نرے اُلو کے پٹھے ہو۔" مگر اُس نے تامل کیا، "سوچا یوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر غلام محمد کو کب بلا کر اُلو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہوگی اور پھر۔ ۔ ۔ اور پھر اس بیچارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے۔ میں دروازے کے پاس بیٹھ کر بھی تو ہر روز حقہ پیتا ہوں۔"

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحے کے لئے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ کہ اُس نے اُلو کا پٹھا کہنے کے لئے ایک اچھا موقع تلاش کر لیا، غائب ہوگئی۔

دفتر کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی۔ پورے دو گھنٹے پڑے تھے دروازے کے پاس کرسی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقہ نوشی میں مصروف ہوگیا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ بچار کے بغیر حقے کا دُھواں پیتا رہا اور ہوا میں اس کے انتشار کو دیکھتا رہا۔ لیکن جونہی وہ حقے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لئے ساتھ والے کمرے میں گیا۔ تو اُسکے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔

قاسم گھبرا گیا۔ "یہ بھی حد ہوگئی ہے۔۔ اُلو کا پٹھا۔۔ میں کسی کو اُلو کا پٹھا کیوں کہوں اور بفرضِ محال میں نے کسی کو اُلو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔"

قاسم دل ہی دل میں ہنسا۔ وہ صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خواہش جو اُسکے دل میں پیدا ہوئی ہے بالکل بیہودہ اور بے سروپا ہے۔ لیکن اسکا کیا علاج تھا کہ دبانے پر وہ اور بھی زیادہ اُبھر آتی تھی۔

قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے اُلو کا پٹھا نہ کہے گا۔ خواہ یہ خواہش صدیوں تک اُسکے دل میں تلملاتی رہے شاید اسی احساس نے اُس خواہش کو جو بھی ہوتی جگنو کی طرح اُسکے روشن دل میں چلی آتی تھی۔ اسقدر تڑپ رہی تھی۔

پتلون کے بٹن بند کرتے وقت جب اُس نے دماغی پریشانی کے باعث اوپر کا بٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلا اٹھا، "... بھی ہوگا۔ ۔ ۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ ۔ ۔ دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔ ۔ ۔ اُلو کا پٹھا کہو۔۔ اُلو کا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر سے بند کرنے پڑینگے۔" لباس پہن کر وہ میز پر آ بیٹھا۔ اُس کی بیوی نے چائے بنا کر پیالی اُسکے سامنے رکھ دی اور توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا۔ روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی۔ توس اتنے اچھے سنکے ہوئے تھے۔ کہ بسکٹ کی طرح کرکرے تھے۔ اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی جس میں سے خوشبو آ رہی تھی۔ مکھن بھی صاف تھا۔ چائے کی کیتلی بے داغ تھی۔ اُس کی ٹونٹی کے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل دیکھا کرتا تھا۔ مگر آج وہ دھبہ بھی نہیں تھا۔

اُس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ اُس کی طبیعت خوش ہو گئی۔ خالص دارجلنگ کی چائے تھی جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی۔ دودھ کی مقدار بھی صحیح تھی۔

قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا۔ "آج چائے کا رنگ بہت ہی پیارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔"

بیوی تعریف سنکر خوش ہوئی۔ مگر اُس نے منہ بنا کر ایک ادا سے کہا۔ "جی ہاں، بس آج اتفاق سے اچھی بنگئی ہے ورنہ ہر روز تو ایسا ہی نیم گھول کے پلائی جاتی ہے۔ ۔ ۔ مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے۔۔ سلیقے والیاں تو وہ موٹی ہوٹل کی چھوکریاں ہیں جن کے آپ ہر وقت گن گایا کرتے ہیں۔"

یہ تقریر سنکر قاسم کی طبیعت منغض ہوگئی۔ ایک لمحے کے لئے اُسکے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر الٹ دے اور وہ نیم جو اُس نے اپنے بچے کی پھنسیاں دھونے کے لئے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقچے میں پڑی تھی گھول کر پی لے مگر اُس نے بردباری سے کام لیا۔ یہ عورت تیری بیوی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسکی بات بہت ہی

بھونڈی ہے جو ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بنکر ایسی
بھونڈی باتیں ہی کرتی ہیں ــــ اور بیوی بننے سے پہلے اپنے
گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سنتی ہیں؟ ــــ بالکل
ایسی ہی قسم کی باتیں اور اسکی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ عورتوں
کو عملی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں۔ ۔ ۔ میری بیوی
تو پھر بھی غنیمت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی
بات کہہ دیتی ہے۔ اُسکی نیت نیک ہوتی ہے۔ بعض عورتوں کا
تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہیں"

یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں اُس طاقچے پر سے ہٹا لیں۔
جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا
رُخ بدل کر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھو آج نیم کے
پانی سے بچے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا ــ نیم زخموں کے لئے بڑی
اچھی ہوتی ہے"۔ ۔ ۔ اور دیکھو، تم موسمبیوں کا رس ضرور پیا کرو
۔ ۔ میں دفتر سے لوٹتے ہوئے ایک درجن اور لے آؤنگا۔ یہ
رس تمہاری صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔

بیوی مسکرا دی۔ "آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحت کا
خیال رہتا ہے۔ ۔ ۔ اچھی بھلی تو ہوں، کھاتی ہوں، پیتی ہوں،
دوڑتی ہوں، بھاگتی ہوں۔ ۔ ۔ میں نے جو آپ کے لئے بادام
منگوا کے رکھے ہیں۔ ۔ ۔ بھئی آج دس ہیں آپ کی جیب میں
ڈالے بغیر نہ رہوں گی۔ ۔ ۔ لیکن دفتر میں کہیں بانٹ نہ دیجئے گا"

قاسم خوش ہو گیا کہ جلد موسمبیوں کے رس اور باداموں نے
اُسکی بیوی کے مصنوعی غصے کو دور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے
طے ہو گیا۔ دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان
طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا۔ جو اُس نے پڑوس کے پرانے
شوہروں سے سیکھے تھے۔ اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق اُن
میں تھوڑا بہت رد و بدل کر لیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر
سلگایا اور اٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا۔ کہ پھر وہی
خواہش نمودار ہو گئی۔ اس مرتبہ اُس نے سوچا "اگر میں کسی روز
اُلّو کا پٹھا کہہ دوں تو کیا حرج ہے ــــ زیر لب، بالکل ہولے سے
کہہ دوں، اُلّو۔ ۔ ۔ کا۔ ۔ ۔ پٹھا۔ ۔ ۔ تو میرا خیال ہے۔ کہ بڑی حد تک
دلی تسکین ہو جائے گی۔ یہ خواہش میرے سینے پر بوجھ بنکر بیٹھ گئی ہے
کیوں نہ اسکو ہلکا کر دوں ــــ دفتر میں۔ ۔ ۔ ۔ "

اُسکو صحن میں بچے کا کموڈ پڑا نظر آیا۔ یوں صحن میں کموڈ کا
سخت بدتمیزی تھی اور خصوصاً اسوقت جب کہ وہ ناشتہ کر چکا تھا
اور خوشبودار کرکرے توس اور تلے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک
اُسکے منہ میں تھا۔ ۔ ۔ اُس نے زور سے آواز دی۔ "غلام محمد"۔

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی۔ "غلام محمد
باہر گوشت لینے گیا ہے۔ ۔ ۔ کوئی کام تھا آپ کو اُس سے"؟

ایک سیکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں
آئیں۔ "کہہ دوں، یہ غلام محمد اُلّو کا پٹھا ہے۔ ۔ ۔ اور یہ کہہ کر جلدی
سے باہر نکل جاؤں۔ ۔ ۔ نہیں۔ ۔ ۔ وہ خود تو موجود ہی نہیں
پھر۔ ۔ ۔ بالکل بیکار ہے۔ ۔ ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بیچارے غلام محمد
ہی کو کیوں نشانہ بنایا جائے ــــ اُسکو تو میں ہر وقت اُلّو کا پٹھا
کہہ سکتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ "

قاسم نے ادھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا۔ "کچھ نہیں
میں اُس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بارہ نہیں ڈیڑھ
بجے لے آیا کرے۔ ۔ ۔ تمہیں کھانا جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف
کرنا پڑتی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ جو فرش
پر اُسکے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی۔ قاسم کو فوراً اپنی غلطی
کا احساس ہوا۔ "یہ سگریٹ اگر بجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اسکا بچہ
رینگتا رینگتا آئیگا اور اُسے اٹھا کر منہ میں ڈال لیگا۔ جس کا نتیجہ
یہ ہوگا۔ کہ اُسکے پیٹ میں گڑبڑ ہو جائیگی"۔ قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا
اٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا۔ ۔ ۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ

میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمد کو الّو کا پٹھا نہیں کہہ دیا۔ اُس سے اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو ابھی ابھی مجھ سے بھی تو ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی . . .

قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اُسے اس بات کا احساس تھا۔ کہ وہ صحیح خطوط پر غور و فکر کرنے والا انسان ہے۔ مگر اس احساس نے اُسکے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اُس کی صحیح الدماغی کو دخل تھا۔ کہ وہ احساس برتری کو اپنے اندر دبا دیا کرتا تھا۔

موری میں سگرٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اُس نے بلا ضرورت صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ دراصل کچھ دیر کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔

اُسکی بیوی ناشتے کا آخری توس کھا چکی تھی۔ قاسم کو یوں ٹہلتے دیکھ کر وہ اُسکے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

قاسم چونک پڑا۔ "کچھ نہیں . . . کچھ نہیں . . . دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟" یہ لفظ اُس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی الّو کا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

اُسکے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہدے کہ عجیب وغریب خواہش اُسکے دل میں پیدا ہو گئی ہے۔ جسکا نہ سر ہے نہ پیر بیوی ضرور ہنسے گی اور یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ اُسکو بیوی کا ساتھ دینا پڑیگا، چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں الّو کا پٹھا کہنے کی خواہش اُس کے دماغ سے نکل جائیگی۔ مگر اُسنے غور کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی ہنسے گی اور میں خود بھی ہنسوں گا لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بنجائے . . . ایسا ہو سکتا ہے . . . ہو سکتا ہے کیا ضرور ہو جائیگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار ناخوشگواری پیدا ہو۔ چنانچہ اُس نے اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا اور ایک لمحے تک اُس کی طرف یونہی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا۔

"آج صبح آپکے برخوردار نے وہ ستایا ہے کہ اللہ کی پناہ — بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اُسے کموڈ پر بٹھایا — اُس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے . . . آخر لڑکا کس کا ہے؟ . . ."

قاسم کو اس قسم کی ہیچ پسند تھی۔ ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاج کی جھلک دیکھتا تھا۔ مسکرا کر اُس نے بیوی سے کہا۔ "لڑکا میرا ہی ہے مگر . . . میں نے تو آجتک کبھی بستر خراب نہیں کیا — یہ عادت اُس کی اپنی ہوگی۔"

بیوی نے اُس کی بات کا مطلب نہ سمجھا۔ قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا۔ اسلئے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے منہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لئے کیا کرتا تھا۔ وہ اور بھی خوش ہوا۔ جب اُسکی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئی۔

"اچھا بھئی میں اب چلتا ہوں — خدا حافظ!"

یہ لفظ جو ہر روز اُسکے منہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی صفائی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

کشمیری گیٹ سے نکل کر جب وہ نکلسن پارک کے پاس سے گزر رہا تھا تو اُسے ایک داڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا۔ اُسکو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر الّو کا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ "لو بھئی، یہ آدمی ہے جسکو الّو کا پٹھا کہہ دینا چاہیئے . . . یعنی جو صحیح معنوں میں الّو کا پٹھا ہے . . . ذرا انداز ملاحظہ کرو . . . کس انہماک سے ڈرائی کلین کئے جا رہا ہے . . . جیسے کوئی بہت اہم کام سرانجام پا رہا ہے . . . لعنت ہے"

لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اُس نے تعجیل سے کام نہ لیا اور تھوڑی دیر غور کیا۔ میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر۔ اگر میں نے بلند آواز میں بھی اُسکو الّو کا پٹھا کہا تو وہ چونکے گا نہیں۔ اسلئے کہ کم بخت اپنے کام میں بہت بُری طرح مصروف ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ اُسکے کان کے

پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اُٹھے تو اسے بڑے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے، "قبلہ آپ اُلّو کے پٹھے ہیں ... لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا"۔

چنانچہ قاسم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اِسی اثنا میں اُسکے پیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہوئی۔ کالج کی ایک لڑکی اسپر سوار تھی۔ اسنے کرتے پیچھے بستہ سنبھالا تھا۔ آناً فاناً اس لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں میں پھنسی، لڑکی نے گھبرا کر اگلے پہیے کا بریک دبایا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہوئی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔

قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لیا۔ اسلئے کہ اس نے اِس حادثے کے ردعمل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا مگر جب اُس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اُسکا بورڈر بہت بُری طرح اُن میں اُلجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اُس نے سائیکل کا پچھلا پہیہ ذرا اونچا اُٹھایا۔ تاکہ اُسے گھما کر ساڑھی کو فری وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پہیہ گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں کی لپیٹ میں آ گئی۔ کہ اُدھر پیٹی کوٹ کی گرفت سے باہر نکل آئی۔ قاسم بوکھلا گیا۔ اُسکی اس بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت زیادہ پریشان کر دیا۔ زور سے اُسنے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا۔ فری وہیل کے دانتوں میں ایک بڑا اُتار رہ گیا۔ اور ساڑھی باہر نکل آئی۔

لڑکی کا رنگ لال ہو گیا تھا۔ قاسم کی طرف اُس نے غضبناک نگاہوں سے دیکھا اور بھینچے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اُلّو کا پٹھا"۔

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے چٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑھی کو کیا کیا۔ اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا، نظروں سے غائب ہو گئی۔

قاسم کو لڑکی کی گالی سُنکر بہت دکھ ہوا خاص کر اس لئے کہ وہ یہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ بہت صحیح الدماغ آدمی تھا۔ ٹھنڈے دل سے اُس نے اس حادثے پر غور کیا اور اُس لڑکی کو معاف کر دیا۔ "اُسکو معاف ہی کرنا پڑیگا۔ اسلئے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے مُلٹی عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اُس نے اپنی لمبی جراب میں اُوپر ران کے پاس تین چار کاغذ کیوں اُڑس رکھے تھے؟"

اسرارِ موسیقی

مصنفہ

مسٹر فیروز نظامی بی۔ اے (گائیک)

گانا سیکھنے والوں کے لئے اس سے بہتر اور آسان کتاب ابھی تک اردو زبان میں نہیں چھپی۔ اس کتاب میں گانے کے متعلق ایسے ایسے راز بتائے گئے ہیں۔ جو باقاعدہ سیکھنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول ڈاک

شرکت ادبیہ پنجاب چوہالہ بھاٹی گیٹ لاہور

اعجاز صدیقی

جنّتِ ذوق

بڑھ گئیں اِس درجہ ذوقِ عشق کی رعنائیاں
حُسن کی فطرت کو لینی ہی پڑیں انگڑائیاں

پُوچھتا کیا ہے تصوّر کی کرم فرمائیاں
بن گئی ہیں جنّتِ ذوقِ نظر تنہائیاں

چاندنی میں "تاج" کی خاموش جلوہ زائیاں
جیسے ہستی کی سمٹ آئی ہوں سب رعنائیاں

شدّتِ جذبات خود ہی باعثِ تشہیر ہے
حُسن سے منسوب کیوں ہوں عشق کی رسوائیاں

فی الحقیقت مل گیا کونین کا حاصل اُسے
عشق میں جس کو میسّر ہو گئیں تنہائیاں

خود ہی آساں منزلِ راہِ وفا ہو جائے گی
پہلے اے ذوقِ طلب پیدا تو کر گیرائیاں

خود سے غافل ہو کے کھو جاتا ہوں اُنکی یاد میں
ہیں بڑی نعمت محبّت میں مری تنہائیاں

مُنجلی کر بے خودی سے تو خودی کا آئینہ
روح میں کرنے لگیں گے وہ جلو فرمائیاں

حُسن اُتنا ہی بہر پہلو بنے گا تابناک
عشق پر کی جائیں گی جتنی خیال آرائیاں

وہ سکوں مندِ محبّت جو کبھی تڑپا نہ ہو
کیا سمجھ سکتا ہے میرے درد کی پہنائیاں

دیدیا جاتا ہے نظمِ گُل خزاں کے ہاتھ میں
جب بہاروں سے نہیں ہوتیں چمن آرائیاں

وہ تصوّر کی حدوں کو چھُو رہے ہیں بار بار
چھن رہی ہیں آج یُوں مجھ سے مری تنہائیاں

ربط اُن کے مرمریں جلووں سے ہے اعجازؔ کو
کیا پسند آئیں ستاروں کی اُسے رعنائیاں

اکرام قمر بی اے۔

آمریت

آمریت اُس فردِ واحد کی حکومت کا نام ہے جس نے حکومت وراثت میں حاصل نہیں کی بلکہ قوت سے حاصل کی ہے۔ مگر اس قوت کے ساتھ رائے عامہ کی تائید کا بھی عنصر شامل ہوتا ہے۔ آمر حاکمیت مطلق کا مالک ہوتا ہے۔ تمام سیاسی اختیارات اُسے حاصل ہوتے ہیں۔ وہ ان اختیارات کے استعمال میں مطلق العنان ہوتا ہے۔ وہ من مانی کارروائی کرتا ہے اور قانون کی بجائے فرمان جاری کرتا ہے۔ اس کا عہدِ آمریت کسی محدود عرصہ کے لئے نہیں ہوتا۔ اور وہ کسی طاقت کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا۔

بعض لوگ آمریت کو جدید نظریہ تصور کرتے ہیں۔ مگر یہ خیال غلط ہے

تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ جمہوریت روما میں آمریت ایک منظور شدہ ادارہ تھا۔ وہاں جب کبھی کسی قومی مصیبت کا سامنا ہوتا تو ایک آمر مقرر کر دیا جاتا۔ جو بحران کا مقابلہ کرتا۔ اُس کا عہدِ آمریت محدود عرصہ کے لئے ہوتا۔ اس مدت کے اختتام پر وہ مستعفی ہو جاتا اور اپنی کارگزاری کی روئداد ایک واضع مجلس عامہ یعنی ایوان اعلیٰ کے سامنے پیش کرتا۔

یونان میں بھی آمر ہوا کرتے تھے۔ مگر انہیں آمر کی بجائے "جابر" کہا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا حاکم ہوتا تھا۔ جو بزورِ شمشیر برسرِ عروج آتا۔ مگر جابر کا مطلب صرف یہی ہوتا تھا۔ کہ اس نے قوت سے اقتدار حاصل کیا ہے۔ اور اسکے معنی یہ نہیں لئے جاتے تھے کہ وہ اپنی طاقت کو جابرانہ طریق پر استعمال کرتا ہے۔ بلکہ ان میں سے بعض بہت خوبیوں کے مالک ہوتے تھے۔ وہ اپنی طاقت کو ملکی بھلائی کے لئے استعمال کرتے۔ بالفاظِ دیگر یونان میں غیر آئینی ذرائع سے مطلق العنان طاقت حاصل کرنے والے کو "جابر" کا خطاب دیا جاتا تھا

موجودہ آمروں اور رومی آمروں میں بہت فرق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ موجودہ آمروں کا برسرِ عروج آنا قوم کی سیاسی و معاشی ضروریات کا نتیجہ ہے۔ لیکن ان کا عہدِ آمریت محدود عرصہ کے لئے نہیں۔ نہ انہیں آئینی ذرائع سے مقرر کیا جاتا ہے۔ اور نہ کوئی شخص ان پر نکتہ چینی کر سکتا ہے۔ اور یہ قدیم آمروں کے برعکس نئے سیاسی تخیلات کی تعلیم دیتے ہیں۔

یونانی جابر اور موجودہ آمر بہت حد تک مشابہ ہیں۔ ان دونوں کے عہدِ حکومت پر مدت کی قید موجود نہیں۔ اور یہ دونوں آئینی ذرائع سے نہیں۔ بلکہ قوت کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی ایک فرق موجود ہے۔ جابر کوئی نیا سیاسی نظریہ پیش نہیں کرتا تھا۔ مگر موجودہ آمر نئے سیاسی خیالات کو قوم کے سامنے پیش کر کے انہیں بزورِ قوت منواتا ہے۔

آمریت کی موجودہ شکل ایک عدیم النظیر سیاسی تجربہ ہے۔ آمری ریاست میں آمر اور اس کی جماعت کے خلاف کوئی جماعت قائم نہیں کی جا سکتی۔ پریس کی سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ سیاسی مخالفوں پر جبر و تشدد کیا جاتا ہے۔ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے ہر قسم کی نکتہ چینی کو کچل دیا جاتا ہے۔ قائد اپنے مطمحِ نظر کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ شہری آزادی مفقود ہوتی ہے۔ قائد یا جماعت کے فیصلہ کے خلاف کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ کسی چیز کے متعلق کسی شخص کو بھی مطلق العنان اختیارات حاصل نہیں حکومت

بیز طلب اور سلب کر سکتی ہے۔ جاسوسوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوتا ہے۔ اور فرد کی زندگی ہمیشہ خطرہ میں ہوتی ہے۔

موجودہ آمریت کا تخیل حاکمیت کے نظریہ کے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ انقلاب فرانس مطلق العنان حاکمیت کو عملی جامہ پہنانے کی پہلی کوشش تھی۔ سرمایہ دار طبقہ، کلیسا، انقلابیوں کی ناتجربہ کاری، بیرونی حملے کے خطرہ اور فرانس کی اقتصادی و معاشری بدحالی نے ملک میں وحشت و دہشت پھیلا دی۔ انقلابی آمریت کی خاطر سیاسی آزادی کو قربان کر دیا گیا۔ فرانسیسی سیاسیات میں قوم پرستی کا تخیل زور پکڑتا گیا۔ عوام ایک مستحکم حکومت کے خواہاں تھے۔ جو اندرونی بدنظمی اور بیرونی خطرات کو رفع کر سکے۔ ان وجوہات کی بنا پر نپولین بوناپارٹ برسر اقتدار آ گیا۔ وہ آمریت کی موجودہ شکل کا اولین علمبردار تھا۔

اسکے عزائم کی بنا پر تمام یورپ اسکے خلاف ہو گیا۔ اور انجام کار اسے ۱۸۱۵ء میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکے زوال کے بعد اشتراکیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے ملک کے کسانوں اور متوسط طبقہ کے لوگوں کے دلوں میں خطرات پیدا کر دئے۔ فاقہ زدہ مزدوروں کی چیخ و پکار نے فرانس ایک دوسرے آمر کے قبضہ میں دیدیا۔ یہ آمر بھی بوناپارٹ خاندان کا ایک رکن تھا۔ اس نے اندرونی امن کو قائم اور بیرونی خطرات کو دور کرنا چاہا۔ مگر مسلسل جنگوں کی بنا پر اُسے بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

نپولین کی ناکامی کے سوا سو سال بعد فرانس میں آمریت کے قیام کی پھر کوشش کی گئی ہے۔ لیکن مارشل پیتاں کی آمریت محض ایک وقتی چیز ہے۔ اور یہ یقین ہے۔ کہ جمہوری ادارے فرانسیسی روایات کا عنصر غالب بن چکے ہیں۔ وہ فرانسیسی جو معمولی معمولی اختلافات پر سیاسی پارٹیاں بنا لیتے ہوں انکا اپنی آزادئ فکر و عمل کو ترک کر دینا ایک ناممکن امر ہے۔ جس طرح نپولین کی ناکامی کے بعد فرانس نے جمہوریت کی طرف رجوع کیا تھا۔ اسی طرح موجودہ جنگ میں اگر آمروں کو شکست ہو گئی تو فرانس میں پھر جمہوریت کا دور دورہ ہو گا۔ پیتاں کی آمریت فرانس کی قومی ضرورت کا اقتضا نہیں۔ بلکہ جرمن فتح کا نتیجہ ہے۔ اور پیتاں فرانس میں محض ہٹلر کا نائب یا وائسرائے ہے۔ اسے صحیح معنوں میں آمر نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ من مانی کاروائی نہیں کر سکتا۔ اسکا کام ہٹلر کے احکام کی تعمیل اور اسکے اشاروں پر ناچنا ہے۔

نپولین کی شکست کے بعد دنیا میں ایک صدی تک جمہوریت کا دور دورہ رہا۔ مگر مغربی دنیا کی سیاسیات پر آمریت کا جدید تخیل گذشتہ بیس سالوں سے نمایاں طور پر اثر انداز ہے۔ جنگ عظیم کے بعد اکثر ممالک میں پارلیمانی نظام کی مخالفت شروع ہو گئی مختلف طبقات نے حصول اقتدار کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ آئینی جمہوریت حالات کا مقابلہ نہ کر سکی۔ یورپ کے جس ملک کو بھی جنگ عظیم نے شدید نقصان پہنچایا وہاں تین گروہوں ـــ یعنی معتدل اشتراکی گروہ، اشتمالی گروہ۔ اور زمینداروں، جاگیرداروں اور ساہوکاروں پر مشتمل گروہ ـــ نے عروج حاصل کرنے کے لئے جد و جہد شروع کر دی۔ اس جد و جہد کی وجہ سے آمریت کی تین اقسام پیدا ہو گئیں۔ پہلی قسم جرمنی میں تیرونگ کی آئینی آمریت تھی۔ جو معتدل اشتراکیوں کے قبضہ میں تھی دوسری قسم لینن کی اشتمالی آمریت تھی۔ اور جہاں اشتراکی و اشتمالی انقلابی تحریکیں قبل از وقت اور ناکام ثابت ہوئیں ـــ مثلاً پولینڈ، فن لینڈ اور ہنگری میں ـــ وہاں آمریت کی تیسری قسم ارتجاعی یا سفید آمریت قائم ہو گئی۔

آمریت کی ایک چوتھی قسم ـــ فسطائی آمریت ـــ بھی پیدا ہو گئی ہے۔ تاحال یہ آمریت باقی آمریتوں سے زیادہ موثر اور طاقتور ثابت ہوئی ہے۔ اسے عالمگیر حیثیت حاصل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جو جو علاقے جرمنی کے زیر نگین آتے جاتے ہیں۔ وہاں یہ آمریت

قائم ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے جمہوریہ فرانس بھی فسطائی آمریت میں تبدیل ہو گئی ہے نیز جرمنی و اطالیہ کی کوششوں سے ہسپانیہ میں بھی فسطائی طرز کی جنرل فرانکو کی آمریت قائم ہو گئی ہے۔ جرمنی اور اطالیہ میں فسطائیت کا خاص مقصد انقلابی تحاریک کی مزاحمت کرنا رہا ہے۔ آئینی جمہوریت اور مارکسیت کے مخالف اسکے حامی بن گئے ہیں۔ جب سرمایہ داروں نے یہ دیکھا کہ نہ معتدل جمہوری ریاست اور نہ آئینی آمریت قومی اتحاد قائم رکھ سکتی ہے اور نہ اُن میں سے کوئی کمیونزم کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ ان دونوں نظاموں کے خلاف ہو گئے۔ اور غیر معتدل و غیر پرولتاری فسطائی آمریت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ فسطائی تحریکات اور ان سرمایہ داروں کا مفاد صرف جارحانہ قوم پرستی ہی سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اس لئے فسطائیت نے سرمایہ دار قومی ریاست کی سرگرم حمایت شروع کر دی۔

فسطائی آمریتوں کے متعلق یہ سوال عموماً کیا جاتا ہے۔ کہ یہ کب تک قائم رہینگی؟ یہ یقین ہے کہ ان آمریتوں نے مخالفت کو مکمل طور پر کچل کے رکھ دیا ہے۔ مدرسہ، مطبع اور ریڈیو سے وہ قوم کے نوجوانوں کو اپنے مقاصد کا علمبردار بنا رہی ہیں۔ اقتصادی بحران یا خوفناک جنگ کے سوا ان آمریتوں کو کوئی چیز ختم نہیں کر سکتی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں پارلیمانی طرز عام ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ملوکیت کو ضرب کاری لگائی۔ بظاہر تو پارلیمانی نظام کو فتح ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء کا انقلاب روس ایک جمہوری مطالبہ پر مبنی تھا کہ حق رائے دہی کو وسیع کر دیا جائے اور پارلیمانی حکومت قائم کی جائے۔ مگر بالشویکوں نے برسر عروج آ کر روسی اسمبلی کو توڑ دیا۔ اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس کی بنیادیں صاف طور پر تشدد و استبداد پر تھیں۔ یہ حکومت بعد میں فردِ واحد کی آمریت میں تبدیل ہو گئی۔ اس انقلاب نے یہ ثابت کر دیا کہ پارلیمانی نظام کی فتح محض ایک واہمہ تھا۔

آمریت کی اساس کے متعلق کچھ کہنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے۔ کہ آیا ہر ریاست کو آمریت کے دور میں سے گذرنا پڑتا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ یونانی عروج کے زمانہ میں سپارٹا اور کارتھیجیا، ازمنہ وسطیٰ کے اطالیہ میں وینس، اور موجودہ زمانہ میں بیشتر ایسی ریاستیں موجود ہیں جہاں صحیح آمریت کبھی بھی قائم نہیں ہوئی۔ برطانیہ کا نام بھی ایسے ہی ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اقتصادی حالات کو آمریت کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آمریت کے قیام کا سب سے بڑا سبب خانہ جنگی ہے بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہی خانہ جنگی طبقاتی جنگ ہے جو عموماً معاشی بنیادوں پر لڑی جاتی ہے۔ لیکن کسی سماج کی اقتصادی تاریخ کے جمہوری دور میں ایسے جھگڑوں کا ہونا کوئی ضروری امر نہیں۔ اور اگر یہ طبقاتی جھگڑے پیدا بھی ہو جائیں۔ تو بعض اوقات بغیر کسی آمریت کے قیام کے یہ ختم ہو جاتے ہیں۔

آمریت ہر جگہ اور ہر وقت خانہ جنگی اور بیرونی خطرات کی وجہ سے قائم ہوتی ہے۔ جب حکومت کمزور ہو جائے یا لاحکومتیت و لامرکزیت پیدا ہو جائے۔ خانہ جنگی کی بنا پر ملک میں وحشت پھیل جائے اور بیرونی حملہ کا خطرہ ہو تو ایسے حالات میں عوام ایک مستحکم حکومت چاہتے ہیں اور اس وقت حکومت کے اقتدار کی حمایت میں کوئی نپولین، مسولینی یا ہٹلر قوم میں نمودار ہو جایا کرتا ہے۔

یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ خانہ جنگی اور بیرونی خطرات روس، جرمنی اور اطالیہ کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مگر اُن ممالک میں آمریت قائم نہیں ہوئی۔ اور ان تینوں ممالک میں آمریت کا قیام عمل میں آ گیا ہے۔ اس تفاوت کا کیا سبب ہے
اس سوال کا جواب اس امر میں مضمر ہے کہ آمریت زیادہ تر اُن ممالک میں قائم ہوتی ہے جہاں کے آئین آشوب کے وقت کسی مضبوط شخصی حکومت کے عارضی قیام کی اجازت نہیں دیتے۔ انگلستان کے کابینی نظام اور امریکہ کے صدارتی نظام میں یہ شرط موجود ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان دونوں ممالک میں آمریت قائم نہیں ہو سکی۔ مگر جرمنی کے ویمر آئین میں کوئی ایسی شرط موجود نہ تھی۔ اسلئے وہاں آمریت کا قیام ناگزیر ہو گیا تھا۔ یہی حالت اطالیہ اور روس کی تھی۔

علاوہ ازیں روس، اطالیہ اور جرمنی میں کبھی بھی پارلیمانی نظام گہری بنیادوں پر استوار نہیں کیا گیا۔ ان ممالک کے عوام بجائے خود حکومت کرنے کے حکومت کئے جانے کے عادی ہیں۔ روس میں پہلی پارلیمان سنہ ۱۹۰۶ء میں منعقد ہوئی۔ اطالیہ اور جرمنی انیسویں صدی کے نصفِ آخر کے آغاز تک صرف چھوٹی چھوٹی ملوکیتوں کے مجموعے تھے۔ اور ان میں جمہوری ادارے اور رواج موجود نہ تھے

ان ممالک میں آمریت کا قیام قومی ضروریات کا نتیجہ ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے تقریباً ہر ملک میں اقتصادی انتشار پیدا ہو گیا۔ انگلستان کے کابینی نظام کی بنا پر وہاں قومی وزارت ان حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے بن گئی۔ امریکہ میں صدر روزویلٹ نے ان حالات کا مقابلہ کیا۔ مگر جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے روس، اطالیہ اور جرمنی کے آئینوں میں ایسی کوئی دفعات تجاویز موجود نہ تھیں۔ اسلئے ان میں آمریت کا قیام ضروری ہو گیا تھا۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد ہر ملک میں قومیت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اطالیہ اور جرمنی کی توقعات اس جنگ میں پوری نہ ہوئیں اسلئے ان کی قوم پرستی جارحانہ حد تک پہنچ گئی۔ اور آمریت ان ممالک میں اسی جارحانہ قوم پرستی کا نتیجہ ہے۔

موجودہ آمر نازیت، فسطائیت اور بالشویت کی تعلیم دیتے ہیں۔ بالشویت اگرچہ نازیت اور فسطائیت سے مختلف ہے۔ مگر یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ نازیت اور فسطائیت میں فرد واحد حکمران ہے اور بالشویت میں ایک جماعت۔ فسطائی اور نازی آمریت بھی ایک جماعت کی آمریت ہے۔ جس پر ایک شخص غالب اثر رکھتا ہے جس طرح کہ بالشویک آمریت پر لینن کا نمایاں اثر تھا اسلئے آمریت کی ان تینوں اقسام کو بنیادی طور پر مترادف سمجھنا چاہیئے۔ ان میں اساسی فرق موجود نہیں بلکہ فروعی اختلافات ہیں۔

ان تینوں آمریتوں کی بنا تشدد پر ہے۔ ایک شخص یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں تو تشدد کو بُرا خیال کیا جاتا ہے مگر قومی معاملات میں بجائے ترغیب و تلقین کے تشدد ہی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور اسکے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ بیسویں صدی میں جبکہ تہذیب و تمدن انتہائی عروج پر پہنچ چکے ہیں تو آمری ممالک دورِ جاہلیہ کی طرف کیوں رجوع ہو رہے ہیں۔

اس سوال کا جواب صرف ایک ہے۔ کہ یہ تینوں ممالک اپنی عمر کے لحاظ سے کمسن ہیں۔ پطرس اعظم سے قبل روس ایک پسماندہ ملک تھا جرمنی بھی تھوڑا سا عرصہ ہوا کہ ایک متحدہ سلطنت بنی ہے یہ سچ ہے کہ زمانہ قدیم میں سلطنتِ روما کی حیثیت عالمگیر تھی۔ مگر پندرھویں صدی میں اسکا زوال شروع ہو گیا۔ ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ اطالیہ کے حصے بخرے ہو گئے۔ اور

سوائے ایک ریاست کے تمام ملک پر غیر ملکی قابض ہو گئے۔ اور یہ صرف دو پشت ہی کی بات ہے۔ کہ اطالیہ ایک متحدہ سلطنت بنی ہے۔

جرمنی اور روس معاشی طور پر بھی زرعی ہیں۔ شمالی یورپ میں صدیوں تک کھیتی باڑی کا کام کمیرے کیا کرتے تھے۔ انگلستان میں یہ رواج پندرھویں صدی میں اور فرانس میں ۱۷۸۹ء میں ختم ہو گیا۔ مگر روس میں گذشتہ صدی کے نصفِ اول کے آخر تک کمیرے عام تھے۔ جرمن تاریخ کے رکنِ اعظم پروشیا میں اگرچہ ۱۸۰۷ء میں کمیروں کا رکھنا قانونی طور پر ممنوع قرار دیا گیا۔ مگر جنگِ عظیم تک کاشت کے اس پرانے طریق میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور زمینداری طریق بدستور رائج رہا۔

کسی ملک کو جدید تہذیب میں رنگے ہوئے دیکھ کر اسے ترقی یافتہ سمجھنا غلطی ہے۔ تہذیب اور تمدن مترادف اشیا نہیں۔ تہذیب سیاسیات، اقتصادیات اور صنعت و حرفت پر مشتمل ہے اور علم، ادب، مذہب اور اخلاق کا نام تمدن ہے۔ تہذیب یہ بتاتی ہے۔ کہ ہم کیا استعمال کرتے ہیں اور تمدن یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ ہماری کیفیت کیسی ہے۔ کسی دوسرے ملک کی تہذیب کی تقلید کی جا سکتی ہے۔ مگر تمدن کسی غیر کا اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

کسی ملک کے حالات کا اندازہ لگانے کے لئے اُسکے تمدن کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ تہذیب اور تمدن کے متذکرہ بالا اختلاف کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر ان تینوں آمری ممالک کا جائزہ لیا جائے۔ تو یہ ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ آمریت کے قیام سے کچھ عرصہ قبل یہ ممالک تمدن کی دوڑ میں بہت پیچھے تھے۔ روس تو ابھی تک مکمل تمدنی ترقی نہیں کر سکا۔ جرمنی اور اطالیہ اگرچہ اب جدید تہذیب میں رنگے ہوئے ہیں۔ مگر تمدنی دوڑ میں یہ انگلستان یا کسی دوسرے جمہوری ملک کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ سچ ہے۔ کہ ازمنۂ قدیم میں اطالیہ کا تمدن عدیم النظیر تھا اور اطالوی علم و ادب کا آفتاب تمام دنیا کو خیرہ کر رہا تھا۔ مگر پندرھویں صدی میں اسکے سیاسی زوال کے ساتھ ہی اسکا تمدنی زوال بھی شروع ہو گیا۔ عوام اپنے مایۂ ناز و دیرینہ تمدن سے بالکل بیگانہ ہو گئے۔ اس لئے تمدنی لحاظ سے یہ تینوں ممالک ابھی تک بچے ہیں جس طرح بچہ دوسرے سے اپنی بات منوانے کے لئے اُسے مارتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے باپ دادا کی داڑھی پر بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح کمسن جرمنی، اطالیہ اور روس کے باشندے اپنی بات منوانے کے لئے زد و کوب سے کام لیتے ہیں اور اُنکے آمر کسی قسم کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر جوں جوں ان اقوام کی عمر زیادہ ہوتی جائے گی۔ توں توں انکو تجربہ حاصل ہوتا جائیگا۔ اور ایک وقت آئیگا کہ انگلستان اور امریکہ کے حکام کی طرح یہ جبر و تشدد پر ترغیب و تلقین اور رضامندی کو ترجیح دینگے۔

بعض لوگ امریکہ پریذیڈنٹ تھیوڈور روزویلٹ کے عہدِ حکومت کو آمریت قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ تھیوڈور روزویلٹ پر آمریت کی جدید تعریف پوری نہیں اترتی۔ وہ غیر آئینی ذرائع سے برسرِ اقتدار نہیں آیا تھا۔ اس نے بزورِ شمشیر طاقت حاصل نہیں کی تھی۔ بلکہ رائے عامہ نے اُسے چُنا تھا۔ اس نے جبر و تشدد سے یا اپنے جماعتی رضاکاروں کے زور پر حکومت نہیں کی۔ عوام اُسکے طریقِ حکومت کو پسند کرتے تھے۔ وہ مطلق العنان نہیں تھا۔ بلکہ اپنے عہدِ حکومت کے اختتام پر عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا۔ اسکا عہدِ حکومت غیر محدود نہ تھا بلکہ وہ صرف چار سال کے لئے منتخب ہو سکتا تھا۔ امریکہ میں سیاسی مخالفوں کو مصائب و آلام میں مبتلا نہیں کیا جاتا۔ امریکی صدر خود بخود اعلانِ جنگ نہیں کر سکتا بلکہ اُسے ایوانِ اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنا ضروری

ہے۔ امریکی پارلیمان اس کی تجاویز کو مسترد کر سکتی ہے۔ اسلئے روزویلٹ کو موجودہ طرز کا آمر نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اسے رومی آمر کا صحیح نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

بعض حضرات ترکیہ جدید کے نظامِ حکومت کو بھی آمری کہتے ہیں۔ مگر یہ بھی سراسر غلط ہے۔ ترکیہ کا نظامِ حکومت واضح طور پر جمہوری ہے۔ آئین کی رو سے قومی حاکمیت کی واحد مالک صرف قومی اسمبلی ہے۔ وہ اپنے قانون سازی کے اختیارات بلاواسطہ استعمال کرتی ہے اور انتظامی اختیارات وہ ایک صدرِ جمہوریہ اور ایک ذمہ دار کابینہ کے ذریعے استعمال کرتی ہے۔ عدالتی فرائض عدالتیں اسمبلی کے نام پر سرانجام دیتی ہیں۔ عدالتوں کے نظامِ کار میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی۔ اراکینِ اسمبلی ہر چار سال کے بعد ہمہ گیر حقِ رائے دہی کے ذریعے چنے جاتے ہیں وہ اپنی میعادِ رکنیت کے دوران میں کوئی سرکاری یا فوجی ملازمت نہیں کر سکتے۔ اسمبلی اپنے اراکین میں سے صدرِ جمہوریہ چنتی ہے۔ جو اسمبلی کی میعاد تک صدارت کرتا ہے مگر بحث میں حصہ لے سکتا ہے اور ووٹ دے سکتا ہے۔ پارلیمان کو وہ برخاست نہیں کر سکتا بلکہ پارلیمان اپنے آپ کو خود برخاست کرتی ہے۔ صدر پارلیمانی تجاویز کو صرف ملتوی کر سکتا ہے مسترد نہیں کر سکتا۔ وہ ایک تجویز کو صرف نظرِ ثانی کے لئے واپس بھیج سکتا ہے۔ لیکن پارلیمان کی اکثریت کی منظوری ایک تجویز کو قانون کی شکل دے دیتی ہے۔ آئینی ترامیم اور مالیاتی تجاویز پر صدر یا انتظامیہ کا کچھ اختیار نہیں۔ وزیر اعظم اور وزیرِ متعلقہ کے دستخطوں سے صدرِ جمہوریہ احکام جاری کر سکتا ہے۔ وزیر اعظم اور وزراء اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ صدرِ جمہوریہ فوج کا کمانڈر اعلیٰ نہیں۔ صدر وزیر اعظم کو چنتا ہے اور موخر الذکر کی منظوری سے باقی اراکین کابینہ مقرر کرتا ہے۔ اعلیٰ ترین عہدوں کے تقرر کے لئے اسمبلی کی منظوری ضروری ہے۔ تمام اراکین کابینہ کے لئے ایوانِ نمائندگان کا ممبر ہونا لازمی ہے۔ اور وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اسمبلی کے سامنے ذمہ دار ہیں۔ اسمبلی کونسل آف سٹیٹ کے ممبر چنتی ہے۔ کونسل آف سٹیٹ قانون سازی اور قانون پر عملدرآمد کرانے کے لئے حکومت کو مشورے اور امداد دیتی ہے۔ یہ انتظامی عدالت کا کام بھی کرتی ہے۔ اور اسکے فیصلوں کے خلاف اسمبلی کے سامنے مرافعہ دائر کیا جا سکتا ہے ان حالات میں ترکیہ جدید کو آمریت قرار دینا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اسلامی امارت کا تخیل آمریت کے مترادف ہے۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ اسلامی امارت کو آمریت سے کوئی علاقہ نہیں۔ بلکہ یہ تو جمہوریت کی ایک اعلیٰ ترین اور بے عیب قسم ہے۔ اگر زیادہ کھینچ تان کی جائے تو اسے جمہوریت و آمریت کا خوشگوار امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ خلفائے راشدہ کو تو عورتیں بھی خطبہ کے دوران میں بلا خوف وخطر ٹوک دیا کرتی تھیں۔ لیکن آمر کے خلاف رعایا کے کسی فرد یا جماعت کا ہلکی سی بھی نکتہ چینی کرنا اس فرد اور جماعت کا اپنی زندگی کو معرضِ خطر میں ڈالنا ہے۔

روس کے بعد ایشیا کا ایک اور ملک — جاپان — بھی آمریت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جاپان کے لوگ جمہوری اداروں سے خائف و متنفر ہیں۔ وہ خود کو دیوتاؤں کی اولاد سمجھتے ہیں۔ اور اپنے بادشاہ کو ایک دیوتا اور خدا کا بلاواسطہ وارث تصور کرتے ہیں لیکن اسکی بادشاہت دن بدن برائے نام ہوتی ہے۔ حقیقی طاقت پر چند فوجی جرنیل قابض ہو چکے ہیں۔ ان جرنیلوں نے ملک کو جنگِ چین میں دھکیل رکھا ہے۔ چنانچہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ جاپان جو جرمنی اور اطالیہ کا حلیف اور مقلد ہے۔ آمریت کے قیام کے سلسلہ میں بھی ان دونوں کی پیروی کریگا۔

آمریت پر بحث کرتے ہوئے سب سے اہم سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آمری نظام مستقل ہوتا ہے یا عارضی؟

آمریت کی بنیادیں قائد کی اطاعت اور جبر و تشدد پر استوار ہوتی ہیں۔ جبر اور قیادت کا اجتماع عارضی طور پر تو کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن متذکرہ بالا اہم سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے۔ کہ جب کسی ملک میں آمریت قائم ہو جاتی ہے۔ تو اسکا اثر قوم کی سیاسی زندگی پر کیا ہوتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جب جوش و خروش کم ہو جاتا ہے تو عوام کو سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ ان کی امیدوں کا خون ہو جاتا ہے اور وہ حکومت پر نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔ قیام آمریت کے پندرہ بیس سال بعد آمریت سے قبل کے نظریات مٹ جاتے ہیں۔ وہ نوجوان جنہوں نے قائد کی رہنمائی میں فتح حاصل کی تھی۔ وہ اسوقت تک یا تو مر چکے ہوتے ہیں اور یا اپنی عمر کے وسطی حصہ میں ہوتے ہیں۔ اور ان کی خواہش صرف یہی رہ جاتی ہے۔ کہ ان کی خدمات کے صلہ میں انہیں جو عہدے ملے ہیں۔ وہ ان پر قابض رہیں۔ مگر قوم میں نوجوانوں کی نئی نسل پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ جب یہ نوجوان یہ دیکھتے ہیں۔ کہ سرکاری ملازمتیں صرف سیاسی احباب کو ملتی ہیں اور اہم عہدوں پر وہ اصحاب قابض ہیں۔ جو قائد کے برسر اقتدار آنے پر اپنی نوجوانی کے زمانہ میں ان عہدوں پر مامور ہوئے تھے۔ تو یہ آمر اور اسکی جماعت سے نفرت شروع کر دیتے ہیں۔

جب آمریت کو ان حالات کا مقابلہ کرنا پڑے۔ تو اسکا باقی رہنا ایک اتفاقی امر بنجاتا ہے۔ تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہے۔ کہ جبر اور قیادت پر کسی مستقل نظام حکومت کی بنیادیں استوار نہیں کی جاسکتیں۔ ازمنہ ماضیہ میں آمریت عموماً آمر کی موت کے بعد قائم نہیں رہتی تھی۔ کسی جنگ میں آمر کا شکست کھانا اسکے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے اور اگر اسکی خارجہ حکمت عملی جارحانہ ہو تو باقی ممالک اسکے استیصال پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اسکا وجود مستقل بین الاقوامی خطرہ بنجاتا ہے۔ انہی حالات کا نپولین اول کو مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ اور انہی حالات سے اب ہٹلر اور مسولینی دوچار ہیں۔

خواہ اندرونی خانہ جنگی یا بیرونی حملہ کسی ملک کی آمریت کو ختم کرے یہ امر واقعہ ہے کہ ارسطو کے قول کے مطابق آمریت کی عمر حکومت کے دیگر تمام نظاموں سے کم ہوتی ہے آمریت کا قیام رضامندی و قانون کی بجائے ہمیشہ آمر کی فتح اور اس کی خوش قسمتی پر مبنی ہوتا ہے۔ آئینی طور پر بنی ہوئی حکومت بہت سی غلطیاں کرنے کے بعد بھی باقی رہ سکتی ہے مگر آمریت کی حالت اسکے بالکل برعکس ہے۔

یہ سوال توجہ طلب ہے کہ آمریت کے زوال کے بعد کیا وقوع پذیر ہوتا ہے؟ اطالیہ اور یونان کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب تک وہ حالات باقی رہیں جنکی بنا پر آمریت کا قیام لابدی ہو گیا تھا اسوقت تک بغاوت اور آمریت یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ اور جہاں انیسویں صدی کے فرانس کی طرح قوم میں سیاسی استحکام پیدا ہو گیا ہو۔ وہاں بغاوت اور آمریت کے اس سلسلہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور ایک نیا نظام حکومت قائم ہو جاتا ہے۔

گرہن

از

راجندر سنگھ بیدی۔

افسانوں کا دوسرا مجموعہ جس میں ذیل کے افسانے شامل ہیں

گرہن	غلامی	آقا	ایوالانش
جب میں چھوٹا تھا	گھر میں بازار میں	پندار	زین العابدین
ٹڈیاں اور پھول	منگی	تیسرے درجے کی محبت	دوسرا کنارہ
آؤ	سرکار بنام نوڑا	کلو کے سبب	نسیم تری انسیم سحری۔

امدر ممتاز بناء و نگاہ میں حسینان جہاں کو، وغیرہ زیر اشاعت ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شکیلہ اختر

لوکٹ

اُس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے لیٹے لیٹے اپنے گلے کا لوکٹ اوپر کیا۔ چوڑیاں جھنجھنا کر اُس کی کہنیوں تک پہنچ گئیں وہ تکیوں کے سہارے خاموش لوکٹ کو دیکھتی ہوئی سوچنے لگی۔ "جب یہ پہلے دن میرے گلے میں پڑا تھا۔ تو یہ بیچارہ کیا جانتا ہوگا۔ کہ ہم کبھی ان ہڈیوں پر بھی اس طرح ڈھلکتے رہیں گے؟"

اُس کے سپید لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم آیا۔ اور وہ اپنے دل میں بولی۔ "کسی بڑے پیر کی تعویذ کی طرح یہ لاکٹ کبھی میرے دل کے پاس سے جدا نہیں ہوا۔" پھر وہ لوکٹ کو تکتی ہوئی ہنس دی۔ جیسے کسی کو چڑا رہی ہو۔ "تم بھی تو ایک پہنچے ہوئے ملا ہی ٹھہرے!"

اُس کے خیالات پرواز کرنے لگے آج سے دو سال قبل جب اُسے ٹائیفائیڈ ہوا تھا۔ تو وہ مسلسل پانچ روز تک بیہوش رہی تھی۔ اور جب اُسے ہوش آیا تو وہ اپنا برہنہ بازو ڈاکٹر زیدی کے ہاتھوں میں دیکھ کر ترسا سی گئی تھی۔ اچانک اُس نے اپنے بائیں طرف ایسے دیکھا جیسے اس وقت بھی ڈاکٹر زیدی وہاں سر جھکائے بیٹھا ہو۔ ہار کا مہین چین اُس کی انگلی میں الجھا ہوا تھا۔ اور لوکٹ ایک بیمار دل کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ وہ اپنی بند آنکھوں پر ہاتھ رکھے سوچ رہی تھی — دوسرے دن ڈاکٹر زیدی اُسے کتنی دیر تک سمجھاتا رہا تھا۔ آخر اُسے تھا کیا؟ اُسکے تو بیسیوں مریض پڑے کراہتے رہتے تھے۔ اور ایک دن جب وہ اپنے مریضوں کا چارٹ دیکھتے دیکھتے تھک کر میری کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا نرس نے اُسے کتنی بار پکارا تھا۔ اور آخر تنگ آ کر وہ اُس کے کندھے کو ہلا کر بولی "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر؟ یہ تم کھوئے سے کیوں رہتے ہو؟" وہ ہنس کر بولا تھا "چونکہ ان دنوں آپ کے جلوے بڑے بیتاب ہیں۔ اسی لئے تو بیہوش سا رہتا ہوں"۔

جانے کیوں ڈاکٹر کی یہ باتیں سن کر میں نے بڑی تکلیف محسوس کی تھی۔ اُس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھول لیں کمرے میں پہلے کی طرح خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کو بند کر کے پھر سوچنے لگی — اور ایک بار — جب کہ میری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی تو زیدی بیچارہ ساری رات جاگتا رہ گیا تھا۔ میرے قریب ہی وہ دریچہ پر بیٹھا ہوا چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اور میں اپنی جلتی ہوئی پیاسی آنکھوں سے اُسے تک رہی تھی اور — پھر اُسکے بعد وہ جو اپنے کاموں سے گھبرا گھبرا کر میرے پاس بھاگ آتا تھا — کام بھی تو بے حد تھے۔ سب ہی ڈاکٹر بھاگتے ہونگے۔ لیکن مجھے بھی اُس کا کتنا انتظار رہتا تھا جب وہ میرے پاس سے چلا جاتا۔ تو میں اپنے ہر طرف کیسی بھیانک تاریکی محسوس کرنے لگتی تھی اور پھر ہسپتال کی دم توڑتی ہوئی سسکیاں — میرا گلا کیسا گھٹنے لگتا تھا۔ فقط اس کی مسکراہٹیں تھیں۔ جن سے میرا کیبن روشن ہو جاتا تھا۔

اور ایک دن جب وہ مجھے دلچسپ لطیفے سنا رہا تھا میں کتنا ہنس رہی تھی — جانے کہاں سے مجھے دیکھنے کے شوق میں آپا آ گئیں بیچ میں بول اٹھیں۔ "اپنی مریضہ کو اسی

طرح ہنساتے ہوئے جلد اچھا کر دیجئے۔ تاکہ انہیں دلہن
بنا لاتے"

"ابھی ان کی شادی؟" — زیدی بوکھلا کر بولا۔ عقد
پہلے ہو چکا ہے۔ وہ لوگ تو زمانے سے شور مچا رہے ہیں"

تیاری یہ باتیں سنکر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری بہت
بڑی لغزش کا اعلان زیدی کے سامنے کر دیا گیا ہو —
اس دن سے پہلے میں ان باتوں سے کتنا خوش ہوا کرتی تھی
مگر اس دن . . . .

اُس دن تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پگھلتا ہوا
سیسہ کسی نے میری روح پر ڈال دیا ہو۔ میں اپنی
آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ زیدی نے آہستہ
سے پوچھا تھا "سو رہی ہیں آپ"؟ "نہیں تو" میں نے اپنی
آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

پھر اُسکے بعد وہی خدمت، وہی خلوص، اور وہی ہمدردی
مجھے کتنا جلدی اچھا کر رہی تھی — ڈاکٹر پال نے مجھے
چلنے کو کہا تھا۔ اب سے پہلی بار مجھے نرس لیلی نے چلایا تھا
زیدی مجھے بار بار سہارا دے رہا تھا۔ میں خاموش تھی۔ میرے
پیر کانپ رہے تھے نرس لیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھے میں
آہستہ آہستہ چل رہی تھی میرا دماغ ڈاکٹر کے سنٹ کی تیز
بو سے معطر ہو رہا تھا۔ میرے دل میں ایک نغمہ گونج رہا تھا
اور میری روح اس خوشبو سے لپک کر ایک پُر سرور رقص
کر رہی تھی"

"اور پھر — ایک دن" وہ اُسی طرح اپنی آنکھوں کو
بند کئے ہنس دی "وہ جو میں نے زیدی کے ہاتھ میں بلا ڈھونڈے
گرم گرم پٹی چپکا دی تھی تو وہ کتنا اچھلا تھا آہ! کتنے
حسین دن اور کتنی پیاری راتیں تھیں وہ!

"الماس تم نے ابھی تک دوا نہیں پی ہے؟"

"نہیں ٹھہر کر پلانا۔ بڑی اچھی نیند آ رہی ہے"

"اور ڈاکٹر صاحب جو آ رہے ہیں انجکشن دینے؟"

اُونہہ ڈاکٹر صاحب! اُس نے چڑھ کر نفرت سے کہا۔
"جیسے بہترین علاج ہی تو کر رہے ہیں کہ بس چٹ بیٹھی ہو
ایک دم پٹ ذرا نبض ہی تو کہنا "انہیں آنا ہے" وہ
اپنے دل میں چڑچڑا کر بولی۔ "آہ ڈاکٹر زیدی" — اور وہ
پھر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سوچ میں غرق ہو گئی۔

" ایک دن جب کافی رات گئے وہ چپکے سے
پاؤں دبا دبا کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ تو اُسے نہ
جانے کیا خیال آیا۔ وہ خاموشی سے میرے پاس آکر کہنے لگا
"اچھا جاگ رہی ہیں آپ؟ میں سمجھا سو چکی ہونگی۔ اور یہ
کھانا؟ کیا آپ نے صبح سے سچ مچ برت رکھنے کا ارادہ کر لیا
ہے؟" وہ ایک طرف بھرا ہوا طشت دیکھ کر بولا۔ میں اپنی مریض
کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ سمجھیں؟

اچھا تو یہ نارنگی کا شربت ہی پی لیجئے! وہ بمشکل
نارنگیوں کو نچوڑتے ہوئے بولا۔ اسکے بعد وہ اپنے جوتے
کی آواز چھپاتا آہستہ آہستہ چل کر پگھلتی ہوئی برف کو
مشکلوں سے تھامے ہوئے بوکھلایا ہوا اپنا رومال ڈھونڈنے
لگا تو میں بے اختیار ہنس پڑی۔

پھر اُسکے بعد — وہ جیسے اپنے کو یاد کرتے ہوئے
سوچنے لگی "وہ جو میرے قریب ایک مریضہ کی حالت خراب
ہو گئی تھی۔ اسکے عزیز گھبرا گھبرا کر میرے کیبن میں آکر زیدی
کو ڈھونڈ رہے تھے۔ آخر میں اٹھی۔ چپکے سے قریب
ہی زیدی کے کمرے میں گئی۔ وہ اپنے بستر پر خاموش لیٹا
ہوا لیمپ کی روشنی سے کھیل رہا تھا — "کیسے ڈاکٹر ہو تم؟"
— میں کچھ دیر کے بعد بول اٹھی۔

"کون — تم — الماس؟" — وہ گھبرا کر بولا۔

"تمہاری ایک مریضہ دم توڑ رہی ہے۔ اور تم کتنے اچھے ڈاکٹر ہو۔ جو یہاں بجلی کی شعاعوں سے روشنی اور اندھیرے کا کھیل کھیل رہے ہو۔۔۔ میں نے اُسے چھیڑتے ہوئے بے تکلف لہجے میں کہا تھا!

"میں بیچاری کے لئے اب کچھ نہیں کرسکتا ہوں الماس! اور کسی کو مرتے ہوئے بھی تو نہیں دیکھا جاتا۔ وہ پتھرائی ہوئی مایوس آنکھیں آخری بار۔ ایک ڈاکٹر سے اپنی زندگی کی ملتجی ہوں گی!"

"لیکن نہیں جینا ہوگا زیدی اسے عزیز تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں"۔

وہ آیا لیکن مریضہ مر چکی تھی۔ میں نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا "تمہیں کون ڈاکٹر کہتا ہے زیدی؟"

میں بھی تو اب یہی سوچتا ہوں الماس۔ کہ ڈاکٹر کی جگہ میں خود ہی ایک قابل رحم مریض ہوں"۔۔ اُسکے بعد میں ساری رات یہی سوچتی رہ گئی تھی۔ کیا ڈاکٹر بھی ایک مریض ہے۔ ایک قابل رحم مریض۔

میرے گھر جانے کے دن جیسے جیسے نزدیک ہو رہے تھے۔ زیدی کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ ایک دن جب میں بری طرح شام تک سوتی رہی تھی۔ یکایک میں زیدی کی آواز سے چونک پڑی۔ میں نے اُس سے شکایتاً کہا تھا "کتنا اچھا سا خواب دیکھ رہی تھی تم نے جگا دیا"۔ وہ سادگی سے بولا الماس زندگی کے بعض لمحے بھی تو حسین اور دلفریب خواب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ہم نیند سے بڑھی ہوئی بیہوشی میں اُسے ہمیشہ دیکھتے ہی رہنا چاہتے ہیں۔ مگر خواب۔ پھر خواب ہی ہے نا۔ اور اُس کی تعبیر کتنی تلخ ہوتی ہے"

ڈاکٹر یال کے جانے کے بعد زیدی مجھے کتنی دیر تک سمجھاتا رہا "دل کا خیال رکھنا"۔ یہ بیچارہ بیمار ہوگیا ہے وہ ڈرتا مت۔ زیادہ تر لیٹی رہنا"۔ ٹائیفائیڈ نے اپنی ایک یادگار چھوڑ دی ہے۔ سمجھیں؟ تمہارا دل اپنا راستہ کھو کر زر زیادہ مضطرب ہوگیا ہے"۔ آہ!۔۔۔ الماس نے میز پر رکھی ہوئی زیدی کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نہیں۔ یہ کیسے کہہ دیتی کہ میرا دل اپنی رفتار کیوں بھول گیا ہے"۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ کمرے میں پہلے کی طرح ایک گہرا سکوت چھایا تھا۔ وہ آنکھوں کو بند کرکے پھر سوچنے لگی۔ چلتے وقت میں نے زیدی سے کہا تھا "مجھے بھول گئے تو نہیں"؟ اُس کے آخری الفاظ میں کتنی مایوسی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ایسے بول رہا تھا جیسے کسی بہت بڑے طوفان کو بمشکل روک رہا ہو۔

اُس کے بعد ایک طویل اور خاموش لیکن پر اضطراب زمانہ! میری شادی، اور پھر یہ دل کی بیماری۔ دعوتی کارڈ زیدی کو بھی گیا تھا۔ لیکن ٹھیک شادی کے روز اُس کا ایک پارسل ملا۔ دل کی شکل کا یہ نایاب تحفہ"۔ الماس نے لوکٹ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا اور لوکٹ پہ جڑا ہوا یہ چور چور شیشہ۔ جبھی تو اُسے پہنے رہتی ہوں۔ ایک دل شکستہ کو شکستہ دل کے قریب۔ لیکن یہ لوکٹ! میں نے اسے ابھی تک کیوں نہ کھولا تھا وہ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی بولی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اُسے کھولنے کی کوشش کی۔ مگر ناکامیاب رہی۔ آخر وہ اُسے دانتوں سے آہستہ آہستہ دبا کر کھولنے لگی۔ لیکن پہلے ہی جیسی مایوسی۔۔۔ اتنی سی محنت میں وہ پسینہ سے تر ہو گئی۔ اُس نے لوکٹ کو ہاتھ میں لے کر پھر سے دیکھا۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا۔ شاید اس میں کچھ ہو۔۔۔ اُس نے آخری بار کوشش کی۔ مگر اُس کے سینے پر لوکٹ کے شکستہ شیشے بیکسانہ طور پر گر پڑے۔ اور ٹوٹے ہوئے شیشے منتشر ہو

گئے؟ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ایک ہلکا سا تبسم اُسکے مرتعش لبوں پہ آیا ۔

وہ لوکٹ کا شکستہ شیشہ اپنی مٹھی میں لئے نحیف بازوؤں سے اپنے تڑپتے ہوئے دل کو بھینچ رہی تھی ۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا ۔ وہ پسینے سے تر ہو رہی تھی ۔ اُس نے ذرا رُک کے کہا "پانی"، اور پھر وہ ۔ بے چینی اور اضطراب میں ایک تکیہ کے سہارے کروٹ لے کر خاموش ہو گئی ۔

"الماس" اٹھو ڈاکٹر صاحب آگئے ۔ اٹھو!"

"الماس"

مگر اُس کے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی ۔ اور اُسکے قریب ہی لوکٹ کے شکستہ شیشے پڑے ہوئے تھے

———

صبر کر!

انور خاں انورؔ

صبر کر اے دلِ ناشاد ذرا صبر تو کر!
گر تجھے اُن سے محبت ہے تو کیا اس کا علاج؛
اُن کے دیدار کی حسرت ہے تو کیا اس کا علاج؛
تو مچلتا ہے اُنہیں دیکھ کے سچ ہے لیکن
بے رُخی اُن کی عنایت ہے تو کیا اس کا علاج؛
حُسن خود دیگا تجھے داد ذرا صبر تو کر!
صبر کر اے دلِ ناشاد ذرا صبر تو کر!
حُسن کو مائلِ بیداد و جفا ہونے دے
بُت کو اُلفت کے بھروسے پہ خدا ہونے دے
وقت آئے گا کہ ہر بات بدل جائے گی
اِک مری آہ کو کچھ اور رسا ہونے دے
دیکھ اے خانماں برباد ذرا صبر تو کر!
صبر کر اے دلِ ناشاد ذرا صبر تو کر!

تیری راتوں کی دعائیں نہیں بیکار اے دل
اور ہونے دے ابھی درد کو بیدار اے دل
کوئی کیا جانے کہ ہے تجھ کو محبت اُن سے
اُن کو کیا تیری محبت سے سروکار اے دل
غم نہ کھا او ستم ایجاد ذرا صبر تو کر!
صبر کر اے دلِ ناشاد ذرا صبر تو کر!
خام ہے تو ترا احساسِ وفا بے معنی
ترے آنسو تو ہیں تجھ سے بھی سوا بے معنی
تجھ کو معلوم نہیں آتشِ غم ہے راحت
آتشِ غم کہیں ہوتی ہے بھلا بے معنی؟
غم کرے گا تری امداد ذرا صبر تو کر!
صبر کر اے دلِ ناشاد ذرا صبر تو کر!

دو غزلیں

سلیمان ادیب

عنایت تری میں نے جب تجھ سے چاہی
بڑھی اور شامِ الم کی سیاہی!
ترا حسن رہبر، مرا عشق راہی
تو تعمیر، تکبیر میں یکسر تباہی
ترا حسن قائم، مرا عشق دائم
مہ و مہر کچھ ہیں نہ یہ مرغ و ماہی
میں محکوم دل کا، خرد تیری حاکم
یہ تو ہی بتا کس کی ہے کم نگاہی
صدائے جرس جس کو سمجھا ہے تو نے
وہ ہے اِک مرا نالۂ صبحگاہی
مری ہر ادا ہے کسی کا اشارہ
رہے جبر کی اے خدا بادشاہی
جدا ہو کے میں تجھ سے ہوں شاد کتنا
مرے اشکِ غم دے رہے ہیں گواہی
گناہ ہی حقیقت، گناہ ہی فسانہ
مرے کام آئے گی کیا بے گناہی
وہی ہیں ادیب اور وہی انکی وحشت
وہی ان کی باتیں ہیں واہی تباہی!

میکش اکبرآبادی

نہ مل اگر نہیں ملتا ہے جستجو لے لے
نہ دے جو کچھ نہیں دیتا ہے آرزو دے دے
ذرا سرک کے چلا آ نگاہ کے آگے
سنبھال قرب کو اپنے رگِ گلو لے لے
اگر مری ہے یہ ہستی تو اختیار بھی دے
نہیں تو خیر سے ہستی بھی اپنی تو لے لے
تجھے جنونِ محبت تو دے نہیں سکتا
جو چاہے تو مرا پاسِ آبرو لے لے
غرض یہ ہے کہ شہیدوں میں آ کے شامل ہو
لگا لے ہاتھ میں مہندی ہی کا لہو لے لے
تو بری طرح سے یا قیدِ آرزو ہو جا
نہیں تو مجھ سے بھی یہ قیدِ آرزو لے لے
مجھے فقط مری ہستی کی رفعتیں دے دے
خطا معاف خود اپنے کو مجھ سے تو لے لے
نہ دے سکے جو مجھے تو لطافتیں اپنی
تو آ کے ہستیٔ میکش سے رنگ و بو لے لے

گرد و پیش

میرے بعد، تیرے بعد

یہ زمین یونہی رہے گی، ، یہ آسمان یونہی رہے گا
نہ زمین ہی پھٹے گی، ، نہ کوئی تارہ ہی ٹوٹے گا
پانی دریاؤں میں اُسی طرح بہے گا ، اور ہوائیں ویسے ہی چلیں گی
پھول ویسے ہی کھلیں گے ، نازنینوں کی ادائیں ویسی ہی رہیں گی
یہ سب حسن قائم رہیگا ، اور حسین بھی زندہ رہینگے
بُت گری اُسی طرح ہوگی ، اور نظمیں بھی کہی جائیں گی۔
کھانڈ کی مٹھاس کم نہیں ہوگی ، اور آگ کا کڑواپن بدستور رہیگا
سورج ہمیشہ تپتا رہیگا اور چاند ٹھنڈا۔
قدرت کے سب جلوے — یونہی رہیں گے۔
دنیا کے سب کام اور کاج یونہی چلتے جائیں گے
ایک تم نہیں رہوگے اور میں نہیں رہونگا - نہ تمہاری دنیا رہے گی۔ اور نہ میری دنیا!
پنج دریا بدگورکھی،

پوسٹ مین شاعر

نوے برس گزرے ڈیون شائر کے گرد و نواح میں ایک پوسٹ مین گھوما کرتا تھا۔ جو کہ شاعر بھی تھا۔ بائیڈفورڈ سے بک لینڈ بریو تک تیرہ میل روزانہ چلنے سے اُسے دس شلنگ فی ہفتہ ملتے تھے۔ اور اپنی شاعری کے لئے اُسے ٹینی سن اور لینڈر کی تحسین حاصل تھی۔ لیکن افسوس کہ اس پوسٹ مین کا نام قومی سوانح کی لغات میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ اور آج اُس کی نظمیں بھی دستیاب ہونا مشکل ہو رہی ہیں۔

وہ لکھتا تھا، اچھا لکھتا تھا — اُس نے کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ کہ دوسرے لوگ کیا کہتے ہیں۔ وہ اپنی آناؤ طبیعت کے مطابق جو جی میں آئے لکھ دیتا تھا۔ اس میں نصف نظم ہوتی اور نصف نثر۔ اور نظم کا حصہ ٹینی سن نے بہت پسند کیا تھا۔ اور وہ سب

چیزیں پوسٹ مین شاعر کے دل کی گہرائیوں میں سے نکلی تھیں۔ لیکن انگلستان کا سا ملک بھی پیسے والے انسان کو ہی شاعر سمجھتا ہے اور اُس کی نظموں کی حفاظت کرتا ہے۔ حالانکہ پوسٹ مین شاعر کا LITTLEHAM HOP-PICKERS گیت بچے بچے کی زبان پر ہے اور اُس کا نوحہ ——

دل پر بوجھ لئے اور تھکا ہُوا۔
میں ہنستا ہوں اور چلا جاتا ہوں۔
کیا کوئی پوسٹ مین کے لئے کبھی دعا کرتا ہے —— نہیں!
نہیں نہیں —— کبھی نہیں!
اگر ایسا ہوتا تو تو اسے افزار کی ضرور چھٹی ہوتی۔

—— پوسٹ مین اس نوحے کو آہنگ گاتے ہیں۔ اس کی بہترین نظم "محبت یا دلیل" ہے جس میں وہ ایک خوبصورت شام کو اپنی بیوی جیسے کہ وہ حسین مزدورنی کے نام سے پکارتا ہے کو تمام کام کاج چھوڑ کر اس دن کی حسین شام کہیں تنہائی میں گزارنے کے لئے مدعو کرتا ہے۔ اس کی مذکورہ نظمیں برسٹل کے بیلیمن پریس نے "پوسٹ مین کی نظمیں" کے نام سے شائع کی ہیں۔ اگرچہ ان میں اسم صفت کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہوا ہے تاہم انگریزی کے قدردانوں کو اس کی ادبی کاوشیں بہت پسند آئیں گی۔

لائف اینڈ لیٹرز (انگریزی)

"دلہن، بول"[1]

جب وہ میرے ساتھ تھی۔ تو پرندہ نہیں گاتا تھا
اب جب کہ وہ چلی گئی ہے۔ یہ پرندہ تمام صبح گاتا رہا ہے۔

"دلہن بول" یہ اسکے بول ہیں۔ اور اس کی آواز سے یوں دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کوئی ہچکیاں لیتی ہوئی روٹھی ہوئی لڑکی کو منا رہا ہے اور میرے محبوب، میرے دل کی گہرائیوں میں بسنے والے محبوب کا چہرہ میرے دل میں حیا سے سرخ ہو جاتا ہے۔

یہ صبح ہر قسم کے پرندوں کے رنگین پروں سے حسین ہو گئی ہے۔ اور اس کا ذرہ ذرہ کوئل کی آواز سن کر گنگنانے لگتا ہے اور ان نغمات کے درمیان میرے دل کا پرندہ، نہ جانے کہاں —— دل کے کس کونے میں —— دل کی کن ویرانیوں میں پکارتا ہے۔

کیا وہ پرندہ درخت کی شاخ پر چھپا ہوا کوئی ستارہ ہے؟

ایک بسنت کی طرح وہ فضا میں آناً فاناً تحلیل ہو جاتا ہے۔ خواب کے پرندے سے بھی زیادہ تیزی سے۔ . . . اور پھر خوابوں کی دنیا شروع ہو جاتی ہے پھر جوانی کے سپنے جاگ اٹھتے ہیں، اور اسکے گانے جوانی کی نئی ترنگیں پیدا کرتے ہیں۔ اور اس کی سریلی آواز میرے محبوب کو میرے اور بھی قریب کر دیتی ہے۔ اور میں اس بیش بہا لعل کی قیمت کا اندازہ کرتا ہوں۔

---

[1] "دلہن، بول" —— ایک پرندے کا نام ہے۔ وہ ایک آواز نکالتا ہے جو بنگالی میں "بوکتھا کو" —— اے دلہن، بول سے ملتی جلتی ہے۔ یہ پرندہ بہت کم ملتا ہے۔ بنگال کے مشرق کی طرف بارش کے موسم میں اس کی آواز اچھی طرح سے سنائی دیتی ہے۔ پنجاب میں بھی ایک پرندہ ہے جسے "بیبے دُکھ" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کی آواز سے یوں پتہ چلتا ہے۔ جیسے وہ "بیبے بے دکھ!" —— "اے ماں مجھے بہت دکھ ہے" پکار رہا ہے۔

نقد و نظر

گلبانگ حیات - از جناب خواجہ محمد مسیح پال امین حزیں
سائز صفحات ۲۰۴ قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ اردو اکیڈیمی پنجاب لاہور

امین حزیں ایک پختہ مشق اور پنجاب کے اُن شعرا میں شمار ہوتے ہیں جو سلسلہ ادب میں اپنی مخصوص جگہ رکھتے ہیں۔ آپکے کلام میں فلسفہ اور تصوف سلیس طرز نگارش میں پایا جاتا ہے۔ رباعیات میں انکا عام فہم مگر حکیمانہ انداز دلیل ہے اُنکے فن اور کاوش کی۔ امین حزیں کا اکثر کلام علامہ اقبال مرحوم کی تقلید کا پتہ دیتا ہے۔ ایک جگہ کیا خوب فرمایا ہے ؎

مجھ کو تری نگاہ سے دیکھ رہی ہے کائنات ٭ بات یہ راز کی نہیں اپنا خود احترام کر

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں۔

بزمِ ہستی کا مرقع ہو، مری تیغ خودی کو جو ہر کردار ملجائے

ایسے ایسے اشعار کی شرح کیلئے نہ فرصت ہے اور نہ گنجائش۔ ایک شعر میں کسقدر پاکیزہ اور بلند درسِ حیات ہے ؎

فقر کا دعویٰ غلط ہے تختِ کسریٰ کے بغیر ٭ گوشۂ عزلت میں کیا لے مینا ملجائیگا

اسی طرح ایک شعر میں تعلیم خودی کو عام کرنیکے خیال سے فرماتے ہیں ؎

لطف جینے کا ہے جب ہی کہ دل مست خودی ٭ آسمان تک رسا ہو مری آہ کر

گری نظر سے صاحب فن حضرات کو متروکات اور تقلید بھی دکھائی دیگی لیکن ان کی وجہ سے اُنکے مجموعی حُسنِ شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ؎

عقل کہ اندھے کہیں ڈھونڈ رہے روشن دل کوئی ٭ ہوسکے ہاں سے تجھکو ترا دل مل جائیگا

فطرت کا التفات فراواں ہے مجھ پہ کیوں

ہے کہا گئی یہ بات ہمارے رقیب کو

دوسرے مصرعہ میں تنقید لفظی ہے اگر یہ اسطرح ہوتا تو بہتر تھا۔

یہ بات کہا گئی ہے ہمارے رقیب کو!—

نمود زندگی - از سید علی منظور حیدرآبادی سائز $\frac{۲۰×۲۶}{۱۶}$ صفحات دو سو بارہ، کاغذ، کتابت اور طباعت دیدہ زیب قیمت ڈیڑھ روپیہ
ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن

سید علی منظور حیدرآباد کے پختہ مشق اور نغز گو شعرا میں ہیں جن کی شاعری میں خلوص اور پاکیزگی کو زیادہ دخل ہے۔ دور جدید کے وہ شعرا جو مذہب اور سوسائٹی کے اصولوں سے بغاوت اور خدا وپیغمبر سے انحراف کو نیا ادب سمجھتے ہیں سید علی منظور صاحب اُن سے کوسوں دور ہیں وہ حقیقی شاعر ہیں اور دینِ فطرت کو اپنی شاعری کا منبع گردانتے ہیں۔ زندگی اور اسکے حقائق کی تشریح "نمود زندگی" کی نمایاں خصوصیت ہے جسے ہندوستان کے بہت کم شاعر محسوس کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خوابیدہ احساس لوگ عوام میں مقبول نہیں ہوتے۔ علی منظور صاحب اُس تمام طبقہ سے بلند نظر آتے ہیں جو اپنی شاعری میں تصنع کو حسنِ شعر سمجھتے ہیں وہ سادہ خاطر اور سادگی پسند انسان ہیں اور نمود زندگی انکے ضمیر کی آواز !۔

دیر و حرم - از جناب منظور احمد صاحب منظور صفحات ۲۰۰ قیمت ۸ ملنے کا پتہ لاہور بک شاپ لاہور

دیر و حرم جناب منظور کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جس کو پہلی ہی نظر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاعر قومی نبض پرکھنے میں دسترس رکھتا ہے۔

دیر و حرم میں شاعر نے اپنے جذبات و احساسات کو ایسے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ جو خوش آہنگی کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہے نہ تو اس میں فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کئے ہیں اور نہ ہندی کے بھدے اور بے محل الفاظ کی بھرتی ہے اس معتدل اسلوب کو قائم رکھنے میں شاعر کو جس کد و کاوش سے

کام کرنا ہوتا ہے۔ اسے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

ذرا گہری نظر سے دیکھنے میں اگرچہ اغلاط بھی نظر آئینگے مثلاً

بگڑ میری میّت کو دیکھ سہارا۔ ادا کر دیا ہے گنہ کا کفارا

"کفارا" بروزن فعولن غلط ہے صحیح لفظ ہے "کفارہ" بروزن مفعولن لیکن ایسے ایسے اغلاط حسن شاعری کو نہیں چھپا سکتے اور کتاب اپنے مفہوم کو ادا کرتی ہے!

عقل و جنوں۔ از حکیم برق موسوی ۲۲×۱۸/۱۶ سائز پر ۶۰ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ خاصا قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ ناشر مرکز ادب حیدرآباد دکن۔

حکیم برق موسوی ان لوگوں میں ہیں جنہیں شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ اُن کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں جدید نظریات کے حامی ہیں۔ ان کے کلام میں ایک وطنی تڑپ اور مقدس جذبہ موجود ہے۔ جو ہندوستان کے بہت کم شاعروں میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ دلیل ہے ان کے فطری شاعر ہونے کی

طلسم عمل یا حسن معاشرت۔ مرتبہ سید مجتبیٰ حسن صاحب بی اے کتابت، طباعت اور کاغذ خاصا حجم ۲۲×۱۸/۱۶ پر ۱۵۰ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔

یہ کتاب علم النفسیات کے ماہر مسٹر ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ فن ترجمہ کی اہمیت اور مترجم کی مشکلات کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جبکہ اسے ایسے موضوعات کی کسوٹی پر پرکھا جائے جن کے تحت اُردو ادب میں مضامین کی کمی کا حد تک ہو چکا ہو۔ زیرِ نظر کتاب کا عنوان بھی اُسی نوعیت کے عنوانات میں سے ہے جہاں ہم بلحاظ ترجمہ مترجم کی کامیابی پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں وہیں اُن کا حسن انتخاب بھی قابل تحسین ہے۔ اُنہوں نے یہ کتاب منتخب کرکے یہ بتادیا ہے کہ وہ ملک کی ضرورت اور اردو ادب کی خامیوں کو سمجھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں

غرض زندگی کے اُن تمام پہلوؤں کی وضاحت کیساتھ تشریح کی گئی ہے جس نے موجودہ دور کی کٹھن زندگی کے گہرے راز انسانی سے معلوم ہو جاتے ہیں اور اسی چیز نے کتاب کو مفید اور قابل مطالعہ بنا دیا۔

ندیم بہار نمبر سنہ ۱۹۴۱ء مرتبہ سید یاسین علی ذہنی قیمت دو روپے ۲۰×۳۰/۸ سائز پر ۲۴۴ صفحات کا ایک ضخیم نمبر ہے۔ جس میں ادبی علمی تاریخی تحقیقی اور پُر از معلومات مضامین کا انبار وغیرہ ہے۔ جو نہ جانے کتنے نوجوانوں کی کاوش اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے اگر کوئی بہار کے کسی بھی ادبی پہلو پر تحقیق کرنا چاہے تو اسکے لئے یہ نمبر دیکھنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مرتب نے اس میں ایسے ایسے پہلوؤں پر تحقیقی مضامین مہیا کئے ہیں۔ کہ مستقبل کے نقادوں اور مضمون نگاروں کے لئے چراغ راہ کا کام دینگے۔ (نوشر طاہر)

اُردو رسم الخط۔ از محمد سجاد مرزا ایم اے کینٹب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج، حیدرآباد دکن۔

کتاب میں رسم خط کی مختصر تاریخ دی گئی ہے اور ظاہر کہ موجودہ فارسی رسم خط بہت پرانا ہو چکا ہے۔ خود فارسیوں نے جن کا رسم خط ابھی تک ہندوستانی استعمال کرتے رہے ہیں۔ اسے استعمال کرنا چھوڑ دیا ہے۔ لیتھو کے کام میں کاپی نویسی، تصحیح، پتھر پر چھاپی کی منتقلی اور سنگ سازی کے تدریجی مراحل میں نہ صرف وقت صرف ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات ذراسی بے احتیاطی سے نہایت فحش غلطی ہوتی ہے ہمیں یہ جان کر مسرت ہوتی ہے۔ کہ عثمانیہ کے ٹریننگ کالج کے خطاط مولوی شیخ حسین صاحب مشہدی شاہ آبادی دگلبرگوی، نے ایک ایسا ٹائپ ایجاد کیا ہے جس میں ہر ایک خط کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہے اس میں روانی ہے، حروف اُونچے نیچے نہیں، ان کی شکل قائم ہے۔ کرسی ایک سی ہے۔ پہلے نستعلیق کی ناکامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں جوڑوں کی تعداد بے شمار تھی۔ لیکن اس ٹائپ میں نہ صرف جوڑ توڑ کم ہی ہے۔ بلکہ اسکے پورے ٹائپ کی تعداد انگریزی زبان کے ٹائپ کی تعداد سے بھی کم ہے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ یہ رسم خط نشر و اشاعت کی دنیا میں انقلاب پیدا کریگا۔ (ا۔ س۔)

Regd L. No. 3521.

حاجی لق لق کے تازہ مضامین کا مجموعہ

ادبِ لطیف

اگست ۱۹۴۱

اشارات	ادارہ	۵
حرف و حکایت	باری	۶
[illegible]	جوش ملیح آبادی	۹
طرزِ بیان اور مضمونِ شعر	فیض احمد فیض	۱۰
ہماری نسل	احمد علی	۱۳
خیالاتِ پریشان	چودھری [illegible] اختر	۱۷
کرشن جی کی شکتی	آغا عبدالحمید	۱۸
غزل	فیض احمد فیض	۲۲
کمیٹی کا دفتر	چیخوف	۲۳
ایک خط	سلام مچھلی شہری	۲۵
افلاس	طالب انصاری	۲۶
بنفشی شعاعیں	ابو سعید قریشی	۲۷
جنگ کو جاتے ہوئے	احمد ندیم قاسمی	۳۳
تاریخ کا مادی نظریہ	علی امام ایم۔ اے	۳۴
معارف	امین حزیں سیالکوٹی	۳۷
راجہ دیکھو دیکھو سمائے	عبدالمجید بھٹی	۳۸
ہاتھی کا شکار	جارج آر۔ ویل	۳۹
غزل	فراق گورکھپوری	۴۵
خزانہ	مریم سمرسٹ	۴۶
دانشکدہ	احسان دانش	۵۰
ناول کی تکنیک	آغا حمید ایم۔ اے۔ آئی سی ایس	۵۱
غزل	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	۵۵
شہنشاہ کا لباس	کرسچن اینڈرسن	۵۶
حجامت	کرشن چندر	۶۰

جوش ملیح آبادی

فیض احمد فیض

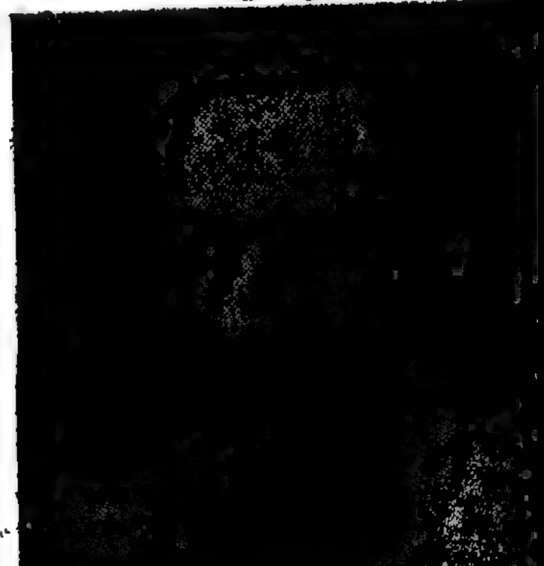
احسان دانش

کرشن چندر

مکتبہ اردو لاہور

میں کبھی نہ مرتی

خاوند نے آسمان کی طرف دیکھکر ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہنے لگے میں ایک ایسی محبت کرنیوالی بیوی کا اتقال ہو گیا اس کے ساتھ ہی خاوند نے مرحوم بیوی کا جنازہ اُس کے سامنے رکھوا کر ایک دفعہ پھر اس خوبصورت جسم کو دیکھنے لگا یکایک جسم میں حرکت ہوئی۔ اُس نے خاوند کی طرف نہایت افسوس ناک نظروں سے دیکھا اور کہا۔

میرے سرتاج!

اب کیا ہوتا ہے خدا کیلئے رو رہے ہیں۔ آپ کے رونے سے میری روح بے چین ہو جاتی ہے۔ اگر آپکو کچھ دن پہلے بھی اس آنیوالی مصیبت کا یقین ہو جاتا۔ تو سچ جانئے۔ میں کبھی نہ مرتی۔ لیکن اب آپ بھی مجبور ہیں اور میں بھی۔ کیا آپ کو وہ وقت یاد نہیں رہا جب میں کچھ بیمار تھی۔ اور روز بروز بیماری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن آپ نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ آخر کار بیماری بڑھ گئی اور میں دنیا سے علیحدہ ہونا ضروری ہو گیا میں بے زبان تھی حیا نے میری قوت گویائی پر مہر لگا رکھی تھی میں کیسے کہہ دیتی کہ مجھے سیلان الرحم کی بیماری ہے شریف تھی اور شریف گھر پیدا ہوئی تھی میری زبان بے حیا سے بیماری کا ذکر اس دنیا میں کیسے آتا لوگ مجھے بیشرم کہہ دیتے۔ آپ خود مجھے بے غیرت اور بے حیا سمجھتے۔

خاوند کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

روح نے کہا:۔

میرے سرتاج! آپ کی یہ تنہائی آپ کو یاد دلائیگی۔ کہ آپ نے ایک بے زبان کی صحت اور زندگی کا کچھ خیال نہ کیا۔ حالانکہ مختلف نشانیوں سے آپ سمجھ چکے تھے۔ کہ مجھے سفید رطوبت جاری ہونے کی بیماری ہو گئی ہے۔ اور آپکو یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ اس بیماری سے تندرست کر دینے کیلئے دوا "روک" کی ایک شیشی مجھے کافی ہو جاتی۔ لیکن افسوس ہے آپ نے تین روپے کا لالچ کر کے ایک بے زبان کو زندہ درگور کر دیا ہے مجھے معلوم ہے اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستان کی ہزاروں عورتوں نے میرے سامنے "روک" سے [illegible] حاصل کیا۔ اور سفید زردی مائل رطوبت کا آنا بند ہو گیا۔

اب کیا ہوتا ہے پیارے سرتاج! مگر یہ شکایت آپ کو ہمیشہ رہیگی تو مجھے اپنی بے وقت موت کی قیمت مل جائیگی اور میں سمجھونگی کہ میں نے اپنی زندگی فروخت کر کے اپنے دل و جان کے واسطے ملک کی آنکھیں کھول دیں۔ اور انہیں دنیا میں خوش رہنے کے قابل کر دیا۔ اتنا کہکر روح چلنے لگی۔ خاوند آگے بڑھا اور اس نے لپک کر روح کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ لیکن یہ اس کی نظر کی غلطی تھی۔ وہاں کا سفید اور چمکدار ستون اس کی آغوش میں آ گیا حیرت و استعجاب میں اس نے چاروں طرف دیکھا۔ تو قریب ہی اس کو ایک پرچہ پڑا ہوا ملا جس پر حسب ذیل عبارت کسی عجیب روشنائی سے لکھی ہوئی تھی۔

روح کا پیغام عورتوں کے نام

اے میری عزیز بہنو! اگر خدانخواستہ تم میں سے کوئی بہن میری طرح اس بیماری میں مبتلا ہو جیسے سیلان الرحم بھی کہتے ہیں۔ اور جس میں مبتلا ہو کر ایک سفید زردی مائل لیسدار رطوبت . . . . . سے خارج ہوتی رہتی ہے۔ تو شرم و حیا کو زیادہ کام میں نہ لانا ورنہ میری طرح یہ تمہاری زندگی بھی تمام کر دے گی۔ اس واسطے یاد رکھنا اپنے خاوند سے کہہ دینا۔ ورنہ خود ایک خط

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ ایل ۳۲ دہلی

کو لکھکر اُن سے ایک شیشی دوا "روک" کی منگا لینا۔ یہ دوا سیلان الرحم کا بہترین علاج ہے۔ ایک شیشی کی قیمت صرف تین روپے ہے۔ اور پارسل پر ست کے خرچ [illegible] ہوں گے۔ گویا تین روپے سات آنے میں تمہاری تندرستی بالکل صحیح ہو جائیگی۔ اور تم دنیا میں ہنسی خوشی اپنی زندگی کی بہار دیکھو گی۔ کیونکہ یہ دوا ایک دو جگہ نہیں بلکہ ہزاروں جگہ آزمائی جا چکی ہے۔ صرف ایک شیشی سے سفیدی کی بیماری ختم ہو جاتی ہے اور ہاں۔ جب خدا تمہیں تندرستی دیدے تو میرے لئے بھی دعائے خیر [illegible]

(تمہاری ایک مرحوم [illegible])

مفت
مرد کی خاص کمزوری کا علاج

صرف ایک روپیہ خرچ ہوگا

جب کسی مرد کی مردانہ طاقت کمزور ہو جائے۔ جب عین وقت پر شرمندگی ہونے لگے۔ اور مرد اپنی شرمندگی کی وجہ سے خودکشی کا خیال کرنے لگے جب کوئی مرد اپنی خاص کمزوری اور قوت باہ کی کمی کو بھرپور کرنا چاہے۔ جب کوئی مرد اپنی عورت کے سامنے ذلیل ہو جاتا ہو۔ اس وقت صرف ایک ہی علاج کام کر سکتا ہے۔ جس کے بعد پھر کایا پلٹ ہو جائے گی۔ پھر نوجوانی کام کرنے لگے گی۔ پھر وہی مایوس مرد اپنے بدن میں بجلی کی سی تڑپ اور امنگ محسوس کرنے لگے گا۔ پھر اسکا جی چاہے گا۔ کہ کوئی اس سے محبت کرے اس کی طرف دیکھے اور اس کی نوجوان تمناؤں کی آغوش میں آ جائے۔

یہ علاج ہے ہندوستان کی سب سے بڑی دوا "معجون کاشمیری" کا استعمال جس نے ہر مقوی دوا کے مقابلہ پر اپنا سکہ جما لیا ہے اور جس کی ایک ایک خوراک مریض کے جسم میں جوانی اور شباب کا صحیح اور اصل جوش پیدا کرتی ہے۔ ہر خوراک پر مریض خود محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کیا تھا اور اب جوانی کتنی تیزی سے اُسکے جسم میں واپس آ رہی ہے۔ دوا "معجون کاشمیری" کی تیاری میں کشمیر کی ایک پہاڑی بوٹی شامل ہے۔ اور یہ تمام کرشمہ اسی کی بدولت ہے۔ ناکارہ مرد اور وقت پر شرمندہ ہو جانے والے انسان کے لئے یہ دوا سب سے بڑی دولت ہے اور کئی سال سے ہندوستانی مارکیٹ میں اپنا سکہ جما رہی ہے۔ اگرچہ ایک شیشی کی قیمت چار روپے سات آنے ہے۔ لیکن اس کو ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچانے کے لئے ایک مختصر عرصہ تک صرف ایک روپیہ قیمت لی جا رہی ہے۔ اور یہ قیمت قطعی مفت برابر ہے۔

لہٰذا اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ اگر کوئی مرد مایوس ہو چکا ہو۔ کثرت جماع یا بچپن کی بے احتیاطی یا کسی مرض کے باعث جوانی کی خاص طاقت کمزور ہو گئی ہو۔ یا وقت پر شرمندگی ہوتی ہو۔ یا عمر کی زیادتی کے سبب کمزوری محسوس ہوتی ہو تو ایسے ہی لوگوں کیلئے دوا "معجون کاشمیری" بہترین علاج ہے۔ اُسے چاہئیے کہ وہ

مینیجر زنانہ دواخانہ اے۔ایل ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھکر ایک شیشی دوا "معجون کاشمیری" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالے۔ محصول پارسل سات آنے لگیگا۔ اس طرح ایک روپیہ سات آنے میں معجون کاشمیری کی پوری شیشی اسے دیدی جائے گی۔ ایک مریض کو اس رعایتی قیمت میں صرف ایک ہی شیشی دیجائیگی۔ زیادہ نہیں۔ ہاں! اس کی اجازت ہے کہ کئی مریض مل کر ایک ہی پارسل میں کئی شیشیاں منگالیں۔ کیونکہ اسطرح محصول بھی کم خرچ ہوگا

بچہ ہونے کی دوا

جس عورت کو حمل نہ ٹھیرتا ہو

اس کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے !!

جب کسی عورت مرد کی شادی کو کئی برس گذر جائیں اور پھر بھی اُن کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو کسی اندرونی اور نامعلوم خرابی کے باعث عورت کو حمل نہ ٹھیرتا ہو۔ یا وہ لوگ جو بچہ کے لئے ترستے ہوں۔ اور ان کے ہاں کچھ نہ پیدا نہ ہوتا ہو تو ایسی حالت میں صرف ایک ہی ترکیب ہے جس کے بعد عورت کو حمل ٹھہر جائیگا۔ برسوں کی تمنا پوری ہو جائیگی۔ یعنی اس ترکیب پر عمل کرنے کے بعد اولاد پیدا ہونے لگے گی۔

عورت کو حمل ٹھہرانے کی ترکیب

موجودہ زمانے کی تحقیقات اور کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد ایک ایسی عجیب و غریب دوا تیار ہوئی ہے جسے اگر روزانہ سات دن تک مسلسل ایک ایک خوراک عورت کو کھلائی جائے اور ان سات دن میں وہ . . . بالکل علیحدہ رہے اور ٹھیک آٹھویں رات . . . تو اُسی آٹھویں رات عورت کو حمل ٹھہر جائیگا۔ اس دوا کا نام "محافظ اولاد" ہے۔ اور تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے۔ کہ مسلسل سات دن تک اس دوا کے استعمال سے عورت کا اندرونی جسم (یعنی بچہ دانی) بالکل قدرتی اور نیچرل حالت میں آجاتا ہے۔ اور جب آٹھویں رات . . . تو اس کو اسی رات حمل ٹھہر جاتا ہے۔ اور پھر نو مہینے بعد وہ اپنی گود میں بچہ دیکھ لیتی ہے۔ ایک شیشی دوا "محافظ اولاد" میں ایک عورت کیلئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے۔ اور اس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ جس کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹرز زنانہ دواخانہ ۳۴ اے ایل دہلی

کے پتہ پر خط لکھکر یہ دوا خانہ بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لینی چاہئے۔ پارسل پر سات آنے محصول ڈاک خرچ ہوگا۔ اور اس طرح اسے گھر بیٹھے دوا کی شیشی پہونچ جائے گی۔

نوٹ :۔ اس دوا کی بدولت آج سینکڑوں عورتوں کی گود میں بچے موجود ہیں۔

کاش میں عورت نہ ہوتی

وہ رو رہی تھی اور اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی۔ کہ بہن اگر میں عورت نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ یا اگر ہوئی تھی۔ تو مجھ میں شرم کرنے کی عادت نہ ہوتی۔ آج سات سال ہو گئے۔ میری زندگی تمام ہوئی جاتی ہے اور تمہارے بھائی کو کچھ خبر نہیں کہ میں مر رہی ہوں۔ بس وہ دریافت کر کے چپ ہو رہتے ہیں کہ "آپ زیادہ تر لیٹی کیوں رہتی ہیں"

پیاری بہن! تم ہی بتاؤ میں کس منہ سے کہوں کہ میں کیا بیمار ہوں۔ مجھے تو اپنی زبان سے کہتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے کہ میں ماہواری ایام کی بیماری میں مبتلا ہوں اور مجھے اس زمانے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ذرا تم کسی کے ذریعہ "ان" تک یہ بات پہنچا دو۔ شاید وہ میرا علاج کرا دیں۔

سہیلی نے جواب دیا۔ پیاری بہن! اب ہمیں اپنے مردوں تک ایسی بات پہنچانے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے بہت سے اخباروں میں پڑھا ہے کہ عورتوں کی تمام خفیہ بیماریوں کی بہترین دوائیاں دہلی کے "زنانہ دواخانہ" میں ملتی ہیں۔ اور مجھے خود بھی تجربہ ہے کہ اس دواخانہ کی ہر دوا نہایت عجیب اثر رکھتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عورتوں کی بیماریوں کو عورتیں ہی بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس دواخانہ کی دوا "کورس" ماہواری ایام کی بے قاعدگی کو ٹھیک کرنے کیلئے بہت عجیب چیز ہے۔ اگر کوئی عورت ماہواری ایام کی بیماریوں میں مبتلا ہو۔ ایام کم آتے ہوں یا رک رک کر اور تکلیف اور درد کے ساتھ آتے ہوں یا زیادہ آتے ہوں۔ یا مہینہ میں دو تین دفعہ آجاتے ہوں یا بالکل نہ آتے ہوں۔ یا ایام کی کوئی اور خرابی ہو۔ بہر صورت یہ دوا اپنا اثر کرتی ہے۔ اور خواہ کیسی ہی کمی زیادتی ہو اس دوا کو استعمال کرنے کے بعد عورت کو ہر مہینہ بالکل صحیح وقت پر اپنی مقررہ تعداد میں بغیر کسی درد اور تکلیف کے ایام ماہواری آنے لگتے ہیں۔ بڑی عجیب دوائی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس دوا کو سینکڑوں بہنوں نے استعمال کر کے اپنی صحت ٹھیک کر لی ہے۔ اسی طرح تم بھی

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۳۴ اے ایل دہلی

کو خط لکھ کر "کورس" کی ایک شیشی منگا کر استعمال کر لو۔ تندرست ہو جاؤ گی۔ اور ہاں! دوا کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ ایک شیشی "کورس" دو روپے آٹھ آنے کو ملتی ہے۔ اور سات آنے محصول ڈاک کے خرچ ہوں گے۔ چنانچہ اس بیچاری نے کورس کی شیشی منگا کر استعمال کر لی۔ اب وہ بالکل تندرست ہے۔ ہر ماہ اپنے مقررہ وقت پر وہ ایام سے بغیر کسی درد کے فارغ ہو جاتی ہے۔ پس جو عورتیں اس بیماری میں مبتلا ہوں۔ وہ بھی "کورس" دوا استعمال کر کے اپنی تندرستی ٹھیک کر لیں۔

اشارات

ادب لطیف "کے افسانہ نمبر کی اشاعت کے بعد کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے۔ جو ادب لطیف" کی باقاعدگی پر اس طرح اثر انداز ہوئے کہ باوجود کوششوں کے باوجود جولائی سنہ ۱۹۴۱ء کا شمارہ وقت پر تیار نہ ہو سکا۔ جولائی کے تیسرے ہفتے میں اس شمارہ کو اس لئے شائع نہ کیا گیا۔ کہ ایسا کرنے سے اگست کے شمارہ کی اشاعت میں تاخیر ہونے کا امکان تھا۔ جولائی کا شمارہ ادب لطیف کے نگران کی گوناگوں مصروفیتوں کے باعث بھی رکا رہا۔ اس تاخیر کا سبب ہمارے چند محترم نگارندگان کے وہ وعدے بھی ہیں۔ جو انہوں نے اپنے اپنے مضمون کے بھیج دینے کے متعلق کئے تھے بہرحال یہ پرچہ شائع نہ ہو سکا۔ ادارہ اس بے قاعدگی پر ناظرین سے معذرت طلب کرتے ہوئے انہیں یقین دلاتا ہے۔ اس گم شدہ شمارہ کی تلافی اس طرح پوری کی جائیگی۔ کہ خریداروں کی میعاد میں ایک ماہ کی توسیع کر دی جائے گی۔

مکتبہ اردو لاہور

مکتبہ اردو لاہور بلند پایہ معیار کے لٹریچر ادب کی بہترین کتابیں شائع کرنے میں مصروف ہے۔ مکتبہ کے پیش نظر صرف ایک مقصد ہے۔ اور وہ یہ کہ اردو کو دنیا کی متمدن زبانوں کی صف میں لانے کے لئے معیاری اور کار آمد کتابیں شائع کرے۔ ہم آئندہ شمارہ میں اپنا پورا پروگرام پیش کرینگے۔ سردست اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ مکتبہ اردو لاہور نے جولائی سنہ ۱۹۴۱ء میں مندرجہ ذیل کتابیں شائع کیں۔

(۱) نئے زاویئے - مرتبہ کرشن چندر
(۲) ماورا - ن م راشد کی نظموں کا اولین مجموعہ
(۳) منٹو کے افسانے
(۴) آؤ - منٹو کے ڈراموں کا مجموعہ۔
(۵) پاپی - اوپندر ناتھ اشک کے ڈراموں کا مجموعہ
(۶) سوانح حیات ابن تیمیہ - ڈاکٹر غلام جیلانی برق -

مکتبہ اردو لاہور کی طرف سے مختلف علوم و فنون سے متعلق سستی کتابوں کا ایک سلسلہ شائع ہو رہا ہے۔ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء میں اس سلسلہ میں گوپال متل کی "سبھاش بوس"، حسن عباس کی "گوند کی ڈائری" اور "رضا شاہ پہلوی" کا اضافہ ہو چکا ہے۔ "اقبال اور اس کا پیغام" کو عنقریب اس سلسلہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ مکتبہ اردو لاہور کی طرف سے بہت جلد جوش ملیح آبادی کا نیا مجموعہ کلام "آیات و نغمات" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعہ میں شاعر انقلاب اپنی بلندیوں پر پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ادب لطیف کا کاغذ:-

آغاز جنگ ہی سے کاغذ کی قیمتوں میں نمایاں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس گرانی کے پیش نظر ملک کے کئی مقتدر رسالوں نے نہ صرف اپنی ضخامت گھٹا دی تھی بلکہ کم قیمت کا کاغذ بھی استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ کاغذ کی گرانی اس حد تک تکلیف دہ تھی۔ پھر بھی ہم ادب لطیف کے لئے بہترین کاغذ مہیا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ادب لطیف کے گزشتہ سالنامہ میں جو کاغذ لگایا گیا تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا انٹیک پیپر تھا۔ کاغذ کے مسئلے نے اب بہت تنگ صورت اختیار کر لی ہے۔ اس شمارہ کے لئے ہم نے انتہائی کوشش کی۔ کہ ویسی کاغذ میسر آسکے لیکن مارکیٹ میں کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے ادب لطیف کا یہ شمارہ اس کاغذ پر شائع کیا جا رہا ہے۔ جسے ہمارے معاصرین کئی ماہ سے استعمال کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اگلی اشاعت تک ہم پھر بہتر کاغذ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائینگے۔ اور ادب لطیف حسب معمول ویسی کاغذ پر شائع ہوگا۔

نذیر احمد چودھری

باری

حرف و حکایت

زکی ولیدی طوغان

ابوریحان البیرونی کا شمار گیارھویں صدی کے ان باکمال فضلا میں ہوتا ہے جنہوں نے مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کیا تھا۔ البیرونی نے سنسکرت کے علاوہ ایشیا کی کئی ایک دوسری زبانوں پر عبور حاصل کیا تھا۔ اس کی کتاب الہند، قدیم ہندوستان کے تمدن کے متعلق ایک غیر فانی کتاب ہے۔ البیرونی نے سنسکرت کی کئی ایک کتابوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ البیرونی کی دوسری مشہور کتاب "القانون المسعودی" کے اجزا منتشر ہو چکے تھے۔ ان منتشر اجزا کو زکی ولیدی طوغان نے نہایت جانفشانی سے جمع کر دیا ہے۔ ہندوستان محکمہ آثار قدیمہ نے اس کتاب کو شائع کریگا۔ اس میں ایک ہزار سال پہلے کے ہندوستان کے جغرافیائی اور تمدنی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زکی ولیدی طوغان نے مشرق اور مغرب کے بیشتر کتب خانوں کی خاک چھان کر اس گمشدہ متاع کو دوبارہ حاصل کیا یورپ میں اس کتاب کی اشاعت کے لئے کسی ناشر نے آمادگی ظاہر نہ کی۔ لہٰذا اس ترک فاضل نے ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ کے ناظم اعلیٰ سے گفت و شنید کی۔ چنانچہ انہوں نے القانون مسعودی کے انگریزی ترجمہ سے پہلے اصل کتاب کو شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے

اثری انکشاف

حیدرآباد دکن، سے اٹھ میل کے فاصلہ پر کونڈاپور میں آندھراؤں کے عہد کا ایک پرانا شہر ملا ہے۔ اثری انکشافات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ شہر پہلی صدی عیسوی کا ہے۔ کھدائی کا مقام مٹی کا ایک بہت بڑا تودہ ہے جو سوا ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ بیس سے پچیس فٹ تک اونچے خاک کے اس تودے پر کھدائی کا جو کام شروع ہوا ہے۔ وہ ابھی کئی سال تک جاری رہیگا۔ اس کھدائی سے آندھراؤں کے عہد سے متعلق اہم امور کا انکشاف ہوگا۔ آندھراؤں نے ۲۰۰ ق م سے ۲۰۰ء تک دکن پر حکومت کی تھی

سویٹ نازی جنگ۔

فرانس کی ہزیمت کے بعد سویٹ روس پر جرمنی کا اچانک حملہ موجودہ جنگ کا سب سے اہم واقعہ ہے اس حملہ کا اعلان کرتے وقت ہٹلر نے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ کہ جرمن فوجیں چند دنوں کے اندر اندر سویٹ روس پر قابض ہو جائینگی۔ لیکن آج کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جرمن عوام کو یہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ سویٹ فوجیں جرمنوں کا شدید مقابلہ کر رہی ہیں آج سویٹ روس پر نازیوں کے برق آسا حملے کا اٹھائیسواں دن ہے۔ نازیوں نے اس حملے سے جو امیدیں قائم کی تھیں وہ تا حال پوری نہیں ہوئیں۔ انہوں نے اندازہ کیا تھا۔ کہ جرمن فوجیں اس دن کے اندر اندر ماسکو میں ہونگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمن فوجیں سویٹ روس کے کئی علاقوں میں داخل ہو چکی ہیں۔ لیکن اس اقدام میں نازیوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ روسی فوجیں جرمن حملوں کا جواب بہ تندی دے رہی ہیں۔ اور بعض مقامات پر سویٹ فوجوں کے جوابی حملے بہت زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔

ہسپانوی خبر رساں ایجنسی کے نامہ نگار مقیم برلن نے اب نازیوں کی طرف سے ایک معذرت نامہ شائع کیا ہے۔ جرمنی اور اسکے مقبوضات میں اب اس خیال کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ سویٹ روس میں نازیوں کو طوفانی فتح حاصل نہیں ہوگی بلکہ جرمن فوجیں بتدریج آگے بڑھیں گی اس خیال کی اشاعت جمہوریت پسندوں کے لئے ایک اچھا فال ہے۔ جرمنی

فوجوں کے پیچھے روس کے چھاپہ مار دستوں کی موجودگی نازیوں کی توقعات کو خاک میں ملانے کے لئے کافی ہے۔ روس نے خالی کئے ہوئے علاقوں کے اموال و املاک کو نذر آتش کرنے کی جو حکمت عملی اختیار کی ہے وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت دور رس ہے۔

سوویٹ روس پر جرمن حملہ کوئی غیر متوقع نہیں تھا۔ ہٹلر کو اپنے عالمگیر پروگرام (جو میری جدوجہد میں موجود ہے) کے پورا کرنے کیلئے اس امر کی ضرورت تھی۔ کہ وہ سوویٹ روس کے یورپی علاقوں پر قبضہ جمائے۔ سوویٹ روس پر جرمن حملہ الیا حیران کن بھی نہیں۔ اس لئے کہ یہ حملہ ناگزیر تھا ہاں اگر حیرت ہے تو صرف اس قدر کہ یہ حملہ اتنی جلدی کیوں ہوا؟

ریاستہائے بلقان میں جرمن فتوحات کے بعد جرمن فوجیں روس کی سرحدوں پر جمع کر دی گئی تھیں۔ ان فوجوں کے اجتماع سے باخبر حلقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ کوئی نہایت اہم واقعہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ لیکن ہر روز برلن اور ماسکو سے یہ اطلاعات نشر ہوتی رہیں۔ کہ سوویٹ روس اور نازی جرمنی کے تعلقات میں کسی کشیدگی کا امکان نہیں۔ یہ اعلان اس وقت تک ہوتے رہے جب تک کہ نازی فوجوں نے روس پر حملہ نہیں کیا۔

روس اور جرمنی کی موجودہ جنگ بالشوزم یا کمیونزم کے لئے نہیں لڑی جا رہی۔ اگر آج روس میں کوئی اور نظام حکومت ہوتا تب بھی اسے ہٹلر کا اسی طرح شکار ہونا پڑتا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ گذشتہ بیس برس سے جرمنی میں کمیونزم کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات پرورش کئے گئے۔ لیکن جرمنی نے روس پر حملہ کمیونزم کے مٹانے کے لئے نہیں کیا بلکہ یورپی روس کے معدنی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے لئے۔ کامریڈ سٹالین بھی اعلان کر چکا ہے۔ کہ یہ جنگ صرف بالشوزم کیلئے نہیں لڑی جا رہی بلکہ مادر وطن کیلئے

ماسکو سے دور

جرمن ہائی کمان نے یہ دعویٰ کیا تھا۔ کہ چند دنوں کے اندر اندر جرمن فوجیں ماسکو میں داخل ہو جائیں گی۔ لیکن سوویٹ روس کی فوجوں نے جرمنوں کی اتنی سخت مزاحمت کی۔ کہ اب وہ ماسکو کا راستہ چھوڑ کر کیین کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ نپولین ماسکو کی فتح کی امنگوں کو لئے ہوئے روس پر حملہ آور ہوا تھا۔ لیکن روس کی برفباری نے اس کی ساری فوج کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اور ہٹلر کی فوجیں نپولین کی فوجوں سے کہیں زیادہ تیز رفتار اور مشینی ہیں لیکن اسکے مقابلہ میں روسی فوج زاروں کے روس کے عہد کی فوج نہیں روس کا فوجی اور روس کا شہری مادر وطن کی حفاظت کے لئے سربکف نظر آ رہا ہے۔ ہٹلر نے چاہا تھا۔ کہ اپنے برق آسا حملوں سے ماسکو کے قریب ہو جائے۔ لیکن روسی فوجوں کی مزاحمت نے اسے ماسکو سے دور پھینک دیا ہے

Pakistan & Untouchability

CH: AFZAL HAQ.

The Ahrar leader has discussed this vexed problem from a new and original angle. He has subjected some of the current political slogans to a critical and searching analysis. Coming from the pen of a well-known political thinker and the leader of an important nationalist group this book will prove a useful contribution to Contemporary National literature.

Price Rs. 1/12/-

Publishers:—

Maktba-i-Urdu, Lahore.

اُردو کے جوان سال اور جوان فکر شاعر

ن۔م۔ راشد

گذشتہ دس سال کے عرصہ میں اُردو دنیا نے راشد کے مجموعۂ کلام سے بڑھ کر کسی کتاب کا انتظار نہیں کیا۔ اس مجموعے میں راشد کی مقفّی نظمیں اور سانیٹ ہی شامل نہیں بلکہ وہ جدید آزاد نظمیں بھی ہیں جنہوں نے راشد کو موجد اور پیشرو کی حیثیت سے ایک لازوال شہرت بخش دی ہے

ماوراء

کو بجا طور پر اُردو میں ایک جدید شعری تحریک کا پیغامبر کہا جا سکتا ہے۔ اگر راشد کی نظم "دریچے کے قریب" اور "رقص" آپ کی نظر سے گذری ہے تو آپ کبھی اس مجموعے کو حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس مجموعے میں راشد کی قریباً چالیس بہترین نظمیں ہیں "ماوراء" کا تعارف کرشن چندر ایم۔اے نے لکھا ہے۔ اور دیباچے میں خود حضرت راشد نے جدید آزاد شاعری کی تکنیک سے مفصل بحث کی ہے کتاب کا سرورق ہندوستان کے سب سے بڑے مصور عبدالرحمٰن چغتائی کے موقلم کا نتیجہ ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:-

مکتبۂ اُردو لاہور

حضرت جوش ملیح آبادی

حیَّ علیٰ خیر العمل

زیرِ تدوین "آیات و نغمات" کا ایک ورق

ہمنشیں! نمازِ صبوحی ادا کریں!
خوشبوئے عود میں درِ میخانہ وا کریں

ہاں اُٹھ کہ مُہرِ شیشۂ گُل رنگ توڑ کر
انسانیت کو دامِ خرد سے رہا کریں

باقی جو بچ رہا ہے کچھ ایمان خیر سے
اُس کو بھی آج پائے صنم پر فدا کریں

پُر سے مُحل بسے ہیں گھٹائیں ہیں پُر خروش
آ، ہم بھی آج حقِ جوانی ادا کریں

بہکیں قدم قدم پہ، چلیں جُھوم جُھوم کر
اتنا تو پاسِ خاطرِ موجِ صبا کریں

ساغر میں غرق کر کے لباسِ فریب کو
پیرانِ خرقہ پوش کے حق میں دعا کریں

ہر شئے ہے پائے لیلیٰ مستی پہ سجدہ ریز
اور ہم نمازِ جام و صُراحی قضا کریں؟

برسات کی گھٹاؤں سے برسیں گلابیاں
اور ہم وضو سے شستِ و شوئے دستِ و پا کریں؟

گلشن کا ذرہ ذرہ پیے بے دھڑک شراب
اور ہم خیالِ پُرسشِ روزِ جزا کریں؟!

بہکے ہوا، رواں ہو فضا، مست ہو گھٹا
اور ہم خرد کو رہبر و رہنما کریں

گردوں پیالہ کش ہے، تو گیتی قرابہ نوش
ہم اور اس بہار میں خوفِ خدا کریں

پی پی کے جُھوم جُھوم کے گا گا کے مثلِ جوش
آ، دُھوم سے عبادتِ آبِ دِہوا کریں

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نامِ فسق!!
داوری دارم بسے، یا رب کرا داور کُنم؟
(حافظ)

فیض احمد فیض

مبادیِ تنقید

طرزِ بیان اور مضمونِ شعر

اچھے شعر کو برے شعر سے تمیز کر لینا یا اچھے شعر سے متاثر ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ قریب قریب غیر ارادی فعل ہے۔ اور ہم میں سے جو لوگ شعر سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ کم از کم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں۔ دقت اس وقت پیش آتی ہے۔ جب ہم اپنی پسند یا ناپسندیدگی کی وجوہات تلاش کرنے بیٹھیں یا دوسروں کے لئے اچھے اور برے اشعار کا معیار قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ایسے موقعوں پر ہمارے اکثر نقاد ذوقِ سلیم، حسنِ مذاق، اور ایسے ہی دوسرے مبہم الفاظ کی آڑ لینے لگتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ شاعری کی طرح سخن فہمی بھی خداداد ملکہ ہے۔ اور ع "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

لیکن آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔ لوگ بال کی کھال اتارے بغیر دم نہیں لیتے۔ اگر میں یہ کہوں کہ فلاں شعر اس لئے اچھا ہے۔ کہ مجھے پسند ہے تو وہ پوچھیں گے۔ کہ کیوں پسند ہے۔ اگر میں یہ جواب دوں کہ میرا دل یہی کہتا ہے۔ تو وہ کہیں گے۔ کہ آپ کے دل کو ایسا کہنے کا کیا حق ہے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہیگا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ کہ اچھے شعر کو اچھا کیوں کہتے ہیں۔ اور اس میں کون سے اجزا یا کون سی صفات ہونا چاہئیں۔ جو ہمیں پہچاننے میں مدد دیں۔

سب سے پہلے یہ سوال پیش آتا ہے۔ کہ شعر کو ہم اپنے مضمون کی وجہ سے اچھا کہتے ہیں۔ یا طرزِ بیان کی وجہ سے۔ اور شعری ترکیب میں ان دونوں کی اہمیت اور باہمی تعلق کیا ہے؟ شاعری کے عمل پر نظر ڈالنے سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ شاعر پہلے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اور اس کے بعد اسے الفاظ کی جستجو ہوتی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کہ وہ پہلے الفاظ ذہن میں رکھ لے۔ اور پھر ان میں مضمون ڈالنے کی کوشش کرے۔ اس لئے کہ جذبات اور خیالات الفاظ کے بغیر بھی ذہن میں آ سکتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات انکا الفاظ میں سمانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن الفاظ اپنے معانی کے بغیر ذہن میں نہیں آ سکتے۔ یہ تو ہو سکتا ہے۔ کہ شاعر کے ذہن میں پہلے سے کوئی جذبہ یا خیال موجود ہو۔ اور بعد میں وہ اسے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کے ذہن میں الفاظ تو موجود ہوں۔ لیکن مضمون کا پتہ نہ چلے۔ اگر الفاظ ذہن میں آجائیں تو مضمون لازماً ذہن میں آجائیگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ الفاظ اور مضمون بیک وقت ذہن میں آجائیں۔ لیکن یہ بھی زیادہ قرینِ قیاس نہیں۔ مضمون بہت سے الفاظ سے مل کر بنتا ہے اور شعر میں ان الفاظ کی کوئی ترتیب بھی ہونا چاہئے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ بہت سے باترتیب الفاظ یکدم دماغ میں آجائیں۔ اور مضمون پیدا ہو جائے۔

عموماً ہوتا یہی ہے کہ مضمون یعنی کوئی تجربہ یا خیال پہلے سے موجود ہوتا ہے اور اس کے بیان کی باری بعد میں آتی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ مضمون کو فنی اعتبار سے طرزِ بیان پر فوقیت حاصل ہے۔ البتہ یہ معلوم ہو گیا۔ کہ شاعری کے نفسیاتی عمل میں مضمون پہلا قدم ہے اور طرزِ بیان دوسرا۔ یا دوسرے الفاظ میں طرزِ بیان محض مضمون کے اظہار کا آلہ ہے۔

اب یہ بھی طے کر لیا جائے۔ کہ فنی اعتبار سے فوقیت کے کیا معنی ہیں۔ جب ہم کوئی اچھا شعر یا اچھی نظم پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں۔ تو

ہمیں ایک قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اگر فلسفہ کا کوئی مستقل قلعہ ہماری نظر سے گذرے۔ یا ہم ریاضی کا کوئی مشکل سوال حل کریں۔ تو بھی ہمیں ایک مختلف قسم کی فرحت میسر آتی ہے۔ ان دونوں فرحتوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ فلسفہ کے نظریے یا ریاضی کے سوالات ہمیں خالص دماغی فرحت بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن شاعرانہ فرحت پر جذباتی رنگ غالب ہوتا ہے۔ آپ پوچھیں گے یہ کیوں؟ یہ اسلئے کہ شاعر اپنے اشعار کے ذریعے کوئی جذباتی تجربہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ کچھ دیکھتا ہے، کچھ سنتا ہے یا کچھ محسوس کرتا ہے۔ اُسکے دل پر ایک جذباتی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور وہ چاہتا ہے۔ کہ اسکے پڑھنے والے بھی اس کیفیت میں شریک ہوں۔ اُسے خواہش ہوتی ہے کہ آپ نہ صرف اُسکے تجربہ کو سمجھیں۔ بلکہ اُس سے متاثر بھی ہوں۔ اور اُسکے تجربہ کا جذباتی عنصر آپ تک اُسی شدت اور گہرائی سمیت پہنچے۔ جس سے شاعر کا اپنا دل متاثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اگر شعر کامیاب ہے تو اسکے مجموعی تاثر میں یہ جذباتی عنصر بھی شامل ہوگا۔ اب آپ یہ کہیں گے۔ کہ شاعر کے تجربات کا جذباتی ہونا کیوں ضروری ہے شاعر فلسفیانہ مسائل کیوں نہ بیان کرے یا ریاضی کے عمل کیوں نہ سمجھائے؟ اس کا جواب یہی ہے۔ کہ اگر شعر سے ہمیں وہ مخصوص فرحت حاصل نہ ہو جو ہم شعر سے متعلق کرتے ہیں۔ تو شعر گفتن چہ ضرور؟ شاعری کوئی حکم الٰہی تو ہے نہیں کہ ہر بات شعر ہی میں کی جائے۔ اگر آپ محض کوئی ذہنی عقیدہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ یا کسی کو محض عقلاً قائل کرنا چاہتے ہیں تو نثر ہی میں کر لیجئے۔ شاعری کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ شاعری میں فلسفیانہ مسائل کا ذکر ہی نہ ہونا چاہیئے۔ شاعری میں ہر مضمون سما سکتا ہے۔ بشرطیکہ شاعر کے ذہن میں اس مضمون کا جذباتی تصور موجود ہو۔ اگر وہ کوئی فلسفیانہ مسئلہ بیان کرے تو وہ مسئلہ اُسکے ذاتی تخیلی تجربہ کی پیداوار ہونا چاہیئے۔ نہ کہ کسی خارجی عقلی عقیدہ کی۔ فلسفیانہ شاعری نسبتاً مشکل اسی لئے ہے۔ کہ ایک خوبصورت عورت کا جذباتی تصور قائم کر لینا نہایت آسان ہے لیکن نظریہ اضافیت کے متعلق کوئی شدید جذبہ محسوس کرنا اور اسے دوسروں تک پہنچانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ ان تمام باتوں سے ثابت یہ ہوا۔ کہ شاعری جذباتی تجربات کو الفاظ کے ذریعے دوسروں تک پہنچانے کا نام ہے۔ اور اس کی پہلی خوبی یہ ہونا چاہیئے۔ کہ اسے پڑھ کر ہم ایک خاص جذباتی فرحت محسوس کریں۔ جس چیز کا اس فرحت کی پیدائش میں زیادہ حصہ ہے۔ وہی زیادہ اہم بھی ہے۔ اب یہ فیصلہ کر لینا زیادہ مشکل نہیں۔ کہ اس فرحت کی پیدائش میں مضمون کو زیادہ دخل ہے۔ یا طرز بیان کو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ کہ یہ جذباتی فرحت شاعر کے تجربہ کے جذباتی پہلو کا عکس ہوتی ہے۔ اگر اُسکے تجربہ میں یہ عنصر سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ تو طرز بیان کیا کر لیگا۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے۔ کہ شاعر اپنے تجربات ہم تک الفاظ ہی کے ذریعہ سے تو پہنچائیگا۔ اگر الفاظ میں جان نہ ہو تو اُسکے تجربہ کی شدت اور گہرائی ہم محسوس ہی کیسے کرینگے۔ یہ بات نہایت صحیح ہے۔ لیکن الفاظ اپنے معانی کے علاوہ اور ہیں کیا چیز۔ اور انہی معانی کو ہم مجموعی طور پر مضمون کہتے ہیں۔ اگر الفاظ زوردار ہونگے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اُن کے معانی زوردار ہیں یا دوسرے الفاظ میں ان کا مضمون پرجوش ہے۔ اگر الفاظ بیجان اور کمزور ہونگے۔ تو مضمون بھی ایسا ہی ہوگا۔ اگر مضمون میں خلوص اور جذبہ نہ ہو تو ہم لاکھ سر ماریں الفاظ کھوکھلے اور کمزور ہی دکھائی دینگے۔ تو کیا یوں نہیں ہوتا کہ شاعر کے ذہن میں مضمون تو نہایت عمدہ ہے لیکن اُس کا طرز بیان اچھا نہیں۔ اور اسلئے شعر میں بات پیدا نہیں ہو سکی۔ یا شعر میں مضمون تو کوئی خاص ہے نہیں۔ لیکن طرز بیان کی دلکشی کی وجہ سے شعر پر لطف ہو گیا ہے۔ پہلی بات کا جواب آسان ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ شاعر کے اپنے ذہن میں کیا مضمون ہے۔ کیا نہیں۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے۔ کہ ہم تک کیا مضمون پہنچا ہے۔ ہمارے نزدیک شاعر کے ذہن میں وہی ہے۔ اگر طرز بیان ناقص ہوگا۔ تو مضمون میں بھی نقص واقعہ ہو جائیگا۔ ہم یہی کہینگے۔ کہ یا شاعر کے ذہن میں مضمون صاف نہیں یا اُس میں اتنی قوت اظہار نہیں۔ کہ اپنے مضمون کو ہو بہو ہم تک پہنچا سکے۔ بہرصورت جو مضمون ہم تک پہنچیگا ناقص ہوگا۔ اور اسی وجہ سے ہم شعر کو بھی ناقص ٹھہرائینگے۔ باقی رہی یہ بات کہ مضمون کے معمولی ہوتے ہوئے بھی ہم طرز بیان کا لطف اٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔ میں کہونگا کہ یقیناً اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن یہ لطف جذباتی نہیں، دماغی ہوگا۔ مگر کسی شعر کی بندش نہایت چست ہو یا اس میں کوئی محاورہ نہایت

خوبصورتی سے چسپاں کیا جائے۔ یا کوئی مشکل قافیہ نہایت بیساختگی سے بندھا ہو یا بحروں اور قافیوں کی ترتیب میں موزونیت اور شگفتگی پائی جائے تو ہمیں ایک فرحت ضرور حاصل ہوگی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی جادوگر کسی معزز شخص کی داڑھی سے انڈا نکال لائے یا خالی بکس سے خرگوش برآمد کرے تو ہمیں فرحت حاصل ہوتی ہے۔ دونوں حالتوں میں ہمیں خوشگوار اچنبھا سا معلوم ہوتا ہے۔ اور منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ ایسا شعر پڑھنے پر شاعر یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ع۔ "لاؤ تو استاد کیوں کیسی کہی" اور ہم اسی لہجہ میں اُسے داد بھی دیتے ہیں۔

شاید کوئی صاحب یہ اعتراض کریں۔ کہ ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ کہ روانی۔ سلاست۔ بے ساختگی وغیرہ شعر کی بنیادی خوبیاں ہیں اور ان کا تعلق طرزِ بیان سے ہے نہ کہ مضمون سے۔ یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ روانی سلاست۔ بیساختگی وغیرہ خوبیاں ضرور ہیں۔ لیکن اگر ہم ذرا سا غور کریں۔ تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ دراصل یہ مضمون یا معانی ہی کی خوبیاں ہیں۔ روانی کے یہ معنی ہیں۔ کہ جب ہمارا ذہن ایک لفظ کے معنوں سے دوسرے لفظ کے معنوں کی طرف حرکت کرے۔ تو اُسے رُکنا نہ پڑے اور اُس کی حرکت آزاد اور یکساں ہے۔ روانی کے دوسرے معنی یعنی الفاظ کی آواز پر ہم بعد میں بحث کرینگے۔ سلاست کے یہ معنی ہیں۔ کہ مضمون اتنا زود فہم اور اُس کا اظہار اتنا کامیاب ہے۔ کہ ہمیں اس تک پہنچنے میں زحمت برداشت نہیں کرنی پڑتی۔ اسی طرح بیساختگی سے یہ مراد ہے۔ کہ مضمون روزمرّہ زندگی سے نہایت قریب ہے۔ اور ہم اُسے دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں۔ اور اسو جہ سے ہمارا ذہن تازگی سی محسوس کرتا ہے۔ اگر شاعر اپنا مضمون آسانی سے ہم تک منتقل کر سکا ہے۔ تو الفاظ کیسے بھی کیوں نہ ہوں شعر سلیس ہی معلوم ہوگا۔ مثال کے طور پر غالب کے دو شعر لیجئے ؎

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم — اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

اور۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔

پہلے شعر کے الفاظ اور تراکیب فارسی ہیں۔ دوسرے شعر میں کوئی ترکیب نہیں اور الفاظ تمام سب روزمرّہ استعمال میں آتے ہیں اس کے باوجود پہلا شعر اتنا ہی سلیس ہے جتنا دوسرا۔ اب بھی بعض حضرات یہ کہینگے کہ طرزِ بیان ہی بعض اشعار کی جان ہے۔ اور بعض شعرا طرزِ بیان ہی کے بل پر شہرتِ جاوید کے حقدار ہیں۔ اگر داغ۔ امیر۔ ریاض وغیرہ کے طرزِ بیان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تو اُنکے کلام میں کچھ باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ مثلاً یہ اشعار لیجئے ؎ مہماں ہے وہ غیرتِ خورشید و قمر آج — دن آج ہے۔ رات آج ہے شام آج سحر آج

یا۔ بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں — کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

الٰہی کیوں نہیں اٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے — ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

دن آج۔ رات آج۔ شام آج۔ سحر آج کا توازن۔ کسی کے بننے اور بگڑنے کا تضاد۔ قیامت کے اٹھنے اور اُن کے بیٹھنے کا مقابلہ۔ دشمن کے قافیہ کی چستی۔ ان باتوں سے ہمیں فرحت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ فرحت محض دماغی ہے اور شاعری سے مخصوص نہیں۔ اس قسم کی فرحت ہمیں ایک ظریف کے چست فقرے یا ایک فلسفی کی استادانہ منطق بھی مہیا کر سکتی ہے۔ اگر ایسے اشعار لئے جائیں جن میں یہ لفظی صنعتیں موجود نہیں۔

مثلاً :- کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور — کیا چیز حرام ہو گئی ہے

یا۔ اس طرح کہ گھنگھرو کوئی چھاگل کا ذرا لے — جب چھم سے چلیں گود میں پیچھے سے اٹھا لے

تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہم داد اُس بات کی دے رہے ہیں۔ جو شاعر نے کہی ہے۔ یا اُن تصوّرات کی جنہیں شعر نے ہمارے ذہن میں بیدار کیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اگر یہی بات کسی اور انداز میں کہی جاتی۔ تو بے مزہ ہو جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ بات صرف اسی انداز میں کہی جا سکتی تھی۔ اور اگر کسی اور انداز میں کہی جاتی۔ تو بات بھی کچھ اور ہو جاتی۔ اور اسی وجہ سے ہمیں اس کا لطف بھی نہ آتا۔ معاملہ بندی کے اشعار کی

قیمت معاملات کی دلچسپی کی وجہ سے ہے نہ کہ بندش کے حسن کی وجہ سے ۔ داغ ۔ ریاض اور لکھنوی شعراء کے معاملات سطحی اور غیر اہم ہونے کی وجہ سے ان کا شاعرانہ رتبہ بھی بہت بلند نہیں ۔ اکثر کہا جاتا ہے ۔ کہ خالص شاعرانہ نقطۂ نظر یا خالص فنی نقطۂ نظر سے ان کا کلام بہت بیش قیمت ہے ۔ لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر صرف ایک ہی ہے ۔ اور بدقسمتی سے یہ بہت خالص نہیں ۔ اس میں مضمون کی وسعت گہرائی اور جذباتی شدت کی آمیزش فقرہ بازی ۔ قافیہ آرائی اور محاورہ بندی سے کہیں زیادہ ہے ۔ طرزِ بیان کے مدّاحوں کے اعتراضات ابھی ختم نہیں ہوتے ۔ مثلاً یہ کہ شاعری میں لفظوں کی آواز اور موسیقی کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے ۔ اور کم از کم یہ تو مضمون اور معانی ۔ مبنی ہے ۔ یہ بات بھی غلط ہے ۔ ہر لفظ کی آواز کے ساتھ اُسکے معنی کا تصور بھی ذہن میں آجاتا ہے ۔ اور اگر آوازیں بھونڈی یا دلکش معلوم ہوتی ہیں تو انہیں تصورات کی وجہ سے ۔ "ڑ" کی آواز بہت کرخت سمجھی جاتی ہے ۔ لیکن آپ پنجابی سے یہ آواز خارج کر دیں ۔ تو اس زبان کی نصف شاعری کا خاتمہ ہو جائیگا ۔ اسی طرح اگر آپ کسی سے نہایت سریلی آواز میں کہیئے کہ تم بڑے احمق ہو ، تو وہ آپ کی آواز پہ سر دھننے کی بجائے آپ سے کچھ لڑنے مرنے کو دوڑیگا ۔

ان سب باتوں سے میری یہ مراد نہیں کہ شعر کی ترکیب میں طرزِ بیان کی اہمیت ہے ہی نہیں ۔ شعر سے ہم جو فرحت حاصل کرتے ہیں وہ ایک حد تک دماغی ہوتی ہے اور زیادہ حد تک جذباتی ۔ دماغی فرحت کا تعلق طرزِ بیان سے ہے ۔ اور جذباتی فرحت کا مضمونِ شعر سے ۔ ان دونو میں سے ہم جذباتی فرحت کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ شعر کی امتیازی خصوصیت یہی ہے ۔ یہ درست ہے ۔ کہ طرزِ بیان شعر کو نثر سے تمیز کرنے میں مدد دیتا ہے لیکن ۔ "اکہتر ، بہتر ، تہتر ، چہتر ، پچہتر ، چھہتر ، ستتر ، اٹھتر" بحر اور قافیہ کے باوجود شعر نہیں کہلا سکتا ۔ شاعرانہ طرزِ بیان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مضمون پڑھنے والوں تک زیادہ سے زیادہ موثر طریقہ سے پہنچے اور اس کی کامیابی مضمون کی خوبی پر منحصر ہے ۔ دائمی قیمت مضمون یا زندگی کے بنیادی تجربات کو حاصل ہے ۔ طرزِ بیان محض اُن کا لباس ہے ۔ جو موزوں ہوا پہن لیا ۔ جو بوسیدہ ہو گیا ۔ پھینک دیا بیان کرنے ہی کو کچھ نہ ہو تو طرزِ بیان کی نوبت ہی نہیں آئے گی ۔ لیکن اگر کوئی جذبہ اظہار کے لئے بیقرار ہو تو اظہار کی کوئی نہ کوئی موزوں صورت نکل ہی آئے گی ۔ جیسے کسی نے کہا ہے کہ ؎ جو دل کو لگانے کے ڈھب جانتے ہیں ۔ وہ ترکیب و ترکیب سب جانتے ہیں "

(بااجازت اے ۔ آئی ۔ آر لاہور)

نقشِ فریادی

"نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا"

پروفیسر فیض کے فکر و فہم نے اردو شاعری میں نئی راہ پیدا کی ، قدامت اور اس کی تمام روایات کو اس انداز میں ترک کیا گیا کہ پرانے اور نئے اسالیب کے امتزاج سے ایک فکرِ نو ، پیدا ہوا ۔ پروفیسر فیض اردو شاعری کے جدید اسکول کے بہت بڑے منّاد و شارح ہیں ۔ وہ الفاظ کے بے جان پیکر میں ایک بے چین روح پیدا کر دیتے ہیں ۔ فیض کی نگاہِ تیز دل و جود کو چیر جاتی ہے ۔ فیض کا ہر شعر قاری کے سامنے ایک ایسا راز فاش کرتا ہے جسے فنکار صدیوں سے چھپاتے ہوئے تھا ۔ وہ غمناک ماحول کی عکاسی تو کرتے ہیں ۔ لیکن اُسکے ساتھ ہی پکار اٹھتے ہیں ؎ اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

تغزل اور سیاسی تفکر — سوز اور خلوص

رومانیت اور حقیقت پسندی — قیمت ایک روپیہ

مکتبہ اُردو لاہور

ہماری نسل

احمد علی

ہماری نسل ایک مایوس کُن نسل ہے، اور یہ ایک ایسا زمانہ جس میں ہم رہتے ہیں یاس اور رنج سے بھرا ہوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ زندگی میں اُمنگ تھی، امید تھی، گردوپیش کی ہر چیز میں نظام تھا۔ اور زندگی کا نصب العین برقرار تھا۔ لیکن وقت کا قانون ہے کہ دنیا کی کوئی شے ایک سی نہیں رہتی۔ ہر چیز کا رنگ بدلتا ہے، اور اس میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ چیز جو ایک وقت میں مفید سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے دور میں مضر اور بیکار ثابت ہوتی ہے۔ ترقی میں تنزل چھپا ہوتا ہے اور تنزل سے بہتری کے اسباب نمایاں ہوتے ہیں۔ وقت ایک ٹھہرا ہوا تالاب نہیں، وہ تو ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے جو نئے نئے مقامات سے گزرتا ہوا زمین کو سینچتا ہوا یا سیلابی حالت میں ہر چیز کو برباد کرتا ہوا اور سمندر کی پھیلی ہوئی آغوش کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہی رفتار زندگی کی ہے۔ انسان پیدا ہوتے ہیں اور انسان مر جاتے ہیں، لیکن زندگی اپنے خیالات کی رو میں کھوئی ہوئی اسی طرح جاری رہتی ہے۔ نہ اس پر انسان کے رنج کا اثر ہوتا ہے۔ نہ اس کی خوشی کا۔ اور نہ آدمی اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی طاقتوں سے لڑنے اور اس پر حاوی ہونے کی کشمکش میں لگے رہتے ہیں جب ایک دور لڑتے لڑتے تھک کر ہار جاتا ہے۔ تو اس میں ادبار نمایاں ہوتا ہے۔ اور ایک نیا دور نئے رنگ ڈھنگ سے اپنی جدوجہد قائم رکھتا ہے۔

موجودہ نسل بھی اسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اسکے سامنے بہت سے اہم مسئلے پیش ہیں۔ لیکن وہ ابھی تک ان کو حل نہیں کر سکے۔ پچھلے دور کا اثر ابھی اس قدر باقی ہے۔ کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن جہاں ہم نے زندگی کے بہت سے پیچیدہ مسئلوں کا دلیری سے سامنا کیا۔ وہیں ابھی تک ماضی کی بہت سی بیکار اور مضر باتوں کے بوجھ کو اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے کی ہمت نہیں کی ہے۔

خود وقت اپنے زور میں ہم کو بہائے لئے جا رہا ہے۔ اور اس کی تندی و تیزی سے بہت کچھ چیزیں برباد ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن خود ہم نے اُن کی بربادی کے لئے کوئی نمایاں کوشش نہیں کی ہے۔

یہ کہنا تو زیادتی ہوگی۔ کہ موجودہ نسل نے خیالات اور عمل کے میدان میں کچھ نہیں کیا ہے۔ شاید اگر اس کو پورا موقع ملتا تو وہ ان باتوں پر قابو کرنے اور ان کی درستی کی پوری کوشش کرتے۔ لیکن اس کی مجبوریاں کچھ ایسی ہیں، کہ وہ اپنا پورا وقت ان باتوں پر صرف نہیں کر سکتے۔ ماضی اور مستقبل میں سخت کشمکش ہے۔ پچھلے نظریوں اور موجودہ مغربی طرز میں ایک جدوجہد جاری ہے۔ اور ہمارا نصب العین تعلیم بھی کچھ ایسا ہے۔ اسکے علاوہ روزی کمانے اور زندگی بسر کرنے کے لئے جو جھگڑے اور مجبوریاں بھی کچھ ایسی درپیش ہیں، کہ کوئی شخص اِن معاملات سے پوری طرح دخل نہیں دے سکتا۔ لیکن انسانیت کا تقاضا ہے۔ کہ انسان اپنی بہتری اور بہبودی کے لئے جان توڑ کوشش کرے۔ لیکن عام طور پر ہماری نسل کا نصب العین بہت پست ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں، جن کا نصب العین بلند ہے، جو اپنے خیالات کے لئے جان دینے کو تیار ہیں۔ لیکن اُن کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ عام طور پر ہماری نسل ہر چیز کو ناامیدی اور یاس سے دیکھتی ہے۔ اگر اُن کے دلوں میں کبھی کبھی کسی جذبہ یا کسی خواہش کی آگ بھڑکتی ہے۔ تو اکثر اوقات اُن میں اپنی خواہشات پوری کرنے کی طاقت نہیں۔ اور ہ آئندہ گویا ہمارے دماغ سوچتے ہیں ہماری روح مر چکی ہے۔ ہمارے جسم سن ہوگئے ہیں آبحیات کے گھڑوں کی طرح ہم پانی کو حسرت بھری آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ہم میں اتنی طاقت نہیں۔ کہ پانی تک پہنچ سکیں۔

ہم تو ایک خوابی دنیا میں رہتے ہیں، ایسی دنیا جسے ہم نے خود بنایا ہے، ایک ایسی دنیا جس میں ہر چیز گویا ہماری مرضی کے مطابق خود بخود ہو جائے گی۔ شاید اس کا بڑا سبب یہ ہے۔ کہ ہم کوششیں کرتے کرتے

تھک گئے ہیں۔ اور اب گویا ہم میں اور دنیا دونوں کا لامیاں سہنے کی تاب باقی نہیں۔ ہمارا فلسفۂ حیات اب یہی نہیں رہا۔

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہم گو لستے بھی ہیں۔ مایوس بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں اب اس بات پر یقین نہیں۔ کہ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو رہے گا۔ چنانچہ ہم حواس باختہ ہو کر سرِ راہ تھک کر بیٹھ گئے ہیں۔ نہ آگے بڑھتے ہی بنتی ہے۔ اور نہ ٹھہرتے بن پڑتی ہے۔ ہم دو دنیاؤں کے بیچ میں گویا اس کشمکش میں پھنسے پڑے ہیں۔ کہ کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے قویٰ تھک گئے ہیں۔ اور ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔

ایک روز میں ایک خاتون سے باتیں کر رہا تھا۔ شروع مارچ کا زمانہ تھا۔ کمرہ کے باہر درختوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور ہوا میں خفیف سی خنکی تھی۔ فضا میں ایک ایسی یاس اور درد کی کیفیت تھی۔ جو صرف کبھی کبھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک ایسی عجیب کیفیت جو مردہ دلوں کو جگا دیتی ہے اور انسان کو اس بات پر مجبور کر دیتی ہے۔ کہ وہ اپنے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے۔ کمرہ میں ایک خاص نسوانی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ اور ان خاتون پر کچھ ایسی کیفیت طاری تھی۔ کہ گو اس سے قبل انہوں نے مجھ سے کبھی راز کی باتیں نہیں کی تھیں۔ آج ایک خاص نرمی اور گداز سے باتیں کرنے لگیں۔

میں تو بس ایک خوابی دنیا میں رہتی ہوں۔ یہ دنیا بڑی تسکین بخش اور حسین ہے۔ مجھے اس میں ایسا سکون حاصل ہوتا ہے جو مجھے دنیا کی کسی اور چیز میں کبھی حاصل نہیں ہوا۔ اور جب کبھی میں پریشان ہوتی ہوں تو خود بخود اس دنیا کے کواڑ کھل جاتے ہیں۔ اور میں اس کے اندر گنگناتی ہوئی بیٹھی رہتی ہوں۔ شاید یہ محض ایک خواب ہے۔ اور میں خواب میں زندہ ہوں ایک بہت بڑا جنگل ہے۔ جس میں طرح طرح کے درخت ہیں۔ ہر درخت کے جداگانہ تاثرات ہیں جیسے وہ ایک خوبصورت جاندار چیز ہے۔ کوئی درخت بہت اونچا ہے اور کوئی چھوٹا۔ کوئی سایہ دار ہے تو کوئی سرو کی طرح سیدھا ہے۔ میں اس جنگل میں پھرا کرتی ہوں۔ اور اپنے درخت دوستوں سے باتیں کیا کرتی ہوں۔ اور وہ مجھ سے محبت اور خوشی سے باتیں کرتے ہیں۔ کوئی درخت بھی ایسا نہیں جس کو میں اچھی طرح نہ جانتی ہوں۔ مجھے ان سب سے محبت سے انس ہے۔ اور وہ درخت میرے رفیق ہیں۔ جب کبھی مجھے کوئی شخص بہت

پسند آتا ہے۔ تو وہ میرے خواب میں ایک درخت بنجاتا ہے۔ اور میں گھنٹوں اس سے پیار اور الفت کی باتیں کرتی رہتی ہوں۔ اور آپ بھی اب میرے خواب کا ایک غیر فانی اور ہمیشہ زندہ رہنے والا حصہ بنجائیں گے

وہ بڑی دیر تک اپنے خواب کی باتیں کرتی رہیں۔ بڑی خوبصورتی اور یاس سے۔ ان کی بھرائی ہوئی نرم آواز میرے کانوں میں موسیقی کی طرح بجتی رہی۔ اُن کی آنکھوں کی خوابیدہ اور خوبصورت کیفیت اور اُن کے نرم نرم ہاتھ جو درختوں کا تذکرہ کرتے وقت اس طرح ہلتے تھے۔ جیسے وہ درختوں کو پیار کر رہے ہوں۔ میرے دل میں گھر کرتے گئے۔ اور جب میں اٹھ کر چلا تو انہوں نے مجھے اس طرح اپنی دلکش باتوں سے روک لیا کہ مجھ کو احساس بھی نہ ہوا۔ کہ میں رک گیا ہوں۔ بہت دیر کے بعد جب میں رخصت ہوا تو رات نے اپنا سیاہ لبادہ دنیا پر ڈال دیا تھا۔ ہر چیز خاموش تھی اور تاروں کی چمک بہت خوابیدہ اور حسین معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میں ان خاتون کو ہمیشہ سے جانتا ہوں۔ مجھے ان کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا۔ کاش کہ میں ان کی مدد کر سکتا۔ اور اُن کو اپنے خواب سے جگا کر واپس دنیا میں لے آتا۔ لیکن پھر میں اس بات پر غور کرنے لگا۔ کہ وہ اس دنیا میں کبھی اس قدر خوش نہ رہ سکیں گی اور نہ دنیا اُن کے قابل ہے۔ اور جب میں نے اس بات پر دوبارہ غور کیا۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ ان خاتون کی کہانی صرف ایک متنفس کی کہانی نہ تھی۔ یہ تو ہماری پوری نسل کی کہانی ہے۔ بارہا میری باتیں نوجوانوں سے ہوئی ہیں۔ اور سب کو میں نے ایک خوابی دنیا میں کھویا ہوا پایا ہے۔ بعض کو اس بات کا احساس ہے۔ لیکن بیشتر اس اصلیت سے بے بہرہ ہیں۔ جن کی خوابی دنیائیں خوشنما ہیں۔ لیکن زیادہ تر بس کشاں کشاں وقت کی رو میں اس طرح چلے جاتے ہیں۔ کہ ان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور حقیقت کیا ہے۔ اگر اُن کو کوئی چیز پسند آتی ہے۔ تو وہ اُس کو حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور اس کو صرف اپنے خوابوں میں پا لیتے ہیں۔

اور یہ ہے ہماری مایوس کن اور افسردہ نسل کی کیفیت۔ زندگی کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ اور ہم اُس کو سمیٹ نہیں سکتے۔ پرانی دنیا مر چکی ہے۔ اور نئی ابھی تک پیدا نہیں ہوئی۔ ہم زمانہ کے ہیں۔ اور نہ ادھر

کے۔ ماضی ہمیں اپنی طرف بلاتا ہے۔ لیکن ہم دو زندگیوں کے بیچ میں گھر گئے ہیں۔ اور واپس جا نہیں سکتے۔ مستقبل کے افق پر ابھی تک صبح کے آثار نمایاں نہیں۔ ہم اندھیرے میں کھڑے بدحواس ہوئے جاتے ہیں۔ لیکن موجودہ نسل ماضی سے اسقدر گھبرا گئی ہے۔ کہ وہ اس سے دور بھاگنا چاہتی ہے اور چونکہ مستقبل کے نئے نظریے ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آتے ہیں۔ اس لئے بہت سی بدعنوانیاں ظہور میں آ رہی ہیں۔ آجکل کے نوجوان، وہ لوگ جو مجھ سے اور میرے معاصرین سے کوئی دس سال چھوٹے ہیں، اور بھی مختلف ہیں۔ شاید ہم لوگوں پر ماضی کے اخلاق و اطوار کا اثر کچھ زیادہ پڑا، اور گو ہم بھی ماضی سے کترا کر نئے سمتوں میں بھاگ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی ہم میں ایک اخلاقی دلیری یا شاید کمزوری باقی تھی۔ ہم میں ایمانداری اور سنجیدگی کا مادہ تھا، ہم میں سے بہت سے اپنے خیالات کے لئے جان دینے پر تیار تھے۔ ہم میں سے بہت سوں کا نصب العین بلند تھا حالانکہ ہم میں سے بہت سے کہیں زیادہ ٹوٹتا اور کہیں زیادہ مشن اور مایوس بھی تھے آج کل کی نسل میں ہم سے زیادہ دلیری ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی حالانکہ ان کو اس بات کا احساس نہیں۔ وہ ہم سے کہیں زیادہ بڑے بت شکن ہیں حالانکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں۔ اکثر صرف بلا سوچے سمجھے کرتے ہیں۔ اگرچہ اُن کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو قابل تحسین ہیں، لیکن اُن باتوں کی جڑ کسی خاص نظریہ پر مبنی نہیں ہے، صرف ایک معاشرتی ہیجان کی پیداوار ہے۔ اُس آزادی کا نتیجہ ہے۔ جو اُن سے پہلے کی نسل نے اُن کو دی۔

اب سے دس سال پہلے والی نسل کے لڑکے اور لڑکیوں میں دوستی ضرور تھی، لیکن انہوں نے یہ دوستیاں سخت مخالفت کے باوجود کیں اسلئے کیں۔ کہ اُن کو اس بات کا یقین تھا۔ کہ مرد اور عورتیں برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اُن کی دوستیوں میں ایک پاکیزگی تھی۔ چاہے وہ اخلاقی کمزوری کی وجہ سے ہو یا اخلاقی پختگی کی وجہ سے۔ آجکل کی دوستیاں اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں اس خواہش سے یکجا ہوتے ہیں۔ کہ وہ دلبستگی کریں جسے انگریزی میں کہتے ہیں

اُن کے رویہ سے شبہ ہوتا ہے۔ کہ اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کوئی عزت نہیں، وہ تو ایک دوسرے کو محض دل لگی کا سامان سمجھتے ہیں۔ اور جب کام نکل جاتا ہے۔ تو وہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور پرانے دوستوں کو چھوڑ کر نئے نئے دوست حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی مثال تو ایک ایسے گلاس کی سی ہے۔ جس میں سے بیسیوں شخص پانی پیتے ہیں۔ اور جیسے جھوٹے ہونے کا کسی کو بھی کچھ احساس نہیں۔ ان کے دلوں میں نہ زندگی کی عظمت معلوم ہوتی ہے۔ اور نہ جنس کی عزت۔ اگر وہ یہی بات کسی خاص مذہبی یا اخلاقی نظریہ کے تحت ہی کریں۔ تو ہم بھی جو اُن سے بڑے یا اُن سے پیچھے ہیں۔ اُن کی عزت کریں اور اُن کو فخر کی نگاہ سے دیکھیں۔ لیکن وہ جو کچھ کرتے ہیں محض وقت گزارنے کی نیت سے کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کا کوئی نصب العین نہیں، انکو اس بات کا قطعی احساس نہیں۔ کہ وہ کدھر جا رہے ہیں اور کہاں جا کر رہیں گے۔ انہیں تو صرف رفتار سے تعلق ہے، باقی خدا جانے۔

یہی بات زندگی کے اور شعبوں میں بھی نمایاں ہے۔ شاید یہ تعلیم کی خرابی کا نتیجہ ہو یا اخلاقی تربیت کی کمی کا۔ بہرحال واقعہ ہے۔ وہ جو ہر سے ہزارہا طلبا ر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہر سال داخل ہوتے ہیں اور ہر سال چلے جاتے ہیں۔ لیکن کسی کو اس بات کا احساس نہیں۔ کہ آخر وہ تعلیم کیوں حاصل کر رہے ہیں۔ تعلیم نہیں بلکہ محض ڈگریاں۔ اور ڈگریاں لینے کے بعد کیا کریں گے؟ کوئی بھی اس بات پر غور نہیں کرتا۔ کوئی بھی نہیں سوچتا کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے۔ وہ کھانا بھی جب کھاتے ہیں۔ تو محض پیٹ کی آگ بجھانے کو نہ کہ قوت اور طاقت حاصل کرنے کو۔ وہ دوستیاں کرتے ہیں محض اچھا وقت گزارنے کو نہ کہ ایک دوسرے کی ڈھارس بندھانے یا مدد کرنے کو۔ وہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ علم حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ بیکار کاغذ کی ڈگریاں لینے کے واسطے۔ اور وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ غذا اور دوستی اور ڈگریاں خود بخود اُن کے لئے علاءالدین کے غار کا دروازہ کھول دیں گی اور وہ بغیر محنت و مشقت بغیر عزت و عظمت بغیر تعلیم و تربیت سونے کی چڑیا پالیں گے مگر اس تاریک و بے امید تصویر کا جو میں نے کھینچی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ہماری نسل میں صرف برائیاں ہی برائیاں ہیں۔ اور کوئی خوبی نہیں۔ خوبیاں ضرور ہیں۔ لیکن یہ خوبیاں ان خرابیوں میں کوئی نصب العین نہ ہونے کی وجہ سے دب چھپ گئی ہیں۔

مگر یہی ہے۔ کہ یہ سب چیزیں اس بات کا ثبوت دیتی ہیں۔ کہ ایک نیا دور آنے والا ہے۔ ایک نیا زمانہ۔ اس قسم کی خرابیاں، ایک ملکیا

قوم کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر نمودار ہوتی ہیں۔ اور وہ آنے والے خوشنما اور امید افزا دور کی آمد کی خبر دیتی ہیں، ایسے دور کی جب اس قوم کے ہر فرد و بشر کے دل میں ایک نئی امنگ نیا جوش ہوگا۔ جب اُسکے نئے نسل کو اپنے اوپر بھروسا اور اپنی طاقت اور خوبصورتی پر ناز ہوگا۔ اس وقت ہم زندگی کے زینے کے موڑ پر کھڑے ہیں۔ اور جب اس تاریک فضا سے نکل کر تازی ہوائیں سانس لیتے ہیں۔ وقت کے تاریک پہرہ پر روشنی کی جھلک آنے والی ہے۔ زندگی کی افق پر سورج کی پہلی کرن پھوٹنے کو ہے۔ اور پھر ہماری آنکھیں ہر چیز کو نئے سورج کی روشنی میں صاف صاف دیکھنے لگیں گی۔ زندگی کا پیغام نئے سرے سے ہمارے دلوں میں گونج اٹھے گا اور ہم پھر تر و تازہ ہو کر انسان کی بہتری اور اسکی بہبودی کے کام میں مشغول ہو جائیں گے

ہری چند اختر

خیالاتِ پریشاں

صحیفے بھی پیمبر بھی ترے ابلیس بھی تیرا الٰہی روزِ محشر امتحاں تیرا ہے یا میرا
ترے مخبر نے کی رسوا مری فطرت تری صنعت قصور اس میں بتا اے بدگماں تیرا ہے یا میرا
علامت میرے عصیاں کی ہے بیشک داغِ پیشانی
مگر یہ داغِ دل یارب نشاں تیرا ہے یا میرا

۱

عبادت اپنے انعام، زاہد
کہ تیرا امر کر سعی و تمنا
ہوس کاری ہے مشتاقی نہیں ہے
شراب و جام ہے ساقی نہیں ہے

۲

کہیں افراطِ مے ہے چہرہ افروز
مجالِ دم زدن کس کو ہے یارب
کہیں خونِ جگر باقی نہیں ہے
مگر یہ شانِ رزاقی نہیں ہے

آغا عبدالحمید

کرشن جی کی مورتی

چمپاوتی کے شہر کو جاگتا ہوا سورج اپنی پھیکی زرد کرنوں سے نہلا رہا تھا۔ سفید مندروں کے اونچے کلس چمک رہے تھے۔ شہر ایک کروٹ لیکر ایک نئے دن کی آمد کے لئے جاگ اٹھا تھا۔ بڑھے سنگتراش سوریت کیتو نے آنکھیں کھولدیں۔ اور آسمان کو تکنے لگا۔ اسے رات اچھی نیند نہ آئی تھی وہ بیٹھا ہوا گھنٹوں اور گھڑیالوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ کہیں دور سے اندھے فقیر سور داس کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ سوریت کیتو کا جی اٹھنے کو نہ چاہتا تھا۔ اسے اپنے جسم میں کوئی سکت معلوم نہ ہوتی تھی۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس کی ہڈیاں لوہے کی بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح لیٹے لیٹے ہی وہ کچھ دیر جاگتی ہوئی دنیا کی پریشان صدائیں سنتا رہا۔ . . رات کے آرام کے بعد سب لوگ پھر اٹھ بیٹھے ہیں۔ اب یہ دن بھر اسے مارے پھریں گے آخر ایسی بھی کیا کوفت ہے. . . وہ ہمت کرکے اٹھا اور اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ اسکے صحن میں کچھ ادھورے اور کچھ مکمل بت اور پتھروں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ وہ پاؤں گھسیٹتا ہوا صراحی کے پاس گیا اور ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ بھر کر پیا تو طبیعت کی بدمزگی کچھ کم ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ نہانے اور ناشتہ کرنے کے بعد اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی تکان کم ہو گئی ہے۔ وہ بازار کا ایک چکر لگانے کیلئے گھر سے نکلا۔

سوریت کیتو نے جونہی گھر سے باہر قدم رکھا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ مزدور سرخ پتھر کا ایک بہت بڑا ٹکڑا پریتم نند کے گھر کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ بھی ایک سنگتراش تھا۔ لیکن ابھی جوان تھا۔ سوریت کیتو کے دل میں ایک حسرت آمیز خوشی کی لہر اٹھی۔ وہ اب بڈھا ہو چلا تھا۔ اس کی تمام عمر سنگتراشی میں گزری تھی۔ اپنی عمر میں وہ مختلف دیوتاؤں کے ہزاروں بت بنا چکا تھا۔ اور بڑے بڑے شناساؤں سے تحسین و آفرین حاصل کر چکا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ تھی۔ اب اس میں اتنی ہمت نہ رہی تھی۔ کہ کسی بڑے کام کو ہاتھ میں لیتا۔ آرزوئیں بہت تھیں۔ لیکن کام کرنے کی طاقت اب ختم ہونے کو آ چکی تھی۔ وہ جلد تھک جاتا تھا۔ اسکے ہاتھوں میں چستی اور چابکدستی کی بجائے رعشہ کے آثار تھے۔ پریتم نند ابھی جوان تھا۔ اور نوجوانوں میں وہ تمام ولولے اور جوش تھا۔ جو کبھی سوریت کیتو کے سینے میں بھی موجزن تھے۔ وہ جب کبھی پریتم نند سے ملتا۔ تو پریتم نند بڑے ادب سے پیش آتا۔ اور اس کی باتوں کو غور سے سنتا بظاہر اسکے مشورے پر عمل کرتا ہوا بھی معلوم ہوتا۔ لیکن اسکے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ ظاہر کرتی تھی۔ کہ وہ ساتھ ہی ساتھ کسی خفیہ طریقہ سے سوریت کیتو کی ہنسی بھی اڑاتا تھا۔

بڈھے سنگتراش کو یہ بات کچھ بہت بری نہ لگتی۔ جوانی میں وہ بھی اسی طرح بوڑھوں پر ہنس لیا کرتا تھا۔ لیکن اتنا نہیں۔ جتنا پریتم نند اور اس کی عمر کے نوجوان۔ پر زمانہ ہی کچھ ایسا آ رہا تھا۔ بہر حال یہ خوشی کی بات تھی۔ کہ چند ایسے نوجوان تو تھے۔ جو اس کی طرح فن میں حقیقی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کا تجربہ محدود سہی فن سے واقفیت کم سہی۔ لیکن قوتِ تخلیق تو جوش پر تھی۔ وہ نئی راہیں نکالنے کے لئے بیتاب تو تھے۔ کام کرتے رہنے سے تجربہ وسیع ہو جاتا ہے۔ چابکدستی بڑھ جاتی ہے. . . یکایک سوریت کیتو نے ایک آہ بھری۔ ہاں تجربہ وسیع ہو جاتا ہے چابکدستی بڑھ جاتی۔ لیکن اسکے ساتھ ہمت اور جوش بھی تو کم ہو جاتے ہیں۔ قدرت کتنی عجیب چیز ہے۔ زندگی میں کتنا کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔ میں اب اتنا تجربہ حاصل کر چکا ہوں۔ فن کے اصولوں سے کتنا واقف ہو گیا ہوں۔ لیکن جوانی کی ہمت اور جوش آہ وہ کیا ہوئیں۔ مجھ میں اگر اس تمام تجربے کے ساتھ پریتم نند کا جوش اور ولولہ بھی ہوتا تو. . . سوریت کیتو نے پھر ایک آہ بھری۔ ان باتوں کے سوچنے سے کیا حاصل زندگی کے اصول کون بدل سکتا ہے ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے۔ اور شاید ایسا ہی ہوتا جائیگا۔ پریتم نند کو کیا معلوم کہ بڑھاپا کیا چیز ہے۔ سوریت کیتو نے تلخی سے سوچا۔ ان [illegible] پچھلے ہوسوں میں یاد [illegible] حسرتوں میں بدلتی جاتی ہیں [illegible]

زندگی کا پہلا حصہ گزر جاتا ہے۔ یا ایک انسان کسی خواب سے بیدار ہو کر محسوس کرتا ہے۔ کہ تندرستی کی زندگی ختم ہو گئی۔ کیا فضول ہے کیسی ختم ہو گئی جوانی میں ہی ایسی رنگین زندگی نہ گزارتا تو شاید کچھ سال اور بوڑھا نہ ہوتا کچھ سال اور۔ پہلے وقت سے کون لڑ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ سوچنے سے کیا حاصل؟

سوریت کیتو یہ سوچتا ہوا پریتم نند کے مکان میں داخل ہوا۔ صحن میں پیپل کے سایہ دار درخت کے نیچے پریتم نند سنگ مرمر کے پتھر کے اس ٹکڑے کو تک رہا تھا جو مزدوروں نے ابھی ابھی لا کر رکھا تھا۔ سوریت کیتو کو داخل ہوتے دیکھ کر بولا۔ "آؤ چچا کیسے آئے" وہ کوئی پچیس چھبیس سال کا مضبوط اور حسین نوجوان تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی چمکیلی آنکھیں سڈول ناک اور نازک ہونٹ مردوں کے سے تھے۔ لیکن ان سب میں نسوانیت کی ایک جھلک نظر آتی تھی۔ جس کو اسکے لمبے بالوں نے نمایاں کر دیا تھا۔ جب وہ مسکراتا تو اسکے ہونٹوں پر رنگ دلی کی ایک خفیف سی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اس کی پتلی اور لمبی انگلیاں بہت حساس معلوم ہوتی تھیں۔ پریتم نند کے چہرے اور برتاؤ میں ایک قسم کی بے پروائی اور آوارگی پائی جاتی تھی جو قریباً بغاوت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ سوریت کیتو نے دل ہی دل میں اپنے سوکھے ہوئے جسم سفید ڈاڑھی اور کسی قدر کانپتے ہوئے ہاتھوں کا مقابلہ پریتم نند سے کیا اور اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔

پریتم نند نے ہنس کر کہا۔ "کہو چچا کیسی سوچ میں ہو۔ آج سویرے ہی سویرے کیسے آنا ہوا؟"

سوریت کیتو نے چونک کر کہا۔ "کچھ نہیں کسی خاص سوچ میں نہ تھا۔ یونہی چلا آیا۔ اتنے بڑے پتھر سے کیا بناؤ گے؟"

پریتم نند نے جواب دیا۔ "کرشن جی کی مورتی۔"

بوڑھے سنگتراش نے جیسے بے خیالی میں یہ الفاظ دہرائے "کرشن جی کی مورتی مگر کرشن جی کی مورتی" پھر یکایک بولا "پر یہ پتھر تو کچھ جاندار نہیں"

پریتم نند نے گویا یہ بات سنی ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اس کی آواز میں جذبات کے وفور سے ایک لرزش تھی۔ "ہاں کرشن جی کی مورتی بناؤں گا۔ رام گھاٹ کی ماتا سوندریہ لتا نے بنانے کو کہا ہے۔ بسنت اتسو کے موقع پر بھوگ منڈپ میں لگائی جائیگی۔ ماتا سوندریہ لتا نے کہا تھا۔

"بیٹا پریتم نند میں تمہاری بہت تعریف سن چکی ہوں۔ ایسی مورتی بنا دو کہ جو دیکھے واہ واہ کر اٹھے۔ پیسے کی پرواہ نہیں۔ اپنے خاوند کی یاد میں بنوا رہی ہوں مرنے والے کے لائق ہو۔ مورتی ابھی پوری تو مہاراج بھی درشن کو آئیں گے" مورتی میرے دماغ میں تیار ہو چکی ہے۔ کرشن جی کی عام مورتیوں سے بہت مختلف ہوگی۔ عام مورتیوں میں کرشن مہاراج مجھے تو بے تعلق بیجان معلوم ہوتے ہیں۔ دیوتاؤں والی سختی اور رعب تو شاید ہوتا ہے۔ پر وہ نرمی اور پریم جو کرشن جی کی خاص خوبیاں ہیں نظر نہیں آتیں۔ میں ایسی مورتی بناؤں گا جس میں سے محبت اور شعریت ٹپکے۔ کرشن جی ایک انسان نما دیوتا معلوم نہ ہوں بلکہ ایک دیوتا خصلت انسان۔ ان کی زندگی کی رنگینی اور موسیقیت نمایاں ہو۔ ان کو عام مورتیاں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ان کی گوپیاں بھی تھیں۔" پریتم نند یکایک رک گیا اور اپنے خیالات میں کھو گیا۔

سوریت کیتو نے کہا۔ "پر اس پتھر پر اتنی محنت کرنی بیکار معلوم ہوتی ہے۔ یہ سرخ پتھر ریتلا اور بودا ہوتا ہے۔ چند سالوں میں اس پر کھدے ہوئے نقش ماند پڑنے لگ جاتے ہیں۔ یہ پتھر تو سستے اور معمولی کام کے لئے ہے۔ مورتی ہو گی کس ڈھنگ کی؟"

پریتم نند نے جواب دیا۔ "کرشن جی ایک ٹانگ پر کھڑے بنسری بجا رہے ہونگے۔ ان کی آنکھیں دور کہیں تک رہی ہونگی۔ . . ."

سوریت کیتو نے بات کاٹ کر کہا۔ "ایک ٹانگ پر کھڑے ہونگے؟"

پریتم نند اپنی آنکھیں آدھی بند کئے ایک جوش سے بول رہا تھا۔ "ہاں وہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہونگے دائیں ٹانگ پر بائیں ٹانگ کے گھٹنے میں کسی قدر خم ہو گا اور پیر کی انگلیاں دائیں ٹخنے کے پاس اس طرح رکھی ہونگی کہ۔"

سوریت کیتو کسی قدر گھبرا کر تیزی سے بولا۔ "نہیں۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

پریتم نند حیرانی سے بوڑھے سنگتراش کو تکنے لگا۔ "کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا مطلب؟"

سوریت کیتو نے جواب دیا۔ "ایسی مورتی نہیں بن سکتی۔ میرا مطلب ہے۔ ایسی مورتی نہیں بنانی چاہیئے۔"

"کیوں؟ اس میں آخر کیا برائی ہے؟"

" برائی کا سوال نہیں۔ یہ پتھر اتنا بودا ہے۔ کہ اگر تم مورتی کو صرف ایک ٹانگ پر کھڑا کرو گے۔ تو نچلا حصہ بہت پتلا ہو جائیگا اور وہ تمام مورتی کا بوجھ نہیں سنبھال سکیگا۔ مورتی میں ٹخنے پر سے ٹوٹ جائیگی۔ آخر مہاراج کرشن کی مورتی میں یہ ضروری تھوڑا ہے کہ وہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہوں۔ یہ تو صرف نٹ راجہ کی مورتی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

پریتم نند نے کہا "تم نے ٹھیک پتہ کی بات کہی۔ مجھے نٹ راجہ کی مورتیاں دیکھکر خیال آیا تھا۔ کہ یہی رنگینی اور موسیقیت کرشن جی کی مورتی میں کیوں نہ ہو۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ کرشن جی کی مورتی میں یہ خاصیتیں نفیس اور اعلےٰ قسم کی ہونگی۔ نٹ راجہ کی ولولہ خیز ہنگامیت شعریت میں ڈوب کر ایک پرامن خوبصورتی میں تبدیل ہو جائے گی۔ میں نے مورتی کو چھوٹے پیمانے پر ماٹی والے تیس بنایا ہے۔ تم دیکھو گے تو پسند کرو گے "۔

سویت کیتو نے کہا " دیکھیں تو بھلا "۔

پریتم نند کمرے کے اندر گیا اور ایک چھوٹی سی مورتی اٹھا لایا۔ یہ مورتی ایک بالشت بھر سے زیادہ اونچی نہ تھی۔ پریتم نند نے جیسا بیان کیا تھا۔ بالکل ویسی ہی تھی۔ کرشن جی کی آنکھوں میں ایک ایسا خمار تھا گویا رکسی اور دنیا کو دیکھ رہے ہیں۔ جسم کے ہر ایک حصے سے نرمی رنگینی اور شعریت ٹپکتی تھی۔ سویت کیتو مورتی دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے عمر بھر میں ایسی خوبصورت مورتی نہ دیکھی تھی۔ اس نے نہایت متانت سے کہنا شروع کیا۔

" بیٹا پریتم نند تم پیدائشی مہاراج ہو۔ میں نے ایسی مورتیاں زندگی میں کم دیکھی ہیں۔ ایسے شاندار خیال انسان کو زندگی میں کبھی کبھی نصیب ہوتے ہیں۔ اتنی شاندار چیز اس بودے پتھر میں بنانا گناہ ہے۔ تمام محنت بیکار جائے گی۔ دیکھو ایک بڈھے کی نصیحت کو بیکار نہ جانو۔ یہ مورتی ٹوٹ گئی تو شاید پھر ایسی نہ بنا سکو۔ اسکو کسی اچھے پتھر میں بناؤ "۔

پریتم نند کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ اور بے رحم ہنسی تھی۔ " خیر تم مان تو گئے کہ مورتی اچھی ہے۔ تمہارا اس پتھر کے متعلق خیال غلط ہے اگر مورتی کا توازن درست ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ گر جائے "۔

بڈھے سنگتراش کی آواز میں ایک التجا تھی "لیکن میں اس پتھر پر تمام عمر کام کرتا رہا ہوں۔ مجھے اسکا پورا تجربہ ہے "۔

پریتم نند نے کسی قدر بے صبری سے کہا " تو میں بھی اسکا تجربہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم تجربہ کرنا چھوڑ دیں تو ہمیشہ ایک ہی لکیر کو پیٹتے رہیں "۔

" لیکن اس قسم کے تجربے کا کیا فائدہ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ تجربہ بیکار رہے "۔

پریتم نند نے تلخی سے کہا " میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں اسی پتھر سے یہ مورتی بناؤنگا "۔

سویت کیتو نے صلح کل لہجے میں کہا " اچھا یونہی سہی لیکن مورتی کو ایک ٹانگ پر کھڑا تو نہ کرو۔ یا کم از کم سہارے کے لئے کوئی چیز پیروں کے قریب بنا دو "۔

پریتم نند گویا اس گفتگو کو بند کرتے ہوئے بولا " اس سے میرے تصور میں فرق آتا ہے۔ مورتی میں میں کوئی تبدیلی کرنے پر تیار نہیں تم مجھے اسکے متعلق کچھ مت کہو "۔

بوڑھا سنگتراش مایوس ہو کر چپ ہو گیا اور حاسدانہ نظروں سے مورتی کو دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا جوانی واقعی دیوانی ہوتی ہے۔ پریتم نند کو کیا معلوم کہ اسکے ہاتھ کیسا موتی لگا ہے۔ اسکو وہ یونہی گنوا رہا ہے۔ سب محنت اکارت جائے گی پھر بلند آواز میں بولا " اچھا تمہاری خوشی۔ تمہیں میری بات بری لگتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن دیکھ لینا میرا کہنا ٹھیک ثابت ہوگا "۔

پریتم نند نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ سویت کیتو یہ کہہ کر اپنے گھر کو چل دیا۔ اسے تمام دن یہی خیال ستاتا رہا۔ کہ پریتم نند کو اس غلطی سے روکنا چاہیئے۔ وہ طرح طرح کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ رات وہ اچھی طرح سے سو نہ سکا۔ عجیب پریشان خواب دیکھتا رہا۔ کہ پریتم نند نے پہاڑ جتنی بڑی مورتی بنائی ہے اور ٹوٹ کر گر پڑی ہے۔ سارا شہر اسکے نیچے دب گیا ہے اور ہزاروں مرد عورتیں مر گئے ہیں۔

سویرے اٹھکر سویت کیتو پھر پریتم نند کے گھر گیا۔ اس نے مورتی پر کام شروع کر دیا تھا۔ سویت کیتو نے کہنا شروع کیا " میں نے ایک نئی ترکیب سوچی ہے۔ مورتی کے پیروں کے پاس درخت کا ایک ٹوٹا ہوا تنہ بنا دو۔ اس سے مورتی کو سہارا ہو جائیگا "۔

پریتم نند نے جھلا کر کہا " تم نے صبح ہی صبح پھر وہی بات شروع

کر دی ہیں مشکل کہا تھا کہ میں مورتی کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ پھر کسی قدر حقارت سے بولا۔ "ترکیب تو خوب نکالی ہے اور درخت کے تنے کو مورتی سے کیا تعلق؟"

بوڑھے سنگتراش نے نرمی سے کہا۔ "اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ میں تو تمہاری بہتری کے لئے کہتا ہوں"

"میں اپنی بہتری خوب سمجھتا ہوں۔ مجھے مشورہ کی ضرورت ہوگی۔ تو میں تم سے کہہ دونگا۔ تمہیں میرے کام میں ہرج کرنے کا کوئی حق نہیں"

لیکن سویت کیتو سے نہ رہا جاتا۔ اسکو چین نہ پڑتا۔ وہ ہر روز پریتم نند کے گھر جاتا اور کوئی نہ کوئی نئی ترکیب بتاتا۔ پریتم نند شروع میں تو کسی قدر لحاظ کرتا رہا۔ لیکن بعد میں وہ سویت کیتو کو جھڑک دیتا۔ وہ غصے سے چلا اٹھتا "بڈھے تو پاگل ہو گیا ہے پاگل۔ میرے گھر آتا ہو تو میرے کام میں دخل نہ دیا کر" مورتی آہستہ آہستہ تیار ہو رہی تھی۔ سویت کیتو جب خود کہتے کہتے ہار گیا۔ تو اور لوگوں سے کہا کہ تم پریتم نند کو سمجھاؤ۔ یہ مورتی ٹوٹ جائیگی۔ اسے یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ پریتم نند کے ہتھوڑے کی ہر ضرب گویا اسکے سینے پر پڑ رہی ہے۔ اسے ایک قسم کا خبط سا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا کام چھوڑ دیا تھا۔ وہ تمام دن بیٹھا بے بسی سے مورتی بنتی دیکھتا رہتا۔

آہستہ آہستہ مشہور ہو گیا۔ کہ سویت کیتو پاگل ہو گیا ہے۔ پریتم نند اب اس کی باتوں پر خفا نہ ہوتا۔ بلکہ ہنس دیتا۔ اور جب صبح صبح سویت کیتو اسکے گھر میں داخل ہوتا۔ تو وہ کہتا۔ "چچا سویت کیتو کوئی نئی ترکیب سوجھی؟"

بوڑھا سنگتراش پہلے تو کوئی جواب نہ دیتا۔ اور اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہتا پھر آہستہ سے کہتا۔ "دیوتا تم پر اتنے نہال نہیں جتنا میں خیال کرتا تھا۔ انہوں نے جہاں تم کو مہاراج کرشن کی نئی مورتی کا خیال سجھایا ہے۔ وہاں اس کی تباہی کے لئے ضد بھی دے دی ہے تم پچھتاؤ گے"

پریتم نند ایک قہقہہ مار کر ہنستا "بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن یہ فکر ہو کہ اگر مورتی گر بھی گئی تو ایسی کونسی آفت آ جائیگی۔ ایک اور بنا لیں گے"

سویت کیتو کہتا۔ "لیکن اگر کوئی اسکے نیچے آکر مر گیا تو؟"

پریتم نند مسکراتا رہتا اور اپنا کام شروع کر دیتا۔

بسنت کے قریب آخر مورتی تیار ہو گئی۔ جو دیکھتا تعریف کرتا ماتا منسیہ تو بہت خوش تھی۔ کہتی "بیٹا پریتم نند تم نے ایک بوڑھی بیوہ کے من کو بہت پرسن کیا ہے۔ مورتی مہرنیوا شکتی یا سکے لائق ہے مہاراج تک تعریف پہنچ چکی ہے۔ بھوگ منڈپ کے ساتھ والے مندر کے برہمن برہسپتی نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ مہاراج بسنت اتسو کے میلے پر درشن کو آئیں گے۔"

بسنت اتسو سے ایک دن پہلے مورتی بھوگ منڈپ میں لگا دی گئی سویت کیتو مورتی کے ارد گرد چکر لگاتا رہتا اور ہر ایک کو مورتی کے قریب آنے سے روکتا۔ کہتا۔ "دیکھو مورتی کے قریب نہ آنا۔ یہ ٹوٹ کر گر جائیگی اور تم نیچے آکر مر جاؤ گے" لوگ اسے پاگل سمجھ کر اس کی باتوں کی بہت پرواہ نہ کرتے۔ کوئی اسے دلاسہ دینے کے لئے کہتا۔ "چچا سویت کیتو تم ٹھیک کہتے ہو" کوئی ہنس دیتا۔ "جا رے بڈھے تو سٹری ہو گیا ہے"۔ کوئی دل جلا کہتا "تم حسد سے پاگل ہو گئے ہو۔ ساری عمر یہی کام کرتے رہے۔ پر ایسی مورتی تم سے نہ بن سکی"

بسنت کے روز بھوگ منڈپ میں بہت زور دار جشن ہوا۔ مورتی پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ برہسپتی اور اسکا ساتھی تمام ودیا اختلف کیں ادا کر رہے تھے۔ نائین گھڑیالیں اور دف بجا کر گا رہے تھے۔ مندر کی دیوداسیاں ناچ رہی تھیں۔ اتنے میں شور ہوا کہ مہاراج آ گئے۔ سب لوگ خاموش ہو گئے۔ اور مورتی سے پیچھے ہٹ گئے۔ مہاراج آئے اور انہوں نے مورتی کے گرد ایک چکر لگایا۔ اور اس کی بہت تعریف کی۔ وہ مورتی کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے آگے بڑھے تو سویت کیتو بھاگ کر سامنے آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا "مہاراج مورتی کے قریب نہ جانا۔ یہ گر پڑے گی" مہاراج نے پوچھا "یہ بڈھا کون ہے" تو برہسپتی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مہاراج یہ ایک پاگل ہے۔ جو ہر ایک کو مورتی کے قریب آنے سے روکتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ مورتی گر جائے گی۔ پاگل ہونے سے پہلے یہ بھی مورتیاں بنایا کرتا تھا" مہاراج مسکرا دیئے اور کہنے لگے۔ "اچھا بابا ہم مورتی کے قریب نہیں جاتا" مہاراج کے جانے کے بعد بہت دیر تک جشن جاری رہا۔ بہت دیر رات تک گانے اور ناچنے کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔

سویت کیتو کا اب یہی کام تھا کہ وہ تمام دن مورتی کے قریب بیٹھا رہتا۔ اور لوگوں کو اسکے قریب آنے سے روکتا۔ اسے پاس والے مندر سے کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا تھا۔ وہ رات بھی مورتی کے قریب ہی

(بقیہ بر صفحہ ۲۲)

فیض احمد فیض

غزل

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہانتاب سفر سے پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے

ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِ نظر سے

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائیگی سر سے

[ناتمام]

چیخوف
(مترجمہ محمد رشید الدین)

کمیٹی کا دفتر

دوپہر کا وقت تھا۔ والدریو ایک پستقامت اور جسیم آدمی، سر پر معمولی بال، بڑی بڑی روشن آنکھیں، شریف صورت، شہریوں کی سی چال ڈھال اور کوٹ لٹے ہوئے کو ریشمی رومال سے پونچھ کے دفتر میں داخل ہوا۔

دفتر میں کچھ لوگ جلدی جلدی لکھنے میں مصروف تھے۔

"میں اس جگہ کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں" والدریو نے ایک چپراسی سے مخاطب ہو کر کہا۔ جو بلورین گلاسوں سے سجا ہوا طشت اٹھائے دفتر سے آ رہا تھا۔

"میں یہاں کچھ معلوم کرنے آیا ہوں۔ مجھے کمیٹی کے ریزولیشن کی نقل لینا ہے"۔

آپ اس طرف تشریف لے جائیے ——— وہ ——— سامنے کھڑکی ہے نا؟ بس وہیں" چپراسی نے طشت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

والدریو نے اپنا گلا صاف کیا اور اس کھڑکی کی طرف ہو لیا۔ اس جگہ ایک نوجوان میز پر بیٹھا تھا۔ اس کی میز سبز رنگ کی تھی جس پر بہت سے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے، اس کا لباس کچھ گہرے رنگ کا تھا سر کے لمبے لمبے بال چار حصوں میں منقسم تھے۔ وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کی ناک پر ایک مکھی بیٹھی تھی جو شاید اسی بات کی علامت تھی۔ کہ وہ بہت چلا جھنا بیٹھا ہے۔

میں اپنے معاملے کے متعلق یہاں کچھ دریافت کرنے آیا ہوں۔ کیا میں کچھ دریافت کر سکتا ہوں؟ ——— یعنی آپ سے۔ میرا نام والدریو ہے۔ اور مجھے کمیٹی کے اس ۲ مارچ والے ریزولیشن کی نقل لینا ہے"۔

کلرک نے قلم کو دوات سے نکال کر دیکھا کہ کہیں سیاہی اتنی زیادہ تو نہیں کہ لکھتے وقت دھبہ پڑ جائے۔ اسکے ہونٹ ہلک گئے تھے۔ اور مکھی ناک سے اڑ کر کان پر جا بیٹھی۔

"کیوں جی! میں نے کہا میں یہاں کچھ دریافت کر سکتا ہوں؟ میرا نام والدریو ہے۔ میں ایک زمیندار ہوں"۔ ایک منٹ تک خاموش رہنے کے بعد والدریو نے کہا۔

"ایوان اکسیچ" کلرک نے پکار کر کہا۔ گویا اس نے والدریو کو دیکھا ہی نہیں "کیا تم یاسیکو تاجر آئے تو اسے بتا دو گے کہ اسے اس شکایت نامہ پر دستخط کرنے ہیں۔ جو پولیس کے پاس ہے؟ میں نے اسے ہزاروں مرتبہ یاد دلایا ہے۔۔۔۔"

"میں اپنے اس مقدمہ کے بارے میں آیا ہوں۔ جو شہزادی گگولین کے وارث کے ساتھ ہے"۔ والدریو بولا۔ "یہ معاملہ تو سب ہی کو معلوم ہے۔ براہ مہربانی میرے معاملہ پر ضرور توجہ فرمایئے"۔

والدریو کی بات پر توجہ دیتے ہوئے کلرک نے اپنے ہونٹ پر بیٹھی مکھی کو پکڑ کر بڑے غور سے دیکھا۔ اور پھر اڑا دیا۔

اب کی مرتبہ والدریو نے منہ پر رومال رکھ کر زور سے کھانسنا اور ناک صاف کرنا شروع کیا۔ مگر بیچارہ پھر بھی ناکام رہا۔ اس کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا ——— پورے دو منٹ مکمل سکوت طاری رہا۔

والدریو نے جیب سے ایک روبل نکالا اور کلرک کے پاس ایک کھلی ہوئی کتاب پر رکھ دیا۔ کلرک کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے۔ اس نے کتاب کو اپنی طرف کھینچ کے بند کر دیا۔

"میں ایک معمولی سی بات۔۔۔۔۔۔ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شہزادی گگولین کے وارث نے کس بنا پر۔۔۔۔ کیا میں آپ کو کچھ تکلیف دے سکتا ہوں؟"

کلرک کھجلاتا ہوا یا قاعدہ اپنے خیالات میں گم تھا۔ کرسی پر سے کبھی کو کھجلاتا ہوا اٹھا اور الماری کا رخ کیا۔ ایک منٹ کے بعد واپس

پھر کتاب میں کھو گیا۔

اب میز پر ایک اور روبل پڑا تھا۔

"میں آپ کو صرف ایک منٹ کے لئے کچھ تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔۔۔ بہت تھوڑی دیر کے لئے"

کلرک نے اس دفعہ بھی کچھ نہیں سنا۔ اور باقاعدہ لکھنے میں مشغول رہا۔ والدیمار اداس سا ہو کر ناامیدی کی حالت میں اس محرر کی طرف دیکھنے [illegible]

"لکھ رہے ہیں" والدیمار نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "بس لکھے ہی جاتے ہیں۔ لکھنا۔ لکھنا۔ لکھنا۔ خدا ان سے سمجھے"

وہ میز سے ہٹ کر پرے جا کھڑا ہوا۔ اب وہ بالکل ناامید ہو چلا تھا۔

چپراسی اسی طرح گلاسوں سے بھرا ہوا طشت اٹھائے [illegible] سے گزرا۔ اس نے والدیمار کے پریشان چہرے سے اس کی مایوسی کو بھانپ لیا۔ وہ اسکے پاس آیا اور پوچھنے لگا "آپ کو جو کچھ دریافت کرنا تھا کر لیا؟"

"میں نے دریافت تو کیا۔ مگر وہ کچھ بولے ہی نہیں"

"آپ انہیں تین روبل دے دیجئے" چپراسی نے والدیمار کے کان میں بالکل آہستہ سے کہا۔

"دو تو میں پہلے ہی دے چکا ہوں"

"بس۔ پھر کیا ہے۔ ایک اور دے دیجئے"

والدیمار پھر میز کی جانب لوٹا اور ایک مزید روبل اس کھلی ہوئی کتاب پر رکھ دیا۔

کلرک نے پھر سے کتاب اپنی طرف کھینچ لی اور ورق الٹ پلٹ کرنے لگا۔ گویا اچانک ہی والدیمار پر اس کی نظر جا پڑی ہو۔ وہ اپنی ناک پر بل ڈالتے ہوئے بناوٹی ہنسی ہنسا۔

"آئیے!! کیا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"میں اپنے معاملے کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا نام والدیمار ہے"

"ہاں ہاں بڑی خوشی سے۔ وہی [illegible] والا معاملہ ہی نا۔ بہت خوب۔ تو اصل میں یہ کیا قصہ ہے؟"

والدیمار نے سارا قصہ بلا کم و کاست بیان کر دیا۔

کلرک کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے والدیمار کو ضروری تفصیلات سے مطلع کر دیا۔ اور ایک نقل کی کاپی کا انتظام بھی خود ہی کر دیا۔ والدیمار کو بیٹھنے کے لئے ایک کرسی بھی دے دی۔ یہ سب کچھ لمحہ بھر کے اندر ہی ہو گیا۔ اسی پر بس نہیں کی۔ بلکہ موسم اور فصلوں کے متعلق بھی اس سے گفتگو کی۔ پھر جب زمیندار واپس جانے لگا۔ تو وہ اسے چھوڑنے کے لئے سیڑھیوں تک ساتھ آیا۔ اب وہ اس سے بڑی مودبانہ گفتگو کر رہا تھا اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ والدیمار کے ادنےٰ سے اشارے پر جان تک کی بھی پرواہ نہ کریگا۔

والدیمار کی طبیعت مضطرب سی تھی۔ پھر نہ معلوم اسکے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے ایک اور روبل جیب سے نکال کر کلرک کو دے دیا اس نے بڑے ادب سے ہنستے ہوئے روبل لے کر جیب میں رکھ لیا

"واہ۔۔۔ کیا عجیب لوگ ہیں یہ بھی۔۔۔"

اس شریف صورت انسان نے اپنے دل میں کہا۔ جس وقت کہ وہ گلی میں داخل ہوا۔ اسکے بعد ایک لمحہ کے لئے وہ رکا۔ رومال سے [illegible] کو پونچھا اور پھر روانہ ہو گیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۲) کرشن جی کی مورتی

پڑ کر سو رہتا۔

ایک رات بہت زور کا طوفان آیا۔ اندھیری کا زور اور بادل کی کڑک دہشتناک تھی۔ مینہ اس زور کا تھا کہ گویا سب کچھ بہا کر لے جائیگا۔ صبح طوفان تھمنے پر لوگوں نے جا کر دیکھا۔ کہ کرشن جی کی مورتی طوفان کے زور سے مین تختے پر سے ٹوٹ کر گر پڑی ہے۔ اور بوڑھا سنگتراش [illegible] اسکے نیچے دب کر مر چکا ہے۔ اسکے بازو صلیب کی طرح کھلے تھے۔ مورتی اسکے سینے پر گری تھی۔ اسکے ہونٹوں سے خون کی ایک دھار نکل کر اس کی سفید داڑھی پر بہہ رہی تھی۔ خون کے دو ایک قطرے فرش پر بھی بہہ گئے تھے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

× × × × × × × ×

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

× × × × × × × ×

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

× × × × × × × ×

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ١٨٥١

[illegible]
[illegible]

[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

× × × × × × ×

[illegible]
[illegible]

بنفشی شعاعیں

ابوسعید قریشی

ڈاکٹر نے اس کے لئے بنفشی شعاعیں تجویز کی تھیں۔ اور چار مہینوں سے وہ ان شعاعوں سے بسی ہوئی فضا میں سانس لے رہا تھا وہ اس کے پھیپھڑوں میں صحت بن کر سما گئی تھیں۔ اور اس کے گالوں پر ایک بجلی بن کر چھا گئیں۔ ہمالہ کا ابدی سلسلہ اس کی چوٹیوں پر چیل کے جنگل اور اس کے آسمان پر چمکتا ہوا حسین سورج سب مل کر سلیم کے لئے بنفشی شعاعوں کا ایک جال بن رہے تھے۔ مینہ کی ہر بوچھاڑ کے ساتھ ان گنت بنفشی شعاعیں پانی میں حل کر کے اس کے جسم پر انڈیل دی جاتی تھیں ـــــ کبھی وہ ان پر ہنسا کرتا تھا۔ لیکن تندرستی کے ساتھ وہ انہیں ایک ٹھوس چیز سمجھنے لگا تھا۔ شعاعیں، جن کی غیر مرئی انگلیاں اس کے جسم میں ایک گدگدی پیدا کرتی تھیں۔ اور وہ دیوانوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ بعض اوقات اُسے اپنے کپڑوں، اپنی کتابوں، اپنے خیمے غرض ہر چیز پہ ایک بنفشی رنگ جھلکتا نظر آتا

اس کا دُکھ دُور ہو چکا تھا۔ اور خوشحالی اور بےفکری نے اس کا وزن پونڈوں بڑھا دیا تھا۔ اور زندگی اُس کے جسم میں کسی برساتی نالے کی طرح اُمڈ رہی تھی۔ اب وہ صرف تندرست ہی نہ تھا۔ بلکہ اس کی صحت پہلی پہلی تندرستی سے (جب ڈاکٹر نے اُسے دِق کے امکان سے نہیں ڈرایا تھا) بہت بہتر تھی۔ اس کی آنکھیں ـــــ جو پلوریسی کے دو حملوں سے دھندلا گئی تھیں ـــــ اب ایک غیر معمولی روشنی سے چمک رہی تھیں ـــــ آنکھیں کوہستانی چشموں کی طرح شفاف! دراصل اس چیڑوں کی وادی میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو نگاہ کے لئے دکھ کا باعث بن سکتی۔ اس کے پتھر بھی سبز پوش تھے۔ اور اس کی راہوں میں پھول اُگ رہے تھے۔ اور اکثر اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ ایک نصرت جام کے کنارے کھڑا ہو۔ اور اس کے تخیل کے پہاڑ، دریا، ابر پارے اور انسان اس کی شفاف سطح میں منعکس ہو رہے ہوں۔ اس کے مزاج کا چڑچڑا پن دُور ہو چکا تھا۔ اور جہاں پہلے اُسے ہر چیز سے نفرت ہو گئی تھی اب تندرستی نے اس کے دل میں ایک عجیب و عظیم الشان جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ جس کے زیر اثر وہ نیچر اور ابن آدم دونوں کی طرف کھچے چلا جا رہا تھا ہر شے اُسے اپنی ہم نوا معلوم ہوتی اور اکثر اس کے دل میں آتا اس تمام کائنات کو ایک وسیع آغوش میں لے لے اور اتنا بھینچے اتنا بھینچے کہ وہ اس میں جذب ہو جائے۔

لیکن چند دنوں سے اس کے خیالات پر مُردنی سی چھا رہی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر چپ سا رہنے لگا۔ ایک قسم کی بےچینی، ایک قسم کا درد اس کے رگ و پے میں مچل رہا تھا۔ اُسے ڈر محسوس ہوا کہ اسکی صحت کہیں دوبارہ نہ بگڑ جائے۔ لیکن ڈاکٹر نے اُسے بتایا کہ یہ اس کا خوف بےبنیاد تھا۔ تو پھر وہ بےچینی کیسی تھی؟ وہ مردنی وہ اُداسی؟ ......
لیکن ان سوالات کا اُسے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ اور آخر بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کامل چار ماہ سے ایک ہی جگہ پر قیام بھی اس نئے دُکھ کا باعث ہو سکتا تھا۔ اور اس کے علاوہ زیادہ مطالعہ بھی اس کی وجہ ہو سکتی تھی۔ "مانا کہ کتابیں بھی اپنے اندر ایک دُنیا لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی دُنیا جعلی ہے مجھے چل پھر کے دُنیا دیکھنی چاہیئے۔" اس نے کہا۔ لیکن ان تمام دلائل کے باوجود بھی پہلگام چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ خیموں کی اس بستی سے اُسے اُنس سا ہو گیا تھا۔ برسات کے بعد راتوں کو دُھلی ہوئی چاندنی میں اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے تخیلات ان نیلگوں سفید خیموں کی شکل میں منجمد ہو کر رہ گئے ہوں۔ چاند کی سکون ریز کرنوں سے فضا میں معلق بخارات موتیوں کی طرح چمکا کرتے اور آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں ابر کے گالے سفید کبوتروں کی طرح تیر رہے ہوتے۔ اور ہلکی سی دھند میں سارا منظر کسی استقبالی مصور کے تخیل کی طرح نظر آتا۔

اُسے ان مناظر سے عشق تھا لیکن اس کے باوجود اُسے جانا تھا۔

اور وہ چل پڑا۔

لیکن تمام مرگ اور بل دیکھنے کے بعد بھی اس بے چینی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا کسی نئے مقام پر چند دن اور بعض اوقات چند گھڑیوں کے بعد ہی اس کی طبیعت اچاٹ سی ہو جاتی۔ اور وہ کسی نئی منزل کی طرف چل پڑتا۔ اور پرانی کہانی پھر دوہرائی جاتی۔ اپنی اس بادیہ پیمائی میں وہ خود کو اس طوفان زدہ ملاح کی طرح محسوس کرتا جو سمندر کا نمکین پانی پئے جائے لیکن اس کی پیاس نہ بجھے۔ شاید نیچر کی ساحرہ اپنا جادو بھول چکی تھی۔ اور آخر وہ دیہات سے شہر کی طرف متوجہ ہوا۔

سفیدے کے درخت سنتریوں کی طرح سڑک کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ اور کھیتوں میں سبزے کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آہستہ آہستہ نیچر میں تہذیب کے آثار نظر آنے لگے۔ شہر قریب آ رہا تھا۔ اور ہر میل کے ساتھ سیم کے دل کی دھڑکن شام کے وقت گھونسلوں کی طرف لوٹتے ہوئے پرندوں کی طرح تیز ہوتی جا رہی تھی۔ شہر کی آوازیں اس کے کانوں سے ایک سیلاب کی طرح ٹکرائیں۔ اس کا سارا جسم فرط مسرت سے کانپ اٹھا۔ اس کے دل سے زندگی کی ایک آواز بلند ہوئی۔ اور دوسری آوازوں میں جذب ہو گئی۔ اور چند دنوں کے لئے زندگی کی ہماہمی میں وہ سب پریشانی بھول گیا۔

سرینگر میں اُسے پانچواں دن جا رہا تھا۔ اور اس عرصے میں وہ نشاط، شالامار، نسیم، چشمہ شاہی، تخت سلیمان، نمائش وغیرہ سب دیکھ چکا تھا۔ اور اس کے آگے کشمیر کا گنبد خاموش تھی۔ اور اس بات کے علم سے بے چینی نے پھر اس کا دامن پکڑ لیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا شہر اور اس کی آوازوں کے نیچے خاموشی کی ایک اداس رَو بہ رہی تھی جس کی آواز ہر لحظہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی بے چینی بڑھ گئی اور وہ سوچنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ "تنہائی، اُداسی، بے چینی!!!" یہ تھا اس کا دکھ صحت انہیں صحت ٹھیک تھی۔ اس بارے میں وہ بے فکر ہو چکا تھا۔ سرینگر آنے کے دوسرے دن ہی وہ ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس مشورے کی خاطر گیا تھا۔ اور ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا تھا کہ بگڑنے کی بات تو الگ رہی اس کی صحت قابلِ رشک طور پر اچھی تھی۔ اور جب اس نے اپنی بے چینی کا ذکر کیا تھا۔ تو ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

نوجوان! اب تمہیں شادی کر لینی چاہیئے۔ شاید تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔

اس پر وہ فیس اور شکریہ ادا کرتے ہوئے مطب سے باہر آگیا۔ اور اس بیہودہ مشورے پر خوب ہنسا تھا۔ شادی اور میں! اس نے کہا تھا۔ "خدا محفوظ رکھے اس بلا سے"! کتابیں، افکار، سیر و سیاحت یہی اس کی دنیا اور اس کے بدلے اُسے گھر کی چار دیواری میں قید ہونے کی صلاح دی جا رہی تھی! ذمہ داریوں کی گٹھڑی اٹھانے کو کہا جا رہا تھا۔ "شادی کیجئے"! اور بچوں کے خیال سے اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ جیسے وہ ان کی چیخ و پکار ابھی سے سُن رہا تھا۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی آزادی مصلوب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور ایک نفرت آمیز "اونہہ" کے ساتھ اس بیہودہ مشورے کو رد کر دیا۔ اور چار دن تک اس کی جھلک تک نہ دیکھی ——

وہ دن بھر کی سیاحت کے بعد تھکا ہوا آتا اور کھانا کھا کر سو جاتا اور اس وقت تک بیدار نہ ہوتا جب تک رحمان مانجھی ناشتہ نہ لے آتا۔ کیسے پُرلطف دن تھے۔ کاش زندگی یوں ہی بیت جاتی! لیکن قابلِ دید مقامات ختم ہو چکے تھے۔ اور اب نہ وہ تھکان تھی، اور نہ وہ گہری نیند۔ اور تنہائی کا خیال ایک بار پھر اس کا طواف کرنے لگا۔

اور اس کے ساتھ ہی اسے ڈاکٹر کا مشورہ یاد آگیا۔

"نوجوان! اب تمہیں ...."

وہ جھلا اٹھا۔

اور اس خیال سے وہ اور بھی چڑ گیا۔ کہ اگلے دن نمائش میں وہ غیر ارادی طور پر صنف لطیف سے متعلقہ چیزیں دیکھتا رہا تھا۔ اور ستم تو یہ تھا کہ "نسائی رنگ" کا ایک شال اور ہاتھی دانت کے بٹنوں اور سیپ کا سنگار دان خرید بھی لایا تھا۔ اس کے لئے یہ چیزیں بالکل بیکار تھیں۔ وہ ان کا مصرف سوچنے لگا۔ کوئی رشتہ دار بھی ایسا نہ تھا جس کے وہ کام آ سکتیں۔ اور یوں بھی رشتہ داروں کی قوم سے اُسے کوئی خاص انس نہ تھا ——" دوست ؟"

نہیں اس کے دوست بھی تو اس کی طرح لنڈورے تھے اور لیل بھی اُن سے اپنی حماقت کا ذکر کرنا اُن کے قہقہے مول لیکر اس میں اضافہ کرنے کے برابر تھا۔ اور ایسی ادھیڑ بُن میں یہ سوال بار بار اس کے کانوں میں گونج رہا تھا کہ کیا وہ چیزیں بیکار ہی پڑی رہیں گی۔ اور اپنی موجودگی سے ہمیشہ اس کی عقل کا منہ چڑاتی رہیں گی بہت کڑا سوال تھا۔ اور جواب کی تلاش میں وہ اپنے ذہن کو کریدنے لگا لیکن نقرئی قہقہوں کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ یکا یکی منقطع ہو گیا۔

اس کے شکارے سے کوئی گز بھر کے فاصلے پر ایک اور شکارا گزر رہا تھا۔ (غالباً) کوئی نو بیاہتا جوڑا سیر کر رہا تھا۔ عورت سُرخ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اُس کے بالوں میں سیندور بھری مانگ سیاہ ساٹن میں سونے کے تار کی طرح چمک رہی تھی۔ اور اس کے ماتھے کی بندیا اُبھرتے ہوئے سورج کی طرح سُرخ تھی۔ وہ آنچل سنبھالنے کے لئے اپنا مہندی لگا ہاتھ اٹھاتی تو اس کی ننگی بانہہ (وہ بے آستین جمپر پہنے ہوئے تھی) بغل تک عریاں ہو جاتی۔

شکارے ایک دوسرے سے دُور ہونے لگے اور وہ اپنے پیچھے حنا میں بسے ہوئے قہقہے چھوڑتی گئی حنا کی خوشبو سے سلیم واقف تھا لیکن اس خوشبو میں جو اس وقت اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر رہی تھی مہندی کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ملی ہوئی تھی۔ ہاں ایک نئی نویلی دُلہن کی خوشبو تھی۔ اس کے بھاری جسم کی خوشبو۔ تیز اور نشہ آور سی کچھ گول گول، کچھ گرم سی، نہیں وہ اُسے بیان نہیں کر سکتا تھا

اور وہ اُس کے رس بھرے قہقہے۔ آہ اُس کی آواز ہی دُنیا بھر کے ویرانوں کو آباد کرنے کے لئے کافی تھی کتنا خوش نصیب ہو گا اس کا شوہر! سلیم نے سوچا۔ اور ایک بار پھر اُسے ڈاکٹر کے الفاظ یاد آگئے۔ لیکن ساتھ ہی اُسے اپنی آزادی کا خیال بھی آگیا۔ وہ ڈاکٹر کے مشورے کو زیادہ گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ شادی کا مشورہ ..... یعنی ایک مہذب یافتہ طریقے سے جنسی آرزوؤں کی تکمیل.... دال بھی تو اور کیا ہے ---- یعنی جسمانی ضروریات کی خاطر اسے اپنی روح فروخت کرنے کو کہا جا رہا تھا کتنا مہنگا سودا تھا نہیں

نہیں یہ نہیں ہو سکتا --- اور یوں بھی ڈاکٹر کا فیصلہ کوئی اٹل حکم خداوندی تو تھا ہی نہیں --- اٹل اور آخری۔ اُسے جنسی تحقیق کی سمجھ میں وہ غلطی بھی کر سکتا تھا ..... لیکن اس منطق کے باوجود وہ اس مشورے کو اپنے ذہن سے دُور نہ کر سکا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں وہ جالے میں پھنسی ہوئی تتلی کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ ہر کوشش کے ساتھ اس کے پروں میں گرہ در گرہ پیدا ہوتے جا رہے تھے۔

اس کا شکارا ہاؤس بوٹ کے ساتھ لگ چکا تھا لیکن وہ اندر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اور ساڑھے پانچ بجے ہی اندر جا کر وہ کر بھی کیا سکتا تھا سوائے اس کے کہ ذہنیت رساں مشوروں سے دوچار ہوتا رہے۔ نہیں اُسے تفریح کی ضرورت تھی۔ دل بہلانے کا سامان چاہیئے تھا۔ اور اُسے یاد آیا کہ سینما والے اُس کے ہاں اشتہار پھینک جایا کرتے تھے ---- ریگل میں اُس دن ہرمن سنڈرمان کے مشہور ناول "نغمۂ نغمات" کا فلم دکھایا جا رہا تھا۔

سر سینے پر جھکائے انگلیاں بالوں میں گاڑے ہاؤس بوٹ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا وہ اپنے ذہن میں "نغمۂ نغمات" کے مناظر دُہرا رہا تھا ---- لِلی چیمک کی زندگی گناہ آلود محبت کی ایک رنگین کہانی تھی۔ اس کی قسمت اس کے حسن کی فراوانی سے جگمگا اُٹھی تھی۔ اور اس کی ارزانی سے تاریک ہو گئی تھی لیکن سلیم اس وقت اس کہانی کے اخلاقی پہلو پر غور نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ اُس لمحے اس کے دماغ پر وہ منظر چھایا ہوا تھا۔ جب لِلی "نغمۂ نغمات" کی شیلماٹ کے ماڈل کی حیثیت سے ایک سنگتراش کے نگار خانے میں پہلی بار عُریاں ہوئی ---- اپنے اچھوتے جسم کو چھپانے کی سعی میں وہ پردوں سے لپٹی جا رہی تھی۔ اور اس کے دوشیزہ قہقہے فضا میں ایک جذبات انگیز جھنکار پیدا کر رہے تھے --- عُریاں تصویر سلیم کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اس کی لائبریری میں نیوڈازم پر کئی کتابیں موجود تھیں جنہیں وہ ہمیشہ ایک مرد جمالیاتی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ حسین سے حسین تصویر کو بھی ایک تبسم

سے زیادہ کچھ نہ دے سکتا۔ لیکن اُسے یہ محسوس کر کے صدمہ سا ہُوا۔ کہ اُس کا زاویہ نگاہ ایکا ایکی بدل گیا تھا جمالیات کا سرد جذبہ اس کی رگوں میں بہتے ہوئے تند، بست خون سے ٹکرا گیا ——— اس کے خیالات اپنا جمالیاتی لباس اتار کے اس کے سامنے عُریاں نہیں، بلکہ ننگے کھڑے تھے۔ عُریاں کا لفظ ان کی شدت کو بیان نہ کر سکتا تھا۔ اُسے اُن سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے اُن سے آنکھیں بچا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن پُرانے قرض خواہوں کی طرح وُہ اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ وُہ سٹپٹا اٹھا۔ اور اسی پریشانی کی حالت میں اُسے اپنی ناک میں ایک تیز سی خوشبو کا احساس ہُوا۔ مہندی کی سی خوشبو جس میں کچھ لہو کی باس سی ملی ہوئی تھی ——— اس کے سامنے سپر مینٹی کے گلدان میں پوست کے سُرخ پھولوں کا گلدستہ سجا ہُوا تھا۔ لیکن نہیں یہ پوست کی خوشبو نہ تھی...... "خیر کچھ ہوگا" اس نے کہا اور ایک بار وُہ پھر اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔

سیلیا ئیٹ کی ماڈل...... آرٹسٹ کی محبوبہ...... اس کی گنا؟ آلود زندگی...... اس کا بہاریں جسم..........

...... اس کے حیات آفریں قہقہے اور اس کے گالوں میں وُہ خوفناک ننھے ننھے گڑھے جنہیں چاہِ غبغب کے نام سے پکارا جاتا ہے "چاہِ غبغب" سلیم نے سوچا کتنا خوفناک اور شہوانی لفظ ہے.... اور اس کے رس بھرے لرزاں ہونٹوں پر جلتے ہوئے بوسے۔ سلیم کو یوں محسوس ہُوا۔ جیسے اس کے اپنے ہونٹ بھی تپ رہے ہوں۔

اس عرصے میں خوشبو پہلے سے بھی تیز ہو گئی تھی۔ اب سلیم اس سے کچھ آشنا سا معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں یہ شکالے والی دُلہن کی خوشبو تھی۔ اور اس کی چشمِ تصور کے سامنے وُہ اپنا آنچل سنبھالنے کے لئے ہاتھ اٹھا رہی تھی۔ اور اس کی بغل تک عُریاں بانہہ کتنی حسین تھی...... اور پھر وُہ خوشبو تیز اور تند اور جذبات انگیز! وُہ اُسے اپنے دماغ سے دور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سگرٹ سے مدد لینا چاہی لیکن "مارکوپولو" کا تیز مصری تمباکو بھی اس پر غلبہ نہ پا سکا۔ بلکہ اس تمباکو نے اس میں مشرق کے ایک رومان پرور ملک کی ایک خوشبو ملا دی۔ کچھ قلوپطرا کے کے رومانوں کی سی مہک۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہاؤس بوٹ کی کھڑکی کھول دی ——— دریا کی سطح پر کہرے کا ایک غبار اُڑ رہا تھا۔ جیسے سینکڑوں فاختاؤں کے پر نوچ کر فضا میں بکھیر دئے جائیں۔ اور کہرے کے نقاب تلے کشتیوں کی روشنیاں سلیم کے خیالات کی طرح جل رہی تھیں ——— لیکن کھڑکی کھولنے کے باوجود بھی وُہ خوشبو دور نہ ہوئی۔ مئے کہنہ سال کی طرح وُہ اس کے دماغ کو چڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے جذبات کو بھڑکاتی ہوئی ہر جھونکے سے بھڑکاتی ہوئی۔

اس کی انگلیاں کانپنے لگیں۔ حلق خشک ہونے لگا۔ اور اس بےچینی کی حالت میں وُہ ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگا۔

اس کا ماتھا تپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور رگوں میں تپا ہُوا لہو اس کے کانوں میں ایک گونج پیدا کر رہا تھا۔ ——— اور لی چیک کا جسم اس کی نگاہوں میں ناچ رہا تھا۔ ہنستا ہُوا بلاتا ہُوا..... سلیم نے اپنے جلتے ہوئے ماتھے کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے اپنا سر کھڑکی میں جڑے ہوئے شیشے کے ساتھ لگا دیا۔ اور شیشے کے ساتھ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ہاؤس بوٹ کے اس پہلو میں جہاں سلیم کھڑا تھا۔ ماجھی کا ڈونگا لنگر انداز تھا اور کھڑکی کے شیشے سے ماجھی کی بیٹی بانہہ کو تکیہ بنائے ایک پیوند زدہ بستر پر محوِ خواب نظر آ رہی تھی۔ ایک بوسیدہ لوئی اُسے کمر تک ڈھانپے ہوئے تھی۔

اس کے سٹابری کی طرح سُرخ ہونٹوں پر ایک مسرت بھرا تبسم کھیل رہا تھا۔ جیسے کوئی سہانا خواب دیکھے۔ اور بغیر بٹن کا کُھلا ہُوا کُرتہ اس کے جوان سینے کو بےنقاب کر رہا تھا۔ سینہ سنگ مرمر کے دو گنبدوں کی طرح جن پر سُورج کی پہلی شعاع ایک گلابی رنگ چڑھا دے۔

وہ گوشت پوست کی ایک زندہ عورت کو دیکھ رہا تھا۔ جو تصویر سے بہت مختلف تھی۔ اور جس کے سینے میں ایک دل دھڑک رہا تھا۔ اور سلیم کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں ——— ہاں ایک زندہ عورت ایک حسین عورت لی سے بھی زیادہ حسین۔ اور جسے اگر وُہ چاہتا تو حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ غریب کشمیری

چاندی کے چند ٹکڑوں کے عوض اپنی بیٹیاں بھی فروخت کر سکتے ہیں۔ اور اسے یقین تھا کہ چند سرد سکوں کے عوض اُسے سکون مل سکتا تھا۔ اُسے اور بھی پریشان کر دیا۔۔۔ تو کیا ڈاکٹر کی تشخیص ٹھیک تھی۔ کہ میں جنسی فاقہ کش ہوں۔ ہاں! بیوی یا رفیقہ یا عورت ایک ہی بات تو ہے! تو کیا یہ سچ تھا؟ تو کیا یہ سچ تھا؟ ——— دیوار پر آویزاں کلاک نے ساڑھے گیارہ کے ٹن بجائے۔ سلیم چونک پڑا۔ جیسے کسی نے "ہاں!" کہہ دیا ہو۔

اس کے خیالات اس قوم کی طرح جس کی آزادی چھین لی جائے بغاوت کا علم بلند کر رہے تھے۔ وہ آرزوئیں جنہیں اس نے مدت سے دبا رکھا تھا کچل رکھا تھا۔ اخلاق اور جمالیات کی اس عمارت کو جسے اس نے ایک عرصے میں استوار کیا تھا مسمار کرنے کے درپے تھیں۔

لیکن کیا اس میں اتنی جرأت موجود تھی؟ کیا وہ ایک غریب ماجھی کی عزت کا ناجائز فائدہ اٹھا سکتا تھا؟ کیا اخلاقیات ایک ڈھکوسلہ تھے جنہیں مرضی کے مطابق بالائے طاق رکھا جا سکتا تھا؟ ان سوالات سے اُسے ایک دھکا سا لگا۔ اور وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے چاہا کہ کھڑکی کا پردہ چھوڑ دے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس نے چاہا کہ اپنی نگاہیں ایک طرف ہٹا لے لیکن سانپ کے سامنے مبہوت چڑیا کی طرح وہ ایسا نہ کر سکا۔ اژدہا نما لیمپ سٹینڈ سے لٹکے ہوئے نیلگوں گلوب کی روشنی میں اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ گال پچکے ہوئے۔ لب خشک اور آنکھیں ساکت اور میز پر پڑا ہوا کنفیوشس کے ملک کا دراز ریش چوبی مجسمہ اس کی بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر کوشش کی کہ اس خطرناک منظر سے دور ہٹ جائے لیکن ناکام۔ اور اس کی آنکھیں غیر ارادی طور پر پھر شیشے کے ساتھ لگ گئیں۔ ضمیر کی آواز باغیوں کے شور کے نیچے دب گئی۔

ماجھی کی بیٹی اسی انداز میں سو رہی تھی۔ سلیم کی گرسنہ نگاہیں اس کے سینے پر پڑ گئیں۔ اس کی کانپتی ہوئی انگلیاں شیشے پر آہستہ آہستہ پھرنے لگیں۔ اور اس کے گرم ہونٹ اس کی سرد سطح پر جم گئے

اس نے سوچا "مجھے سکون چاہیئے۔ ہر حالت میں سکون، کسی قیمت پر سکون۔۔۔ نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا" اور اس کے لئے ذرا سی ہمت اور ذرا سی جرأت کی ضرورت تھی۔ بس رحمٰن کو بلانے کی دیر ہے۔۔۔ لیکن میں کہوں گا کیا؟ بات کیسے چھیڑوں گا؟" بہت ٹیڑھا سوال ہے۔ اور آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ رحمٰن خود ہی سمجھ جائیگا اُسے یاد تھا کہ پہلے دن جب وہ اس کے ہاؤس بوٹ میں آیا تھا تو رات کو سوتے وقت اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کسی اور چیز کی ضرورت ہو سیٹھ؟"

"نہیں" سلیم نے کہا تھا "مجھے کچھ نہیں چاہیئے"

"میرا مطلب ہے کہ اگر ضرورت ہو تو کہہ دیجئے گا" اور یہ کہہ کر ماجھی سلام کر کے چلا گیا تھا۔ اور سفر کا تھکا ہوا سلیم ان الفاظ پر غور کئے بغیر سو گیا تھا۔ لیکن آج وہ اپنے مفہوم کی تشریح کرتے ہوئے اُسے ایکا ایکی یاد آ گئے تھے۔

"ہاں وہ خود ہی سمجھ لیگا" سلیم نے سوچا "میں کہوں گا۔ ساتھ والے ڈونگے میں کون رہتا ہے۔ اور وہ خود ہی سمجھ جائیگا" اُسے یقین تھا کہ رحمٰن کے لئے اشارہ ہی کافی ہوگا "ابھی کل ہی تو کوئی کہہ رہا تھا کہ ماجھی روپے کے لالچ میں سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ بیٹی ہے تو پھر کیا۔ اُسے تو چاندی سے غرض ہے نا ——— اس کی جیب میں چاندی کی جھنکار پیدا ہوئی۔ اور اس کے لبوں پر ایک سرمایہ دارانہ تبسم بکھر گیا۔

لیکن اُسے بلانے اور اس کا سامنا کرنے سے پہلے وہ اپنے آپ کو تیار کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا اضطراب ماجھی پر ظاہر ہو۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ سگرٹوں کے ڈبے کی طرف متوجہ ہوا تا کہ تمباکو کے زہریلے دھوئیں سے وہ اپنے عصبی ہیجان کو شانت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک اپنی بدحواسی سے وہ جلا اُٹھا۔ سگرٹ کی بجائے اس کے ہونٹوں میں دیا سلائی موجود تھی۔ اور دیا سلائی کی جگہ ماچس پر سگرٹ رگڑا جا رہا تھا۔۔۔۔

آخر وہ میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کی طرف بڑھا۔ اس کی انگلی گھنٹی کے بٹن پر تیزی سے پھرنے لگی۔ لیکن اس کا دماغ اُسے دبانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

"رحمٰن سو رہا ہوگا" اس نے سوچا "اس کی نیند خراب ہو جائے گی"

احمد ندیم قاسمی

جنگ کو جاتے ہوئے

بھولے گا نہ مجھ کو شبِ رخصت کا نظارا
وہ چاندنی رات اور وہ دریا کا کنارا

وہ سبزۂ خاموش میں گاتے ہوئے جھینگر
وہ نیم کی شاخوں میں الجھتا ہوا تارا

وہ چاند کے انوار سے لہروں کا چمکنا
جس طرح ہو سیماب کا بہتا ہوا دھارا

شاخوں پہ پھڑک جاتی تھیں سوئی ہوئی چڑیاں
چمگادڑیں بھرتی تھیں طرارے پہ طرارا

میدان میں یوں ٹھنڈی ہوا گھوم رہی تھی
اٹھلاتا ہوا جیسے کوئی ساقیٔ دلارا

بیٹھی تھی صبوحی مرے زانو پہ سمٹ کر
لے لیتی تھی گاہے مرے شانے کا سہارا

سینوں میں تڑپتی تھیں قیامت کی امنگیں
خاموشی کی ہمت تھی نہ گفتار کا یارا

ناگاہ صبوحی نے لرز کر مجھے دیکھا
اِک ہاتھ سے بکھری ہوئی زلفوں کو سنوارا

بولی میرا ایمان ہے تم جا نہیں سکتے
مجھ سے ابدیّت کا ہے اقرار تمہارا

"اب نام یہاں سے کبھی جانے کا نہ لینا
دل کو نہ دکھانا مرے للّٰہ! دوبارا"

میں نے یہ کہا "اے مری امید کی رانی
تو نے مری اجڑی ہوئی دنیا کو سنوارا

"تو نے مجھے احساس کی دولت سے نوازا
تو نے مجھے قوت سے عمل پر ہے ابھارا

"ہے آج وطن کو جو ضرورت مرے خوں کی
تو کیوں نہیں کرتی مجھے مرنے کا اشارا

"ظاہر ہے کہ آنکھوں میں کٹیں گی تری راتیں
دن کو ترے اشکوں کا ابھر آئے گا دھارا

"لعنت ہے مرے دین میں لیکن وہ جوانی
ہو جس میں نہ حریّتِ قومی کا شرارا

"دے اذنِ وغا اب مجھے تو اپنے لبوں سے
ہو میرے ارادوں میں مزاحم نہ خدارا

"کچھ دیر اگر اور یہ حالت رہی قائم
ہو جائیگا پرچم مرے بھارت کا دوپارا"

یہ کہہ کے صبوحی کی قسم میں نے اٹھائی
اور فرش پہ بکھرے ہوئے تیروں کو سنوارا

وہ روتی ہوئی میری طرف دیکھ کے کانپی
میں ہنستا ہوا جنگ کے میداں کو سدھارا!

تاریخ کا مادی نظریہ

علی امام۔ ایم۔ اے

مختلف زمانوں میں تاریخ کی تعریف اور تشریح کے مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن کچھ مدت قبل تک تمام مجوزین اس کو واقعہ نگاری کے قائم شدہ اصول یا حالات موجودہ کو برقرار رکھنے کے ایک استدلالی فلسفہ سے زیادہ اہمیت دینے کے ہیگل نے اسے سائنس کے مرتبہ تک پہنچانے میں بہت حصہ لیا۔ بقولِ ہیگل "تاریخ خیالات کی ایک رفتار ہے۔ جو کہ استغنا اور آزادی عمل تک پہنچاتی ہے۔ استغنا خود شعوری سے وابستہ ہے۔ اور خود شعوری خدا ہے" چنانچہ تاریخ خدا کی آپ بیتی ہے۔ جسٹر اور بیں برنہیج نے کہا کہ تاریخ انسان کے ارتقاء اور عمرانیت کی سائنس ہے بینبر کے خیال کے مطابق تاریخ ایک سائنس ہے۔ جو ہمدردانہ نظر سے زندگی کے مظاہر کی جستجو کرے۔ اور اس کو بیان کرے۔ لیکن ان تمام مجوزین کی تشریحات اور نظریات نہ صرف دھندلی ہیں۔ بلکہ غیر مکمل بھی۔ سب نے تاریخ کو زندگی کے فلسفہ غایاتی سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ آخر کارل مارکس اور اینگلس نے تاریخ کے مادی نظریہ کو واضح کیا۔ اُن کی رائے میں نہ تو انسان جنت سے نکالا ہوا ایک گنہگار ہے۔ نہ سماج کی ابتدا ایسے متبرک حیاتیات پر ہوئی۔ جو پہلے پہل طوفانِ عظیم سے بچ نکلے اور نہ کسی حاکمِ مطلق نے کائنات کو خوش طبعی کی حالت میں ترتیب دیا۔ بلکہ سماج کی ابتدا تنازع للبقا کے اصول پر ہوئی۔

مارکسی فلسفہ کی رو سے انسان خدا کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ سائنس کی تحقیقات کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ کہ انسان کے خیالات، اعتقادات، کردار، اور ارتقاء سب زندگی کے ماحول سے تشکیل پاتے ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ساتھ انسان اس ماحول پر رد عمل کرتا ہے۔ اور اُن کو اپنے موافق بناتا ہے۔ وہ محض اسٹیج کا ایکٹر نہیں ہے جو کہ اسٹیج سے علیحدہ رہتا ہو۔ بلکہ وہ اسٹیج کا ایک جزو ہے۔ اُس کی حرکات اُسکے ماحول سے اتنی ہی وابستہ ہیں۔ جتنا کہ اُس کا وجود۔ چنانچہ وہ صرف اپنے ماحول اور وجود کا ہی بنانے والا نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ کا خالق بھی ہے۔

تمدن نتیجہ ہے انسان کی اُس جدوجہد کا جو وہ طبعی طاقتوں (NATURAL FORCES) پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ جدوجہد کی یہ اہمیت ہی اسکو دیگر ادنیٰ جانداروں سے علیحدہ کرتی ہے۔ جانور طبعی طاقتوں کے غلام ہوتے ہیں۔ لیکن انسان ان کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ اور ان پر قبضہ کر لیتا ہے۔ شروع میں تو وہ محض معاش ہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے لیکن جوں جوں وہ ان طاقتوں پر قابض ہوتا جاتا ہے وہ ثقافتی قدر (CULTURAL VALUE) پیدا کرتا ہے۔ فرصت ثقافت کی پہلی شرط ہے۔ جب تک انسان مہذب نہیں ہوتا وہ ثقافت نہیں پیدا کر سکتا۔ پس ثقافت نتیجہ ہے اور تمدن سبب۔ یہ کہنا کہ ہندوستان میں ایک روایاتی ثقافت موجود ہے۔ لیکن تمدن موجود نہیں، قطعاً غلط ہے۔ سماجی اور مذہبی استقرار کے ایک خاص دور میں۔ جبکہ انسان سوائے مذہبی خیالات کے اور کچھ نہیں سوچ سکتا۔ ثقافتی قدر بھی مذہبیت کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ لیکن جوں جوں انسان طبعی طاقتوں پر قبضہ کرتا جاتا ہے۔ وہ مذہبی خیالات کو چھوڑ کر سائنٹیفک، استدلالی، اور معقول، خیالات قبول کرتا جاتا ہے ثقافتی قدر بھی ایسی حالت میں مذہبی جامہ کو چھوڑ دیتی ہے۔ جس طرح ایک مہذب شخص کی ثقافت ایک عظیم الشان وحشی کی ثقافت سے برآمد ہوگی۔ اسی طرح دو مختلف مذہبی قوموں کی ایک مہذب قوم کی ثقافت ایک ایسی قوم سے بہتر ہوگی۔ جس پر اب تک مذہبی خیالات کا غلبہ ہے۔ سماج کے نشوونما کے کسی خاص وقت میں اُس کا قانون اور اخلاقی نظام اس زمانے کے اقتصادی نظام کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ قانون اور اخلاق، لفظ گیر فرقہ د( ) بنایا گیا ہے۔ جسکے ذریعہ وہ اپنی نفع گیری کو روا رکھتا ہے۔ پس سیاسی ادارے اور قانون جن کے ذریعہ نفع گیری روا رکھی جاتی ہے۔ نہ صرف اقتصادی نظام پر مبنی ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں۔ یہی اخلاقی شعور

کے متعلق کہا جا سکتا ہے غلامی اور رعیت پن د) ایک خاص سماج میں رعایا کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب اقتصادی نظام اسکے موافق تھا تو اخلاقی شعور نے بھی اسکو روا رکھا۔

اس پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ تاریخ کے مادی نظریہ کی ابتدا اس اصول سے ہوتی ہے کہ سماجی نظام پیداوار اور اُس کی تقسیم کے طریقوں پر مبنی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت سماجی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کے اسباب کو انسانی دماغ یا انصاف اور حق پسندی کے جذبات میں ڈھونڈنا چاہیئے۔ بلکہ پیداوار اور اُس کی تقسیم کے طریقوں کی تبدیلیوں میں دیکھنا چاہیئے۔ تمام گزشتہ تاریخ دبجز تاریخ قدیم کے) طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔ سماج کا پورا نظام اسی محور پر گردش کرتا رہا ہے۔

حرارت، غذا، حفاظت اور لباس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انسان نے خام اشیاء کو استعمال کرنا سیکھا چنانچہ انسان اور اشیاء کے درمیان ایک بنیادی تعلق قائم ہو گیا۔ یہی ایک انسان کا دوسرے انسان سے تعلق کا باعث ہوا۔ ہر کیونکہ محنت (LABOUR) کی تقسیم اور تخصیص کی وجہ سے اسکے متعلق بعض لوگوں کے حقوق اور بعض کے فرائض قائم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بعض اشیاء پر بعض لوگوں کی ملکیت ہوتی جبکہ دوسرے اُس سے محروم رہیں گے۔ سماجی نشو و نما کے کسی خاص وقت میں افراد کے تعلقات آخرکار ایسے نظام پر مبنی ہوتے ہیں۔ جس میں اشیاء کی ملکیت بھی ہو۔ اور محرومیت بھی۔ چنانچہ سماج دو مخالف فرقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ تعلقات یکساں رہتے ہیں۔ مختلف اوقات میں سماج مختلف چولے بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً غلامانہ سماج، جاگیری سماج، اور سرمایہ دار سماج اول الذکر دو سماجوں میں انسانی تعلقات اُن دو فرقوں میں قائم ہو جاتے ہیں۔ جن میں ایک خام اشیاء کا مالک ہونے کی وجہ سے اقتصادی اور سیاسی طاقت رکھتا ہے۔ اور دوسرا خام اشیاء کو مال میں تبدیل کرتا ہے۔ کام کرنے والا فرقہ اس کام قدر زائد SURPLUS VALUE) پیدا کرتا ہے۔ جیسے بدلے میں اُسے معمولی اجرت مل جاتی ہے۔ موخر الذکر سماج یعنی سرمایہ داری میں حالانکہ یہ تعلقات بدلتے نہیں۔ لیکن حالات اور طریقوں میں کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اب پیداوار کا منشا استعمال نہیں۔ بلکہ تجارت ہو جاتا ہے۔ اور پیدا کرنے والے اور استعمال کرنے والے کے درمیان دلال کی ایک نئی کڑی اضافہ ہو جاتی ہے۔

اگر تاریخ طبقہ وارانہ کشمکش کی تاریخ ہے۔ تو آخر یہ کشمکش ہوتی ہی کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ انسان معاش حاصل کرنے کے لئے اپنے اوزاروں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ نئی نئی پیداواری طاقتوں) اور نوایجاد اوزاروں کی ملکیت کی وجہ سے اس کو اُن دوسرے لوگوں سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ جب ان کو دوسرے لوگوں سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے جو پرانے اوزار استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ان نئی طاقتوں کا مالک اقتصادی طاقت کا بھی مالک ہو جاتا ہے۔ جیسے ان دو گروہوں کی باہمی مخالفت تیز ہو جاتی ہے۔ تو ایک معاشرتی انقلاب رونما ہوتا ہے جس میں یا تو سماج برباد ہو جاتی ہے۔ یا فتح اُس گروہ کی ہوتی ہے جس کا نظام زیادہ منظم اور مرتب ہو۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ سماج کا ارتقا کیوں کر ہوا؟ یعنی قدیم اشتمالی سماج، سرمایہ داری سماج، اور اشتراکی سماج کس طرح عمل میں آئیں۔ سماج کی بنیاد اُس وقت پڑتی ہے۔ جب انسان زراعت کے ذریعہ زمین سے کچھ پیدا کرنا سیکھتا ہے۔ گروہ در گروہ انسان زرخیز مقامات پر بس جاتے ہیں۔ اور آپس میں زمین اجتماعی طریقہ پر تقسیم کر لیتے ہیں۔ ملکیت مشترکہ ہوتی ہے۔ اور زیادہ پیدا کرنے کی ہوس نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنی استطاعت کے موافق کام کرتا ہے۔ اور اپنی ضروریات کے بموجب پاتا ہے۔ سکونت پذیر ہونے کے بعد برادری کے افراد فرصت کے وقت ثقافتی قدر پیدا کرتے ہیں۔ اور سیدھے سادے اوزار بناتے ہیں۔ ان اوزاروں کے ذریعہ وہ تنہا کام کرنے لگتے ہیں۔ اور اپنی محنت کے پھل آپ ہی کھاتے ہیں۔ یہاں سے انفرادی ملکیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ برادری میں اجتماعی ملکیت ختم ہو جاتا ہے۔ اُس وقت ایسے قانون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے ذریعہ آپس کے تعلقات اور تصادم خیز مفاد کی نگرانی کی جا سکے۔ مذہب پہلے پہل سماج میں داخل ہو کر ایک خدائی قانون پیش کرتا ہے۔ جس کی مدد سے کوئی ایسا فوق البشر طاقت انسانی کے تعلقات کی حکمرانی کرتی ہے۔ چنانچہ سورج چاند اور دوسرے مظاہر فطرت ایک ما فوق الفطرت وسیلہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ قدیم اشتمالی سماج درہم برہم ہو جانے کے بعد زمین قبیلوں اور خاندانوں کے سرداروں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ اور یہ قبیلی

سماج جو پرانی سماج کی جگہ لے لیتی ہے
سرداری قبیلہ آخرکار جاگیردار بلکہ بادشاہ بن جاتا ہے (
کے سایہ میں ایک اعلیٰ اقتدار قائم کر لیتے ہیں جو کہ مذہب، دینیات، اور قانون کا نام قائم شدہ نظام کی محافظت ہوتا ہے۔ اس سے یہ جابر استبداد کی انہیں کششوں کے ذریعہ جمہوری آزادی اور ہر مخالفانہ تحریک کو دبا دیتے ہیں۔

فتوحاتِ ممالک کے زمانے میں غلامی کا نظام زور پکڑ جاتا ہے کوڑوں کا ڈر غلاموں کو ہمہ وقت محنت کرنے پر مجبور رکھتا ہے جس کے بدلے میں اُن کو اسقدر خوراک مل جاتی ہے۔ کہ وہ زندہ رہ سکیں۔ اور افزائشِ نسل کریں۔ تاکہ غلاموں کی تعداد بڑھے۔ جس طرح سے بھیڑ اور بکریوں کے بچے گلہ بان کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے غلاموں کے بچے مالکوں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ یہ غلام زیادہ تر خانگی کام اور آرائش کے سامان بنانے میں لگا دئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرتی ضروریات التوا میں پڑ جاتی ہیں۔ اور چونکہ اس زمانے میں زراعت ہی پر سب دار و مدار ہوتا ہے۔ اسلئے زراعت عدم توجہ کی وجہ سے اپنا توازن کھو بیٹھتی ہے۔ اور معدوم ہو جاتی ہے۔ سماج پر بھی ایک خطرناک دور آ جاتا ہے۔ اور غلامانہ نظام کی پیداوار کا طریقہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

غلامانہ سماج کے کھنڈر پر ایک نئی جاگیری سماج کی (FEUDAL SOCIETY) قائم ہوتی ہے۔ جاگیریت کی بنیاد آزاد کسانوں کو بےدخل کر دینے پر ہے۔ اس نئے نظام میں غلام کی بجائے کسان محنت کرتا ہے۔ جاگیریت کی خصوصیت یہ ہے کہ خود کسان اپنے آلات اور اوزاروں سے محنت کرتا ہے۔ لیکن معمولی خوراک کے علاوہ سب کچھ زمیندار کو دے دیتا ہے کسان کو خوراک کے معاملہ میں نیم جان رکھنے سے جاگیریت دوسری صنعتوں کو روک سکتی ہے۔ لیکن اسکو کامیابی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ انسان کی روز افزوں ضروریات کو ہمیشہ کے لئے روک نہیں سکتی۔ جدید ایجادات، سائنٹیفک نظریات، بڑھتی ہوئی صنعت اور رسل کے معاملہ میں لوگوں کا ایک دوسرے پر انحصار، جاگیریت کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ تجارت کی ترقی جاگیریت کے لئے پیغامِ اجل لیکر آتی ہے۔ جاگیریت میں یہ طاقت نہیں ہوتی۔ کہ وہ تمدنی فرقہ کے وجود میں آنے کو روک سکے۔ نئے اوزار اور منظم طریقوں کی وجہ سے اشیا کی مانگ سے زیادہ پیداوار ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ سب کی سب استعمال میں نہیں آتیں اسلئے مال میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس سرمایہ داری سے ملل نظام کی بنیاد پڑتی ہے۔

سرمایہ دار مزدور کی طاقت خریدتا ہے۔ تاکہ اُسکے ذریعہ کارآمد قدر (USE VALUE) پیدا کرے لیکن اس عمل میں پھر مانگ سے زیادہ پیداوار کی وجہ سے قدرِ زائد (SURPLUS VALUE) پیدا ہو جاتی ہے بقول مارکس روپیہ سرمایہ نہیں ہے۔ یہ قدرِ زائد ہے جو جمع ہو کر سرمایہ بن جاتی ہے، چنانچہ سرمایہ دار کا کام قدرِ زائد پیدا کرنا ہے۔ جو کہ مشین کے استعمال، مانگ سے زیادہ پیداوار، کام کے گھنٹوں میں طوالت اور کم اجرت ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ اس دور میں روپیہ پیداوار بڑھاتا ہے۔ استعمال کے لئے نہیں بلکہ فروخت کے لئے۔ پیدا کرنے کے عمل کے لئے سرمایہ دار کو ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو جو محنت کریں۔ چنانچہ کھیت مزدور اور بےدخل کسان اپنی طاقت بیچتے ہیں۔ سرمایہ داری کی خصوصیت یہ ہے کہ دو مخالف فرقے بنجاتے ہیں ایک بورژوا دار (BOURGEOIS) جس کے قبضے میں پیداوار کے ذرائع ہوتے ہیں۔ اور دوسرا پرولتاری (
جو مزدوری کرتا ہے۔ اُجرتی مزدور جو اب تک شاذ و نادر تھا۔ بڑھنے لگتا ہے اور سرمایہ داری پیداوار کا وسیلہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اجرت پر کام کرنے والا مزدور اب زندگی بھر کے لئے اُجرتی مزدور بنجاتا ہے۔ جاگیریت کا شیرازہ بکھر جانے، تعلقہ داروں اور رؤسا کے نوکروں کے برخاست ہو جانے اور کسانوں کی بےدخلی کی وجہ سے اُجرتی مزدور کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ اجتماع کی کثرت اور طاقتِ پیداوار کی زیادتی سرمایہ داری کے ظہور کا باعث ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسے سماج کا نظام ہے۔ جس میں فرقہ وارانہ کشمکش اور تفاوت بے حد سرعت کے ساتھ بڑھ رہے ہوں۔ جس میں امیر امیر تر ہو رہا ہے اور غریب غریب تر۔

پیداوار کے ذرائع (جن پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے) اور مزدور (جن کے پاس سوائے اپنی طاقت کے کچھ نہیں ہے) کے درمیان مخالفت بہت بڑھ جاتی ہے۔ معاشرتی پیداوار اور سرمایہ داری لوٹ کھسوٹ کے تعلقات میں تضاد کے عنصر کا اظہار بورژوا اور پرولیتاری کی دشمنی سے ہوتا ہے۔ پیداوار کی معاشرتی بدنظمی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ

آدمی پرولتاری میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ بازار کی وسعت بڑھتی ہوئی پیداوار کا ساتھ نہیں دے سکتی یہ بحران کسوقت ہوتا ہے مال کی گردش کم ہوجاتی ہے۔ اور سرمایہ مال کی گردش میں حائل ہوجاتا ہے۔ کل معاشرتی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ پیداوار کا طریقہ نفع گیری سے بغاوت کرتا ہے اس وقت طبقہ وارانہ کشمکش سخت ہوجاتی ہے۔ مزدور کام بندکر دیتے ہیں۔ اور عوام میں ایک بغاوت شروع ہوجاتی ہے۔ سرمایہ دار اسکو نہیں روک سکتے کیونکہ تاریخ کا چرخ پیچھے واپس نہیں کیا جاسکتا۔ سرمایہ دار اپنی حالت کو کچھ دیر اور بدستور قائم رکھنے کے لئے فسطائیت کو فروغ دیتا ہے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد مزدور اپنی انجمنوں کی مدد سے سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور سیاسی طاقت حاصل کر لیتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام اپنی افادیت سے زیادہ عرصہ زندہ رہنے کے بعد ایک ایسے نظام کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے۔ جو کہ پیداوار کے ذرائع کی انفرادی ملکیت ختم کر دیتا ہے۔ انسان کے معاشرتی افعال کے قوانین جن پر اب تک اس کا کوئی زور نہ تھا۔ اب انسان کے قبضے میں آجاتے ہیں اور وہ اُن کو انسانیت کے فائدہ کیلئے استعمال کرتا ہے۔ وہ تمام خارجی طاقتیں جو ابھی تک تاریخ پر حاوی تھیں انسان کے قبضہ قدرت میں آجاتی ہیں اور انسان آزادی کی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔

یہ ہے تاریخ کے مادی نظریہ کا مختصر سا خاکہ جو کہ آجکل کے مادی فلسفہ دان پیش کرتے ہیں۔

امین حزیں سیالکوٹی

معارف

۱

مارا ہمیں آوارگیٔ فکر و نظر نے
معلوم نہیں قافلہ بھر ہی میں کسی کو

مرکز کی نہ منزل کی ہمیں کوئی خبر ہے
جو کعبہ مقصود ہے وہ کعبہ کدھر ہے

۲

سالار کوئی ہے نہ کوئی بانگ درا ہے
فطرت کے معلم سے پٹے جائیں نہ کیونکر

اس بھیڑ کی تنظیم کے امکان ہیں مفقود
ہم بھول چکے ہیں سبق وحدتِ مقصود

۳

ہے وحدتِ مقصود سے ہر قوم کی ہستی
استاد ہے فن کار ہے مطرب وہی مطرب

جس قوم کو جینا ہو وہ اس راز کو سمجھے
جو ساز کو اور ساز کی آواز کو سمجھے

۴

ناداں تجھے کیوں داد ملے بزم جہاں میں
یوں اسلئے جمعیتِ خاطر ہے پریشاں

جب ساز سے آواز ہم آہنگ نہیں ہے
تو ریت کا تودہ ہے ایں سنگ نہیں ہے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فراق گورکھپوری

غزل

غم و خوشی مری ہم رنگِ لالہ زار نہیں — یہ وہ خزاں نہیں اے دوست وہ بہار نہیں

کچھ اور عشق کی مجبوریوں کے ہیں اسرار — یہ مت سمجھ کہ مجھے دل پہ اختیار نہیں

ترے جمال کی تنہائیوں کا دھیان نہ تھا — میں سوچتا تھا مرا کوئی غمگسار نہیں

اسی پہ ختم ہیں محفل کی مستیاں لیکن — کوئی بجز نگہِ یار ہوشیار نہیں

دھواں سا دیکھ فضاؤں میں کب نہیں اٹھتا — کہاں وہ گیسوئے شبرنگ مشکبار نہیں

ابھی تو اور بھی ہونا ہے رات کو پرکیف — ابھی ستاروں میں اس آنکھ کا خمار نہیں

ابھی جبینِ بشر منتظر سی ہو جیسے — کہ آدمی ابھی فطرت کا شاہکار نہیں

اداسیوں میں زندہ دلی جھلکتی ہے — یہ داغِ دل ہیں چراغِ سرِ مزار نہیں

خزاں میں آنکھ نہ بدلی مری گلستاں سے — چمن پرست ہوں جاں دادہ بہار نہیں

تو کیا کوئی بھی نہیں ہے خرابِ جلوۂ یار
فراق خیر ہمارا کوئی شمار نہیں

موہم سمرسٹ

(مترجمہ حسن عباس)

خزانہ

موہم سمرسٹ موجودہ دور کا ایک مایۂ ناز مغربی انشاپرداز ہے جسے کردار نگاری میں بہت ملکہ حاصل ہے۔ جزئیات کا تجزیہ، اس کی تحریر کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ اس کی مخلوق کوئی ایسی نہیں۔ جو محض اپنے خالق کے تخئیل کی گہرائیوں میں گم ہو۔ بلکہ وہ اپنی فطرت کی تمام تر تاریکی اور روشنی سمیت ظاہر ہوتی ہے اس کے افسانوں کا رنگ لاکھ نرالا سہی۔ لیکن اسکے باوجود ان میں ایسی اجنبیت دکھائی نہیں دیتی۔ جو پڑھنے والے کے ذہن پر گراں گزرے۔ یہ افسانہ اس کی فنی قابلیت کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ (مترجم، حسن)

رچرڈ ہیجز ایک خوش باش انسان تھا۔ اس کی بلا سے کوئی مرے جئے یا آگ ہی جلے۔ لیکن اس سے مراد یہ نہیں۔ کہ وہ کوئی خود غرض تھا۔ قطعاً نہیں۔ اپنے کسی دوست کا ماتھ بٹانے میں اس نے کبھی انکار نہیں کیا۔ اور اس کی جیب میں اتنے پیسے ضرور رہتے۔ کہ وہ دوسروں کے کام آسکے وہ ایک سرکاری دفتر میں معقول مشاہرہ پر ملازم تھا۔ اور اس کی زندگی پہ دفتر کی ذمہ داریوں کا کوئی ناخوشگوار اثر نہ تھا۔ شام کو دفتر سے نکل کر کلب میں چند گھنٹے برج کھیلنے کے لئے جاتا۔ اس کا معمول تھا۔ چھٹی کے دنوں میں وہ باہر چلا جاتا اور کلیسا، نگار خانے اور عجائب گھر دیکھتا۔ وہ خاصا پڑھا لکھا اور خوش مزاج تھا۔ دوست اس پر لٹو تھے۔ یہ سچ ہے۔ کہ وہ کوئی ایسا خوبصورت نہ تھا۔ لیکن چہرا چکلا مرد تھا اس کی عمر پچاس سال ہونے کو آئی تھی۔ لیکن بھوری بھوری آنکھوں میں ہنوز ایک مسکراہٹ سی جھلکیاں لیتی نظر آتی۔ اسکا ایک بھی دانت مصنوعی نہ تھا۔

اس نے آغاز جوانی میں ایک دوشیزہ سے شادی کی۔ خوش قسمتی سے اُسے اس معاملے میں کسی قسم کی کوفت اٹھانا پڑی۔ کیونکہ شادی کے بعد چند سال پُرامن زندگی بسر کر کے وہ دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ وہ دونوں دوسری شادی کے خلاف تھے۔ اس لئے ان کے درمیان طلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ البتہ وہ دونوں کو اختیار تھا۔ کہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ رچرڈ نے اپنا مکان فروخت کر کے دفتر کے نزدیک ایک فلیٹ کرایہ پر لے لیا جو بخوبی آراستہ تھا۔ اسکے پاس اپنی پرانی باورچن تھی۔ لیکن اُسے اب ایک کھانا کھلانے والی خادمہ کی ضرورت تھی۔ جسکے لئے اُس نے ایک ایجنسی میں درخواست کی۔ اس نے ایجنسی کی ناظمہ کو واضح طور پر بتا دیا کہ خادمہ ذرا ادھیڑ عمر کی ہو۔ کیونکہ وہ بوڑھا آدمی ہے اور اصول کا پابند، خادمہ جوان ہوئی تو لوگ نجانے کیا کہیں گے۔ اس میں دونوں کی عزت کا سوال ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ سلور پالش کرنے میں ماہر ہو۔ کیونکہ اُسے پرانا سلور جمع کرنے کا شوق ہے۔ وہ مہمانوں کی تواضع کرنا جانتی ہو۔ کپڑے احتیاط سے رکھ سکے پتلون اور ٹائی پر بخوبی استری کر سکے۔ اور بوٹ اس طرح پالش کرے۔ کہ بس چمک اٹھے۔ علاوہ ازیں گھر بار سنبھالنا، فلیٹ کی صفائی اور سامان کی آرائش بھی شرط ہے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک خادمہ کے لئے تحمل مزاج، دیانتدار اور خوش شکل ہونا از بس ضروری ہے۔ اگر اُسے کوئی ایسی خادمہ مل گئی۔ تو وہ اُسے معاوضے میں معقول تنخواہ اور آزادی دیگا۔ ناظمہ نے اسکے پاس مختلف عورتیں بھیجیں۔ لیکن ایک بھی امتحان میں پوری نہ اُتر سکی۔

زندگی میں یہ ایک عجیب بات ہے۔ کہ اگر کوئی انسان کسی بات کے لئے ڈٹ جائے۔ تو اکثر اُسے وہ چیز مل جاتی ہے۔ ایک دن فلیٹ کے دربان نے رچرڈ سے کہا۔

"جناب میں نے سنا ہے۔ آپ کو ایک خادمہ کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو ایک بڑی ہوشیار خادمہ لا کے دیتا ہوں۔"

"کیا تم ذاتی طور پر اُسے جانتے ہو؟"

رچرڈ کو اس بات کا یقین تھا۔ کہ ایک مالک کی بجائے ایک نوکر کی سفارش ایسے معاملہ میں مقدم ہوتی ہے۔

"یقیناً آپ اُسے بہتر پائیں گے"

"اُسے آج سات بجے لے آنا۔ میں دیکھ لونگا"

ابھی پانچ منٹ مشکل گذرے ہونگے۔ یاسچن نے اطلاع دی۔ کہ وہی خادمہ جس کی دربان نے سفارش کی تھی حاضر ہے۔

اس نے کمرے میں روشنی تیز کر دی۔ تاکہ وہ اس خادمہ کی شکل صورت اچھی طرح دیکھ سکے۔ ایک عورت دروازے میں داخل ہو کر نہایت ادب سے کھڑی ہو گئی۔

"تمہارا نام؟"

"پیچرڈ جناب"

"تمہاری عمر؟"

"پینتیس سال، جناب"

"ٹھیک . . . . ."

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ اور بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ قد آور تھی لیکن رچرڈ کا خیال تھا۔ کہ اس نے اونچی ایڑی والے جوتے پہن رکھے ہیں۔ اسکے چہرے کے خط و خال اور رنگ میں مناسبت تھی۔

"ذرا اپنی ہیٹ اتار دو"

اسکے سر کے بال بھورے رنگ کے تھے جو بخوبی آراستہ نظر آتے تھے۔ وہ تندرست و توانا دکھائی دیتی تھی۔ نہ فربہ، نہ اتنی نازک۔ اُس نے چند سوالات پوچھے جن کا اُسے نہایت چست جواب ملا۔ خادمہ نے اپنی ذات کے متعلق جو حوالے دئے وہ بھی نہایت تسلی بخش تھے۔

"میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ملازم رکھ لوں۔ لیکن یہ یاد رہے۔ کہ میں روز روز نوکر بدلنے کا عادی نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تین چار مہینے بعد تم میری ملازمت صرف اسلئے ترک کر دو کہ تمہیں شادی کرنا ہے"

"آپ اطمینان رکھیں، جناب، میں بیوہ ہوں۔ مجھے اب دوبارہ شادی کی ضرورت بھی تو نہیں"

"بالکل ٹھیک، شادی اچھی چیز ہے۔ لیکن اس کی عادت ڈالنا اچھا نہیں"

وہ خاموش رہی۔ اس کے لئے یہی مناسب تھا۔ رچرڈ کو اس کا سلیقہ، اس کی باتیں بہت پسند آئیں۔ اور یہ طے پایا کہ ایک ہفتہ بعد وہ اسکے ہاں کام شروع کر دے گی۔ اسکے جاتے ہی رچرڈ نے گھنٹی بجا کر یاسچن کو طلب کیا اور بتایا کہ اس نے بالآخر ایک خادمہ کا بندوبست کر لیا ہے۔

"آپ اُسے ضرور پسند کریں گے جناب، آج دوپہر کو مجھے اُس سے بات کرنے کا موقع ملا۔ یقین ہو گیا کہ وہ بڑی ہوشیار اور باسلیقہ ہے"

"وہ تو اُسکے کام سے پتہ چلے گا مسٹر میڈی! بہرحال میں مطمئن ہوں"

"وہ کہتی تھی کہ مجھے ایسا آدمی بہت پسند ہے۔ جو کام کی قدر کرنا جانتا ہو۔ مجھے امید ہے۔ کہ وہ اپنے کام میں بہت دلچسپی لے گی"

"یہی میری خواہش ہے"

"اور جناب فرنی کھانے سے ہی اُسکے لذیذ ہونے کا ثبوت ملتا ہے میری رائے میں تو یہ خادمہ آپ کے لئے سچ مچ خزانہ ثابت ہو گی"

پیچرڈ کے کام نے ان الفاظ کی تصدیق کر دی۔ اس سے بڑھ کر کوئی خدمت کرنے کا اہل نہ تھا۔ وہ بوٹ پالش کرتی۔ تو اس طرح چمک اُٹھتے۔ کہ چمڑے میں عکس نظر آنے لگے۔ کپڑوں کی حفاظت کا اُسے خوب سلیقہ تھا۔ اُسے معلوم تھا۔ کہ اُسے کونسا لباس کس وقت پہننا ہے اور اب رچرڈ کو خود روزانہ اپنے لباس کے انتخاب کی زحمت گوارا نہ کرنا پڑتی اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ٹیلیفون پر بات کرتے وقت کیسا لب و لہجہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ فلیٹ میں ہر چیز صاف قرینہ سے رکھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُسے سلور پالش کرنے کا بھی خوب ڈھنگ آتا تھا۔ رچرڈ کے ہاں اب دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ نہایت خوش اسلوبی سے مہمانوں کو کھانا کھلاتی اور ٹیبل پر ان کا اشارہ پاتے ہی چیز حاضر کر دیتی۔ اسکے سارے دوست اس کا گن گانے لگے۔ اور بعض تو اُسکے مالک کو حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ وہ واقعی سونے میں تولنے کے قابل تھی۔ وہ موتیوں کے مول بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ ایک شام رچرڈ کے کمرے میں بیٹھے۔ اسکے دوستوں نے اسکا ذکر چھیڑ دیا۔

"اگر وہ تمہاری ملازمت ترک کر دے۔ تو تمہیں یقیناً صدمہ ہو گا"

"آخر کیوں! ایک دو سنے کوشش کی تھی۔ کہ وہ اسے مجھ سے چھین لیں۔ لیکن وہ کب جانے والی تھی۔ اسے معلوم ہے۔ کہ زیادہ آرام کہاں مل سکتا ہے"

"تھوڑے دنوں میں وہ ضرور اپنی شادی کر لے گی"

"میرا ایسا خیال نہیں"

"وہ خوبصورت ہے"

"بے شک وہ بھلی معلوم ہوتی ہے"

"پر کیا؟ میں کہتا ہوں وہ بڑی خوش شکل ہے۔ اگر وہ کسی دوسری زندگی میں قدم رکھے تو اخباروں تک میں اسکے حسن کا چرچا ہو"

عین اس وقت پیچرڈ قہوہ لئے اندر داخل ہوئی۔ رچرڈ نے اُس کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ متواتر چار سال تک، صبح و شام اُسے دیکھنے سے وہ شاید اسکے ظاہری حسن سے بے خبر ہو چکا تھا۔ ان چار سالوں میں اسکے چہرے کے خطوط، اسکے رنگ میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

"یہ تمہارے لئے ایک نعمت ہے"

"بے شک میرا اسکے بغیر گذارہ نہیں۔ لیکن مجھے یہ کچھ ایسی زیادہ پسند بھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ بہت کم گو ہے۔ میں نے اس سے گفتگو کرنے کی متعدد بار کوشش کی لیکن وہ صرف بات کا جواب دے کر خاموش ہو جاتی ہے ان چار سالوں میں اُس نے اپنی طرف سے کبھی کوئی بات نہیں کہی۔ مجھے اسکے دل کی کوئی خبر نہیں۔ میں نہیں جانتا۔ آیا میں اسے پسند بھی ہوں یا نہیں! میں اس کی عزت کرتا ہوں۔ مجھے اس پر اعتماد ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا بھر کی خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ لیکن نہ معلوم مجھے یہ کچھ ایسی زیادہ پسند کیوں نہیں۔ شاید اسلئے کہ یہ جاذبِ نظر نہیں"

یہ بات یہیں ختم ہو گئی۔

دو تین دن بعد ایک رات رچرڈ نے اکیلے کلب میں کھانا کھایا اُسے کوئی مصروفیت نہ تھی۔ اور پیچرڈ بھی گویا اس رات فارغ تھی۔ ایک نوکر نے اُسے اطلاع دی۔ کہ گھر سے ٹیلیفون آیا ہے۔ کہ آپ چابیاں وہیں بھول آئے ہیں۔ اگر ارشاد ہو تو کلب میں آپ کے پاس پہنچا دی جائیں۔ اس نے کہا کہ وہ آدھ گھنٹے تک خود ہی چابیاں لے لیگا۔ کلب میں اس رات کوئی رونق نہ تھی۔ لوگ سیر و تفریح کے لئے شبستانوں، سینما اور رقص گاہوں میں چلے گئے تھے۔ اس کا بھی خیال تھا کہ آج رات کوئی اچھا فلم دیکھے۔ اس نے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی خادمہ چابیاں لئے باہر نکل آئی اور سیر و تفریح کے خیال سے وہ اُسے اپنے ساتھ سینما لے جانے کو تیار ہو گیا۔ وہ ہیٹ پہننے کے بہانے اندر گئی اور پانچ ہی منٹ میں اپنے کپڑے بھی تبدیل کر لئے۔ نیلا فراک، سیاہ ہیٹ! گردن کے گرد اُس نے لومڑی کی کھال لپیٹ رکھی تھی۔ رچرڈ کو یقین تھا۔ کہ اُسے دیکھ کر کسی کو بھی یہ گمان نہ ہو گا۔ کہ وہ گھر کی ایک خادمہ ساتھ لئے سینما جا رہا ہے۔ گھر سے نکلتے وقت بھی اُسی نے دروازہ کھولا تھا۔ اور وہ پہلے باہر نکلی۔ سینما میں کھیل شروع ہونے سے پہلے ایک مزاحیہ فلم دکھایا گیا۔ پیچرڈ جو چار سال کے عرصے میں ایک بار بھی اسکے سامنے نہ مسکرائی تھی۔ آج جی کھول کر ہنسی۔ پھر اصل کھیل شروع ہوا۔ دونوں کو اپنی رگوں پر ایک کپکپی سی طاری ہوتی محسوس ہوئی۔ اُس نے پیچرڈ کے سامنے اپنا سگریٹ کیس کھولا اور اس نے شکریہ کے ساتھ ایک سگریٹ نکال لیا۔ جب وہ واپس لوٹے تو آسمان پر ستاروں کا ایک ہجوم مسکرا رہا تھا۔ وہ اُسے کھانا کھلانے آکسفورڈ سٹریٹ کے ایک ریستوران میں لے گیا۔ جہاں شراب کا دور بھی چلا۔ رچرڈ کے کانوں میں اس رات کی بات گونج رہی تھی۔ کہ اس کی خادمہ قطعاً بدصورت نہیں۔ پیچرڈ اپنی مد بھری نگاہوں سے رقص کرنے والوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسکے لبوں پر ایک لطیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"تمہیں رقص پسند ہے"

"کیوں نہیں۔ جب میں دوشیزہ تھی۔ تو میری بڑی مانگ تھی شادی کے بعد میں نے یہ شغل ترک کر دیا۔ میرا خاوند مجھ سے قد میں چھوٹا تھا اور اگر آدمی قد آور نہ ہو تو رقص کا لطف نہیں آتا"

رچرڈ اپنی خادمہ سے یقیناً قد آور تھا۔ اسے رقص کا بہت شوق تھا۔ لیکن وہ خادمہ سے رقص، اور پھر اس طرح بغلگیر ہونے سے گھبراتا تھا۔ اس نے سوچا کہ پیچرڈ بڑی بے لطف سی زندگی بسر کر رہی ہے

اور سا خوانکے رقص میں بہ سرعت بھی کیا ہے۔ بینڈ بجتے ہی وہ دونوں رقص کے لئے اٹھے۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ وہ بھرکم تھی۔ لیکن اُسے رقص کا خوب سلیقہ تھا۔ اُس نے دیواروں پر آویزاں آئینوں میں اپنا عکس دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں آپس میں ملیں۔ رچرڈ کے دل میں خیال تھا کہ دونوں کی جوڑی خوب رہی ہے۔ رقص سے فارغ ہو کر وہ ریستوران سے نکلے۔ پریچرڈ گویا ایک بیخودی کے عالم میں تھی۔ دس منٹ بعد وہ واپس گھر پہنچ گئے۔

"شب بخیر، جناب،" اُس نے کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔۔۔"

"شکریہ، پریچرڈ تمہارے بغیر میری شام بھی یونہی بسر ہو جاتی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم نے سیر کا خوب لطف اُٹھایا۔"

"بہت زیادہ، جناب میں اسے بیان نہیں کر سکتی۔"

رچرڈ اپنے کئے پر بہت خوش تھا۔ اور ایک لمحہ کے لئے اسکے دل میں دنیا بھر کے انسانوں کے لئے ایک محبت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

"شب بخیر، پریچرڈ،" اس نے کہا اور چونکہ اسکا دل مسرور تھا اس نے کمر میں باہیں ڈال کر اسکے لب چوم لئے۔

اُسکے ہونٹ بہت نرم تھے۔ پریچرڈ نے بھی اُسے چوما۔ بڑھاپے میں ایک تندرست عورت کا لو سا وہ بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی گرفت اور مضبوط کر لی۔ اُسکے گلے میں بھی اب کسی اور کی باہیں تھیں۔

اس کا معمول تھا۔ کہ صبح جب پریچرڈ اس کی ڈاک لیکر آتی۔ تو وہ بستر سے اٹھتا۔ لیکن اگلے دن صبح ساڑھے سات بجے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسکے جسم پر ایک کپکپی سی طاری تھی۔ وہ ہر روز دو تکیے سر ہانے لگا کر سوتا تھا لیکن آج ایک غائب تھا۔ اس نے پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دوسرا تکیہ بھی اسکے قریب پڑا تھا۔ اس پر کسی کا سر نہ تھا لیکن ظاہر تھا کہ وہاں کوئی شب کو لیٹا رہا ہے۔ اس کا دل بیٹھنے لگا اور بے اختیار منہ سے نکلا میرے اللہ میں کتنا احمق ہوں! خادمہ سے معاشقہ، کتنی ذلت کی بات ہے۔ وہ اُسے کوئی اتنی زیادہ پسند بھی نہیں۔ وہ تو اسکے مزاج کی عورت ہی نہیں۔ اب کیا ہوگا؟ اُسے رکھنا ممکن نہیں اور ملازمت سے کیونکر جواب دیا جائے۔ قصوروار تو دونوں ہیں۔ اگ

ذراسی حماقت کے لئے ایسی اچھی خادمہ کھو دینا کتنا افسوسناک ہے "یہ سب میری نرم مزاجی کا نتیجہ ہے" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اُسے اب ایسی خادمہ ملنا دشوار تھی۔ اس سے بہتر کپڑوں کی حفاظت اور سلوٹ پالش کرنے والی اسکے لئے گویا ناپید تھی۔ اُسے اسکے دوستوں کے مزاج کا علم تھا۔ ٹیلیفون نمبر یاد تھے۔ لیکن اب اس رات کے واقعہ کے بعد اس کا گھر میں رکھنا کیسے ممکن تھا! اُسے یقین تھا۔ کہ رات ہی رات میں اسکا مزاج بدل گیا ہوگا۔ وہ تو غالباً آج اس کی ڈاک لیکر بھی نہ آئے گی۔ اور اگر اس نے اسے بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔ تو بستر مبادا اگر یہ سنا دے گی۔ کہ پریچرڈ رات کی تھکی ہوئی اب آرام کر رہی ہے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بہت مضطرب سا ہو گیا۔

"اندر آؤ"

رچرڈ کا دل ٹوٹ چکا تھا۔

"صبح بخیر، جناب"

"صبح بخیر"

وہ پردے جھٹکتی ہوئی آگے بڑھی اور ڈاک اسکے حوالے کر دی اسکے چہرے پر کوئی تبدیلی کے آثار نہ تھے۔ نقل و حرکت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس نے ایک بار بھی رچرڈ سے آنکھیں ملانے یا چرانے کی کوشش نہ کی۔

"جناب کیا آپ نیا گہرے سوٹ پہنیں گے؟"

"ہاں"

وہ خط پڑھنے کا بہانہ کر کے چرائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے قمیص سے پرانے اسٹڈ اتار کر نئے لگا دیئے۔ جراب کا نیا جوڑا کرسی پر رکھ دیا۔ اور پھر گرے سوٹ نکال کر پتلون کے ساتھ بریسز لگا دیئے۔ اس نے سوٹ کے ساتھ ملتی جلتی ٹائی نکالی۔ رات والا سوٹ بازو پر لٹکا لیا، جوتے اٹھائے اور کہا۔

"جناب آپ پہلے ناشتہ کریں گے یا غسل فرمائیں گے"

"ناشتہ کرونگا"

"بہت اچھا جناب"

وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسکے چہرے پہ آج بھی وہی سنجیدگی اور متانت تھی۔ رات کا کھیل اسکے لئے گویا ایک خواب تھا۔ رچرڈ نے اطمینان کا سانس لیا اسے کالنگ کی ضرورت ہے؟ وہ بڑی اچھی خادمہ ہے۔ اُسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ کبھی زبانی یا اشارۃً یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہ کریگی۔ کہ کبھی ایک لمحہ کے لئے ان دونوں کے تعلقات مالک و خادمہ کی حدود سے نکل گئے تھے۔۔۔۔

رچرڈ ہیرنگ کے لبوں پر ایک لطیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

احسان دانش

دانشکدہ

مطلوب و طالب اکثر رہتے ہیں سرگراں سے
اک حسن خودنگر سے اک عشق بدگماں سے

اے کاش کوئی کہہ دے مل کر یہ باغباں سے
گل مطمئن نہیں ہیں ترتیبِ گلستاں سے

وہ بھی سمجھ رہے ہیں میں بھی سمجھ رہا ہوں
سجدوں سے آستاں یا سجدے ہیں آستاں سے

کیا خاک اُس کو ہوتا عرفانِ غنچہ و گُل
فرصت ملی نہ جس کو تعمیرِ آشیاں سے

دُنیا سکونِ دل تو کیا خاک مجھ کو دیتی
میں نے تو گردشیں بھی مانگی ہیں آسماں سے

سوئے ادب ہے لیکن اے دو جہاں کے والی
کیا فاقہ کرنے والے باہر ہیں دو جہاں سے

بے اعتمادیاں ہیں سب اُن کی حق بجانب
رُسوا ہوئی محبت کم ظرف رازداں سے

انجامِ گلستاں کی سُرخی جھلک رہی ہے
بجلی چمک رہی ہے تقدیرِ آشیاں سے

رفتار پر چلے گا جس کی نظامِ عالم
ایسا بھی اک مسافر نکلے گا کارواں سے

تالیف ہو رہی ہے کب سے کتابِ محشر
افسانے آ رہے ہیں کس کس کی داستاں سے

اے کاش تُو وہ جلوے میری نظر کو بخشے
باقی جو رہ گئے ہیں تقسیمِ دو جہاں سے

اب یاد کیا کرے گی احسان ہم کو دنیا
اب کیا غرض کسی کو اک خاکِ رائیگاں سے

آغا حمید ایم۔ اے۔ آئی سی ایس

ناول کی تکنیک

آپ نے اس شخص کی کہانی تو سنی ہوگی۔ جو بگلا پکڑنا چاہتا تھا اور اس خواہش سے اپنے استاد کے پاس گیا۔ استاد نے کہا وہ تو بہت آسان کام ہے۔ جب کوئی بگلا کسی جوہڑ کے کنارے آنکھیں بند کئے ایک ٹانگ پر کھڑا ہو تو چپکے سے جا کر ایک روشن موم بتی اسکے سر پر رکھ دو۔ موم پگھل کر بگلے کی آنکھوں میں چلی جائے گی۔ اور وہ اندھا ہو جائیگا۔ بس پھر پکڑ لو۔ اس شخص نے کہا۔ لیکن جب موم بتی بگلے کے سر پر رکھنے جائیں تو اسی وقت کیوں نہ پکڑ لیں۔ استاد نے حقارت سے ہنسکر کہا۔

"پکڑ تو سکتے ہو۔ لیکن یہ استادی کا طریقہ نہیں"

عام ناول پڑھنے والوں کا بھی نقادوں کے متعلق یہی خیال ہے کہ وہ موم بتی رکھ کر بگلا پکڑنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ناول کی تکنیک یعنی بناوٹ۔ توازن۔ کردار نگاری۔ ماحول اور طرز تحریر کا مطالعہ کچھ خاص سودمند چیز نہیں۔ اگر ناول کامیاب ہے۔ اور جس مقصد سے لکھا گیا ہے اسکو پورا کرتا ہے۔ تو تکنیک کے اصولوں سے بحث بیکار چیز ہے۔ اور اگر ناول ناکام ہے۔ تو اس بحث سے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

کسی حد تک یہ نقطہ نظر ٹھیک ہے۔ لیکن صرف کسی حد تک کیونکہ اس میں ایک خامی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سے تنقید کا اصل مقصد ظاہر نہیں ہوتا۔ بیان کرنے سے پہلے کہ تنقید کا اصل مقصد کیا ہے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ تکنیک کے معنے کیا ہیں۔ انسان ہزار ہا سال سے مختلف فنون میں اظہار جذبات کی کوشش کرتا رہا ہے اس کوشش میں اس نے مختلف ذرائع استعمال کئے ہیں۔ اور تجربے سے دیکھا ہے۔ کہ ہر ایک فن کے ہر ایک شعبے میں فن کار یعنی آرٹسٹ چند اصولوں کے ماتحت کام کرتا ہے۔ مثلاً شاعر کو وزن۔ قافیہ۔ ردیف اور الفاظ کی موزونی۔ مصور کو رنگوں کی ہم آہنگی۔ ماہر موسیقی کو آوازوں اور سروں کی ترتیب اور اسی قسم کی چیزوں کا لحاظ ہوتا ہے۔ ان اصولوں کو مجموعی طور پر ہم تکنیک کہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ فنکار کے لئے اس لئے ضروری ہے۔ کہ اس سے اس کی قوت اظہار میں اضافہ ہوتا ہے اور سامعین یا ناظرین جان سکیں۔ کہ فنکار نے کن جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اور اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ فن کار کی کامیابی کو پرکھنا محض ایک دلچسپ ذہنی شغل ہی نہیں۔ بلکہ اسکا تعلق ہمارے جمالیاتی حظ سے بہت گہرا ہے۔

تاریخ نہیں بتاتی ہے۔ کبھی نوع انسان کو قصے کہانیاں کہنے اور سننے کا شوق شروع ہی سے ہے۔ صرف مہذب اقوام میں ہی یہ شوق نہیں ہے۔ بلکہ جو لوگ جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اور جو تمدن اور تہذیب کے ابتدائی مراحل میں ہیں۔ اُن میں بھی یہ شوق انتہائی حد تک موجود ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم اور لوگوں کی زندگی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اور یہ جاننا چاہتے ہیں۔ کہ انہیں زندگی میں کیسے واقعات پیش آئے۔ کن کن مشکلات کا سامنا ہوا۔ اور اُن کو کہاں تک کامیابی ہوئی یا ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تمدن کی ترقی کے ساتھ کہانی بیان کرنے اور سننے کے علاوہ زندگی اور فطرت کا۔ مطالعہ انکا مقصد اور رسم و رواج کی حیثیت اور حقیقت جاننے کا شوق بھی بڑھ جاتا ہے۔ اسوجہ سے ناول میں کہانی کے علاوہ اور بھی کئی ضروری چیزیں ہوتی ہیں۔

کہانی سب ناولوں میں ہوتی ہے۔ لیکن تنقید کے موجودہ نظریے کے مطابق وہ ناول کا سب سے ضروری جزو ہو تو ہو۔ لیکن سب سے اہم جزو نہیں ہوتا۔ محض قصے کی دلچسپی کے علاوہ ناول نویس کی قوت اظہار، اسکا زندگی کے متعلق نقطہ نگاہ، تخلیق کردار کی اہلیت اور زندگی کو اپنے اصلی رنگ روپ میں پیش کرنے کی صلاحیت شاید زیادہ اہم اجزا ہیں۔ انہیں کو پرکھ کر ایک نقاد یہ فیصلہ کرتا ہے۔ کہ کوئی ناول یا کوئی ناول نویس کس پایہ کا ہے۔ اور اس میں کون کون سی امتیازی خصوصیات ہیں

جو اسے دوسرے ناولوں یا مصنفوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ایک ناولسٹ کا کام زندگی کو حقیقی رنگ میں پیش کرنا ہے۔ اگر وہ اسے کامیابی سے پیش کرتا ہے۔ تو ان سچی اور حقیقی تصویروں کو دیکھ کر ہمارے دل میں وہی حسیات بیدار ہوتے ہیں۔ جو خود زندگی کے حادثے برانگیختہ ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ ان واقعات کو بعینہٖ اس طرح بیان کرے جیسے وہ زندگی میں ہوتے ہیں۔ بلکہ اُن کو اس طرح پیش کرے کہ وہ زندگی کے واقعات معلوم ہوں یعنی ان دو الفاظ۔ معلوم ہوں" پر خاص زور دینا چاہتا ہوں۔ ایک پرانی ضرب المثل ہے۔ کہ حقیقت افسانے سے زیادہ حیران کن ہے۔ جب ہم زندگی کا کوئی نادر الوجود واقعہ سنتے ہیں۔ تو صرف یہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ تو ناممکن ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے" اسکے مقابلے پر ناول پڑھنے والے کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسرے الفاظ میں ناول کی کہانی میں چند قیدیں ہیں۔ جو زندگی کی کہانی میں نہیں۔ اسی لئے میں نے اسپر زور دیا ہے۔ کہ ایک ناول کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ زندگی کی تصویر معلوم ہو ہم دیکھتے ہیں کہ کیریکٹر یعنی کردار کی تخلیق میں ایک ناول نویس کو کسیقدر مبالغے سے کام لینا پڑتا ہے۔ یا کم از کم کسیقدر رنگ آمیزی کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ناول کے مرد و زن کچھ پھیکے معلوم ہونگے۔ صرف یہ لازم ہے کہ ہمیں ناول پڑھتے وقت وہ دلچسپ اور جیتے جاگتے انسان معلوم ہوں۔ زندگی کے واقعات ناول نویس کے لئے صرف مواد کی حیثیت رکھتے ہیں جنکو اسے فن کے اصولوں کے ماتحت ایک ایسی صورت میں ڈھالنا ہوتا ہے کہ پڑھنے والے پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جائے۔ مثلاً مزاحیہ یعنی کامیڈی میں وہ مسرت کے جذبات ابھارنا چاہتا ہے۔ اور اسکے برعکس المیہ یعنی ٹریجڈی میں غم انگیز کیفیت طاری کرنا چاہتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں اسکا طرزِ تحریر۔ واقعات کی ترتیب کردار کی تخلیق قصے کی بناوٹ اور توازن مختلف ہونگے۔ یا یوں کہو کہ ہر ایک ناول کی اپنی تکنیک ہوتی ہے اور ہر ایک ناول جداگانہ اصولوں کے ماتحت لکھا جاتا ہے۔ لیکن کسی فن کے اصول اتنے مقررہ۔ غیر تغیر پذیر اور جانچے تلے نہیں ہوتے جتنے مثلاً طبیعات ریاضی یا کیمیا کے۔ لیکن ان کی حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

اوّل اوّل تو ناول نویس کو ایک کہانی بیان کرنی ہوتی ہے اس سے کم از کم ہم سب کو اتفاق ہوگا۔ قصے کو زیادہ دلچسپ یا نیا نہ اہم بنانے کیلئے واقعات میں نہ صرف منطقی اور وقتی تسلسل پیدا کرنا ضروری ہے۔ بلکہ ایک ایسا رشتہ جس سے وہ ایک دوسرے پر انحصار رکھتا ہوا جوڑ جاوے اسکو ہم پلاٹ کہتے ہیں۔ پلاٹ کہانی سے زیادہ پیچیدہ چیز ہے۔ اور اس کی تنظیم ایک مشکل کام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ سرشار اور پریم چند بلکہ ان سے بھی بڑے مصنفین مثلاً ٹالسٹائے اس میں ناکام رہے ہیں۔ قصہ اور پلاٹ میں جو فرق ہے۔ اسکو نمایاں کرنے کے لئے مسٹر ای ایم فارسٹر نے ایک نہایت عمدہ مثال پیش کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ "بادشاہ مر گیا اور ملکہ مر گئی" تو یہ ایک قصہ ہوگا۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ "بادشاہ مر گیا اور اسکے غم میں گھل گھل کر ملکہ مر گئی" تو یہ پلاٹ ہوگا۔ اور اگر اسکو اس طرح پیش کیا جاوے کہ "ملکہ مر گئی تو کسی کو معلوم نہ تھا۔ کہ کیوں مر گئی۔ آخر پتہ چلا کہ بادشاہ کے غم میں گھل گھل کر مر گئی ہے" تو اس سے پلاٹ میں اسرار کا ایک عنصر بھی آ جاتا ہے۔ جس کو بہت ترقی دی جا سکتی ہے۔ اب ملکہ کی موت پر غور کیجئے۔ قصے میں ہم پوچھتے ہیں "اور پھر" یعنی یہ سنتے ہی کہ بادشاہ مر گیا۔ ہم پوچھتے ہیں۔ "پھر کیا ہوا" لیکن پلاٹ میں ہمارا سوال ہوتا ہے "کیوں" یعنی ملکہ کیوں مر گئی" قصے اور پلاٹ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ آپ تکنیک کے مطالعے کی ضرورت اور اس کی اہمیت کی چند زندہ مثالیں لیجئے۔ اردو میں جو چند ناول نویس ہوئے ہیں۔ ان میں قابل ذکر یہ چار ہیں:۔ رتن ناتھ سرشار۔ رسوا۔ مولوی نذیر احمد اور پریم چند میری رائے میں ان چاروں میں سے صرف دو کو فن کے اصولوں کا احساس ہے۔ اور وہ مولوی نذیر احمد اور رسوا ہیں۔ رسوا کا مشہور ناول "امراؤ جان ادا" بناوٹ کے لحاظ سے ایک سیدھا اور سلجھا ہوا ناول ہے۔ یہ ایک تمثیلی یعنی ٹپیکل بازاری عورت کا قصہ ہے۔ جس کو اپنی زندگی میں مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ وہ اپنا قصہ خود بیان کرتی ہے۔ رسوا ہمیں زندگانی کی ہنگامیت کا ایک رُخ امراؤ جان کی آنکھوں سے دکھاتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں۔ کہ جو عورت گناہ کی زندگی بسر کرتی ہے۔ یا کم از کم جسے ہم گناہ سمجھتے ہیں۔ اسکے لئے دنیا ایک ہی رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتے ہوئے۔ رسوا نے اپنے ناول میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں کیا۔ جو ایک ایسی عورت کے تجربے سے بہت مختلف ہو۔ رسوا

کو اپنے مضمون کی مجبوریوں کا پورا احساس ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے
ادا۔ ایک نہایت کامیاب ناول ہے۔ اس میں واقعات کا ایک ایسا تسلسل
اور روانی۔ پلاٹ کی منظم تعمیر اور گفتگو میں ایک ایسا بے ساختہ پن پایا جاتا
ہے۔ جو کم اردو ناولوں کو نصیب ہے۔ اور بیان کی اسی وحدانیت اور
کفایت کا نتیجہ ہے۔ کہ ناول کے اختتام پر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ
ہم نے نہ صرف ناول کی دنیا دیکھی ہے۔ بلکہ اس میں رہے ہیں۔ اور
اسکے نشیب و فراز سے آشنا ہیں۔

مولوی نذیر احمد بھی زندگی کا صرف ایک کونہ دیکھتے ہیں۔ اور جس
پردے پر وہ خود تصویر بناتے ہیں۔ وہ بہت چھوٹا ہے۔ لیکن اس کا
انہیں پورا احساس معلوم ہوتا ہے۔ مراۃ العروس اور بنات النعش
اسی وقت کے عام ناولوں کی طرح انگریزی ناولوں کی نقل میں
نہیں لکھے گئے۔ بلکہ اُن کی ساخت خاص مشرقی ہے۔ مولوی نذیر احمد
کے اکثر ناول دہلی کی گھریلو زندگی کے متعلق ہیں۔ جس سے وہ پوری
طرح آشنا ہیں۔ اُن کے ناولوں میں ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں کھٹکتی
جو اُس زندگی سے بے تعلق معلوم ہو۔ اور یہی اُن کی کامیابی کا راز ہے

اُن کے برعکس رتن ناتھ سرشار اور پریم چند گو اعلےٰ درجہ کے
ناول نویس ہیں۔ تکنیک کے اصولوں سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں
بناوٹ اور توازن کے لحاظ سے فسانۂ آزاد، چوگان ہستی، گوشۂ عافیت
اور بازار حسن ناقص ناول ہیں۔ ان کو جو کامیابی حاصل ہے۔ اس
کا انحصار اس چیز پر ہے۔ کہ ان میں کردار کی تخلیق بہت اعلےٰ پیمانہ پر
ہے۔ اور اس میں سماج کے رسم و رواج کی سچی تصویریں ہیں۔ لیکن
اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اگر ان میں تکنیک کی وہی خوبیاں
ہوتیں۔ جو رسوا اور نذیر احمد کے ہاں ہیں۔ تو انکی حیثیت بہت بڑھ جاتی

چوگان ہستی میں دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں جن میں صرف
سطحی تعلق ہے۔ ایک طرف تو پریم چند یہ دکھانا چاہتے ہیں۔ کہ وہ
معاشرتی اور اخلاقی اصول جو انسان نے اپنی حفاظت اور سوسائٹی
کے تقرب کے لئے مدتوں کی پیہم کوشش سے وضع کئے ہیں۔ ایک فرد کے
جذباتی تجربے اور خواہش کے مقابلے میں کس قدر کمزور بے وقعت اور
بے معنی ہیں۔ صوفیا صاحب اُن کو محبت اور ذاتی آزادی کے جذبات
کا سامنا ہوتا ہے۔ تو اُن کی کیا حیثیت اور قیمت رہ جاتی ہے یعنی ایک
طرف تو انسان کی یہ زبردست خواہش ہے۔ کہ دوسرے انسانوں کی
زندگیوں کو رسم و رواج کی پابندیوں اور تعصب کی بند صفوں میں
جکڑ کر منظم کیا جائے۔ اور دوسری طرف جذبات کی ہیجان آفرینی اور
دلفریبی ہے کہ ہر زندگی کو قوانین کی ہر جائز و ناجائز قید سے
آزاد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ عقل و عشق یہ خوفناک مگر عجیب تمدنی
نتائج پیدا کر دیتی ہے۔

اسکے ساتھ ہی ساتھ پریم چند ہماری بدلتی ہوئی حالت کا
نقشہ کھینچنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی نسل کا حال ہے جو ابھی ابھی
ایک لمبی نیند سے بیدار ہو کر بے تاب ہر امید اور ہنگامہ خیزی پر
آمادہ ہے۔ یہ ایک ایسی قوم کا حال ہے۔ جو ایک زبردست کروٹ
لے رہی ہے۔ ان دونوں موضوعوں کو بیک وقت پیش کرنے کا
یہ نتیجہ ہے۔ کہ دونوں میں سے ایک بھی پوری طرح نہیں ابھرتا ہمارا دھیان
اور ہمارے تاثرات دونوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اگر ان دونوں میں
سے صرف ایک موضوع پیش کیا جاتا۔ تو اسکا اثر بہت بڑھ جاتا۔
پریم چند کو غالباً "چوگان ہستی" لکھتے وقت یہ احساس بالکل نہ تھا
کہ وہ ایک کتاب میں ہی دو کتابیں لکھ رہے ہیں

فسانۂ آزاد کے متعلق تو یہ مشہور ہے۔ کہ اسکا پلاٹ بہت غیر
منظم اور غیر مربوط ہے۔ اگرچہ سرشار کا موضوع ایسا تھا۔ کہ انہیں
ایک حد تک مجبوری بھی تھی۔ آزاد جیسے آوارہ شخص کا قصہ لکھتے وقت انہیں
بھی اسکے ساتھ ہر قسم کی سوسائٹی میں جانا پڑتا تھا۔ لیکن اگر۔ فسانۂ آزاد،
میں صرف لکھنؤ کی ہی سوسائٹی کا حال ہوتا۔ تو ایک تو خود آزاد کی شخصیت
زیادہ نمایاں ہو جاتی۔ اور دوسرے اس وقت کی سوسائٹی کا حال زیادہ
واضح ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالت میں "فسانۂ آزاد" کے پلاٹ کی پریشانی
اور آوارگی ناقابل معافی ہے۔ اگر آپ نے "فسانۂ آزاد" کو ایک سے زیادہ
مرتبہ پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ تو آپ خوب سمجھتے ہونگے۔ کہ میرا مطلب
کیا ہے۔ تکنیک کے انتہائی کمال کی سب سے نمایاں مثال فرانسیسی ناول
نویس فلابیر کی مشہور کتاب "مادام بواری" ہے۔ کتاب کا موضوع
بہت معمولی ہے۔ یعنی ایک ایسی بے وقوف عورت کا قصہ ہے۔ جو

ہر وقت عشق و محبت اور امارت کے خواب دیکھتی رہتی ہے۔ وہ بھول جاتی ہے۔ کہ وہ خود ایک معمولی گھرانے کی لڑکی ہے۔ اور اُس کا خاوند ایک معمولی فرانسیسی قصبہ میں رہتا ہے۔ اپنے سنہری خوابوں کے نشہ میں وہ حقیقت کو کھو بیٹھتی ہے۔ اور آخر کار جب اسکے دونوں عاشق ایک دوسرے کے بعد اسکو رد کر دیتے ہیں۔ اور وہ دوکاندار جس سے وہ اپنے بناؤ سنگار کا سامان قرض پر لیتی رہی ہے۔ روپیہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تو وہ خودکشی کر لیتی ہے۔ اس معمولی سے موضوع اور اس پامال قصہ پر فلابیر نے دنیا کا ایک مشہور اور کامیاب ناول لکھا ہے۔ بہت حد تک اس کی کامیابی کا راز ٹکنیک کے اصولوں کی پابندی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ جب کوئی فنکار ٹکنیک کے اصولوں کے متعلق سوچنا شروع کرتا ہے۔ تو اس کی تخلیق میں تصنع اور بناوٹ آجاتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب کوئی فن کار کسی شاہکار کی نقل کرے۔ اگر وہ کوئی نئی چیز پیدا کرتا ہے۔ تو ٹکنیک کے اصول اسکے راستہ میں حائل نہیں ہونگے۔ مادام بواری اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ گو فلابیر نے یہ ناول لکھتے وقت بہت ہی کاوش اور چھان بین سے کام لیا۔ اور ٹکنیک کے اصولوں کی پوری پابندی کی ہے۔ کسی نقاد نے آج تک اعتراض نہیں کیا۔ کہ اسکے شاہکار میں تصنع ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہر ایک ناول کی اپنی ٹکنیک ہوتی ہے۔ اسلئے تصنع صرف اسی حالت میں پیدا ہوتا ہے۔ جب ایک ناول کو کسی کامیاب پرانے ناول کی ٹکنیک کے مطابق سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کیجائے۔ ورنہ ٹکنیک کے اصولوں کا مطالعہ اور اُن کی پیروی کسی تخلیقی فنکار کی سدراہ نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اسکے فن کا ایک اہم جزو ہے۔ جسے اکثر وہ غیر محسوس طریقے پر عمل میں لاتا ہے

مکتبۂ اُردو کی تازہ مطبوعات

پاپی } اوپندر ناتھ اشک۔ قیمت ایک روپیہ

اشک کے ڈرامے زندگی کا مرقع ہوتے ہیں

اور پھر ہماری معاشرتی کمزوریوں کو اس طرح بے نقاب کرتے ہیں۔ کہ انہیں پڑھکر ہم اپنے گردوپیش کی حالت کو دیکھنے اور اسپر غور کرنے کے لئے مجبور ہوجاتے ہیں • سماجی رسوم اور توہم پرستی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہستی کس طرح تڑپتی ہے۔ اس کی تصویر آپ کو وہاں ملے گی۔ اسکے علاوہ عالمگیر بیکاری اور سیاسی غیر دیانتداری کے پس منظر میں اوپندر ناتھ نے جو طنز کئے ہیں۔ وہ ہماری کھوکھلی زندگی کو ہمارے سامنے بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اشک کے بہترین حزنیہ المیہ، طنزیہ، طربیہ اور مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ

آؤ } سعادت حسن منٹو ——— قیمت ۱۲؍

ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ سعادت حسن منٹو ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں یدطولیٰ رکھتا ہے۔ اس کے ریڈیائی ڈرامے ہندوستان کے تمام بڑے ریڈیو اسٹیشنوں سے براڈکاسٹ ہوچکے ہیں۔

آؤ — منٹو کے آٹھ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے

آؤ بھی منٹو کے ڈرامے پڑھیں۔

گورکی کی ڈائری } مترجم۔ حسن عباس — قیمت . . . . . ۱۲؍

——— تاثرات کا ایک رنگین خاکہ ———

اس میں ہلکے اور گہرے دونوں رنگ موجود ہیں۔ انسانی زندگی کو کرید کرید کر وہ جو کچھ نکال سکا۔ اس نے مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے

سبھاش بوس } گوپال متل — قیمت ——— چھ آنے
سنیاسی، آئی سی ایس اور باغی

سبھاش بوس کی زندگی کے نشیب و فراز

اس شخص کی داستان جس کی تمام زندگی جہاد حریت میں بسر ہوئی۔ نظربندی اور اسکے بعد کے واقعات پر سیر حاصل تبصرہ۔ ایک باغی کے حالات زندگی دوسرے باغی کے قلم سے

مکتبۂ اردو لاہور

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

غزل

گوہر شو و بگوشِ حسیناں رسیدہ باش   یا ہمچو اشک از سرِ مژگاں چکیدہ باش

در بزم ہمچو شمع فروزاں بر آر سر   در رزم ہمچو تیغِ صفاہاں کشیدہ باش

پایت ستوہ آید ازیں عقلِ امن کوش   دستِ جنوں بیار و گریباں دریدہ باش

در مرغزارِ حسن بسے آرمیدۂ   در کارزارِ شوق یکے دل رمیدہ باش

لرزی کہ خارِ راہ کند پائے تو فگار
رو ہمچو نیش در رگِ منزل خلیدہ باش

[illegible]

"خدایا" وزیر نے اپنے دل میں کہا۔ "کیا میں احمق ہوں؟ آج تک تو مجھے پتہ نہیں چلا۔ اور نہ میری حماقت کسی دوسرے پر ظاہر ہوئی ہے۔ کیا میں اپنے عہدہ کے لئے نااہل ہوں؟ میری تو اس میں خیر نہیں اگر میں کہوں۔ کہ مجھے کپڑا نظر نہیں آتا"

ایک جولاہا وزیر کو تامل کرتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ "کیا حضور اسکے متعلق کچھ ارشاد نہ فرمائیں گے؟"

"کیوں نہیں؟" بوڑھے وزیر نے جواب دیا۔ اور اپنے چشمہ میں سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ "یہ کپڑا تو بہت ہی عمدہ اور دلفریب ہے۔ یہ نمونے اور رنگ سبھی حیرت انگیز ہیں۔ میں بادشاہ سلامت کو جاکر بتاتا ہوں۔ کہ میں اس کپڑے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا"

جلاہے بولے۔ "ہمیں آپ کے تعریفی کلمات سنکر بہت خوشی ہوئی ہے۔ خدا آپکا اقبال بلند کرے!" اسکے بعد جلاہوں نے کپڑے کے رنگوں کے نام لینے شروع کئے۔ اور اس کے نمونے کی توضیح کرنے لگے۔

بوڑھا وزیر اُن کی طرف پوری طرح متوجہ رہا۔ تاکہ جب وہ شہنشاہ کے پاس واپس جائے۔ تو اسے جاکر اپنی رائے سے آگاہ کرے۔

چنانچہ اس نے واپس جاتے ہی کپڑے کا تمام حال کہ سنایا اب جلسازوں نے اور روپیہ مانگا اور اسکے ساتھ ہی ریشم اور سلمہ بھی۔ اور سب کچھ لیکر اپنے پاس رکھتے رہے۔ اور یوں ظاہر کرتے رہے۔ گویا وہ سب چیزیں بننے میں استعمال کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں انہوں نے ایک تار بھی کھڈی پر نہ چڑھایا بلکہ پہلے کی طرح بڑی جیتی سے بیکار کام کرتے رہے۔

اسکے ذرا بعد شہنشاہ نے ایک اور معزز درباری کو دیکھنے کے لئے بھیجا کہ بنائی کیسی ہو رہی ہے۔ اور یہ کہ کپڑا جلد تیار ہو سکے گا یا نہیں۔ اسکے ساتھ بھی وہی واقعہ پیش آیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ لیکن جب کھڈیوں پر کچھ تھا ہی نہیں۔ تو اسے نظر کیا آتا۔

وہ فوراً جلسازوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور کپڑے کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے اُس سے پوچھنے لگے۔ "کیوں جناب۔ کیا یہ کپڑا واقعی لاجواب نہیں؟"

درباری سوچنے لگا۔ میں احمق تو ہوں نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہیں اپنے عہدے کے لئے نااہل ہوں۔ مگر یہ بہت عجیب بات ہے۔ مجھے اپنی سمجھ سے کام لینا چاہیئے"

چنانچہ اس نے کپڑے کی تعریف شروع کر دی۔ جو اسے نظر تک نہیں آتا تھا۔ اور اسکے خوبصورت رنگوں اور با مذاق نمونوں پر مسرت کا اظہار کیا

شہنشاہ کے پاس آکر بھی اُس نے یہی کہا۔ کہ یہ بہت ہی دلفریب کپڑا ہے۔

تمام شہر میں اس خوبصورت کپڑے کے چرچے ہونے لگے۔ بادشاہ کو خیال آیا کہ اب وہ خود کپڑے کو کھڈیوں پر چڑھا ہوا دیکھ آئے۔ چنانچہ بادشاہ اپنے ممتاز مصاحبین اور اُن دو مشہور عہدیداروں سمیت جو اس سے پیشتر ہی معائنہ کر آئے تھے، مکار جلاہوں کے پاس گیا۔ جو بغیر ذرہ بھر دھاگے یا ریشے کے استعمال کے بڑی جانفشانی سے کھڈیاں چلا رہے تھے۔

وہ دو درباری جو اس سے قبل وہاں آچکے تھے۔ شہنشاہ سے مخاطب ہوکر بولے۔ "حضور غور فرمائیں۔ کیا یہ قابلِ قدر شئے نہیں؟ ذرا آپ اسکے نمونے اور اسکے رنگوں کی طرف تو التفات فرمائیں۔" یہ کہتے ہوئے اُن دونوں نے خالی کھڈی کی طرف اس انداز سے انگلی بڑھائی۔ گویا وہ کپڑے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں تو وہ باقی سب لوگوں کو نظر آ رہا تھا۔

بادشاہ سوچنے لگا۔ "یہ کیا بات ہے! مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ یہ تو بڑی خوفناک بات ہے! کیا میں بیوقوف ہوں؟ کیا میں حکومت کے قابل نہیں؟ یہ بات تو مجھے ایک ایسا ناقابل برداشت صدمہ پہنچائے گی جس کا اس سے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا۔

پھر وہ ایک دم درباریوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ "واقعی یہ بہت ہی نفیس کپڑا ہے۔ اس کو ہماری منظوری دیتے ہیں۔" پھر اس نے ایک خاص توجہ کے انداز سے۔

اپنا سر ہلایا اور خالی کھڈیوں کی طرف بھی دیکھتا رہا۔ کیونکہ اس بات کا اظہار تو وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ صاحب جو اسکے ساتھ کھڑے تھے۔ اُن کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ دیدے پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ دوسروں کی طرح انہیں بھی خاک نظر نہ آیا لیکن بادشاہ کے الفاظ سنکر انہیں بھی پسندیدگی کا اظہار کرنا پڑا۔ بلکہ انہوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ بادشاہ سلامت یہ لباس پہنکر اس پُرشکوہ جلوس میں شامل ہوں۔ جسکے انتظامات ہو رہے ہیں

کوئی کہتا تھا۔ آہ یہ کپڑا کیا ہی دلفریب ہے! لطافت اور نفاست کی جان! لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کاریگروں کی حوصلہ افزائی کے لئے شہنشاہ نے انہیں "بافندگانِ شاہی" کا خطاب مرحمت فرمایا۔

جلوس نکلنے سے ایک دن پہلے رات کو جلاہوں نے بڑی سرگرمی دکھائی۔ اور سولہ شمعیں روشن کرکے بڑے زور سے کام پر لگے رہے۔ لوگ بار بار دیکھنے آتے تھے۔ کہ وہ شہنشاہ کے نئے لباس کو ختم کرنے کے لئے کس محنت سے کام کر رہے ہیں۔ لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے یوں ظاہر کیا۔ کہ وہ کھڈی پر سے کپڑے کو اتار رہے ہیں پھر بڑی بڑی قینچیوں کو بلند کرکے یوں کاٹنا شروع کیا جیسے وہ سچ مچ کپڑے پر چل رہی ہیں۔ اسکے بعد ایسی سوئیوں کو جن میں دھاگا پرویا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ یوں اوپر نیچے گھمایا۔ جیسے وہ کپڑے کو سی رہے ہوں۔

اسکے بعد وہ کہنے لگے۔ "بادشاہ سلامت کا لباس تیار ہے"

شہنشاہ بہ نفسِ نفیس اپنے خاص درباری اُمرا کو ساتھ لے کر آیا۔ اسکے آنے پر ایک کاریگر نے اپنا بازو اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھئے حضور کا پاجامہ ہے۔ یہ کوٹ ہے اور یہ چغہ" اور اس طرح زمین پر سے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دکھاتے رہے۔ اور ساتھ ہی تعریفیں بھی کرنے لگے۔ کہ "دیکھئے نفاست اور سبکپن میں یہ تارِ عنکبوت سے کسی طرح کم نہیں۔ اسے پہنکر معلوم بھی نہیں ہوتا۔ کہ جسم پر کچھ ہے بھی۔ اور یہی اس کی خصوصیت ہے"

درباریوں نے بھی ہاں میں ہاں ملانا شروع کیا۔ "آپ بجا فرماتے ہیں!" مگر درحقیقت انہیں نظر کچھ نہ آیا۔ کیونکہ نظر آنے والی وہاں کوئی چیز ہی نہ تھی۔ اسکے بعد جلاہے آگے بڑھے اور کہنے لگے "کیا بادشاہ سلامت بکمال مہربانی اپنے کپڑے اتارنا پسند فرمائیں گے۔ تاکہ ہم اس قدِ آدم آئینے کے سامنے انہیں نیا لباس پہنا دیں۔"

شہنشاہ نے اپنے سب کپڑے اتار ڈالے اور جلاہوں نے بظاہر اسے نیا لباس پہنانا شروع کیا۔ اس عرصہ میں آئینے کے اندر اپنا ننگا جسم دیکھ کر بادشاہ پیچ و تاب کھا کر ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ بادشاہ کو دیکھ کر ہر فرد و بشر کی زبان سے یہی کلمہ نکلا۔ "واہ واہ کپڑے کس خوبصورتی سے بدن پر سج رہے ہیں!" کوئی کہنے لگا "کیا نفیس نمونہ ہے! اور رنگ کیا ہی اچھے ہیں!" کسی نے کہا۔ "کیسا شاندار لباس ہے!"

اسکے بعد چوبدار پکار کر کہنے لگا "حضور کا اقبال بلند! غلام منتظر ہیں کہ حضور جلوس میں رونق افروز ہوں۔ تو آپ پر چتر کا سایہ کریں۔"

شہنشاہ بڑی تمکنت سے بولا "دیکھو تو میں تیار ہوں! اور یہ کپڑے تو بھلے دکھائی دیتے ہیں نا!" یہ کہہ کر وہ دوبارہ آئینے کی طرف مڑا اور بڑے غور سے اپنے لباس کو نیچے اوپر دیکھنے لگا۔ تب صاحب جو اس کا طویل دامن تھام کر چلتا تھا، جھکا اور ظاہر کیا۔ کہ اس نے فرش پر سے کچھ اٹھا لیا ہے۔ اور چلنے کے دوران میں بھی وہ یہی ظاہر کرتا رہا۔ کہ وہ کسی چیز کو تھامے ہوئے ہے۔ اُسے اس بات کے ظاہر کرنے کی جرأت نہ تھی۔ کہ اُسے بادشاہ کا لباس نظر نہیں آتا۔

شہنشاہ پر شوکت طور پر جلوس میں شامل ہوا۔ ایک شاندار چتر اسکے سر پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ بازاروں میں کھڑے اور کھڑکیوں سے جھکے ہوئے لوگ پکار رہے

"شہنشاہ کا نیا لباس تو دیکھیا خوبصورتی میں جواب نہیں رکھتا۔ اس کا دامن کیا خوبصورت ہے!"

کسی فرد و بشر کو یہ ہمت نہ پڑی کہ ایک لمحہ کے لئے اقرار کرے۔ کہ اُسے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اور کوئی ایسا کرتا کیونکر؟

فوراً ہی ننگ سے احمق یا نااہل کہنے لگ جاتے۔"
اس سے پیشتر بادشاہ کے کسی لباس کو اتنی شدت سے
نہ سراہا گیا تھا۔

آخر کار اس مجمع میں سے ایک بچہ پکارا۔
"بادشاہ نے تو کچھ پہنا ہی نہیں!" اور لڑکے کے باپ نے
لوگوں سے کہا "ذرا اس معصوم بچے کی بات تو سنو!" اور
بچہ کا فقرہ کانوں کان سارے ہجوم تک پہنچ گیا۔ اور وہ
جوش میں آکر بولے۔ "بادشاہ کے بدن پر تو کپڑا ہی نہیں!"
یہ بات بادشاہ کو متاثر کئے بغیر نہ رہی۔ اس نے سوچا
کہ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ اب تو جوں توں کرکے
مجھے اس جلوس کے ساتھ چلنا چاہیئے۔"

دامن بردار پہلے سے بھی زیادہ اکڑ اکڑ کر چلنے لگے، بادشاہ
کے اس دامن کو اونچا اٹھائے ہوئے جس کا وہاں نشان تک نہ تھا

جدید ہندوستانی ادب
کے
ہر مدرسۂ فکر کو آپ اس میں پائیں گے
ترقی پسند فسانہ نگاروں، شاعروں اور مقالہ نویسوں کے خیالات
کا البم

نئے زاویئے

مرتبہ
کرشن چندر

ہندوستانی ادب کے موجودہ دور کے ہر بڑے مصنف کی تحریر اس کتاب میں موجود ہے

فہرست: راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، ایس ایک واتسائن، ن۔ م۔ راشد، احمد علی، احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، موہن سنگھ، فیض احمد فیض، دیانند ستیارتھی، ملک راج آنند، پریس (دھرم پرکاش آنند)، اختر اورینوی، ممتاز مفتی، گوپال متل، شیلا سیرو، شانتا کیرتن، سہیل عظیم آبادی، سنت سنگھ سیکھوں، اسلام مچھلی شہری، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، مطلبی فرید آبادی، میراجی، پریم چند، حسن نذیر، احسان دانش، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، کرشن چندر۔

قیمت بلا جلد ؏ ——— مجلد مع ڈسٹ کور سے

ناشران: مکتبہ اردو لاہور

کرشن چندر

محبت

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

پولیس آفیسر (ریسیور اٹھاتے ہوئے) کون؟ کیا؟ ہاں۔
ہاں۔ میں نہیں سن سکتا ہوں۔ تمہاری آواز — ہاں ہاں۔
میں جانتا ہوں۔ تم مجھ سے ٹیلیفون پر بات کر رہے ہو۔ کیا کہا؟
قتل کر دیا؟ دو آدمی؟ نہیں نہیں۔ ہاں ہاں۔ اچھا۔ وہ آدمی
وہ آدمی کون ہے؟ کیا کہا؟ زخمی آدمی بھاگ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں
آتا۔ کیا کہہ رہے ہو۔ وہ زخمی آدمی کدھر بھاگ گیا؟

ڈوگر سنگھ حضور یہ ملزم۔

پولیس آفیسر (ریسیور پر ہاتھ رکھ کر) دیکھتے نہیں۔ میں ٹیلیفون پر
بات کر رہا ہوں۔ بدتمیز۔ خاموش کھڑے رہو اور ملزم کو بھی اُس
کمرے میں لے جاؤ۔ (ٹیلیفون میں) ہاں۔ اچھا تم کیا کہہ رہے ہو؟
ملزم پکڑا گیا؟ کیا کہا مقتول بھاگ گیا۔ قاتل پکڑا گیا۔ کیا واہیات ہے
میر حیات؟ میں نے کب کہا۔ میر حیات؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا
دیکھو عبدالرحمٰن اگر تم قتل کی رپورٹ کرنا چاہتے ہو۔ تو سیدھی طرح
بات کرو۔ یہ ناک میں سارنگی کی طرح کیوں گنگنا رہے ہو۔ کیا کہا
گاتا؟ کوئی گانا سننا چاہتا ہے۔ اس وقت؟ میں کہتا ہوں کہ خدا
کے لئے۔ سنتے ہو۔ ناک میں سارنگی کی طرح نہ گنگناؤ۔ سنتے ہو؟ او
... ہلو۔ ہلو (گھنٹی بجتی ہے) (پولیس آفیسر ریسیور ہاتھ سے رکھ
دیتا ہے) او ... ڈیم ...

(ڈوگر سنگھ کی طرف مڑتے ہوئے) اچھا ڈوگر سنگھ یہ کیسے ہے؟ تم

ڈوگر سنگھ حضور۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔ میں ڈیوٹی پر تھا کہ یہ
شخص سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر شور مچانے لگا۔ سینکڑوں لوگ
اکٹھے ہو گئے۔ تانگے۔ موٹریں۔ چھکڑے سب رک گئے۔ سب ٹریفک
بند ہو گیا۔ حضور یہ سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر شور مچانے لگا۔
کہنے لگا کہ میں ایک سبزی فروش ہوں۔ میرا نام دُولا ہے۔ میں نے
ایک آدمی کو جان سے مار دیا ہے۔ میں ملزم ہوں ... اس لئے
حضور میں اسے آپ کے پاس لے آیا ہوں۔

پولیس آفیسر (ہنستے ہوئے) کوئی بیچارا شرابی ہے ... کیوں بیٹا
دُولے ... ہا ہا۔

ڈوگر سنگھ۔ نہیں حضور، ہوش میں ہے۔ شرابی تو بالکل نہیں۔ مگر
بات اتنی ہوئی۔ کہ یہ سڑک کے درمیان جہاں میں کھڑا ڈیوٹی دے
رہا تھا آکر چلانے لگا۔ لوگو میں خونی ہوں۔ قاتل ہوں۔ میں نے
ایک انسان کو قتل کیا ہے۔ حضور اب میں اسے آپ کے حضور میں
پیش کرتا ہوں۔

پولیس آفیسر۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ اچھا یہ بات ہے۔ کہ
ڈوگر سنگھ ملزم کو گردن سے کیوں پکڑے ہوئے ہو۔ چھوڑ دو
اس بیچارے کو۔ بھاگ کر کہاں جائے گا۔ کیوں بے دولے کیا
بات ہے کون ہو تم؟

دُولا۔ حضور میں ایک سبزی فروش ہوں۔ میں گنہگار ہوں (رو رو کر ہو
کر گلوگیر لہجہ میں) حضور میں قاتل ہوں۔ میں ایک خونی ہوں میں نے
خون کیا ہے۔ مجھے قید کر لو۔ جیل میں ڈال دو۔

پولیس آفیسر (سختی سے) ہوں ... تھکے چلاتے ہو گے تم خونی ہو
بدمعاش!

دُولا۔ میں بدمعاش نہیں ہوں۔ حضور میں خونی ہوں۔ حضور، میں
سبزی فروش ہوں۔ میں نے ایک انسان کو قتل کیا ہے سب
انسان بھائی بھائی ہیں۔ ہائے ... حضور میں اپنے گناہوں

اور اس گناہ کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤنگا۔ لیکن نہیں میرا ضمیر
مجھے دن رات پریشان کرتا رہا۔ مجھے ایک منٹ بھی آرام اور
سکون نصیب نہیں ہوا۔ زندگی ایک مسلسل عذاب بن کر رہ گئی
میرا خیال تھا کہ میں اسے بھول جاؤنگا۔ لیکن نہیں رات کو بھی
اکثر جب میں دکان پر سوتا تو یہی خیال مجھے ستائے رکھتا اور
میں گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑاتا تو کیا دیکھتا کہ . . .

پولیس آفیسر (بات کاٹ کر) ہاں تو تم کیا دیکھتے ؟

دو ولا ۔ میں گاجر، مولیاں، گوبھی، پالک . . . اے حضور میں سبزی
فروش ہوں نا ۔

پولیس آفیسر ۔ (پاؤں فرش پر مار کر) سیدھی طرح بات کرو۔ ورنہ

دو ولا ۔ لیکن اس سے زیادہ سیدھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ کہ میں نے ایک
آدمی کا خون کیا ہے ۔

میں ہر روز رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر روتا ہوں اور میری بیوی
مجھے روتے دیکھ کر کہتی ہے۔ دو ولے شاہ اس طرح رونے دھونے سے
ضمیر کا بار ہلکا نہیں ہو سکتا۔ اور پھر تم رات تکیہ اور بستر کے غلاف اور
چادریں گیلی کر دیتے ہو۔ تم کیوں نہیں اپنے آپ کو پولیس کے حوالے
کر دیتے ۔ اب تم بوڑھے ہو چکے ہو اور یہ غم اب تم سے نہیں سہا جائیگا۔
جاؤ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔ سرکار تمہیں کالے پانی بھیج
دیگی ۔ اور ہم یہاں تمہارے لئے دعا کرینگے۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ پھر
میں بھی رونے لگا۔ پھر ہم سب مل کر رونے لگے۔ اور اس طرح کوئی فیصلہ
نہ کر سکے۔ . . . آخر ایک دن میری بیوی نے مجھے ایک نئی قمیص پہنائی۔
میرے سفید بالوں میں کنگھی کی۔ خود اپنے ہاتھ سے۔ مجھے پراٹھے کھلائے
اور پھر مجھے خود بازار کے چوک تک چھوڑ گئی۔ لیکن اس دن بھی میری ہمت
نہ بندھ سکی اور میں واپس چلا گیا۔

پولیس آفیسر ۔ میں پوچھتا ہوں۔ بھلے مانس یہ واقعہ کب ہوا تھا
وہ کون شخص تھا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا ۔

دو ولا ۔ اب یہ تو مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ بیس بائیس سال سے اوپر
ہی ہوئے ہونگے۔

پولیس آفیسر ۔ تو پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ
یہ چارٹ قتل کے مقدمات کی فائلوں سے بھرے پڑے
ہیں۔ مجھے فرصت نہیں کہ بائیس برس کے پرانے اور گلے
سڑے مردوں کو اکھاڑتا پھروں۔ ڈوگر سنگھ اسے باہر نکال دو۔ دیکھو
میاں دو ولے شاہ اس بات کو بند کرو اور جاؤ خاموشی سے
دکان پر سبزی بیچو ۔

دو ولا ۔ میں سبزی بیچنا نہیں چاہتا۔ میں کالے پانی جانا چاہتا ہوں
میرا جسم پھنک رہا ہے۔ میرے دل میں آگ سی لگی ہوئی ہے
مجھے کوڑوں سے مارو۔ مجھے رسوں سے باندھ کر جکڑ لو۔ مجھے
جیل میں ڈال دو۔ میرے سر کی حجامت کر دو۔ خدا کے لئے مجھے
واپس اپنی بیوی کے پاس نہ بھیجو ۔

پولیس آفیسر ۔ الله الله۔ میرے قدموں پر نہ گرو۔ یہاں سے
نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ بائیس سال کا پرانا کیس ہونہہ۔

دو ولے شاہ ۔ میں خونی ہوں ۔

پولیس آفیسر ۔ اپنے گھر جاؤ۔ میں کیا کر سکتا ہوں ۔

دو ولے شاہ ۔ میں نہیں جاؤنگا۔ میں جیل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے
حراست میں لے لو۔ مجھے رسوں سے جکڑ لو۔ میری حجامت کر ڈالو

ڈوگر سنگھ ۔ میں حضور یہ اسی سڑک کے بیچ ——

پولیس آفیسر ۔ ہاں ہاں۔ میں اسے سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر
چلانے کا مزہ چکھاؤنگا۔ میں اسے وہ سبق دونگا۔ کہ یہ ہمیشہ یاد
رکھیگا۔ میں ——

دو ولے شاہ ۔ تمہاری ہمت ہی نہیں ہو سکتی کہ تم ایسا کرو۔ مجھے حراست
میں لے لو۔ نہیں تو میں تمہاری شکایت کر دونگا۔ تم مجھ سے کوئی
خلاف قانون سلوک نہیں کر سکتے۔ میں اپنے بیوی بچوں سے
آخری بار مل کر آیا ہوں۔ میری حجامت کر ڈالو۔ نہیں تو میں
تمہاری شکایت کر دونگا۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔ کہ میرا ضمیر مجھے
کتنی ملامت کر رہا ہے ۔

پولیس آفیسر ۔ ملامت ؟ سُنا؟ ڈوگر سنگھ تم نے سُنا؟ ہم ہا

ملک بھر کے قوں سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ دیکھو چار ڈانگ۔ نئے مقدمات سے بھرے پڑے ہیں۔ خاص سٹاف اس کام کے لئے تعینات کیا گیا ہے۔ اور کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اتنا عرصہ یہ بدمعاش چھپا رہا اور اس کے ضمیر نے اسے ایک بار بھی ملامت نہ کی۔ اب یکایک یہ سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر چلانے لگتا ہے۔ اے ضمیر، ضمیر مجھے باندھ دو۔ یہاں ہم نئے مقدمات کی تفتیش میں اپنے ہوش و حواس بھلائے بیٹھے ہیں۔ اور اب یہ کمبخت باتیں کس کے پہلے مردے اکھاڑنا چاہتا ہے۔۔۔ دفع ہو یہاں سے بدمعاش کہیں کا۔ کالا پانی تیرے جیسے بدمعاشوں کے لئے نہیں ہے۔

دولا شاہ:۔ میں کالے پانی جانا چاہتا ہوں۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ خدا کے لئے مجھے اپنی جیل میں ایک تھوڑی سی جگہ دے دو۔ میرے بھائی میں اقبال کرتا ہوں کہ میں نے ایک آدمی کا خون کیا ہے۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے قید کر دو۔ میری پیٹھ پر کوڑے لگاؤ میرے سر کی حجامت کر ڈالو۔

پولیس آفیسر:۔ بکتے ہو تم۔ کیا تم نے مجھے کوئی نائی سمجھ رکھا ہے ڈوگر سنگھ۔ عبدالرحمان۔ رؤف شاہ۔ پیارا دتا۔ نکالو اس حرامزادے کو۔

دولا شاہ:۔ میں نہیں جاؤں گا۔ تمہیں قید کرنا ہو گا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالنی ہوں گی۔ میرے سر کی حجامت کرنا ہو گی

پولیس آفیسر:۔ نکالو۔ نکالو۔ اسے باہر۔

(سیڑھیوں پر قدموں کی آواز۔ تین چار آدمی اندر داخل ہوتے ہیں)

ایک آدمی:۔ وہ رہا۔ پاگل! پکڑ لو اسے (پولیس آفیسر سے) حضور یہ پاگل۔ پاگل خانے سے کئی روز سے بھاگا ہوا تھا۔ ہمیں پتہ چلا کہ ادھر ——

ڈوگر سنگھ:۔ جی، ہاں حضور۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ بات یہ ہوئی کہ میں ڈیوٹی پر تھا۔ اور یہ شخص میرے قریب آ کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر چلانے لگا۔۔۔۔

پولیس آفیسر:۔ بکو مت!

(پردہ)

چوپال

یہ کتاب مشہور نوجوان شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے چودہ دیہاتی افسانوں کا مجموعہ ہے حقیقی ہندوستان دیہات میں ہے۔ اور دیہاتیوں کی زندگی کی طرف اب تک ہمارے ادیب اور شاعر پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے اس کتاب نے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے دیہات کے سادہ مناظر اور سادہ باشندوں کی جو تصویریں ندیم نے ان افسانوں میں پیش کی ہیں وہ اردو ادب میں ایک دلکش بیداری کا پیش خیمہ ہیں۔ صحیح مشاہدہ صحیح احساس اور سلاستِ بیان ان کہانیوں کی جان ہیں۔ سادہ لوح دیہاتی لڑکوں اور لڑکیوں کی محبت، دوستی اور دشمنی ان افسانوں کا موضوعِ خاص ہے اور انہیں پڑھ کر انسان یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے ایک ایسی دنیا میں تیرتا چلا جا رہا ہے جہاں پُر تکلف تہذیب کی ہماہمی اور مشینوں بھرے شہروں کا غلغلہ نہیں بلکہ آسمانی سکوت اور فردوسی خاموشی ہے۔ اور اس سکوت میں غریبوں کی کراہیں اور بیواؤں کی آہیں سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہیں۔

ملک کے مشاہیر اور متعدد اخبارات و رسائل نے اس کتاب پر حوصلہ افزا تبصرے کئے ہیں۔ قیمت عہ مجلد عمہ

ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور

تجربہ ایجاد کی ماں ہے!

ہمکو جنسی امراض کے متعلق سینکڑوں ادویات تیار کر کے مریضوں پر آزمانے کا موقع ہوتا ہے۔ جنسی امراض کے نسخے ہزار ہا کتب میں لکھے ہوئے ہیں۔ اخباروں میں بھی لکھے جاتے ہیں تو بھی ان امراض کا علاج کامیابی سے کرنا بڑا مشکل ہے ہم نے بیسوں سے لیکر سینکڑوں روپیہ قیمت کی ادویات بنا کر مریضوں پر تجربہ کی ہیں تبھی کبھی کوئی نئی بات نکل آتی ہے۔ آج یہ ایک ایسی دوائی ناظرین کی پیش کرتے ہیں جس پر نے تجربات کئے ہیں۔ یہ دوائی کل جنسی امراض میں مفید ہے۔ اور درمیانہ قیمت کی ہے اس کا نام

یوشال

رکھا گیا ہے۔

جریان منی۔ جریان مذی۔ جریان ودی۔ سرعت۔ رقت۔ کثرت احتلام۔ ضعف باہ۔ ذکاوت حس۔ نامردی سب کو مفید ہے اور اس کے ساتھ بھوک لگاتی اور ہاضمہ کو بڑھاتی ہے۔ دودھ گھی ہضم کرنے کی طاقت پیدا کرتی ہے۔ خون کو بڑھاتی اور سرخ کرتی ہے۔ معدہ جگر دانتریوں کو طاقت دیتی ہے۔ بوڑھوں کو جوان کرتی اور جوانی کو قائم رکھنے میں مددگار ہے۔ بعد از فراغت کمزوری کو دور کرتی ہے صرف ۱۱ دن باپرہیز کھانے سے جسم میں نئی زندگی معلوم ہونے لگتی ہے قوت مردمی حیرت انگیز ہونے لگتی ہے۔ دائمی نزلہ زکام وغیرہ دور ہو جاتے ہیں۔ تمام شکایتیں دور ہو کر طاقت حسن و شجاعت بڑھتی ہے۔ سستی چستی میں بدل جاتی ہے۔ دل و دماغ گردہ و مثانہ کو تقویت ہوتی ہے۔ زیادتی پیشاب۔ پیشاب میں کئی مادوں کا آنا رک جاتا ہے۔ سلسل البول و تقطیر البول کو آرام ہوتا ہے۔ پراسٹیٹ گلینڈ اور دوسری گلینڈ کی طاقت بڑھتی ہے۔ غرضیکہ سارا جسم ہرا بھرا ہو جاتا ہے دیر یہ قابل اولاد ہوتا ہے۔ قدرتی امساک بڑھتا ہے!

قیمت { ۳۲ ٹکیہ تین روپے - ۱۰۰ ٹکیہ آٹھ روپے
3/-/- 8/-/-

المشتہر منیجر امرت دہارا اوشدہالیہ امرت دہارا بھون
منیجر امرت دہارا روڈ - امرت دہارا ڈاکخانہ لاہور

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہو جائیں گے

سائنس کی حیرت انگیز ایجاد جو سیاہ اور بدنما جلد کو سفید اور دلکش بنا دیتی ہے

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہو جائیں گے۔ یہ فلوروزون کی موجد مشہور عالم فرم کا دعوٰی ہے۔ جو گذشتہ کئی برسوں سے اس معاملہ کی ریسرچ کر رہی تھی۔ اس ایجاد سے ہر ایک شخص گورا ہو سکتا ہے۔ یہ گورے فرازدواجی زندگی اور سوسائٹی میں عزت اور مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ رات کو سوتے وقت "فلوروزون" کے چند قطرے ہتھیلی پر ڈال کر چہرے پر دو چار منٹ مالش کیجئے۔ صبح چہرے کو نیم گرم پانی سے دھو ڈالئے۔ متواتر چار ہفتہ ایسا کیجئے۔ اور اس کے بعد آئینہ میں اپنی شکل دیکھئے۔ آپ حیران ہو جائیں گے۔ وہ چہرہ جو سیاہ گندمی رنگ کا تھا۔ یا کیل، مہاسے اور چھائیاں وغیرہ اور جھریوں سے بدنما ہو رہا تھا۔ چاندنی کی طرح۔ سفید۔ سیب کی طرح سرخ اور بہار کی طرح حسین اور دلکش ہو گیا ہے۔ کیل۔ مہاسے، چھائیوں وغیرہ کا نام نشان باقی نہیں رہا۔ اور بدنام مرجھائے ہوئے چہرے پر پھر سے جوانی اور بہار آ گئی ہے۔ فلوروزون سائینس کی حیرت انگیز ایجاد ہے۔ اسکے ہر قطرے میں اوزون (تیز آکسیجن گیس، سائنٹفک طریقوں سے شامل کی گئی ہے۔ جو جلد کی سیاہی کو اپنے آپ میں جذب کر لیتی ہے۔ اور جب آپ سوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت آپ کے چہرے کی سیاہی، کیل، مہاسے، چھائیاں وغیرہ آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہیں۔ اور چار ہفتوں میں بدنما چہرہ حسین اور دلکش ہو جاتا ہے۔ ہر ایک مرد عورت اس سہل سائنٹیفک ایجاد سے دائمی خوبصورتی اور جاذبیت حاصل کر سکتا ہے۔ فلوروزون کے استعمال کے بعد عارضی خوبصورتی حاصل کرنے کے لئے کریم پوڈر وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فلوروزون چہرے کے علاوہ جسم کے ہر ایک حصّہ پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ قطعی بے ضرر ہے۔ فلوروزون مکمل کورس تین روپے آٹھ آنے میں ملتا ہے۔ ڈاک خرچ الگ۔

ہندوستان کے ہزاروں مرد عورتیں "فلوروزون" سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

تیار کنندگان :- فلوری کیمیکل انڈسٹریز

ہندوستان کے نمائندگان

فلوروزون ڈپو پوسٹ بکس نمبر ۵۸۷ A-L-A بمبئی

[illegible]

کیا آپ دولت کی تلاش میں ہیں
تو کیوں نہیں گھر بیٹھے پانچ سو روپے ماہوار کماتے

امیرکن نیوگولڈ کی ایجنسی لیکر آپ پانچسو روپیہ ماہوار کما سکتے ہیں۔ یہ سونا کسوٹی پر اصلی سونے جیسا رنگ دیتا ہے۔ اور اصلی سونے کی طرح گلایا اور پگھلایا جا سکتا ہے۔ اس کا رنگ خراب نہیں ہوتا۔ آج کل کے فیشن کے ہر طرح کے زیور ہمارے اسٹاک میں موجود ہیں۔ آپ اپنے شہر کی ایجنسی کے لئے آج ہی درخواست کریں۔ تیار شدہ زیورات کی مکمل فہرست اور چار نمونے امیرکن نیوگولڈ ایک جوڑی فینسی چوڑی ایک انگوٹھی ڈیمنی فیشن، ایک جوڑی بندے، نیو ڈیزائن، فروخت کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ ہوشیار اور تجربہ کار ایجنٹوں کو ہر طرح کی سہولت دی جائے گی۔

آج ہی ایجنسی کے قواعد منگوا لیجئے

امیرکن نیوگولڈ سپلائی کمپنی نمبر ۱۵ کانپور (یو۔پی)

نقلی سیاہیوں سے بچو
الف خاں روشنائی اصلی رجسٹری شدہ متعلق نمبر ۹۹۲۲۸ شاہان مغلیہ کا پسندیدہ تحفہ جس کی شہرت و قدر و منزلت زمانہ قدیم و جدید کے حکمران و والیان حکومت و رؤسائے ریاست ہائے ہند سے تعریف بیش نظر ہے۔ نمونہ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیج کر طلب کریں اور اصلی نسخہ الف خاں روشنائی کی داد دیں۔ محکمہ پولیس و عدالت ہائے ہند نیز ہر ہیڈ اہلکاران عرائض نویس وکلا و صاحبان محکمہ رجسٹریشن آفس قبالہ نویس و وثیقہ نویس و محکمہ بندوبست و کار سرکاری جہاں عمدہ تحریرات قائم رہنا منظور ہیں۔ اسٹیشنرز و جنرل مرچنٹ و کرانہ مرچنٹ جملہ کاروباری طبقہ اصلی مال پتہ ذیل سے طلب فرمائیں۔ نیز ایجنسی ہر جگہ معتبر دکاندار و ں کو دینا منظور ہے۔ لہٰذا ایک سو روپیہ روانہ کرنیوالے اصحاب کو مبلغ ایک سو پچاس روپیہ کا مال معہ سائن بورڈ اور جملہ ایڈورٹائز و دیگر پرنٹ کیا جائیگا یعنی یا پچاس روپیہ آپ بعد میں روانہ کر سکتے ہیں۔

تیار کردہ۔ الف خاں عبد الغنی محمد اسمٰعیل اینڈ کمپنی چتلی قبر کلاں دہلی

ہمارا پنجاب
دور جدید کے مشہور ادیب شیخ عزت اللہ صاحب کے نادر قلم کی کتاب موسومہ ہمارا پنجاب۔ اپنی نوعیت کی بینظیر تصنیف مانی جا چکی ہے۔ اس میں صوبہ بھر کی معاشرتی، تاریخی، تمدنی سیاسی اور اقتصادی زندگی کے گیارہ باب بطرز سلیس پر از معانی اور لطیف عبارت میں پیش کئے گئے ہیں۔ بلاک کے فوٹو۔ کاغذ و چھپائی دیدہ زیب۔ سائز ۲۲×۱۷ پر تکلف نسخہ مصنف کے دستخطوں کے ساتھ پیش کیا جائیگا۔

عام قیمت

ہدیہ	غیر مجلد	مجلد
[illegible]	[illegible]	[illegible]

پبلشرز۔ فرینڈز لائبریری لاہور

اسرار موسیقی
مسٹر فیروز نظامی بی۔ اے (گائیک)

گانا سیکھنے والوں کے لئے اس سے بہتر اور آسان کتاب ابھی تک اردو زبان میں نہیں چھپی۔ اس کتاب میں گانے کے متعلق ایسے ایسے راز بتائے گئے ہیں۔ جو باقاعدہ سیکھنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول ڈاک

شرکت ادبیہ پنجاب۔ چوہالہ بھائی گیٹ لاہور

۱۲۶۶

۱۲۶۶

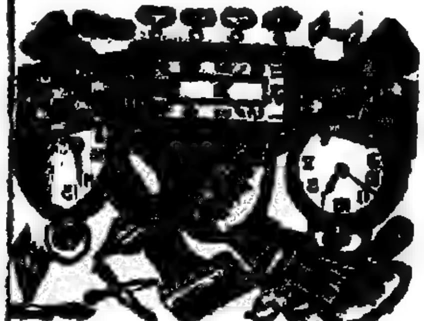

[illegible] — 1266 — [illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

منٹو کے افسانے

سعادت حسن منٹو ہندوستان کے چوٹی کے افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ منٹو کے افسانوں کے کردار ہمارے اور آپ کی طرح چلتے پھرتے انسان ہیں۔ منٹو نہ اصلاح پسند اور نہ پراپیگنڈا سٹ ہے۔ وہ انسانی حوادث کا عکاس ہے۔ جو دیکھتا ہے۔ اُسے افسانوں کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے

چند شریکِ کتاب افسانوں کے نام

نیا قانون، شغل، پھاہا، ٹیڑھی لکیر، شرابی، تماشا، شوشو، بیگا خوشیا، بانجھ، نعرہ، اُس کا پتی، منتر، بیگو، ہتک، لالٹین، موسم کی شرارت، نشہ نشین پر، ڈرپوک، دیوالی کے دیئے۔

کتابت طباعت نہایت اعلےٰ

آؤ

ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ سعادت حسن منٹو ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں یدِطولیٰ رکھتا ہے۔ اس کے ریڈیائی ڈرامے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ریڈیو اسٹیشنوں سے کئی کئی بار براڈکاسٹ ہو چکے ہیں۔

آؤ — منٹو کے آٹھ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے

پاپی

اوپندر ناتھ اشک — زیرِ طبع۔ حزنیہ، طنزیہ، رومانیہ، اصلاحیہ ناٹکوں کا خوبصورت مجموعہ جن میں زندگی کی تڑپ، ہیجان اور زمینی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جو سکولوں کالجوں اور ڈرامیٹک کلبوں میں بڑی آسانی سے کھیلے جا سکتے ہیں۔ اشک کے ڈرامے ہندوستانی معاشرت کے آئینہ ہیں [illegible]

الف لیلےٰ کے بعد الف لیلےٰ کی سی دلچسپ کتاب

صحرانورد کے خطوط۔

صحرانورد کے خطوط میں وادیٔ نیل کی ساحرۂ جمیل کے مہیب رومان
مطربۂ سرفروش کے دردناک و درد انگیز افسانے
اور سرزمینِ ہاروت و ماروت کی تحیر انگیز داستان

کے علاوہ

ان ہستیوں کے قصے ہیں۔ جنہوں نے اپنا سب کچھ کھو کر محبت کی۔ مگر جنہوں نے محبت قربان کر دی۔ فرض کے لئے!
جنہوں نے فریبِ محبت کھایا اور اپنی محبوب ترین ہستی کے خرمنِ حیات پر بجلی بن کر گرے۔
جو ماہ چار دہم بن کر آسمانِ شہرت پر چمکے۔ لیکن محبت کے افسوں سے شبنم کا قطرہ بن کر مٹ گئے۔
صحرانورد کے خطوط آپ کو اس دنیا میں لیجائینگے —
جس کے چپے چپے پر شفق کی رنگینیاں بکھری پڑی ہیں۔
جس کی فضاؤں میں طلسم و کیف کی دنیائیں لہرا رہی ہیں
جس کے ذرے ذرے میں شراب کی مستیاں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔

کتاب میں آٹھ تصویریں ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت اعلےٰ قیمت ۱؎ صحرانورد کے خطوط مشتمل ہیں آٹھ رومانوں پر۔

مکتبہ اُردو لاہور

فلم کا مقصود اب مجنوں کی صحرانوردی اور فرہاد کی کوہ کنی نہیں رہا

ملک و ملت اور دین و دنیا کے اہم مسائل کے حل فلم میں پیش کئے جاتے ہیں۔

شانتارام کے سال بھر کی دماغی کاوش کا ثمر۔

محبت اور قربانی کا حامی

پڑوسی

نصرت اور منصور قومی کا دشمن

اپنے شہر میں نمائش کے منتظر رہیے

"سنت سکھو"

بہت تیزی سے فلمایا جا رہا ہے "ہنساو اکر" اس کا مرکز ہے۔

عمر خیام

کی مہورت بہت جلد ہونے والی ہے۔ اس فلم میں شانتارام ہدایات کا

فتح لال آرٹ کا اور ڈاکٹر عابد حسن مکالمے کا کمال دکھائیں گے

نمائش کنندہ: فیمس پکچرز لمیٹڈ۔ بمبئی۔ دہلی۔ مدراس

ADAB-I-LATIF, LAHORE. August 1941.
Regd. L. No. 3521.

5 As. | ڈرامے | منظومات | افسانے | مقالات | شمارہ

ادبِ لطیف

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

جگر مرادآبادی

ن۔م۔ راشد

ستمبر ۱۹۴۱

اشارات	ادارہ	۱
رابندر ناتھ ٹیگور	پروفیسر ہمایوں کبیر	۳
غزل	جگر مرادآبادی	۵
غزل	فصاحت جنگ جلیل	۶
ٹیگور کی آخری تقریر	رابندر ناتھ ٹیگور	۷
کہاں ہے ہندوستان	"	۸
انتظار اور ہمکلامی	ن۔م۔ راشد	۹
رُباعی	جوش ملیح آبادی	۱۱
دو تصویریں	مسعود پرویز	۱۲
انگریزی شاعری	آل احمد سرور	۱۳
غزلیات	اختر انصاری	۱۸
قبض	سعادت حسن منٹو	۱۹
قیدی کا پیغام	سید مطلبی فریدآبادی	۲۶
منجدھار	سنت سنگھ سیکھوں	۲۸
غزل	حمید نسیم	۳۳
میلاد شریف	محمد حسن عسکری	۳۴
بیوہ	احمد ندیم قاسمی	۴۴
سبیل محبت	کے۔ آر۔ بمبوال	۴۵
جنت کی سیر	راجہ مہدی علیخان	۵۱
اپنائے	گوپال متل	۵۲
شکست	آسی رام نگری	۵۳
ایک منظر	سلام اختر ایم۔ اے	۶۰
بڑوں کی موت	شاکر علی	۶۱
نقد و نظر	ادارہ	۶۲

مکتبہ اردو لاہور

نگران
فیض احمد فیض

ایڈیٹر
چودھری برکت علی

ادبِ لطیف لاہور

چندہ سالانہ
چار روپے چار آنے

فی پرچہ
پانچ آنے

اشارات

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

۷ اگست کی رات کو ۱۲ بجکر ۱۰ منٹ پر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اس جہان سے سدھار گئے۔ ہم ڈاکٹر ٹیگور پر پروفیسر ہمایوں کبیر کا لکھا ہوا ایک مفصل مضمون کسی اور جگہ شائع کر رہے ہیں۔ ٹیگور ان فرزندانِ وطن میں سے تھے جن کی وجہ سے غلامی اور ذلت کے باوجود اس بدنصیب ملک کا سر اب تک اونچا ہے۔ جن کی زندگی اس امر کا ثبوت ہے کہ ابھی ہمارے ذہن کی کشادگی اور ہمارے دل کی وسعت بالکل ختم نہیں ہوئی۔ ہر نوع کی دست برد کے باوجود ہمارا کلچر ابھی تک زندہ ہے اور ہمارے ادب کی نامیاتی صلاحیت یکسر مردہ نہیں ہوئی۔

ٹیگور کی ادبی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ بنگالی زبان کا حلقہ بہت ہی محدود ہونے کے باوجود ان کی تصانیف نے قریب قریب تمام ملکی ادب کو متاثر کیا۔ اس دقت و اثرات کا تجزیہ کرنا ذرا مشکل ہے اس لئے کہ ہر بڑے مصنف کا اپنے معاصرین پر دوہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے کلام کی بنیادی خوبی یا خوبیاں زبان و ادب میں تحلیل ہو کر ان کا دائمی جزو بن جاتی ہیں اور یہ عمل قریب قریب غیر محسوس طریقہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کورانہ تقلید میں ایک ہنگامی تحریک بھی شروع ہو جاتی ہے جس کے دن بہت جلد پورے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ٹیگور کی شیرینی اور رعنایت موجودہ ادبی تحریک کا ایک مستقل حصہ بن چکی ہے۔ لیکن خطوط اور نقطوں کا وہ گورکھ دھندا جسے آج سے کچھ دن پہلے 'ٹیگوریت' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ آج کل کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

ٹیگور کے کلام میں وجودِ عالم کے مشاہدہ کی وہی تمنا اور حقیقتِ دائم کے وصال کی وہی تڑپ موجود ہے جو ہمارے بہترین صوفیانہ شعراء کے کلام کو ممیز کرتی ہے لیکن ٹیگور کا تصوف زندگی سے بالکل بے تعلق اور ماحول سے بالکل بے نیاز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے دیس کے ڈال ڈال اور پات پات، ذرہ ذرہ اور قطرہ قطرہ کے دکھ کو محسوس کیا ہے۔ انہوں نے ایک غیر مرئی دیوتا کی دھن میں اس کی محسوس اور موجود مخلوق کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ٹیگور کے کلام کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی مصوری ہے ہمارے پربت جلتے میدان ہمارے ندی نالے دیہات کی رنگین صبحیں اور شہروں کی والہانہ راتیں ساون کی گھٹا اور کوندے کی لپک ان سب کو ٹیگور سے بہتر ترجمان موجودہ زمانہ میں نصیب نہیں ہوا۔

ٹیگور محض شاعر ہی نہ تھے محب وطن اور محسن قوم بھی تھے۔ ان کا شمار ہمارے ہموطنوں کی اس بہت ہی مختصر اور محدود جماعت میں ہے جن کا ضمیر مشکل وقتوں میں کبھی متذبذب نہیں ہوا۔ جن کی زبان پر کبھی لکنت نہیں آئی اور جن کا قلم دم تک آزاد رہا۔ ٹیگور ایک بلند منصب شاعر تھے اور ایک عالی مرتبہ انسان۔

اظہارِ تشکر۔ رسالے کے اسلوب اور معیار کے متعلق مزید تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن ہم اپنے کرمفرماؤں سے یہ ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں انہیں کے اختیار میں ہیں: حسابِ دوستاں در دل کے مسئلہ کے باوجود ہم اُن معاونین کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے ہماری معروضات کو قابلِ اعتنا سمجھا بالخصوص ہم جناب جوش ملیح آبادی، حضرت جگر مراد آبادی اور پروفیسر آل احمد سرور، محمد حسن عسکری کے خاص طور سے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی تازہ نگارشات ہمیں عنایت فرمائیں۔

سالنامہ ادبِ لطیف حسبِ دستورِ سابق دسمبر میں ادبِ لطیف کا سالنامہ شائع ہوگا ہم چاہتے ہیں کہ اس نمبر کو ہر لحاظ سے معیاری حیثیت حاصل ہو۔ امید ہے کہ ہمارے پرانے کرمفرما اور نئے معاونین اس سلسلہ میں ہمارا ہاتھ بٹا کر ممنون فرمائیں گے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا انتقال۔ ہندوستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ ہندوستان کے مشہور ظرافت نگار ادیب مرزا عظیم بیگ چغتائی کا عین عالمِ جوانی میں ۲۰ اگست کو طویل علالت کے بعد جودھپور میں انتقال ہو گیا مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ہندوستانی ادب میں ظرافت کا ایک ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے جس کی مثال اس سے قبل ہندوستانی لٹریچر میں مفقود تھی۔ آپ اپنے رنگ کے موجد تھے اور آپکا مخصوص رنگ آپ ہی کے ساتھ ختم ہو گیا مرزا عظیم بیگ چغتائی کی موت ہندوستانی لٹریچر کیلئے ایک صدمۂ عظیم ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کی روح کو سکون اور پس ماندگان کو صبر عطا کرے۔

(ادارہ)

شاعرِ انقلاب

جوشؔ ملیح آبادی کے افکارِ نو کا تازہ مجموعہ

آیات و نغمات

اُردو شاعری کے دورِ ارتقا کی جیتی جاگتی تصویر

جوشؔ کا پیغام خوابیدہ روحوں کے لئے صورِ اسرافیل کا حکم رکھتا ہے۔ اُس کا نغمہ ایسی حرارت کا حامل ہے جو افسردہ دلوں کے خون کو بھی گرما سکتا ہے۔

آیات و نغمات

میں شاعرِ انقلاب نے اپنے آپ کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ اُس کی روح کا عکس ہے۔ اُس کے نغمات میں اپنے دل کی دھڑکنیں سُنیں۔ آپ کے دل کے تار دیر تک مرتعش رہیں گے۔

سائز ۱۷×۲۷ حجم ساڑھے تین سو صفحات۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے (عہ)

ناشر **مکتبہ اُردو**

پروفیسر ہمایوں کبیر

رابندر ناتھ ٹیگور

ابھی وہ وقت نہیں آیا جب ہم ٹیگور کی فطانت اور اُس کے کاموں کی ستائش کر سکیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ہم جس بنگال میں رہتے ہیں وہ ٹیگور کا تعمیر کردہ بنگال ہے۔ بنگال جو سوچتا ہے جس زبان میں سوچتا ہے اور جن خیالات کو پیش کرتا ہے وہ سب کے سب ٹیگور کے عطا کردہ ہیں۔ ہماری سرزمین دریاؤں کی سرزمین ہے جسے صدیوں سے دو بڑے دریا سیراب کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک لحاظ سے ٹیگور بھی بہت بڑا دریا تھا جس نے بنگال کی ذہنی اور تمدنی سرزمین کو سیراب کیا۔ کبھی فردِ واحد کو یہ افتخار نصیب نہیں ہوا کہ وہ ایک صوبجاتی زبان کو جہاں گیر زبان کا مرتبہ بخش دے۔ تاریخِ عالم میں یہی صرف ایک دوسری شخصیت دکھائی دیتی ہے جس نے صوبجاتی زبان کو عالمگیر زبان میں بدل دیا۔ لیکن میرے خیال میں ڈانٹے سے زیادہ ٹیگور کو اس مسئلہ میں کامیابی ہوئی۔ ٹیگور کو ان مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا جو ڈانٹے کے سامنے نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ٹیگور نے بنگالی زبان اور بنگالی ادب کو اس کی موجودہ شکل و صورت دی۔

ٹیگور کی موت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اس کی گوناگوں سرگرمیوں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ان سرگرمیوں کا بھی تذکرہ ہو چکا ہے جن کا تعلق بنگال، ہندوستان اور ساری دنیا کی زندگی سے ہے۔ میرے ذہن میں بھی سب سے پہلے ٹیگور کی ہی گوناگوں سرگرمیاں آتی ہیں۔ میرے خیال میں اس کی عظیم الشان ذہنی کامیابی کا راز اس کی شخصی تکمیل میں مضمر تھا۔ اس شخصی تکمیل کو ہر اس فرد نے محسوس کیا۔ جو ٹیگور کے قریب گیا۔ ٹیگور نے اپنے آپ کو کسی مخصوص انسانی سرگرمی تک محدود نہیں کیا۔ اس نے انسان کی ساری سرگرمیوں کو اپنے دائرے میں لے لیا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے ایک انسان دوست نے کہا تھا۔ "مجھے ہر اس چیز سے پیار ہے جس کا تعلق انسان سے ہے" ٹیگور نے اس قول کی حرف بحرف پیروی کی اور اس مقولہ کی تکمیل کے لئے وہ مخالف قوتوں سے نبرد آزما بھی ہوا۔

بنگال کی گذشتہ تین نسلیں ٹیگور کے افکار پر زندہ رہیں۔ وہ ٹیگور کے خیالات سے متاثر ہوئیں۔ وہ اس فضا میں پلیں جس کا پس منظر ٹیگور نے پیدا کیا تھا۔ ایک ایسا پس منظر جس کا تعلق بنگال کی تمدنی زندگی سے تھا۔ یہی سبب ہے کہ جب ہم نے ٹیگور کی موت کی خبر سنی تو اس سے ہماری روح بے چین ہوئی۔ ہمیں بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ فانی کے لئے موت ضروری ہے۔ ہر شخص کو جلدی یا دیر میں یہی راستہ اختیار کرنا ہے۔ لیکن جب ہم نے اس خبر کو سنا تو ہماری روح غم کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ ٹیگور اپنے آخری ایام تک امید اور توانائی سے اس قدر لبریز تھا کہ وہ خود زندگی کا مجسمہ دکھائی دیتا تھا۔ ٹیگور نے بنگالی ادب کو اپنی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ گذشتہ چند سالوں میں ٹیگور کے ذہن میں ادب کے متعلق نئے نئے تصورات پیدا ہوئے تھے میں نے ٹیگور کی شخصی تکمیل کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ تکمیل ٹیگور کی مختلف تحریروں سے عیاں ہوتی ہے۔ میرے خیال میں وہ سب سے بڑا بنگالی تھا۔ آج اس بات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق اشرافیہ سے تھا۔ لیکن وہ اشرافیہ کا گرویدہ نہیں تھا اس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے؟ اس کے لئے مقام اور پیدائش محض اتفاقی حوادث تھے۔ اس کا اشرافیہ سے تعلق رکھنا ایک لحاظ سے خوش قسمتی تھی۔ کیونکہ اس طرح اس کے لئے وسطی اور قدیم ہندوستان کی تمدنی روایات کو اپنے اندر جذب کر لینا آسان ہو گیا تھا۔ جس زمانے میں ٹیگور پیدا ہوا تھا۔ اس زمانے میں دوسرے

طبقات کے لوگوں کے لئے ایسا کرنا مشکل تھا۔ ٹیگور ایسے زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب ہندوستان پر بحرانی کیفیت طاری تھی اور نئے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ یورپی تہذیب اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ اس زمانہ میں ہر وہ شور و غل موجود تھا جس کا تعلق انقلابی تغیر سے ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہندوستانی زندگی دو غیر متعلق اجزا میں بٹ رہی تھی اور یہ دو اجزا اکثر متصادم ہوتے رہتے تھے۔

ایک طرف وہ لوگ تھے جنہوں نے مغرب کی ہر شے کو قبول کر لیا تھا۔ ان کے نزدیک ہر قدیم اور ہر مشرقی شے قابل نفرت تھی۔ انکے خیال میں ہند وسطی کا تمدن بھول جانے کے قابل تھا۔ انہوں نے مغربی تہذیب کو پوری طرح سے قبول کر لیا۔ انہیں وقتی طور پر کامیابی ہوئی۔ مغربی تمدن انہیں اپنے ملک کی تمدنی دولت سے بہت دور لے گیا اور انہوں نے ہندوستان میں ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالنا چاہی۔ دیہاتی زندگی سے کٹ کر وہ بہت جلد تھک گئے۔ بنگال میں مغربی تہذیب کا یہ زور گزشتہ صدی کے آخری نصف میں پایا جاتا تھا ـــــ دوسری طرف وہ لوگ تھے جنکا مغرب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی قدیم وضع کو برقرار رکھا۔ ٹیگور کی زندگی کی کامیابی کا راز ہندوستانی زندگی کی سرگرد تحریکات کو یکجا کرنے میں ہے۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جس کی بنا پر اس کیلئے ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستانی تمدن کو قبول کر لینا آسان ہو گیا۔ وہ گزشتہ زمانہ کی روحانی دولت کا بھی وارث بنا۔ اس پر بھی اس کے خاندان نے مغرب کے چیلنج کو قبول کیا اور بلا خوف و خطر ہندوستانی زندگی کیلئے بعض یورپی اقدار کو قبول کر لیا۔ حالات کے اس اتحاد نے ٹیگور کی ذہنی کاوشوں کے لئے راہ نکالی۔

ٹیگور کی سیاسی زندگی کے متعلق بھی حوالے دیئے جا چکے ہیں۔ ہمارے لئے یہ بات حیران کن نہیں ہو سکتی کہ ٹیگور نے اپنے ملک کے مصیبت زدہ باشندوں پر آنسو بہائے۔ یہ بات حیران کرنے والی نہیں کہ ٹیگور ـــــ جس کا دائرہ فکر و عمل بہت وسیع تھا ـــــ وطن کو پیار کرنے والی سرگرمیوں میں حصہ لیتا۔ ہر چند ٹیگور کے ذہن کے اظہار کی طبعی صورت تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس جدوجہد کے حوالے کر دیتا جس کا تعلق اس کے وطن کی آزادی سے تھا، اور اپنے بلند افکار سے منزل مقصود کو قریب تر لانے کے لئے تگ و دو کرتا ـــــ بیس برس کی عمر میں ٹیگور بنگال کی دیہاتی زندگی کے مرکز شیلیدا میں چلا گیا اور وہاں جا کر وہ دیہاتیوں سے گھل مل گیا۔ اسے ان دیہاتیوں سے محبت تھی۔ اس نے ان دیہاتیوں کی زندگی اختیار کر لی۔ ان کی مصیبتیں اس کی مصیبتیں تھیں، ان کی خوشی اس کی خوشی تھی۔ ان کا غم اس کا غم تھا۔ اس نے دیہاتیوں کے داعیہ کو اپنا بنایا۔ دوسری طرف اس نے دیہاتیوں کی زندگی سے اپنے لئے حیات اور توانائی کو اخذ کیا۔ ہمارا تمدن دیہاتی ہے اور ہمارے پاس جو تخلیقی توانائی ہے وہ ہمارے دیہات میں موجود ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں ٹیگور کے آرٹ میں ایک تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ دس سال ہوتے ٹیگور روس گیا اور وہاں اس نے اپنی آنکھوں سے آزاد محنت کی بنیادوں پر ایک نئی تہذیب کو استوار ہوتے دیکھا۔ ٹیگور ایک فلسفی تھا۔ اسے چھوٹے چھوٹے سیاسی جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے خواب کو پورا ہوتا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے افکار و آرا میں محنت کی عظمت کو پیش کیا۔ اس نے انسانی مساوات کو پیش کیا۔ اسکی وشوا بھارتی اسکے خیالوں کی عملی دنیا ہے۔ وہ انسانی مساوات اور انسانی برادری کا جغرافیائی حدود و قیود سے قطع نظر، پوری طرح سے قائل تھا۔ اس کے ذہن میں چینی، حبشی، امریکی اور برطانی سب مساوی تھے۔ وہ مصیبت میں ہر ایک کی مدد کرنے کا قائل تھا۔ اس کی ہمدردی صوبجاتی قیود سے آزاد تھی۔

تاریخ عالم ہمیں بتاتی ہے کہ سیاست دان تھوڑی دیر کے لئے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ کل کے سیاست دان کہاں ہیں! ہم انہیں بھول چکے ہیں۔ لیکن ہم ان لوگوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو لوگوں کی زندگی بنانے میں کام آتے ہیں۔ جو لوگوں کے مصائب میں شریک ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا تعلق خواہ کسی ملک سے ہو انہیں دنیا کے نجات دہندے کہا جاتا ہے۔ وہ روشنی کے ایسے مینار ہوتے ہیں جو تاریکی ایام میں چمکتے رہتے ہیں۔ مجھے اس امر کا پورا پورا یقین ہے کہ جب معمولی معمولی سیاسی تنازعات ختم ہو جائیں گے تو اس وقت ٹیگور کے افکار ہماری دنیا کو منور کریں گے!! ♦

جگر مرادآبادی

غزل

اُس رُخ پہ اثرِ دامِ نظر دیکھتا ہوں میں
کانٹوں کی گود میں گُلِ تر دیکھتا ہوں میں

سعی و مآلِ فکر و نظر دیکھتا ہوں میں
منزل رواں دواں ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

معراجِ شوق و جذبِ اثر دیکھتا ہوں میں
دُنیا اُدھر کی آج اِدھر دیکھتا ہوں میں

تاثیرِ التفاتِ نظر دیکھتا ہوں میں
کونین ۔ اپنے زیرِ اثر دیکھتا ہوں میں

خود جس میں ہیں آرزوئے شکستِ غرور ہے
ایسی بھی آج ایک نظر دیکھتا ہوں میں

رعبِ جمال و جذبِ محبت تو دیکھنا
اُٹھتی نہیں نگاہ مگر دیکھتا ہوں میں

محوِ خرام ناز ہیں صحنِ چمن میں وہ
گستاخی نسیمِ سحر دیکھتا ہوں میں

اللہ رے کمالِ خودی کی یہ وسعتیں
میرا ہی سامنا ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

اِک عشق ہے کہ جس سے عبارت ہے زندگی
اِک سلسلہ بہ طرزِ دِگر دیکھتا ہوں میں

اے عشق شاد باش! کہ آج ان کو بار بار
مصروفِ احتیاطِ نظر دیکھتا ہوں میں

میرا مقامِ عشق مقامِ فنا نہیں
دنیائے زندگی ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

شاید اُنہیں بھی اُس کی خبر ہو نہ اے جگرؔ
در پردۂ نظر، جو نظر دیکھتا ہوں میں

[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

ٹیگور کی آخری تقریر

اپنے سفرِ حیات میں جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ تو مجھے انسانی تہذیب کے گرتے ہوئے کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ ناکامی کے بکھرے ہوئے انبار۔ لیکن میں انسانی فطرت سے مایوس ہو جانے کا گناہِ عظیم اپنے سر نہیں لوں گا۔ اس کی بجائے میں مستقبل کی طرف دیکھتا ہوں۔

جب انسانی تاریخ موجودہ زلزلہ کے بعد نیا ورق گردانے گی۔ جب خدمت اور ایثار کی روح فضا کو پھر سے پُر کر دے گی۔ شاید یہ سحر یہیں مشرق سے پھوٹنے والی ہے۔ یہیں جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ ہاں! ابھی ایک ایسا دن آئے گا جب انتھک انسان تمام قیود کے باوجود اپنی کھوئی ہوئی انسانی وراثت کے حصول کے لئے عظمت کی راہ پر دوبارہ گامزن ہوگا۔

جلاوطنی

"مہاراج!" ملازم نے عرض کیا "سنت نروتم داس کبھی آپ کے مندر میں جانے کی کرپا نہیں کرتے۔ وہ کھلی سڑک پر پیڑوں کے سائے تلے ایشور بھجن گایا کرتے ہیں۔ مندر پجاریوں سے خالی ہو گیا ہے۔ وہ شہد سے پُر سونے کے گھڑے کی پروا نہ کرتے ہوئے سفید کنول کے چاروں طرف بھنوروں کی طرح ان کو گھیرے رہتے ہیں۔"

راجہ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ نروتم داس کے پاس پہنچا۔ وہ گھاس پر تشریف فرما تھے۔ راجا نے اُن سے کہا "پتا آپ اُس زریں کلس والے مندر کو چھوڑ کر کیوں باہر خاک پر بیٹھے وعظ و نصیحت فرماتے ہیں۔؟"

"کیونکہ ایشور تمہارے مندر میں نہیں ہے" نروتم داس نے جواب دیا۔ راجا کی بھنویں تن گئیں۔ اُس نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ اس بے مثال عمارت کی تعمیر میں دو کروڑ اشرفیاں خرچ ہوئی ہیں اور انتہائی شان اور احترام کے ساتھ اس میں دیوتا کی مورتی کو رکھا گیا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے" نروتم داس نے جواب دیا "اُس سال تمہارے ہزاروں آسامیوں کے گھر جلا دیئے گئے تھے۔ وہ تمہارے دروازے پر کھڑے امداد مانگا کرتے تھے۔ تب ایشور نے کہا تھا 'یہ ظالم شخص اپنے بھائیوں کو پناہ نہیں دے سکتا اور میرے لئے مندر بنا رہا ہے'۔ اُسی وقت سے خدا نے ان خانماں برباد لوگوں کے ساتھ درختوں کے نیچے اپنے رہنے کی جگہ بنا لی۔ تمہارا سنہرا مندر سونا پڑا ہے۔ اس میں صرف تمہارے غرور کی آگ بھری ہے۔"

راجا نے غصے میں لال پیلا ہو کر حکم دیا "میری سلطنت سے باہر نکل جاؤ۔" نروتم داس نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "ضرور! مجھے بھی وہیں نکالا دیدو جہاں تم نے میرے ایشور کو نکال دیا۔"

(ٹیگور)

کہاں ہے ہندوستان

تیری صلائے عام دنیا کے تمام ممالک میں پھیل چکی ہے۔
اور لوگ تیری نشست کے گرد جمع ہو چکے ہیں۔
وہ دن آپہنچا ہے ——— مگر کہاں ہے ہندوستان؟
کیا اب تک وہ پوشیدہ اور پسماندہ ہے؟
اب اس کو اپنا بوجھ اٹھا کر سب کے برابر چلنا چاہیے۔
اے توانا و قادر خدا! اسے اپنا پیغام ظفر بھیج دے
اے آقا تو جو ہمیشہ بیدار ہے!
وہ لوگ جنہوں نے بہت سے مصائب کا مقابلہ کیا۔
انہوں نے صحرائے ازل کو طے کر لیا۔
اور اپنی خیالی قیود کو توڑ ڈالا۔
وہ دن آپہنچا ہے ——— مگر کہاں ہے ہندوستان؟
اس کے غافل بے پروا ہاتھ سست و منفعل ہیں۔
اور اس کی راتیں اور دن فضول اور بیکار
زندگی کی مسرت سے محروم
اپنے زندہ تنفس کیساتھ اُسے چھوڑ دے
اے آقا تو جو ہمیشہ بیدار ہے!
عہد جدید کا آفتاب سحر طلوع ہو چکا
تیرے معبد کا سارا ہال نمازیوں سے بھر گیا۔
اور دن نکل آیا ——— مگر کہاں ہے ہندوستان؟
وہ ذلت کی خاک پر دراز ہے
اپنی نشست سے معزول۔

اس کی ندامت کو دور کر دے۔
اے آقا تو جو ہمیشہ بیدار ہے!
دنیا کے تمام بڑے بڑے راستے
جن پر بھیڑ لگی ہے
تیرے رتھ کے پہیوں کی آواز سے گونج رہے ہیں۔
آسمان رہرووں کے نغمات سے مرتعش ہے۔
دن نکل آیا ہے ——— مگر کہاں ہے ہندوستان؟
اس کے بوسیدہ مکان کے دروازے بند ہیں۔
اس کی امید کمزور اور اس کا دل خاموشی میں
ڈوبا ہوا ہے
تو اس کے بے زبان فرزندوں کو اپنی آواز عنایت کر
اے آقا تو جو ہمیشہ بیدار ہے!
یہاں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دست و بازو میں
تیری قوت کو محسوس کر لیا۔
اور دوام زندگی کو حاصل ——— خوف پر غالب آکر
وہ دن آپہنچا ——— مگر کہاں ہے ہندوستان؟
اس کی حرماں نصیبی اور خود اشتباہی پر اپنے ضرب سے
چوٹ لگا دے
اور اس کو اپنے تعاقب کرنے والے سایہ کے ڈر سے محفوظ و مغفور
کر دے۔
اے آقا تو جو ہمیشہ بیدار ہے!

(ٹیگور)

کا اثر تو زندہ نہ کرے جو اولاً اُس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اگر ہم کلامی کی یہ غیر شعوری خواہش شاعر کے دل میں نہ ہو تو وہ اپنے قلب کو قابلِ فہم بنانے کیلئے کبھی اس قدر صعوبتیں برداشت نہ کرے اور کبھی اپنے آپ کو فن کی قیود کا پابند نہ کرے، نہ آئے دن مشاعرے ہوں اور بڑے بڑے دیوان شائع کئے جائیں، نہ رسالوں میں نظموں کے لئے صفحوں کی تخصیص کی جائے۔ یہ تمام باتیں محض اتفاقی نہیں بلکہ یہ تمام سرگرمیاں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ فن کو بھی اُسی طرح لوگوں کی تلاش ہے جس طرح لوگ اُس کی تلاش میں ہیں!

یہ ضروری نہیں کہ شاعر کا وہ تجربہ جو اُس نے زندگی سے اخذ کیا ہے بجنسہٖ قاری کے ذہن میں منتقل ہو جائے کیونکہ اس تجربے کی حیثیت ایک پنسل یا ربڑ کی نہیں کہ ایک جیب سے نکال کر دوسری جیب میں ڈالا جاسکے۔ چنانچہ شاعر خواہ کتنا ہی صاحبِ ہوش اور نزاکتِ حس کا مالک ہو قاری کے ذہن میں عین وہی تصویر پیدا نہیں کرسکتا جو اُس کے ذہن کی آنکھوں نے دیکھی ہے۔ اس کے علاوہ صحیح اکتساب کرنے کے لئے قاری کی اپنی ذہنی تربیت، اُس کا ماحول اور اُس کے گزشتہ تجربات بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ شاعر کے تجربے کا عکس مختلف انسانوں کے دلوں پر مختلف درجے کا ہوتا ہے۔ خیر یہیں نہیں، کیونکہ "اظہار" کے لئے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کی اس مسلّمہ صورت میں نمودار ہو جسے شاعری کہتے ہیں۔ یہی "اظہار" ہمالی تجربے کا بیرونی دنیا کے ساتھ ربط قائم کرتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص محض شعور اور حسِ تمیز کا مالک بن کر شاعر نہیں کہلا سکتا۔ بے شک شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ "اظہار" کا وسیلہ اختیار کرے۔

"اظہار" کی حقیقت واضح کرنے کے بعد میں اس بات کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ آیا شاعر شعر کہتے وقت دوسرے انسانوں کے ساتھ ہم کلامی اور ربط کی خواہش رکھتا ہے یا نہیں۔

ہماری زبان میں شاعری کے لئے دو الفاظ "سخن" اور "کلام" نہایت بامعنی ہیں۔ یہ محض اتفاقی اصطلاحیں نہیں۔ بلکہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارے وہ شعرا جن کی شاعری زیادہ تر عشقیہ خیالات کا مجموعہ تھی۔ اور بظاہر عالمِ انسانی کے ساتھ نہایت کم ربط رکھتی تھی۔ وہ بھی اس بات کا احساس رکھتے تھے۔ کہ اُن کے اشعار اُن کی ذات تک محدود رہنے کی چیز نہیں بلکہ اظہار کی تکمیل کے لئے کسی قاری یا سامع کا وجود چاہتے ہیں۔

گویا شاعری کو دو پہلوؤں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک تو خود شاعر کے نقطۂ خیال سے جس کے ذہن سے شعر پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسرے سُننے یا پڑھنے والے کے نقطۂ خیال سے جو سخن سے اکتساب کرتا ہے۔

ہم جو سالہا سال سے باہم گفتگو میں لگے ہیں اس بات کا پورا احساس نہیں کرتے کہ ہمارا تجربہ جب الفاظ کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس لئے کرتا ہے کہ ہم اجتماعی حیوان ہیں اور بچپن سے ہم کلامی کے عادی ہیں۔ لیکن فنونِ لطیفہ صرف ہم کلامی کا ذریعہ نہیں بلکہ ہماری بلند ترین ہم کلامی کا معراج ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ شاعر جب شعر کہتا ہے تو سُننے والے کی موجودگی کا خیال لازمی طور پر اُس کے ذہن میں موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر خود شاعر سے پوچھا جائے تو وہ شعر کہنے کا اوّلین مقصد یہی بیان کریگا۔ کہ میں تو شعر کہہ کر اپنی ہی تسکین چاہتا ہوں۔ میں تو محض اپنی واردات قلب کا اظہار کرکے ذہنی بار سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یا میں تو حسن کی تخلیق کر رہا ہوں۔ اور مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ تم میری اس کوشش کو کس نظر سے دیکھتے ہو۔ خود اکثر شاعر شاعری کو انفرادی اور شخصی یا اپنے لئے تسکین بخش چیز سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے تجربے کو سب سے صحیح اور مکمل۔ اس سے بحث نہیں کہ قاری شاعر سے کیا کچھ اور کس قدر اخذ کرتا ہے۔ مگر یہ صحیح ہے کہ شاعر کا شاعری کی قیود اپنے ذمے لینا ہی اُس کی اس بے تابی کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے تجربے کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکنے قابل بنائے۔ اُس کے اپنے نقطۂ خیال سے دوسرے انسانوں کے ساتھ ہم کلامی اُس کا بنیادی مقصد نہ سہی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُسے ہم کلامی سے مطلقاً کوئی سروکار نہیں۔

شاعر اپنے مطلب کو قابلِ فہم بنانے کے لئے جو صعوبتیں برداشت کرتا ہے اُنہی کا نتیجہ ہے کہ جب یہ تجربہ ہم تک پہنچتا ہے تو ہمارے دِل کو بھی زندگی کے ساتھ قریباً وہی ہم آہنگی بہم پہنچاتا ہے جو شاعر کو زندگی کے ساتھ حاصل ہوتی تھی۔ ہم ایک اپنے سے زیادہ ذی فہم انسان کے تجربات میں شرکت کرنے لگتے ہیں۔ ہمارے دلوں کو بھی وہی لطیف بیداری حاصل ہوتی ہے جس سے شاعر آگاہ ہے لیکن جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے جمالی تجربہ "اظہار" کے وجود میں آنے کی ضروری شرط ہے لیکن اظہار صرف اُس وقت کامل ہوتا ہے جب سُننے والوں تک اس کی رسائی ممکن ہو جاتے۔

اس میں شک نہیں کہ مختلف شاعروں میں ہم کلامی کی خواہش مختلف درجے کی ہوتی ہے۔ لیکن علمِ تنقید میں ہمیں شاعر کے ارادوں سے سروکار نہیں بلکہ اُس کے طریقِ کار سے ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ شعر کہہ کر جو تسکین اُس نے حاصل کی ہے۔ وہ اس کے اشعار کے اثر سے کس قدر مطابقت رکھتی ہے۔ کیونکہ شاعر کے تجربے اور قاری کے تجربے میں جب تک آہنگ نہ ہو اُن کا باہم ربط کامیاب نہیں۔

شاعر اس بات میں حق بجانب ضرور ہے کہ وہ شعر کہتے ہوئے اپنے تجربے اور اظہار کی پختگی پر نظر رکھے اور ہم کلامی کے جذبے کو پس پشت ڈال دے۔ لیکن جہاں تک قاری کے نقطۂ خیال کا تعلق ہے کوئی قاری اس بات میں دلچسپی ظاہر نہیں کر سکتا۔ کہ شاعر اپنے تجربہ کے اظہار میں یا اپنے تجربے کو سخن بنانے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ بلکہ قاری تو یہ دیکھتا ہے کہ شاعر کا کلام اس کے اصلی تجربے کو زندہ کرنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ اور قاری کے دل کو کہاں تک زندگی کے ساتھ ربط اور قربت بہم پہنچا سکا ہے۔

حیف بر جانِ سخن گر بہ سخنداں نہ رسد!

رباعی

افسوس کہ اب بھی غم سے پانی ہے لہو
اب تک ہی ارتقا کی ہے سست نمو
حکمت ہے صباحِ نادمیدہ بہ اُفق
انسان ہے حرفِ نارسیدہ بہ گلو

جوش ملیح آبادی

مسعود پرویز

دو تصویریں

دیکھ وارفتگیِ شوق کی نازک تصویر ـــــ
ہوش و تمکیں تری صحبت میں لٹا بیٹھا ہوں
ماندسی روشنی، مدہوش فضا، بوئے نبیذ
نشۂ دید میں سرشار نگاہیں، اور دل
اِک حسیں خواب میں تحلیل ہؤا جاتا ہے
کبھی رقصاں، کبھی عریاں، کبھی تو جام بکف
لڑکھڑاتی ہوئی آنکھوں میں محبت کی شراب
یوں پراگندہ فضا میں ترے گیسو جیسے
پیکرِ شعلہ سے شرمایا ہؤا دودِ چراغ

ایک لذت ہے تصور کی فسوں سازی میں
ان گنت نقش بناتا ہوں مٹا دیتا ہوں
آہ لیکن یہ حسیں خواب نگاہوں کا فریب
ہیں یہ وہ خواب نہیں جن کی کوئی تعبیریں

دیکھ دُنیا کے تمدن کا بھیانک منظر ـــــ
بے کسی، بے بسی، بیداد، ستم، جور، جفا
اس قدر کشمکشِ زیست سے بیزار ہجوم
گر یہ ممکن ہو، نہ ہونے کی تمنا کر لیں
رنج و آلام سے احباب کے گھبرائے ہوئے
زرد مرجھائی ہوئی صورتیں، فاقوں سے نڈھال
جسم لاغر، قفسِ خاک میں بے بس جانیں

آلِ احمد سرور

انگریزی شاعری ؎

اُردو شاعری پر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ اس کا سارا سرمایہ بدیسی ہے، اسکی اپنی چیزیں کم ہیں۔ ایک زمانہ میں اس پر بھاشا کا اثر تھا، پھر فارسی کا غلبہ ہوا، اب انگریزی کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اس قسم کا اعتراض ہر زبان کی شاعری پر ہو سکتا ہے۔ جس طرح کسی قوم کا تہذیب و تمدن آسمان سے نازل نہیں ہوتا، بلکہ یہ مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کے ایک دوسرے پر عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی طرح دنیا میں کوئی ادبی سرمایہ ایسا نہیں جو کسی دوسرے قدیم ادب کا ممنون نہ ہو۔ اپنے ادب کے سوتوں کے لئے ہمیں بعض پراکرتوں اور عربی و فارسی کے خزانے کھنگالنے پڑتے ہیں۔ انگریزی ادب پر بھی یونانی، لاطینی، فرانسیسی اور جرمن ادب کا بہت گہرا اثر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ چونکہ انگریزی ادب آٹھ سو سال سے زیادہ کی عمر پا چکا ہے، اس لئے ہمیں بعض ایسی خصوصیات مل گئی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں اور جو آئینہ ہیں انگریزی قوم کی تاریخ، اس کی تہذیب اور اس کے تمدن کا، مگر یہ خصوصیات علیحدہ ہوتے ہوئے بھی مشترک ہیں۔ دراصل مختلف زبانوں کے شعر و ادب ایک دوسرے سے جدا گانہ بھی ہیں اور قریب بھی، ایک ہی جذبہ ہے، جو مختلف پیرایوں میں کھلتا ہے، ایک ہی تاثر ہے جس کی رنگینیاں بے شمار ہیں۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت محض صوفیوں کی بازیگری نہیں ایک ادبی اصول کی تفسیر بھی ہے۔

انگریزی شاعری کہنے کو چاسر سے شروع ہوتی ہے، مگر اس سے صدیوں پہلے قدیم انگریزی یا اینگلو سیکسن میں ہمیں مذہبی نظمیں ملتی ہیں۔ شاعری پیدا تو سحر کی گود میں ہوتی ہے، مگر مذہب کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔ یہ شاعری بہت پہلے موجود تھی جس طرح دریا کی روانی و قوسِ قزح کے رنگ اور چاند کی ہلکی اور لطیف روشنی موجود تھی، چنانچہ انسان نے بچپن ہی میں نور و نغمہ یا رنگ و بو کا اثر اپنے دل پر محسوس کیا۔ احساس کے اظہار نے اسے شاعر بنایا، مگر چونکہ اس کے احساسات سیدھے سادے تھے، اس لئے ان کا اظہار بھی سیدھے سادے انداز میں ہوا۔ قدیم شاعر فطرت سے ڈرتا تھا اور تقدیر کا قائل تھا، مگر چونکہ فطرت کی گود میں پلا تھا، اسلئے اس سے لگاؤ بھی رکھتا تھا۔ شمالی ہواؤں کی تیزی، برف و باراں کی سختی، زندگی کی شدید کشمکش، ان چیزوں نے اس کے مزاج کو چڑچڑا نہیں بنایا، بلکہ اس میں مردانگی پیدا کی، ایک تلخ واقعیت کو بیدار کیا۔ حزنیہ رنگ اور تقدیر پرستی، قدیم نظموں میں بہت نمایاں ہیں، یہ قنوطیت شمالی قوموں میں فطری ہے۔ مسیحی تعلیم نے اپنے فلسفۂ گناہ سے اسے اور گہرا کر دیا۔ اس زمانہ کا شاعر اپنی چند روزہ زندگی کا پورا پورا احساس رکھتا تھا، مگر آنے والی زندگی سے ڈرتا بھی تھا۔ یہ شاعری پوری قوم نے کی ہو یا نہیں۔ پوری قوم کے لئے ضرور تھی۔ قوم نے اسے اپنایا۔ اپنی زندگی میں جگہ دی اور ایک زندہ روایت کی طرح آنے والی نسلوں کو سونپا، شاعری اس وقت کتب خانوں، یا حکومتوں یا دل کی خاموش گہرائیوں کے لئے نہ تھی، محفلوں، جلسوں اور ہنگاموں کے لئے تھی، انداز میں سادہ، استعارہ سے بے نیاز، مافوق الفطری، جذباتیت سے خالی، واقعیت سے لبریز، ایک امید پرور تصور میں ڈوبی ہوئی۔ یہ ہے چاسر سے پہلے کی شاعری، اس میں میٹھی لوریاں بھی ہیں اور جادو ٹونوں کا ذکر بھی، اور ایک جملہ یا فقرہ آخر میں دہرایا بھی جاتا ہے۔ اسی کو نثر میں سب گاتے ہونگے، قدیم

؎ اس مضمون میں Lewis کی کتاب HOPE FOR POETRY سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

(Humanism)

بیک وقت حسن کی دیوی اور ملکہ وکٹوریا دونوں کے پجاری تھے۔ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ نئے سانچے بنانے والے تو چند ہی ہوتے ہیں، یہ نئے سانچے خیال کی نئی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ مگر دوسرے درجہ کے لوگ، سانچے کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں یہاں تک کہ ان کی وجہ سے سانچہ بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ ٹینی سن اپنے دور کا بہت اچھا ترجمان ہے۔ وکٹوریہ کے عہد کا سارا بلند آہنگ مگر کھوکھلا فلسفہ، ساری لفاظی، اخلاقی اور سیاسی عظمت کا سارا طلسم ٹینی سن کے یہاں موجود ہے۔ اُسے تو شباب کے بدلے میں موت ہی آنی تھی، حیاتِ ابدی کہاں سے ملتی۔ ہاں براؤننگ کے یہاں چونکہ خیال کی گہرائی اور ایک منفرد تجربہ ملتا ہے، اسلئے اس کی مقبولیت زیادہ دیر تک رہی۔ مگر ان اونچے اونچے اور سربفلک محلوں میں بھی زلزلہ آنا ضروری تھا، چنانچہ جلد ہی روزن ظاہر ہونے لگے، انہیں میں سے بعض نے بغاوت کا علم بلند کیا، میتھو آرنلڈ نے لاکھ روحانیت اور تہذیبِ نفس کا جادو جگانا چاہا، مگر زمانہ بدل چکا تھا، انیسویں صدی کے آخر میں ہی، اس دور سے بیزاری شروع ہو گئی، جو باندی تھی وہ رانی بن گئی اور رانی کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

جنگِ عظیم سے پہلے اس بیزاری نے زیادہ تلخی اختیار نہ کی تھی، جنگ نے وہ اخلاقی نصب العین، وہ سیاسی نظریہ، وہ معاشی نقطۂ نظر، وہ جماعتی نقطۂ نظر سب برباد کر دیا۔ ان میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ توپوں کی گھن گرج اور میدانِ جنگ کی ہلاکت آفرینی نے صدیوں کے پردے سالوں، بلکہ دنوں میں اُٹھا دیئے، جنگ کے بعد جو عیش پرستی آئی وہ اتنی اہم نہیں ہے جتنی وہ طنزیاتی روح، وہ نفسیاتی تجزیہ۔ وہ حقیقت سے ہر قسم کے پردے اُٹھا دینے اور اس سے آنکھیں چار کرنے کی خواہش، جو ہمیں دونوں بڑی لڑائیوں کے بیچ کے سارے ادب سے ملتی ہے۔

شاعری پیدا سحر سے ہوئی۔ مذہب کی گود میں کھیلی، عقلیت کے سائے میں پروان چڑھی، مناظرِ قدرت کے ساتھ جوان ہوئی، کیا پروپیگنڈے کے دور میں یہ باقی رہ جائیگی؟ یہ ذہنی اعتراض ہے۔ جو مکاؤلے نے شاعری پر کیا تھا جب کبھی اس قسم کا خطرہ شاعری کو لاحق ہوا ہے تو اس نے کسی نہ کسی طرح ہی سے اپنے لئے بقا کا سامان پیدا کیا ہے۔ چنانچہ انگریزی شاعری کی ترقی میں سائنس ایک دیوار کی طرح حائل نہیں، بلکہ اسے مدد دینے اور اس کے لئے خام مواد مہیا کرنے کے لئے ہے۔ سائنٹیفک مزاج، مشینوں کا دور، ریڈیو، ہوائی جہاز، انجن، آپریشن ٹیبل، کو غیر شاعرانہ کہنے والے شاعری کی ترقی میں بند باندھتے ہیں۔ ان میں ایک آہنگ یا شعریت ہے۔ شاعری ان سے بھی کچھ نہ کچھ اخذ کر سکتی ہے۔

T.S. Eliot کی ایک مشہور نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

Let us Go Then You And i
When The Evening is Spread
Out Against The Sky.
Like a Patient Etherized Upon
a Table.

چنانچہ کئی جدید شعرا مثلاً (C. Day Lewis)، (Auden)، (Spender) وغیرہ کے یہاں بجلی کے تاروں، انجن کی بھاپ اور عظیم الشان بحری قوتوں سے تشبیہ اور استعارے اخذ کئے گئے ہیں۔ Eliot مابعد الطبیعاتی شعرا سے زیادہ متاثر ہے، ہر دور کا ایک فلسفی ہوتا ہے۔ اس دور کا فلسفی T.S. Eliot ہے۔ اس کی نظم Waske Hard بیسویں صدی کی Epic کہی جا سکتی ہے۔ اس نظم کا ترجمہ ہمارے رسالہ اُردو میں چھپ چکا ہے۔ اس میں اور کھوکھلے آدمی میں اس دور کی مایوسی اور تلخی، پورے طور پر موجود ہے، چاہے وہ Eliot کا ہیرو Prenfrock ہو یا Spanorell Hurby دونوں بس فرسٹ ہی ذہن رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ کھو چکے ہیں اور اتنا ذوقِ یقین نہیں رکھتے کہ پھر پا سکیں۔ ہمارے یہاں چونکہ اتنی تڑپ، خلش اور آرزو نہیں ہے۔ اسلئے ہم ان کا تصور بھی اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ ایلیٹ (Eliot) تو خیر فلسفی ہے اور فلسفی ادھر یا ادھر نہیں ہوتا وہ محض بلند ہوتا ہے مگر Spender اور Auden اور

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سعادت حسن منٹو

قبض

نئے لکھے ہوئے مکالمے کا کاغذ میرے ہاتھ میں تھا۔ ایکٹر اور ڈائرکٹر کیمرے کے پاس ساتھ کھڑے تھے۔ شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس لئے کہ سٹوڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ چل رہا تھا۔ ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا کیونکہ شوٹنگ کے دوران میں جب ایکا ایکی اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی۔ تو کئی کئی ہزار فٹ فلم کا ٹکڑا بیکار ہو جاتا۔ ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔

ڈائرکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کیمرے کے پاس کھڑے سگرٹ پی رہے تھے اور میں سستانے کی خاطر کرسی پر ٹانگوں سمیت بیٹھا تھا وہ یوں کہ میری دونوں ٹانگیں کرسی کی نشست پر تھیں اور میرا بوجھ نشست کی بجائے اُن پر تھا۔ میری اس عادت پر بہت لوگوں کو اعتراض ہے مگر یہ واقع ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔

نیتا جس کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں ڈائرکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا "صاحب وہ بولتا ہے کہ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے۔ پھر شور بند ہو جائے گا"۔

یہ روزمرہ کی بات تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک کارخانے میں صابن کٹتے اور اُن پر ٹھپے لگتے رہیں گے۔ چنانچہ ڈائرکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن سمیت اسٹڈیو سے باہر چلے گئے۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھا رہا۔

سقفی لیمپ کی ناکافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں پڑی تھیں اُن کا درمیانی فاصلہ اصلی فاصلے سے کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور گیرو رنگ کے نقری پلائی وڈ کے تختے جو دیواروں کی صورت میں کھڑے تھے پست قد دکھائی دیتے تھے۔ میں اس تبدیلی پر غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی: "السلام علیکم"۔ میں نے جواب دیا "وعلیکم السلام" اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی۔ میری آنکھوں میں "تم کون ہو؟" کا سوال تیرنے لگا۔ آدمی ہوشیار تھا، فوراً کہنے لگا: "جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہوا ہوں —— میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔ خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہوں —— آپ کا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے"۔

میں نے کہا "جی نہیں —— میں پنجاب کا باشندہ ہوں"۔

عبدالرحمٰن نے جیب سے عینک نکالی "معاف فرمایئے گا، چونکہ ڈائرکٹر صاحب نے عینک اُتار دینے کا حکم دیا تھا۔ اس لئے ......" اس دوران میں اُس نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکالی اور میری طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ "واللہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ دہلی کے ہیں یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں —— ماشاء اللہ کیا مکالمہ لکھا ہے...... قلم توڑ دیا ہے واللہ...... یہ اسٹوری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے؟"

عبدالرحمٰن نے جب یہ باتیں کہیں تو اُس کا قد بھی میری نظر میں نقری پلائی وڈ کے تختوں کی طرح پست ہو گیا۔ میں نے روکھے پن کے ساتھ

کہا "جی نہیں"

وہ اور زیادہ جھگیلا ہو گیا "عجیب زمانہ ہے صاحب جو اہلیتوں کے مالک ہیں ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں . . . . یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ عجیب اوٹ پٹانگ بستے ہیں یہاں کے لوگ، پندرہ دن مجھے یہاں آئے ہوئے ہیں مگر کیا عرض کروں سخت پریشان ہو گیا ہوں ——— آج آپ سے ملاقات ہو گئی . . . . . . "اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ ملکر اُس روغن کی مروڑیاں بنانا شروع کر دیں، جو چہرے پر لگاتے وقت اُس کے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔

میں نے جواب میں صرف "جی ہاں" کہہ دیا اور وہ خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور روا روی میں لکھے ہوئے مکالموں پر نظرِ ثانی شروع کر دی۔ چند غلطیاں تھیں جن کو درست کرنے کے لئے میں نے اپنا قلم نکالا۔ عبد الرحمٰن ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا۔ مجھے اُس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا "فرمایئے"

اُس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا "میں ایک بات عرض کروں"

"بڑے شوق سے"

آپ اس طرح ٹانگیں اُوپر کر کے نہ بیٹھا کریں"

"وہ کیوں؟"

اُس نے جھک کر کہا "بات یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے قبض ہو جایا کرتا ہے"

"قبض؟" میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی "قبض کیسے ہو سکتا ہے" یہ کہہ کر میرے جی میں آئی کہ اُس سے کہوں "میاں ہوش کی دوا کرو ——— گھانس تو نہیں کھا گئے ——— مجھے اس طرح بیٹھتے بیس برس ہو گئے ——— آج کیا تمہارے کہنے سے مجھے قبض ہو جائیگا" مگر میں یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بات بڑھ جائیگی اور مجھے بیکار کی مغز دردی کرنا پڑے گی۔

وہ مسکرایا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اُس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سُکڑ گیا "آپ نے مذاق سمجھا ہے حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ٹانگیں جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے ——— میں نے تو اپنی ناچیز رائے پیش کی ہے۔ مانیں نہ مانیں یہ آپ کا اختیار ہے"

میں عجیب مشکل میں پھنس گیا۔ اس کو اب میں کیا جواب دیتا۔ بستبعض . . . . . . یعنی قبض ہو جائیگا۔ بیس برس کے دوران میں مجھے قبض نہ ہوا لیکن آج اِس مسخرے کے کہنے سے مجھے قبض ہو جائیگا۔ قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر بیٹھنے سے۔ جس طرح میں کرسی پر بیٹھتا ہوں اُس سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے۔ دوسروں کو نہ سہی لیکن مجھے تو اس سے آرام ملتا ہے اور یہ سچی بات ہے کہ مجھے ٹانگیں جوڑ کر سینے کے ساتھ لگا دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسٹڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑا رہنا پڑتا ہے جس سے آدمی تھک جاتا ہے۔ دوسرے نا معلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دُور کرتے ہیں مگر میں تو اسی طریقے سے دُور کرتا ہوں۔ کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ خواہ قبض کے بجائے مجھے سرسام ہو جائے۔ یہ ضد نہیں، دراصل بات یہ ہے کہ کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا انداز میری عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز مطالبہ ہے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں اکثر لوگوں کو میرے اس طرح بیٹھنے کے انداز پر اعتراض رہا ہے۔ اس اعتراض کی وجہ نہ میں نے ان لوگوں سے کبھی پوچھی ہے اور نہ انہوں نے کبھی خود بتائی ہے۔ اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو میں اس معاملے میں اچھی دلیل سننے کے لئے بھی تیار نہیں کوئی آدمی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔

جب عبدالرحمٰن نے مجھ پر نکتہ چینی کی تو میں بھنا گیا اور اس کا یوں شکریہ ادا کیا جیسے کوئی یہ کہے: "لعنت ہو تم پر"
اس شکریے کی رسید کے طور پر اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر میلی سی مسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا۔ اتنے میں ڈائرکٹر، ہیرو، ہیروئن آ گئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے سے عبدالرحمٰن کے قبضے سے نجات حاصل ہوئی۔

اس کی پہلی ملاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں۔

(۱) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغد ہے۔

(۲) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔

(۳) یہ ایکسٹرا جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پرلے درجے کا مغز چاٹ ہے۔

(۴) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس سے بے حد نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کچھ عرصے کے لئے زیادہ متحرک ہو جائے گی۔ میں نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں۔ آپ پوچھیں گے بھلا نفرت کرنے میں مہارت کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ ہر کام کرنے کیلئے ایک خاص سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے اور نفرت میں چونکہ شدت زیادہ ہے اس لئے اس کے عامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے۔ محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لیکر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں مگر نفرت بہت کم لوگوں نے کی ہے اور جنہوں نے کی ہے اُن میں سے اکثر کو اس کا سلیقہ نہیں آیا۔ نفرت محبت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف ہے۔ محبت میں مٹھاس ہے جو اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر نفرت میں ایک ایسی ترشی ہے جو دل کا قوام درست رکھتی ہے۔

میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نفرت اس طریقے سے کرنا چاہئے کہ اس میں محبت کرنے کا مزا ملے۔ شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے مجھے اس سے سو فی صدی اتفاق ہے۔ یہ ایک ایسی نفرت ہے جو شیطان کی شان کے خلاف نہیں۔ اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی موجود ہے تو وہ یقیناً اس نفرت سے جو کہ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے خوش ہوتی ہوگی اور سچ پوچھئے تو یہ عالمگیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اگر ہمیں اس سے نہایت ہی بھونڈے طریقے پر نفرت کرنا سکھایا جاتا تو دنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصور سے خالی ہوتی۔

میں نے عبدالرحمٰن سے نفرت کرنا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری اور اس کی دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی۔ اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو کے باہر جہاں کہیں اس سے میری ملاقات ہوتی میں اس کی خیریت دریافت کرتا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔

عبدالرحمٰن کا قد متوسط ہے اور بدن گٹھا ہوا۔ جب وہ نیکر پہن کر آتا ہے تو اس کی بے بال پنڈلیوں کا گوشت فٹ بال کے نئے کور کے چمڑے کی طرح چمکتا ہے۔ ناک موٹی جس کی کوٹھی ابھری ہوئی ہے۔ چہرے کے خطوط منگولی ہیں۔ ماتھا چوڑا جس پر گہرے زخم کا نشان ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شیطان لڑکے نے اپنے ڈیسک کی لکڑی میں چاقو سے چھوٹا سا گڑھا بنا دیا ہے۔ پیٹ سخت اور ابھرا ہوا۔ حافظ قرآن ہے

[illegible]

میں نے تصویر کو ایک نظر اور دیکھا اور مسکرا کر کہا: "کیوں نہیں ——— اِس ہفتے ہی کیلئے تو میں یہ کہہ رہا تھا۔"

اس پر عبدالرحمٰن نے دوبارہ شکریہ ادا کیا: "پرچے میں تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹ نکل جائے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں ۔ ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ تو ——— معاف کیجئے، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ ملتا ہوا چلا گیا۔

میں نے اب تصویر کو غور سے دیکھا۔ آدھی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں لمبی کی بھاری بھرکم ڈائرکٹری تھی جس پر چھپے ہوئے حروف بتا رہے تھے کہ سن سولہ کی یہ کتاب فوٹوگرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لئے ایک یادگار نے میں خریدی ہوگی۔ دوسرے ہاتھ میں جو اوپر کو اٹھا ہوا تھا ایک بہت بڑا پائپ تھا۔ اِس پائپ کی نوزنی عبدالرحمٰن نے اِس انداز سے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا۔ چائے کا پیالہ پکڑے ہے۔ لبوں پر چائے کا گھونٹ پیتے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا کرتا ہے وہ تصویر میں اُس کے ہونٹوں پر چھایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں کیمرے کی طرف دیکھنے کے باعث کھل گئی تھیں۔ ناک کے نتھنے تھوڑے تھوڑے پھول گئے تھے۔ سینے میں ابھار پیدا کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ کیونکہ وہ اچھا خاصا کارٹون بن گیا تھا۔ یاد رہے کہ عبدالرحمٰن انگریزی پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا تھا۔

میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اُس کے فوٹو کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق ایک تعریفی نوٹ کیساتھ پرچے میں چھپوا دیا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کمپنی کے غلیظ رسٹوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبدالرحمٰن تازہ پرچہ جس میں اُس کی تصویر چھپی تھی ہاتھ میں لئے داخل ہوا اور آداب عرض کر کے میری کرسی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے۔ آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے۔ بغل میں پرچہ دبا کر اُس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے۔ شکریئے کے کئی فقرے اُس نے دل ہی دل میں بنائے ہونگے۔ سب کو ناموزوں سمجھ کر انہیں منسوخ کر دیا ہوگا۔ جب میں نے اُسے اِس اوھیڑبن میں دیکھا تو ماتم پرسی کے انداز میں اُس سے کہا "تصویر چھپ گئی آپ کی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوٹ بھی پڑھ لیا آپ نے؟"

"جی ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔ ۔ کی بڑی نوازش ہے۔"

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی۔ میرا رنگ پیلا پڑ گیا۔ یہ درد بہت پرانا ہے جس کے دورے مجھے اکثر پڑتے رہتے ہیں۔ میں اس کے دفیعے کے لئے سینکڑوں علاج کر چکا ہوں مگر لاحاصل۔ چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اُٹھا اور سارے سینے میں پھیل گیا۔ عبدالرحمٰن نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا: "آپکے دشمنوں کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔"

میں اُس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اِس موذی مرض کا شکار ہوتے نہ دیکھ سکتا۔ چنانچہ میں نے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہا: "کچھ نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"جی نہیں، آپ کی طبیعت ناساز ہے ———" وہ سخت گھبرا گیا: "میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ مطلق فکر نہ کریں ——— سینے میں معمولی سا درد ہے، ابھی ٹھیک ہو جائیگا۔"

"سینے میں درد ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا: "سینے میں درد ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو قبض ہے اور قبض ۔ ۔ ۔ ۔"

قریب تھا کہ میں بھنا کر اُس کو دو تین گالیاں سُنا دوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا "آپ . . . . حد کرتے ہیں۔ آپ . . . . . . سینے کے درد سے قبض کو کیا تعلق ؟"

"جی نہیں ——— قبض ہو تو ایک سو ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہے ——— آپکی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ بکو پُرانا قبض ہے اور جناب قبض کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو۔ جی نہیں، آپ جس کو با فراغت اجابت سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ قبض ہو . . . . . . سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں قبض سے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے . . . . میرا خیال ہے کہ آپ . . . . درا صل آپ کی کمزوری کا باعث بھی یہی قبض ہے"

عبد الرحمٰن چند لمحات کے لئے بالکل خاموش ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی اُس نے اپنے لہجے میں زیادہ چکناہٹ پیدا کر کے کہا "آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہوگا ——— ایک معمولی سا علاج میرا بھی کر دیکھئے ——— خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دور ہو جائیگا"

میں نے پوچھا "کونسا مرض ؟"

عبد الرحمٰن نے زور زور سے ہاتھ ملے "یہی . . . یہی قبض !"

لاحول ولا، اس بیوقوف سے کس نے کہہ دیا ہے کہ مجھے قبض ہے، صرف میرے سینے میں درد ہے جو کہ بہت پُرانا ہے اور سب ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے۔ مگر یہ نیم حکیم خطرۂ جان برابر کہے جا رہا ہے کہ مجھے قبض ہے، قبض ہے، قبض ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کے سر پر غصے میں آ کر چائے کا پیالہ دے ماروں۔ عجب نامعقول آدمی ہے، اپنی طبابت کا پٹارہ کھول بیٹھا ہے اور کسی کی سنتا ہی نہیں

غصے کے باعث میں بالکل خاموش ہو گیا۔ اس خاموشی کا عبد الرحمٰن نے فائدہ اٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا۔ خدا معلوم اُس نے کیا کیا کچھ کہا . . . . . "

بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپکے سُدے پڑ گئے ہیں۔ آپ کو روز اجابت تو ہو جاتی ہے مگر یہ سُدے باہر نہیں نکلتے۔ معدے کا فعل چونکہ درست نہیں رہا اس لئے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہو گئی ہے۔ رطوبت یعنی وہ لیسدار مادہ جو فضلے کو نیچے پھسلنے میں مدد دیتا ہے آپ کے اندر بہت کم ہو گیا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپکو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہوگا۔ قبض کھولنے کے لئے عام طور پر جو انگریزی مسہل دوائیں بازار میں بکتی ہیں فائدے کے بجائے نقصان پہنچاتی ہیں اس لئے کہ ان سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمائیے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لئے آپکو دو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے . . . یونانی دوائیں اول تو ہم لوگوں کے مزاج کے موافق ہوتی ہیں۔ دوسرے . . . .

میں نے تنگ آ کر اُس سے کہا "آپ چاء پئیں گے ؟" اور اُس کا جواب سُنے بغیر ہوٹل والے کو آرڈر دیا "گلاب ان کے لئے ایک ڈبل چاء"

چاء فوراً ہی آ گئی۔ عبد الرحمٰن کرسی کھسیٹ کر بیٹھا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا "معاف کیجئے گا۔ مجھے ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ ایک سین کے متعلق بات چیت کرنا ہے ——— پھر کبھی گفتگو ہوگی"

یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبد الرحمٰن کی زبان پر منجمد ہو گئی اور میں رسٹوران سے باہر نکل گیا۔ درد شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہو گئی تھی اُس کی باتوں نے اس تکدر میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیوں اس بات پر مصر ہے کہ مجھے قبض ہے۔ میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا کہ مدقوق ہوں جیسا کہ عام لوگ میرے متعلق کہتے آئے ہیں۔ وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے سل ہے میری انتڑیوں میں ورم ہے، میرے معدے میں رسولی ہے، میرے دانت خراب ہیں۔ مجھے گنٹھیا ہے مگر بار بار اُس کا اس بات پر زور دینا کیا

معنی رکھتا تھا کہ مجھے قبض ہو رہا ہے۔ یعنی اگر مجھے واقعی قبض تھا تو اس کا احساس مجھے پہلے ہونا چاہئے تھا نہ کہ حافظ عبدالرحمٰن کو؟ ـــــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنا رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں ڈائرکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھے ہیرو، ولن اور تین چار ایکسٹراؤں کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے باعث ملتوی کر دی گئی تھی اس لئے سب کو چھٹی تھی۔ مجھے جب ہیرو کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گذر گئے تو معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمٰن کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ایک ایکسٹرا نے اس کے خلاف کافی زہر اگلا۔ دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مضحکہ اڑایا۔ تیسرے نے اس کے مکالمہ ادا کرنے کی نقل اتاری۔ ہیرو کو حافظ عبدالرحمٰن کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے۔ ولن نے ڈائرکٹر صاحب سے کہا "بڑا واہیات آدمی ہے صاحب کل ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ میرا ایکٹنگ بالکل فضول ہے۔ آپ اس کو ایک بار ذرا ڈانٹ بتا دیجئے۔"

ڈائرکٹر صاحب مسکرا کر کہنے لگے "تم سب کو اس کے خلاف شکایت ہے مگر اسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے۔"

تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا "وہ کیا؟"

ڈائرکٹر صاحب نے اپنی مسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا "وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ میں اس کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ مجھے قبض وبض نہیں ہے لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔ ابھی تک اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے۔ کئی علاج بھی مجھے بتا چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اس طرح ممنون کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے پوچھا "وہ کیسے؟"

"یہ کہنے سے کہ مجھے قبض ہے اور پھر اس کا علاج بتانے سے ـــــــ وہ مجھے ممنون ہی تو کرنا چاہتا ہے ورنہ پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ ـــــــ بات دراصل یہ ہے کہ اسے صرف اسی مرض کا علاج معلوم ہے یعنی اس کے پاس چند ایسی دوائیں موجود ہیں جن سے قبض دور ہو سکتا ہے۔ چونکہ مجھے وہ خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے اس لئے ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ جونہی مجھے قبض ہو وہ فوراً علاج شروع کر کے مجھے ٹھیک کر دے ـــــــ آدمی دلچسپ ہے۔"

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ ڈائرکٹر صاحب ـــــــ آپ کے علاوہ حافظ صاحب کی نظرِ عنایت خاکسار پر بھی ہے ـــــــ میں نے کل اُن کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے۔ اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے ابھی ابھی ہوٹل میں انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اُن کے اس حملے سے بچ گیا اس لئے کہ مجھے قبض نہیں ہے۔

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے قبض ہو گیا۔ یہ قبض ابھی تک جاری ہے یعنی اس کو پورے دو مہینے ہو گئے ہیں۔ میں کئی پیٹنٹ دوائیں استعمال کر چکا ہوں۔ مگر ابھی تک اس سے نجات حاصل نہیں ہوئی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ حافظ عبدالرحمٰن کو اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک موقع دے ہی دوں۔ کیا حرج ہے؟ ـــــــ مجھے اس سے محبت تو ہے نہیں۔

× × × × × × × × ×

[illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سنت سنگھ سیکھوں

منجدھار

جو امر کہ قابلِ علاج نہیں، قابلِ برداشت ہونا چاہیئے، میرے دوست کی نوعمر بیوی، جو ابھی ابھی سکول سے نکلی تھی، مجھے نصیحت کر رہی تھی۔ اسے پسند نہ تھا کہ میں ان پڑھ گنواروں کی طرح اپنے بچے کی موت پر روتا پیٹتا رہوں۔ ایسا کر سکنے میں اسے اور دیگر دوستوں لوانو بھی لی کو دکھی کر رہا تھا۔

مجھے اس کی ہمدردی کی سچائی پر شک نہ تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کی اُداسی کی یہ بھی وجہ تھی کہ اس سفر میں جس کی ہم بہت دیر سے انتظار کر رہے تھے اسے میرے ساتھ ناز و نخرہ کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ہے تو شرم کی بات، لیکن ہم میں ناز و نخرے کا رشتہ قائم تھا میرے اور میرے دوست کی نوعمر بیوی کے درمیان۔ گو یہ سب کچھ بالکل معصومانہ تھا، اتنا معصومانہ کہ ناز و نخرہ کم ہی ہوا کرتا تھا۔ مثلاً ابھی تک بوس و کنار تک نوبت نہیں پہنچی تھی، اور نہ ہی ہمارا ارادہ تھا۔ ہماری محض ایک شاعرانہ چھیڑ چھاڑ تھی، کیونکہ ہم دونوں شادی شدہ تھے اور اس دلیری سے محروم جو دو بستے گھر اجاڑ کر ایک نیا گھر آباد کرنے کے لئے لازمی ہے، تاہم ہم کوشش کر رہے تھے کہ دیکھیں ہمارے لئے اور کس قسم کی زندگی بسر کرنا ممکن ہے، بغیر اس دوسری زندگی کے جھمیلوں میں پھنسے۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں اتنی خوبصورت ہوں کہ ایسی ناگزیر حالت میں بھی یعنی میری اور اس کے خاوند کی دوستی کے باوجود ایک شخص اس پر دل و جان سے فدا ہے۔ میں خوش تھا کہ میں ایک دوسری عورت کو رام کر سکتا ہوں۔ نظروں اور نیم آغوشیوں میں ہم مکمل طور پر ایک دوسرے میں جذب تھے، گو ہمیں کبھی کھلے طور پر ہمکنار ہونے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا، صرف کبھی کبھی میں اس کے کندھے پر اپنے بازو کا پیچ ڈال دیتا یا بہت جرأت کرتا تو ایک مختصر ترین لمحہ کے لئے دونوں ہاتھوں میں اس کی کمر کو پکڑ لیتا۔ وہ میری اس حرکت کو بہت پسند کرتی تھی، کیونکہ اس کی کمر اتنی پتلی تھی کہ میرے ہاتھوں کے گھیرے میں پوری آجاتی، اور کبھی کبھی جب میں پڑھ یا لکھ رہا ہوتا تو وہ میرے پیچھے اتنا نزدیک آ کر کھڑی ہو جاتی کہ اس کے پستان میرے کندھوں پر پھڑپھڑانے لگ جاتے یا پھر سامنے سے اتنا نزدیک ہو جاتی کہ اس کے سینے میری پسلیوں میں چبھتے ہوئے معلوم ہوتے۔ لیکن عموماً ہماری محبت صرف نظروں تک ہی محدود تھی۔

کچھ دیر کیلئے وہ مجھے غم سے باہر نکال کر اپنے ساتھ ہم نظری کی بازی کھلانے کی کوشش کرتی رہتی۔ اور جب پانچ منٹ کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا، تو وہ میرے اور نزدیک آجاتی، میرا ہاتھ پکڑ کر ہلکا سا تھوڑا سا کھینچتی کہ مجھے ایک ٹھنک سی ہی گزرے تاکہ یہ سب کچھ بالکل سرسری ظاہر ہو۔ اسے اپنے خاوند کے حسد کا بہت ڈر تھا۔

"اگر تم ایسے مُن مُن رہو گے تو میں رو پڑوں گی، اور پھر تمہیں مجھے چپ کرانا ہوگا" آخر اس نے ڈبڈباتی آواز میں کہا۔

"ارے نہیں، میں بدنہیں رہا" میں نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھئی، اوید تمہیں چاہیئے کہ ایک عورت کے خوش کرنے پر خوش ہو جاؤ" میرے دوست نے فراخدلی سے کہا۔ پھر اس نے جھٹ اپنی بیوی کی طرف دیکھا، اس ڈر میں کہ کہیں اس کی بیوی نے جو صرف اسے خوش کرنے کے لئے تخلیق کی گئی تھی اس بات کا بُرا نہ مانا ہو۔

اس خیال سے میرے ہونٹوں پر پھیکی سی ایک مسکراہٹ سی

نہ، تم ایک سکول کی ملعون چھوکری ہو، جہاں سے تم نے چند چلتے ہوئے فقرے سیکھ رکھے ہیں، بدصورت، جب آنکھیں گھماتی ہو، بدصورت جب نہیں گھمائے جاتی ہو۔ جانور ہو اور جانوروں کی سی ٹھیک مکمل اور موزوں پڑتی ہو۔ صاف کہنے کی جرأت نہیں رکھتی ہو اور میں تمہیں یہ تشفی نہیں دوں گا۔ اس دوست کی دوستی کا صدقہ۔ ورنہ میں جانتا ہوں جیسی نیک طینت بیوی تم ہو! میں نے نہایت غصہ سے اور بے انصافی سے دل ہی دل میں اسے طعن و تشنیع کی۔ میں قریب جانتا تھا کہ میں اس سے بے انصافی کر رہا ہوں، لیکن میں بے انصافی کرنا چاہتا تھا۔ میری یہ بے انصافی قسمت کی میرے ساتھ کی ہوئی بے انصافی کا کونسا حصہ ہو سکتی ہے!

میرا جواب سن کر میرا دوست خیال میں مستغرق ہو گیا تھا۔ اور اس سارے وقفے میں وہ فلسفے کی خالی گہرائیوں سے یہ بات نکال سکا: "ہم کر کیا سکتے ہیں؟"

"میں کچھ نہیں کرونگا۔ غم، غم، غم کھاؤنگا۔ بس اس ستم کو قبول نہ کیجیے۔ میرے ساتھ مذہب و زہب کی بات نہ کرنا مہربانی ہے۔" مجھے ڈر تھا کہ اب وہ مذہب کو بیچ میں لا گھسیڑیگا۔

"میں پھر آپ سے ناراض ہوں۔" شیاما نے آنکھیں گھما کر کہا۔ وہ بدصورت لگتی تھی، لیکن مجھے ہنسی سی آ گئی۔ "اب تم نے سچ کہہ دیا ہے، چھوکری۔ تم ناراض ہو اور میں جانتا ہوں۔" میں نے سوچا: "تمہاری ناراضگی کی مجھے کوڑی بھر پروا نہیں۔" میں نے بیوقوفی سے، ضد میں آ کر کہا: "تم خدا سے تو بڑی نہیں۔"

"تو تم خدا میں یقین رکھتے ہو؟" وہ بولی۔ اس نے میری اس بات پر تازہ ناراضگی ظاہر نہیں ہونے دی۔

"جو کوئی بھی مجھ سے ناراض ہے جس کسی نے بھی مجھ سے میری بچی چھین لی ہے۔"

وہ مسکرائی، میں بھی مسکرا دیا۔ اس نے آنکھیں گھمائیں، جو مجھے بہت بدصورت معلوم ہوئیں۔ لیکن اس لئے بدصورت کہ وہ مجھے ایسے دکھ کر رہی تھیں، جیسے ایک عورت فحش اشارے کر رہی ہو۔ میں نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں، ایک فحش طریقے سے۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں، اب یہ خوبصورت اور شوُر کن تھیں۔ مجھے اس مختصر وقفے میں اپنے دوست کی نزدیکی کا کوئی احساس نہیں رہا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پہاڑی نالے فیتوں کی طرح جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے اور ان کے پیچھے پہاڑوں کی ایک خاکی دیوار افق کی گود میں کھڑی تھی۔ ہمارا ریل سے سفر اختتام کے قریب تھا۔

"کتنی دور رہ گیا؟" میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔ میں ابھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"دو سٹیشن اور" میرے دوست نے جواب دیا۔

"یعنی دس گیارہ میل؟" وہ بولی۔

"شکریہ" میں نے اس کی دلجوئی کرنے کے لئے کہا

یہ دس گیارہ میل کا عرصہ ہم سب چپ رہے۔ وہ مجھ سے ناراض تھی۔ میرے دوست نے سب چیزیں اکٹھی کیں اور ٹرنکوں وغیرہ میں بند کر دیں۔

سٹیشن پر میں سب سے پہلے اُترا۔ اُتر کر پلیٹ فارم پر سے میں نے پیچھے کو دیکھا۔ وہ ابھی دروازے میں کھڑی تھی، لیکن میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ میرا اسے اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں مایوس سا ہو کر دروازے کی طرف چل دیا۔

بس کا سفر چڑھائی کا تھا۔ بیس میل یعنی سارا رستہ وہ بیمار رہی، اُلٹیاں کرتی رہی۔ میں اس کا ماتھا اپنے ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہا۔ میرا دوست بہت گھبرایا ہوا تھا اور اسے دل مضبوط کرنے کی تاکید کرتا رہا۔

"آپ کا خیال ہے کہ میں اس طرح جان توڑ رہی ہوں صرف آپ کو اُڑانے کے لئے؟ آپ چپ ایک طرف بیٹھے رہیں، میری سُدھ لینے کے لئے دیکانی ہے!"

میرے دل میں محبت کی موج عود کر آئی۔ مذاق کا مقام نہیں تھا۔ اس نے میری محبت کا اعتراف کر لیا تھا، اپنے خاوند سے نہیں، مجھ سے۔ اور یہ اعتراف میرے چند گھنٹے پہلے کے اعتراف سے زیادہ پُرمعنی تھا۔

"لو دیکھو میں نے کب کہا تم یہ سب میرے ڈرانے کے لئے کر رہی ہو؟ میں اور کیا کر سکتا ہوں؟" میرے دوست نے خفت سے جواب دیا۔

ہمارے سفر کی آخری منزل دریا کو عبور کرنا تھا۔ اور اب ہم تینوں پر آ پہنچے تھے۔

"میں نہایت بزدل ہوں" وہ کہنے لگی "مجھے دریا سے اور کشتی سے ڈر لگتا ہے۔ میں موٹر کی طرح کشتی میں بھی آپ کی تکلیف کا باعث ہونگی۔"

"آپ بس سے ڈرتی تو نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ بیمار ہو گئیں۔" میں نے کہا۔

"ڈر کیسا؟" میرے دوست نے کہا "کوئی طوفان تھوڑا ہے۔ کیا ہوا اگر ہوا تیز ہے، اور دریا بھی کوئی چڑھا ہوا نہیں۔"

اس بات نے ہماری توجہ دریا کی طرف اور بادلوں کی طرف مبذول کر دی۔ گو سورج کے ڈوبنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ لیکن بادل ایسا گھنا تھا کہ رات کا سا اندھیرا ہو رہا تھا۔ تیز ہوا بادلوں کو مٹی کی طرح گوندھ رہی تھی اور آسمان مٹی چھاننے والوں کے گڑھے کی طرح مکدر تھا۔ اُفق میں، پانچ سات، دس میل کے فاصلہ پر بہاڑ کی دیوار بادل میں مل رہی تھی اور اسے اور بھی گھنگھور بنا رہی تھی۔ دریا بھی معمولی حالت میں دکھائی نہیں دیتا تھا گویا اسے طوفان کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ ڈر میں بھی رہا تھا، لیکن کہتا نہیں تھا۔

وہ کانپ رہی تھی، اتنا سردی سے نہیں جتنا ڈر سے۔ "مجھے ہوا سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے میری جانب منہ اُٹھا کر کہا "دریا کی طرف تو دیکھو۔"

میں اس کے چہرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے آنکھیں نہیں گھمائیں دوسری طرف پھیر لیں۔ وہ خوبصورت تھی اور شیشے کی طرح نازک، زود شکست، اگر ہوا تیز ہو گئی اور یہ اسی طرح کھڑی رہی تو اس کی کمر ٹوٹ جائیگی، میں نے اندر ہی اندر لطف اندوز ہو کر کہا۔ اس کمر کے متعلق اندر ہی اندر میرے دل میں ایک وحشت اُٹھ رہی تھی۔ اور وہ یہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔

"دیکھو، دریا کی طرف" اس نے پھر کہا گویا وہ میری وحشت کا بہاؤ اپنی طرف سے ہٹا کر دریا کی طرف کر دینا چاہتی تھی۔

میں پھر اُداس ہو گیا، اپنے آپ میں آ گیا اور مجھے اپنا لا تلافی نقصان پھر نئے سرے سے محسوس ہونے لگا۔

"نہیں، میں تو اسے ہمیشہ سے بھی نہیں چھوڑونگا" میں نے پشیمان ہو کر اپنے آپ سے کہا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میری بچی مجھے طعن کر رہی ہے جیسے میں اب اور کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔

"دیکھو، دریا میں تو طوفان آ رہا ہے!" اس نے اپنے خاوند سے کہا۔

اس کے خاوند نے دریا کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی دیکھ رہا تھا۔ دریا چڑھا ہوا تھا لیکن ابھی تند نہیں ہوا تھا۔ اس کی تندی ابھی اس کے سینے میں دبی ہوئی تھی۔ میں خوفزدہ ہو رہا تھا۔ مگر میں کیوں ڈر رہا ہوں؟ میں نے سوچا۔ پندرہ منٹ میں ہم دریا پار کر جائیں گے۔ گو یا دریا کو ایک کشتی اُلٹنے پندرہ منٹ سے زیادہ لگ جاتے ہیں۔

ڈوب جانے کے فوائد اور میرا ہونہار مستقبل۔ میں موازنہ کرنے لگا۔ اور کسی طرح نہیں تو اس طرح تو میں اپنی بچی سے مل جاؤنگا۔ دوسری طرف میں اپنے آپ کو، اپنے رشتہ داروں اور دنیا کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔ اور اگر روحانی محبت اور کشش کوئی چیز ہے تو میری بچی واپس آ جائے گی۔ وہ میری بیوی کے بطن سے پھر پیدا ہو گی۔

میں نے نہ ڈوبنے کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

"طوفان تو کوئی نہیں آ رہا۔" وہ نظر اُٹھا کر اپنی بیوی سے مسکرانے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا وہ اس کی نگاہ کے نیچے سکڑتی جا رہی ہے

"ارے نہیں، خطرے کی بالکل کوئی بات نہیں۔" میں نے ان کا حوصلہ بندھانے کو کہا۔

"دریا کے اس پار کوئی جگہ نہیں جہاں ہم رات گذار سکیں؟ مجھے تو اس وقت دریا پار کرنے کے خیال سے کپکپی چھوٹ رہی ہے!" وہ بولی اور اپنی کپکپی کا ثبوت دینے کیلئے کانپی۔

"ارے ڈرو نہیں۔" اس کے خاوند نے اسے بہلانے کی کوشش کی "جگہ تو اس پار ہے، محکمہ رفاہ عام کا ایک بنگلہ ہے جو یہاں سے ایک میل کے

فاصلہ پر ہے لیکن تم تشویش کیوں کرتی ہو؟ ہم پندرہ منٹ میں باہر ہو جائیں گے اور کنارے پر ہمارے لئے سواریاں آئی ہوتی ہیں۔

"ہاں سواریاں ہمارے انتظار میں ہونگی" میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"بشرطیکہ ہم پار ہو جائیں" وہ بولی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک غم زدہ مسکراہٹ تھی۔

"ارے ایسی بددلی کی باتیں مت کرو، آگے گرن سے ہم بہت خوشی میں آتے ہیں" میرے دوست نے میری بچی کی سمت کی طرف اشارہ کیا۔

"جیسے مرضی ہے، کرو" اس نے جواب دیا۔

ہم کشتی میں سوار ہو گئے۔ اصل میں اب میں نے پہلی دفعہ دریا کی طرف اور آسمان کی طرف دیکھا۔ واللہ دریا طغیانی پر تھا۔ ملاح لالچ کے بس میں آ کر اس کی پروا نہیں کر رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر جو میرے اندازے میں آدھ میل سے زیادہ نہیں تھا، پرانے دریا پر ایک نیا دریا چڑھا آ رہا تھا۔ پانی آدمی جتنا اونچا اٹھتا اور آگے کو کودتا۔ جیسے ہماری کشتی کو پکڑنے کے لئے دوڑا آ رہا ہو۔ اور پھر بادل اس زور سے گرجا کہ ہمیں اس دھماکے سے کشتی الٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شیاما ہاتھ میں پکڑے ہوئے پرندے کی طرح پھڑپھڑائی۔ اس کے خاوند نے اسے آغوش میں لے لیا اور وہ کچھ چپ ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے میرے سینے میں حسد کی آگ اٹھی۔ پھر مجھے اپنی بچی یاد آ گئی اور میں نے اس کی یاد کو اپنے سینہ میں بھینچ لیا۔

"طوفان بڑھ رہا ہے" کسی کی آواز سنائی دی۔ ہم سب اپنے آپ سے دھیان ہٹا کر اپنے پیاروں، مردہ و زندہ کا دھیان کرنے لگے۔

ایسا دکھائی دیتا تھا گویا اندھیرا اس کے بالوں کی طرح ہوا کے جھونکوں سے آگے بکھر گیا ہے اور ہمارا دریا اور ہماری کشتی اس کے گھیرے میں بے بس ہیں۔ دریا پر کا دوسرا دریا کچھ گزوں کے فاصلے پر ہی تھا، اور ایک دیو کی طرح ہماری کشتی کے پکڑنے کو دوڑا آ رہا تھا تحکمانہ اور بھیانک شور کے ساتھ۔

بچے اور عورتیں رونے لگے۔ ایک بوڑھی جو ملاح سے بہت ناراض تھی بولی: "میں نے اس طرح کو کہا بھی کہ کشتی مت چھوڑو، مگر اسے تو پیسوں کی پڑی تھی!"

"میں نے کہا نہیں تھا کہ آج رات دریا پار نہ کرو" شیاما نے اپنے خاوند کو گھورتے ہوئے کہا۔

نہیں اس کی آنکھیں بدصورت نہیں، صرف ڈراؤنی تھیں۔ نہیں ڈری ہوئی تھیں نسبتاً خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے اپنی رائے بدل دی۔

"ارے گھبراؤ نہیں، رام کا نام لو" میرے دوست نے کہا۔ سارے مسافر اپنے اپنے خداؤں، پیغمبروں اور گروؤں کا نام دبی زبانوں سے پکار رہے تھے۔ مجھے یہ خیال کر کے ایک ہنسی سی آ گئی کہ ہر ملک خداؤں، پیغمبروں اور گروؤں کی دولت سے کیسا مالا مال ہے۔ بچے بھی رام رام اللہ اللہ کر رہے تھے۔ کیوں نہیں؟ رات کو سوتے وقت اندھیرے میں جب ڈر لگتا ہے تو رام رام اللہ کرنے سے کیسی اچھی نیند آ جاتی ہے؟

لیکن شیاما عورت تھی اور جوان، وہ اس طرح خدا یا قسمت کے آگے جھٹ سے ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی۔ وہ اصرار کر رہی تھی، اچھل رہی تھی، اور رو رہی تھی "ہوئی کو ان ہوئی" کرنے کے لئے۔

"آپ نے پروا نہ کی، جیسے آپ کی عادت ہے۔ میں بہتیرا چلائی کہ دریا طغیانی پر ہے۔ بکتی ہے، آپ نے سوچا، جیسے آپ کی عادت ہے۔ آپ میری پروا کب کرتے ہیں، میں کون چیز ہوں؟"

ایک دفعہ تو میرے دوست نے بھی پھبتی کہہ دکھائی "کون کہتا ہے آپ کوئی چیز نہیں۔ آپ ایک بہت بڑی چیز ہیں، حیرت انگیز چیز" اور اس نے شیاما کو اپنی باہوں میں بھینچ لیا۔

"اچھا مذاق کا موقعہ ہے" شیاما نے جھلا کر کہا۔ گو میں جانتا تھا کہ وہ اپنے خاوند کی محبت کے اس مظاہرے پر خوش تھی۔ میں بھی اسے اسی طرح باہوں میں بھینچنا چاہتا تھا۔

اور پھر میں نے کہا: یہ ہو گا گیا، اگر ہم سب ڈوب جائیں؟ کم از کم میں؟ میں اپنی پوتی کے پاس جا رہا ہونگا۔ اگر کوئی دنیا ہے بعد از موت اگر نہیں، تو معاملہ ہی ختم ہے۔"

تم اپنے بچے کے ساتھ مرنا تو نہیں چاہتے، مجھے یقین ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تم جینا چاہتے ہو اور اس صدمہ کو بھول جانا چاہتے ہو۔ میرے دوست نے میرے پرانے بیان کو میرے سامنے رکھ کر کہا۔

کچھ لمحوں کے لیے میں سب کچھ بھول گیا۔ طغیانی، میرے جھگڑتے ڈوبے ہوئے ساتھی اور ہم سفر سب مجھے بھول گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسا لڑکپن میں جب گاؤں کے نزدیک کے نالے میں دیر تک نہاتے رہنے پر اور ایک لمبی ڈبکی کے بعد محسوس ہوا کرتا تھا۔ ساری دنیا عجیب، معدوم سی، خواب کی مانند، مجھ سے باہر، میں بتا نہیں سکتا۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ وہ سب جوش سے باتیں کر رہے ہیں اور بس۔

پھر یکایک یہ غول ساؤٹ گیا اور میں پھر اسی دنیا میں آ گیا۔ پانی نے ہماری کشتی کو آ پکڑا۔ ایک موٹی چادر کی چادر ہمارے پاس آ کر اُٹھی۔ اور جھپٹ کر میرے دوست اور اسکی بیوی پر آ گری۔ دونوں لپک کر اُٹھے اور وہ اندھیرے کے پنچھی کی طرح میری گود میں پھڑپھڑاتی ہوئی آ گری۔ میرے اندر سے ایک لہر سب سوگندوں، دعاؤں اور دیا سے زیادہ پُر زور، اس پانی کی چادر سے بھی طاقتور تھی۔ میرا ہاتھ اُس کے کندھے پر سے گزرتا ہوا اس کے سینے کے خانے پر جا ٹھہرا اور اس ہاتھ میں سے میری زندگی بکر اس کے سینے میں چلی گئی۔

پانی کی ایک اور چادر ہم پر گری۔ ہم کو پڑے لیکن شکایت نہیں کی۔

"جو بات کہ قابل علاج نہیں قابل برداشت ہونی چاہیئے" میرے نے مسکرا کر کہا جواب میں اُس نے مسکرا دیا۔

مجھے قریب قریب میری بچی واپس مل گئی۔ پر نہیں: میرا دوست تھا کہ اس کو بازوؤں میں تھامے بیٹھا تھا، ایک پرشکستہ پرندے کی طرح۔ اور میری دوستی تھی، میری باوفائی کہ مجھے لعن طعن کر رہی تھی۔

مجھے اپنی بچی کا خیال آیا۔ اور میں نے ایک نیم سی دعا کی۔ کہ میں اس طغیانی میں بہ جاؤں۔

چوپال

یہ کتاب مشہور نوجوان شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے چودہ دیہاتی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ حقیقی ہندوستان دیہات میں ہے۔ اور دیہاتیوں کی زندگی کی طرف اب تک ہمارے ادیب اور شاعر پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے۔ اس کتاب نے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ دیہات کے سادہ مناظر اور سادہ باشندوں کی جو تصویریں ندیم نے ان افسانوں میں پیش کی ہیں وہ اُردو ادب میں ایک دلفریب بیداری کا پیش خیمہ ہیں۔ صحیح مشاہدہ، صحیح احساس اور سلاست زبان ان کہانیوں کی جان ہیں۔ سادہ لوح دیہاتی لڑکوں اور لڑکیوں کی محبت۔ دوستی اور دشمنی ان افسانوں کا موضوع خاص ہے اور انہیں پڑھ کر انسان یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے ایک ایسی دنیا میں تیرتا چلا جا رہا ہے جہاں پُر تکلف تہذیب کی ہما ہمی اور مشینوں جیسے شہروں کا غلغلہ نہیں بلکہ آسمانی سکوت اور فردوسی خاموشی ہے۔ اور اس سکوت میں غریبوں کی کراہیں اور بیواؤں کی آہیں سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہیں۔

ملک کے مشاہیر اور متعدد اخبارات و رسائل نے اس کتاب پر حوصلہ افزا تبصرے کئے ہیں۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت پنجاب لاہور

حمید نسیم

غزل

پھر تقاضا ہے وفا کا کوئی نادانی کروں
سوزشِ دل کاوشِ جاں کی فراوانی کروں

پھر کسی غارت گرِ دل کے مٹانے کے لئے
اپنے دل میں آرزوؤں کی جہانبانی کروں

پھر کسی کافر کو جانِ آرزو کا نام دوں
پھر کسی ظالم کو جبرِ چاکدامانی کروں

پھر تغافل کے گلے دل سے مٹا ڈالوں تمام
حُسن کو آزادِ غمہائے پشیمانی کروں

آتشِ خاموش بنکر رات دن جلتا رہوں
دلمیں چنگاری لگا دوں شعلہ سامانی کروں

باندھ دوں پھر چشمِ تر سے سُرخ اشکوں کی جھڑی
پھر نہادِ جسم و جاں کو صرفِ طغیانی کروں

پھر بنوں دیوانہ اک چپ چاپ سا خاموش سا
اختیار اکبار پھر سے در گریبانی کروں

ہو عبودیت کی دُنیا میں بپا اک رستخیز
شاہدِ دل کو حریفِ شانِ یزدانی کروں

کس قدر بے کیف ہے آسودگی کی زندگی
اے نسیم اب دل کو پھر وقفِ پریشانی کروں

محمد حسن عسکری

میلاد شریف

ابھی شیخ ضیاء دین یہی طے کر رہے تھے کہ جمعرات کا دن رکھیں یا جمعہ کا، اور بڑے بتاشے ہوں یا جلیبیاں یا لڈو، کیونکہ چار بتاشوں کے مقابلے میں چار جلیبیاں ذرا ہلکی پھلکی چیزیں ہیں اور مزیدار بھی، اور پھر نام بھی زیادہ ہوتا ہے، لڈو گول گول ہوتے ہیں اور ٹھوس، اس لئے پُر وقعت معلوم ہوتے ہیں..... کہ حلوائی کی دکان کے زرد لڈو خلا میں ایسے اچھل رہے تھے جیسے کوئی پوشیدہ اسپرنگ لگا ہو، لیکن لڈو کی بہرحال لڈو ہے، گرا اور ٹوٹا، موتی چور کے لڈو کی زرد بُندیاں پارے کی طرح زمین پر بھاگ گئیں...... اور اگر بندیاں ہوں تو کٹوری میں بھر بھر کر دی جا سکتی ہیں.....، "ہاں مولوی، باؤ میلاد کریں گی بھی کہ نہیں!" رحیم اللہ راستے ہی میں کہنے لگے "اگر ٹیڑھی کر کر کے، ایک ایک منہ میں ڈالیگا جیسے چنے کے دانے، پھر بندیاں ہیں! کہاں ہوتی ہے ایسی روز بُندیوں کی میلاد شریف......

مگر عنایت کے دونوں بازوؤں میں ایک ایک لڈو پھنس گیا، اور وہ شیخ جی کے آخری فیصلے سے پہلے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ....

...... اور بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بازار کی طرف چل دیا۔

سب سے پہلے اُسے نفوسقہ ملا جو اپنے بیٹے کو گالیاں دیتا آ رہا تھا۔ وہ عنایت کی خوش خبری سے محظوظ نہ ہو سکا کیونکہ اُسے صاف نظر آ گیا کہ یہ بدمعاش عزیز مولود کے بہانے سے پھر رات کے دو بجے تک غائب رہیگا اور اگلے دن آٹھ بجے سو کر اُٹھے گا اور آدھے گھروں کا پانی خود اُس کے سر پڑ جائے گا "بھلا دو؟" اُس نے رُک کر گھورتے ہوئے کہا "ہاں ہوتی ہی رہے مولود!" عنایت کا اپنے کندھے تو ضرور اُسے نیچے کرنے پڑے مگر اُس نے اپنے جوش کو سرد نہیں ہونے دیا، اور ارادہ کر لیا کہ اب کے ذرا انتخاب سے کام لے گا سلامت آتے ہوئے اُسے رحمت کا اَنس ... تھا، دادو خرچی

گلے بیچنے کے کپڑے آج بہت سفید تھے اور گلا بہت ہی چمک رہا تھا اور پھر اُن کی بغل میں انگریزی کی ایک بہت موٹی کتاب بھی، اُمید لا صاحب لالہ رام پرشاد کو آتے دیکھ رہا تھا مگر اُس گھر کو پیچھے عنایت پہ باقی تھے۔ ان لوگوں کے چہرے اُسے اُمید افزا معلوم ہوتے، اس نے اُس نے اپنا چہرہ خشک بنا لیا، دانت خوب بھینچ لئے اور سینے کے ٹُچّوں کو پھیلا دیا کہ کہیں یہ زرد اور گول اور میٹھی خبر اُس کے اندر سے نہ اُڑ جائے۔ یہاں تک کہ جب اُسے گلاب منگن گھروں سے روٹیاں جمع کرتی ہوئی ملی تو اُس نے اُس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ "اری پپیپے کی سکے سیرا" لیکن بازار کے نکڑ پر چھدن کو دیکھتے ہی بازوؤں میں پھنسے ہوئے دونوں لڈو اُس کے جبڑوں میں آ کر جھولنے لگے۔ اُس نے چھدن کو پکارا، اور جواب کا انتظار کئے بغیر اُس کی طرف جھپٹا۔ اب تو سینکڑوں لڈو اُس کے گلے میں، سینے میں، ہاتھوں میں، ٹانگوں میں کود رہے تھے، کود ہی نہ رہے تھے بلکہ نکلے پڑ رہے تھے۔ اُس نے چار گز کے فاصلے ہی سے چیخ کر کہا،

"ابے چھدن! مولود ہے بے!"

چھدن کے گلے کی رگیں پھٹک پڑیں "مولود؟" اُس نے ایسی آواز میں کہا جیسے کوئی ڈاکے کی خبر سُنی ہو "میری قسم؟"

"ہاں ہاں سچ"

"میری قسم کھا!"

"کہہ تو رہا ہوں بے کہ مولود ہے، مولود ہے، اور وہ مانتا ہی نہیں!"

"سبحے کا ہیں کی ویسے؟ بتاسوں کی؟"

"بتاسوں کی؟ ربڑی ملے گی پاؤ پاؤ بھر!"

"ابے چل!" اپنے لہجے کا طنز محسوس کر کے چھدن نے اطمنان

کے، یہ دن ہمیں نیچے بیٹھنا پڑا، سلام بھی انہوں نے ہی پوچھا، اور جو
اصل کا ہوگا وہ تو جانے کا تا ہے۔"

رشید کی پُر اشتیاق آنکھوں کو مایوس نہ ہونا پڑا۔ اُستاد کی داڑھی
تیزی سے پھڑپھڑائی، اور اُنہوں نے غائب کر دیا کو ڈانٹ سکنے کی جرأت
سے تکلف اُٹھاتے ہوئے کہا: "نہ آویں گے سالے تو مت آؤ، کوئی مر دو
نہ ہوگی ان کے بغیر؟ کیا اور پڑھنے والے نا رہے ہیں؟ کس بات کی
ہے دھونس ان کی؟ کوئی دبے بسے ہیں شیخ جی ان کے، کیا کیا ہے؟
کمینے ہیں سالے، ابھی بتاویں ڈانٹ تو ہولیں آگے آگے۔ ایسے ایسے
تو جوتیں چاٹتے پھریں ہیں سینکڑوں!"

"ہاں جی، یہ تو ہے ہی!" اسمٰعیل جوش میں پٹی پر کھسک آیا تھا۔
"رئیس ہیں صاحب، کون ہے ان کی برابر کا قصبے میں!"

"گیند گدا اٹھا کر اُدھر اُچھلی" اور وہ بھول گئے جب خوشامدیں کرتے
پھرتے تھے، جب مقدمہ چلا تھا، ٹوپی ڈال دی تھی شیخ جی کے پیروں پہ،
جو شیخ جی وردا جی سے سفارش نہ کریں تو کاٹتے ہوتے جیل بھول
جاتے سب کھا کھا کے ڈنڈے، ابجی! شیخ جی ہی کچھ ڈھیلے ہیں ہمارے،
اک لگواتے دو دو جوتے تو ہو جاتے ٹھیک، پر کیا کریں، شیخ جی ہی بچارے
سیدھے سادے ہیں!"

"بہت سیدھے ہیں واقعی شیخ جی بھی!" رشید نے لہجے میں رقت
پیدا کرتے ہوئے تائید کی۔

"بھئی ہاں!" اسمٰعیل دونوں ہاتھ پٹی پر رکھ کر اُوپر اُٹھ گیا تھا۔
"یہ تو ہم بھی کہیں گے، بڑے سیدھے ہیں شیخ جی!"

"رئیس ہیں، بھائی! رئیس کو ہونا ہی چاہئیے ایسا!" اُستاد نے
اپنے سامعین کو حیرت میں ڈالنے کے لئے کہنا شروع کیا۔ "اور ان
کے باپ تھے، صاحب! کیا بتاؤں کیسے آدمی تھے، وہ رعب تھا کہ کوئی
نکل تو جاتے سلام کئے بغیر سامنے سے، چار پانچ آدمی جمع ہی رہیں تھے
ہر وقت، مجھے تو وہ بیٹا کہیں تھے، مجھ سے کہتے، میاں شیر خو، چلم تو
بھر لا۔ سب ہیں چلم کے اندر پہنچا، واہ جی آگ لگائی ہے چلم میں، ہوگا۔

وہیں سے چلا تیں، اسے تم تم ہی آتی، ڈھاک بھاڑ کے رکھ دیا، ساری
تھیں وہ بھی بڑی اچھی جب کبھی ہیں گیا اور وہ بچا کچھ بولتی ہو تیں تو انہوں
نے کبھی کچا چوسنے بغیر نہیں آنے دیا مجھے سے رسے شرفو، اچھا کچھ چکھا،
اور ہیں سے کے میوہ گیا کتر را، لاڈو بھی، اور بڑا دودھ دستی اُنکی بھینس
بھی، ساب! بچپن روپے کی لی تھی اُنہوں نے پینٹھ میں سے، جاٹ تھا وہ
کہنے لگا، او سیٹھ جی کیا یاد کرو گے تم بھی کو دی تھی، کوئی بھینسیا اور نکلی بھی وہ
ایسی ہی زوردار، دودھ وقت ——"

"کیا ڈینگ مار رہا ہے بے لنگڑے؟" لطیف ٹیلر ماسٹر نے رشید کو
مونڈھے پر سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

اُستاد نے تو خیر ذرا بُردباری سے کام لیا، مگر رشید اور اسمٰعیل کے
کندھے فوراً تن گئے کہ دیکھیں پہلے کون بتاتے، اسمٰعیل تو "ماسب ساب"
ہی کرتا رہ گیا، مگر رشید نے باوجود پھولے ہوتے سانس کے مولوی جزلدہ
کریا کا حکم، سب حال سُنا ڈالا۔

"ابے چھوڑ یہ جھگڑا!" ٹیلر ماسٹر بولے۔ "یہ بتا کب بٹے گا کیا ہو"
"لڈو ہیں، ماسٹر، لڈو!" اسمٰعیل تُلا ہوا تھا کہ اب کے رشید کو
آگے نہ بڑھنے دیگا۔

"لڈو؟" ٹیلر ماسٹر نے اپنی آواز میں سے لڈوؤں کی ساری
مٹھاس اور خوشبو نکال دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کیا روز روز
لڈو؟ ہونہہ!"

"تو پھر تمہارے لئے کون بانٹے گا سوہن حلوا؟" اسمٰعیل نے ماسٹر
کو اپنا جارحانہ اور غیر انسانی خیال ترک کر دینے پر اُکساتے ہوئے کہا۔

مگر ماسٹر بھلا کسی کو ایسی چھوٹی چیزوں پہ پسیجتے ہوتے کہاں دیکھ
سکتے تھے، انہوں نے اپنا وہی سوچا ہوا فقرہ اُنیسویں بار استعمال کیا۔
"ارے اس سے تو اچھا ہے کہ دو دو روپیوں پہ ایک ایک ہڈی اور چھٹانک دال
رکھ کے بانٹیں، جو پیٹ تو بھر سکے کہیں بھلے مانس کا!" ماسٹر رشید اور اسمٰعیل کے
صرف مسکرا دینے سے مطمئن نہ ہو سکے [illegible] انہوں
نے یہ ظاہر کرنے کے لئے [illegible]

[illegible]

"مگر ماسٹر، چائے بہت اُڑائی تم نے جلال پور میں، وہ بھی کہتے ہوں گے کہ کیا مشہور ہی پئیں گے۔"

"چھ! " بدمذاقی کا الزام ماسٹر برداشت نہیں کر سکتے تھے "چائے تھی وہ؟ اُونٹے ہوتے پانی میں گڑ گھول دیا جیسے۔ گنوار تھا! ارے چائے ہم نے پی ہے دلّی میں! پہنچ گئے صبح ہی صبح، اک پھینکے چار پیسے، اوجی بناؤ ایک پیالی، بس ساب دی اُس نے بنا کے، دو دو اُنگل ملائی چڑھی ہوئی، اور جو ذرا کم ہوئی تو ڈانٹا، کیوں جی یہ کیا دی ہے دیگچی کا دھوون، فوراً کہا اُس نے، اجی لو، لو، ناراض مت ہو، اور لو ملائی، ملائی کی کیا کمی ہے!"

ماسٹر تو دلّی کی ملائی پر ہونٹ چٹخار رہے تھے، مگر ملائی کی چکنائی بھی اسمٰعیل کی آنکھوں کو ماسٹر کے ہونٹوں پر چکتا ہؤا نہ روک سکی تھی، اور وہ سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا، سامنے والے بنئے کی لڑکی اپنی چھوٹی بہن کو لیئے باہر نکلی تھی جو نالی کے کنارے کھڑی روٹی کا ٹکڑا کھا رہی تھی، ان لوگوں کو بیٹھا دیکھ کر اُس کے کولھے اور زیادہ مٹکنے لگے، کمر میں بل پڑے، کندھے اور آڑے ترچھے ہوئے، اُس نے اپنی بانہہ ساڑھی میں سے ذرا اور باہر نکال دی، اور "تلّی!" کے بجائے آواز میں جھنک پیدا کرتے ہوئے "لیل لی ای!" پکارنے لگی، اسمٰعیل کی دونوں پنڈلیوں میں گدگدی ہوئی، اور اُس کی انگلیوں کے سرے بوجھل معلوم ہونے لگے پہلے تو وہ اپنا گھٹنا سہلاتا رہا، لیکن مصنوعی غصّے سے پھولی ہوئی سُرخ ناک دیکھ کر اور "تا چلتی ہے تو میں چھوڑے جاتی ہوں" سُن کر اُس نے اپنی ٹانگیں سکوڑ لیں، اور "رخسار سے برقع کو اُٹھا کیوں نہیں دیتے" گانے لگا، اب تک اور دو نے بھی اس گانے کے مأخذ کو دیکھ لیا تھا، لیکن استاد لڑکی کو دیکھنے کے بجائے سُرخ آنکھوں سے اسمٰعیل کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "ہم بھی تاڑ گئے ہیں، مگر خیر جاؤ، چھوڑتے ہیں۔ ابھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں تمہارے۔" رشید کی مسکراہٹ یہ بتانے کے لئے بیتاب تھی کہ اسے چھوٹا نہ سمجھا جائے وہ بھی ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ٹیلر ماسٹر بے پرواہ اور متین بنے ہوئے تھے ——— یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ دہلی میں جن میم صاحب کے یہاں کام کرتے تھے وہ ابھی ولایت سے آئی تھیں، اور بڑی خوبصورت تھیں، اور ماسٹر کو اپنے آپ بُلا کر چائے دیا کرتی تھیں، اس لئے اُنہیں ایسی وہڑچی لونڈیوں سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، اور صرف سانسوں کی آواز آتی رہی۔ یکایک اسمٰعیل نے چونکتے ہوئے، ایسے انداز میں کہا جیسے وہ اُن سے کسی بڑی چیز کی درخواست کر رہا ہو اور اُسے معلوم ہو کہ وہ انکار کر دیں گے "مولود میں یہی نعت پڑھیں گے، رہے گی تو اچھی۔"

ٹیلر ماسٹر اس جذباتیت کو وہیں ختم کر دینا چاہتے تھے، وہ انکار کرنے ہی والے تھے کہ سامنے تھانے کے دیوانجی جاتے نظر آتے۔

"دیوانجی ہیں کیا؟" اُستاد نے پُوچھا۔

"ہاں، دیوانجی ہی ہیں۔" رشید نے یقین دلایا۔

"دیوانجی کو بھی دعوت دے دیں مولود کی؟" اُستاد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"میں کہہ دوں بھاگ کے دیوانجی سے؟" اسمٰعیل نے پُوچھا۔

"اچھا کہہ دے۔" اُستاد نے کہا، مگر پھر کچھ سوچ کر بولے "ذرا ٹھیر میں ہی جاتا ہوں، میں ہی کہوں گا دیوانجی سے۔"

جب سے رابعہ فاطمہ نے سُنا تھا کہ شیخ بنیاد علی کی بیٹی شفیقہ چھ سال بعد آگرے سے آئی ہے، وہ بہت بے چین تھیں کہ کسی طرح اُس سے ملیں، اور اُن کے علاوہ اُن کی بھتیجی زینت بھی، اور وہ تو سیانی بھی جو جلدی ہی اُنہیں وا کہنے لگی تھی اور اب دوپہر کا وقت اُن ہی کے ہاں گزارتی تھی۔ خاص طور پر وہ یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ شفیقہ آگرے سے کس رنگ میں رنگ کر آئی ہے، وہ پہلے ہی کی طرح سیدھی سادی ہے، یا ساڑھی یا شلوار یا آڑے پائنچوں کا پیجامہ پہننے اور ٹیڑھی مانگ نکالنے لگی ہے، اگر وہ یہ سوچتیں کہ بچوں کے گھر میں کہاں نکلنا ہوتا ہے اور کیسا گھر سا کر

کر دہ جاتیں، لیکن جب مولود کی دعوت پہنچی تو انہیں اپنی تمنا پوری کرنے کا ایک زریں موقع ہاتھ آ گیا، کیونکہ یہ وہ ایک ایسی چیزیں تو ہوتی ہیں جن میں جب جانا فرض ہو جاتا ہے، جیسے کوئی خوشی یا موت یا مولود: چنانچہ تینوں نے اپنے اپنے یہاں نہانے کے لئے پانی گرم ہونے کو رکھ دیا اور دوپہر ہی سے جو کچھ پکانا تھا منگا لیا تاکہ مغرب کے وقت تک کھانے دانے سے فارغ ہو جائیں۔

گو سپاہن نے نہانے میں کافی دیر کر دی تھی جس پر بُوا فاطمہ بہت بگڑی تھیں، مگر پھر بھی عشاء سے ایک گھنٹہ پہلے ہی وہ سب تیار ہو گئیں، اور چاند بچوں اور بُوا فاطمہ کی بڑی لڑکی کلثوم کو ساتھ لیکر چل پڑیں۔ سپاہن نے آج اپنا اکیلا سُرخ پائنچوں کا پاجامہ پہنا تھا، اور کچھ دیر سوچنے سمجھنے کے بعد ٹرنک میں سے اپنا تین روپے والا ریشمی سُرخ بُرقع بھی نکال لیا تھا، جس کے دو حصے تھے، اس برقع کو ایک منٹ تک دیکھنے کے بعد زینت کے ہونٹ کچھ اس طرح کھلے رہ گئے۔ جیسے اُن میں پلکیں نہ رہی ہوں اور اُس کے نیچے کے دانت اُوپر کے دانتوں میں گڑنے لگے، مگر جب بُوا فاطمہ نے کہا کہ "اری کیا ہے یہ تیرا بُرخا، ہاتھ تو سارے باہر نکلے دے ہیں" تب جا کر اُس کے ہونٹ کچھ ڈھیلے پڑے، اور اُس نے اپنا پُرانی وضع کا سفید بُرقع جھاڑ کر اوڑھ لیا۔

جب یہ چاروں شیخ جی کے یہاں پہنچیں تو وہاں ابھی تک کھانا ہی کھایا جا رہا تھا، بچے پیچھے پیچھے آ رہے تھے، اس لئے انہیں اپنی جوتیوں سے پٹ پٹ کرنی پڑی، تب شیخ جی کی بیوی چونکیں اور انہوں نے چولہے کے پاس سے پکارا: "ابھی بیٹھیے، بیٹھیے۔" جتنی دیر میں شیخ جی نے پانی پیا اور ہاتھ دھوئے، ان چاروں کو دالان میں گرمی میں گھٹنا پڑا، چلتے چلتے بھی شیخ جی نے بیوی کو بُلایا اور آہستہ سے کہا: "دیکھو باہر چھوٹی والی سینی بھیجنا، سمجھیں؟" جب شیخ جی کے جوتوں کی آواز پہنچ گئی، اور بُوا فاطمہ نے دروازے کی طرف جھانک کر اچھی طرح اطمینان کر لیا تو وہ چاروں ایک شکایت آمیز لمبا سا سانس لیکر باہر صحن میں نکلیں۔ "سلام" دونوں پارٹیوں نے ایک ساتھ کہا —— "مولود" مگر دو نے یہ کوشش کرتے ہوئے کہ اُس کی آواز سب سے کم سنائی دے۔

"تب سے ہے، مرگئے تارے گرمی کے!" سپاہن نے آگرے والی پر پہلے ہی یہ واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اُس کا مزاج بھی شہر والیوں کا سا ہے اور وہ قصبے کے دالانوں کی قطعاً عادی نہیں ہے۔ اُس کا ارادہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر پانی مانگنے کا تھا، مگر بُوا فاطمہ نے شفیقہ کے پاس پہنچ کر اُس کی کمر تھپکنی شروع کر دی، اور پوچھا "بڑے دن میں آئی ہے بیٹی، اچھی تو ہے؟"

"جی" شفیقہ نے بات ٹالنے کیلئے کہا۔ "آیئے، بیٹھیے، ادھر آ جائیے اس پلنگ پہ، اُس پلنگ پہ تو۔۔۔۔" مگر اُس نے جملہ نا تمام ہی چھوڑ دیا۔

اس دوران میں بُوا فاطمہ خوب دیکھ داکھ کر اطمینان کر چکی تھیں کہ بات بڑے پائنچوں کے ریشمی پجامے اور بالیوں کے بجائے بندوں تک ہی پہنچتی ہے، زینت کا بھی ڈر کم ہو گیا، اور اُس نے اپنے تنگ پائنچوں میں ٹانگوں کے پٹھے ڈھیلے چھوڑ دیئے، گو سپاہن کو ایک حد تک مایوسی ہوئی۔ مگر اس خیال سے تسکین ضرور ہوئی کہ اب اُسے خواہ مخواہ جھکنا تو نہ پڑیگا۔ کلثوم نے بھی پیچھے سے جھانک جھانک کر دیکھا، اور آگرے والی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا چاہی، مگر تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے کسی اور وقت پر ملتوی کر دینا ہی بہتر سمجھا۔

اب بچے بھی آ پہنچے تھے، اور دونوں گھروں کے بچوں نے بھاگ بھاگ کر اور غل مچا مچا کر پس منظر کی موسیقی فراہم کرنی شروع کر دی تھی۔ سپاہن نے زیادہ دیر پُر تکلف بنا رہنا بیکار سمجھا، اور سیدھے شفیقہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "بہن، میں تو تمہارے پاس بیٹھوں گی، میں تو برابر بُوا سے کہے جا رہی تھی کہ دیکھ پاؤں کسی طرح، نہیں!" اور پھر ساتھ ہی اپنے خصائص سے بھی آگاہ کر دیا تاکہ آگرے والی کو زیادہ دیر تک اُس کے بارے میں غلط فہمی نہ رہے۔ "میری تو ایسی ہی عادت ہے بہن، ہنسنے ہنسانے کی، اب کیا کروں اپنی عادت کو، بُوا کہتی رہیں کہ اری کیا ہو گیا تیری ہنسی کو۔"

"ہاں ہاں، بہن بیٹھو!" آگرے والی نے فوراً بتایا کہ اُسے بھی مردہ دل نہ سمجھا جائے۔ "میں بھی یہ کہہ رہی تھی کہ کوئی باتیں واتیں کرنے والا ہی نہیں

مثلاً یہاں، آگرے میں تو ہر وقت آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔"

"وہاں تو بہت سی بہنیں بنی ہوئی ہوں گی؟ فرخ آباد میں تو میں بھی گھر میں ناگن تھی، کھڑکی تک ہمارے گھر میں! بس کھڑکی کھولی اور اُدھر نکل گئی، پھر یاں ہمارے محلے میں، وہ آتے اور بگڑنے لگے بس کبھی گھر ہی میں نہیں دکھائی دیتی ہو، اُٹھیں اور چل دیں۔"

آگرے والی نے نہ معلوم کیوں یہ محسوس کیا کہ زیادہ سہیلیاں رکھنا کوئی مبتذل سی بات ہے۔ "ہاں.... بہت سی تو کیا، وہی جن سے ذرا زیادہ میل جول ہے۔ ایک تو ہیں آصف کی اماں، وہ بھی" اُس نے سیاہنی کا دل رکھنے کے لئے کہا۔ "بالکل تمہاری سی ہیں! بہن، بہت ہنستی ہیں، جب ہنسنے پہ آتی ہیں تو بس ہنسے چلی جاتی ہیں۔ فوج کے دفتر میں ہیں وہ، اور ایک ہیں نسیمہ کی اماں، وہ بہن بنی ہوئی ہیں خالہ کہلاتی ہیں وہ اپنی بیٹی سے مجھے، کوئی آٹھ سال کی ہے اُن کی بیٹی، تیسری میں پڑھتی ہے، بڑی ہوشیار ہے، ہے ذرا سی، مگر باتیں بالکل بڑوں کی سی کرتی ہے۔"

"اسکول جاتی ہوگی پڑھنے؟" سیاہنی نے اپنے شبہ کی تصدیق کرنے کے لئے پوچھا۔

بُوا فاطمہ نے بھی اس سلسلے میں کچھ پوچھنا چاہا، مگر اسے اپنے بالا تریا قبل از وقت سمجھ کر چھوڑ دیا۔ کلثوم نے بھی فوراً ایک چوڑی سی سڑک بنائی جس کے دونوں طرف مبہم سی دکانیں تھیں، اور جہاں انجان شکلوں کی کالی اور بھاری گاڑیاں بغیر گھوڑوں اور پہیوں کے اُڑتی ہوئی آجا رہی تھیں، اور وہ آٹھ سال کی نسیمہ کو اپنی ہری اوڑھنی سنبھالتے ہوئے بغل میں بستہ دبائے اسکول جاتے دیکھنے لگی، مگر چونکہ وہ راستوں سے ناواقف تھی، اسلئے اُسے نسیمہ کو چوراہے پر کھڑا چھوڑ دینا پڑا، اور وہ باوجود متعدد کوششوں کے اُسے آگے نہ بڑھا سکی،

"ہاں اسکول ہی تو جاتی ہے۔" شفیقہ نے بتا دیا۔

"بڑے ٹھاٹھ سے جاتی ہوگی پڑھنے؟" سیاہنی نے پوچھنے میں جلدی کی کہ کہیں گفتگو کسی اور طرف نہ بہک جائے۔

"ٹھاٹھ؟ نہیں، ٹھاٹھ کیا، اپنا ہی جیسے سیدھے سادے ہیں۔"

"تو تو بیٹی آگرے میں رہ کے بالکل نہیں بدلی۔" بُوا فاطمہ بہت دیر سے پوچھنا چاہ رہی تھیں، اب اُن سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔ "بالکل ویسی ہی سیدھی سادی ہے جیسے سب ہوں ہیں۔"

"ہاں، بہن" سیاہنی کو بھی اس موضوع پر روشنی کی ضرورت تھی۔ "تم کیوں ہو اتنی سیدھی؟ تم کیوں نہیں کرتیں شہر والیوں کے سے فیشن؟"

"ہاں، فیشن؟ فیشن کیا! اُنہیں نہیں پسند، وہ تو کہتے ہیں کہ یہی اچھی ہے اپنا سیدھی سادی وضع، اور ویسے فیشن دیکھنے ہوں تو آگرے میں دیکھو، ایک ایک فیشن کرتی ہیں عورتیں جس رنگ کی قمیص ہو اُسی رنگ کی شلوار ہو، سوٹ کہتے ہیں اُسے..... ہاں، سوٹ، اور پھر ایک ہاتھ میں تو ایک چوڑی، اور دوسرے میں پانچ پانچ چھ چھ۔"

"آئے سچ؟" اور جب شفیقہ نے یقین دلایا کہ ہاں واقعی ایسا ہی ہے تو سیاہنی اور ہکیں، "آئے ہائے! اُن سڑی ہوؤں!؟"

"بس تو یہی سُن۔" بُوا نے فیشن پرستی کے الزام سے بچنے کے لئے کہا "مجھے ہی ہے شوق ایسی باتوں کا، مری جاوے ہے اونچی ایڑیوں کے جوتے پر، کیا اچھا لگے ہے تجھے؟ مجھ سے تو نہ چلا جائے، دوپہر کو دیکھو اس کے تو تماشے، کبھی شیشہ لیکر ٹیڑھی مانگ بنائیگی، کبھی فُند پٹے کی ساڑھی باندھیگی۔ کبھی مشک مشک کے گائیگی، اب تو ٹرمیں بھی کنگھی لگانے لگیں، اور خدا انگریزی سنو اس سے بولے گی!"

سیاہنی نے آتے ہی اپنی جو تعریف پیش کی تھی اُس کے صحیح ہونے کے ثبوت دینے کی وہ اب تک کئی دفعہ کوشش کر چکی تھی، مگر جب بُوا فاطمہ نے شہادت دینی شروع کر دی تو اُس نے اُن کے بیان کے اثر کو مکمل کرنے کیلئے کئی قہقہے لگائے۔ "تم تو یہاں پڑی ہو بُوا، تمہیں کیا خبر دنیا میں کیا ہو رہا ہے، جو باہر نکلو تو پتہ چلے۔"

"ہاں!" آگرے والی نے تال دی،

"ہاں۔" بُوا فاطمہ نے بھی مرعوب نہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" سیاہنی نے زیادہ کچھ نہ سمجھ پانے کے انداز میں کہا۔

[illegible]

"ہاں تو پھر یہ ہوا کہ . . ." آگرے والی نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "غل تو بچ رہا ہے، کیا کروں باتیں، کان پڑی آواز تو سنائی نہیں دیتی۔"

"ہم نے بھی وہ بہن غل، ہ سپاہنی اپنے جوش میں ایسے بہاؤ کو کب خاطر میں لانے والی تھی، "تم سناؤ۔"

"ہاں . . . . تو اُس دن کالج کے لڑکے بھی آئے تھے، مجھے تو پڑوسن نے دکھایا کہ دیکھو تو بہن کیسے پھر رہی ہیں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ، ایک ایک گھنٹے تک رہے تھے۔ ایسے باتیں ہو رہی تھیں جیسے کوئی بات ہی نہیں، ایک اچھل کود، بھاگ کے یہاں، بھاگ کے وہاں، کوئی تو ساڑھی باندھے دے، سر کھلا ہوا، پلو جا رہا ہے زمین میں جھاڑو دیتا ہوا، کسی بات کا ہوش ہی نہیں اور کوئی نکر پہنے دے . . . . ہاں نکر یہی گھٹنوں تک کا جو ہوتا ہے، ٹانگیں بالکل ننگی، آدھی آدھی باہنوں کی قمیص، اور جو ساڑھی پہنے دے تھیں باہیں اُن کی بھی کھلی ہوئی تھیں کندھوں تک،

اور ڈوپٹہ وپٹہ کچھ نہیں، وہ جو نیکر پہنے دے تھیں؟" بُوا فاطمہ نے پوچھا

"نہیں، کچھ بھی نہیں، بس نکر اور کھلے گلے کی قمیص، آدھی باہنوں کی۔"

"اور وہ . . . . وہ سب . . . . ہیں؟" یہ پوچھتے ہوئے سپاہنی کی گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"سب . . . . سب" آگرے والی نے اس سوال میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

بُوا فاطمہ تو خیر ہکا بکا ہو کر رہ گئیں، مگر سپاہنی کو اپنے پیٹ میں سانس زیادہ بھاری معلوم ہوا، اور دونوں کنپٹیاں سرسرانے لگیں، وہ ایک روشن، واضح اور معین تصویر بنانے کی کوشش کرنے لگی، مگر اُس جگہ جگہ سے پھولے ہوئے سفید کپڑے پر نہ معلوم ننگی ٹانگیں کیوں چھو کے چلی جاتی تھیں، کلثوم کے اندر بھی دو ایک پتیاں جلد جلد ہلیں، مگر اُس نے اپنے چہرے سے اس کے سب آثار مٹا ڈالے، اور وہ ہوا کو سونگھ سونگھ کر دیکھنے لگی کہ اُس میں اس وقت کیسی خوشبو آ رہی ہے۔

سپاہنی کے جسم میں لہریں اُٹھ رہی تھیں جو اپنی اصل کے لحاظ سے تو ہنسی نہ تھیں، مگر حلق تک آ کر وہ مسکراہٹ کی شکل میں ظاہر ہونا چاہتی تھیں، اور وہ اُنہیں چپ چاپ چہرے کی جھریوں میں جذب کر لینے کی کوشش کر رہی تھی، وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا واقعی اُن لڑکیوں کی رانیں دکھائی دے رہی تھیں، مگر لفظ اُبھرتے اُبھرتے پھر ڈوب جاتے تھے، وہ ابھی یہ سوال ہمت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی کہ شیخ جی نے پکار کر اطلاع دی کہ پڑھنے والے اندر آ رہے ہیں۔

اُس کے ساتھ خاموشی گر رہی تھی، اور ہر چیز پر چپکی جاتی تھی، یوں کہنے کو تو میلاد پڑھنے والوں کے گلے کافی بلند تھے، مگر معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی آوازیں فضا میں اُٹھ جاتی ہیں اور اُوپر کی خاموشی کو نیچے دھکیل دیتی ہیں، صرف شروع شروع میں سپاہنی نے ایک قہقہہ لگایا تھا کیونکہ حافظ جی بیان پڑھتے ہوئے اپنی آواز میں سوز و ساز پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، ہر الف ہی نہیں بلکہ بعض دفعہ تو زبر بھی عین بن جاتا ہے اور اُن کا بوڑھا اور بھرایا ہوا گلا لفظوں کو چبا چبا کر لمبوترا بناتے دے رہا تھا، اس کے بعد سپاہنی چپ ہو گئی، اس وجہ سے نہیں کہ اُس نے بُوا فاطمہ کی تنبیہ کو مان لیا تھا، بلکہ خود اُس کا جسم کچھ سست پڑ گیا تھا اب تو ایسی خاموشی چھائی تھی کہ وہ اپنے اندر خون کی سنسناہٹ اچھی طرح محسوس کر رہی تھیں، صرف چھالیا کاٹنے کی آواز اُنہیں ایک لمحے کیلئے خارجی دنیا میں کھینچ لاتی تھی، مگر کٹ کٹ کے ختم ہوتے ہی وہ بہت تیزی سے واپس ہو جاتی تھیں جیسے کھنچی ہوئی ربڑ کا سرا چھوڑ دیا جائے، کلثوم کی ہم آہنگی میں ذرا حرکت بھی مخل نہ ہو رہی تھی، اور یہ ارادہ کر کے بیٹھی تھی کہ بہت دلچسپی سے مولود سُنے گی۔ ایک دو دفعہ تو ضرور ایسا ہوا کہ کسی مصرعے کے ٹکڑے نے اُس کے اندر سے سینے سے کروٹیں لیں، اور اُس کی کلائیوں میں خون بھر بھر آیا مگر تھوڑی ہی دیر میں اُسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ وہ آنکھیں جھپک رہی ہے اور پہلو بدل رہی ہے، اُس کا خیال چپکے سے کھسک گیا تھا، اور گشت کرتا پھر رہا تھا، کبھی تو اُسے ایسے چہرے، نیم کے پیڑ، دیواریں اور چوطے نظر آتے تھے جو جانے بوجھے تھے، مگر کبھی وہ ایسے طبقات پر سے گزرتا تھا جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور گہرائی ہی گہرائی، اور یہ اندھیرا کچھ ایسا تہ دار تھا اور سیلا

تھا کہ وہ کہ کر منڈلانے لگا تھا، اور بار بار سر جھکا کر اُس میں غرق کر دیتا تھا۔ بوا فاطمہ نے اپنے خون تک کو دُھو کر رکھی تھی جس سے وہ بہت شکست ہو گیا تھا، اُن کے خیالات آ کر سینے میں جمع ہو گئے تھے۔ اور بہت کلبلا رہے تھے انہوں نے سب کی ٹانگ میں رسّی باندھ رکھی تھی، وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو یقین دلا دیتی تھیں کہ اُن کی توجہ صرف حضور کے بیان کی طرف ہے، سپاہی اس فرصت کے وقت فرّخ آباد گھوم چلی گئی تھی، مگر کالج کی لڑکیوں کی راتوں کا خیال جو کبھی تو سرخ معلوم ہوتی تھیں اور کبھی سفید بار بار اُس کے اندر چمک پیدا کر رہا تھا۔

اس تقدّس کی فضا میں سپاہی کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس لئے اُس نے چادر کو تھوڑا سا کھول کر باہر کا جائزہ لینا شروع کر دیا، اُدھر سے دیکھا تو وہ بھی کھسک آئیں اور اُس کے اُوپر سے جھانکنے لگیں، سپاہی کی نگاہیں سامعین کے سروں پر سے تیرتی ہوئی تخت پر پہنچ گئیں، چینی کے رنگین گلدان پر پھریں، تھوڑی دیر حافظ جی کی لمبی داڑھی سے کھیلیں، اور پھر پڑھنے والوں کے چہروں کا مطالعہ کرنے لگیں۔

"یہ کون ہے؟" سپاہی نے ہنستے ہوئے پوچھا، "یہ چکن کی ٹوپی اوڑھے والا لڑکا سا؟"

"یہ؟ یہ رشید ہے" کلثوم نے جھانک کر دیکھا اور بتایا "میرے ساتھ پڑھا کرتے تھے مدرسے میں، آٹھواں سپارہ تھا اس کا جب"

"یہ ہے کس کا یہ؟" سپاہی نے دوبارہ پردے سے آنکھ لگاتے ہوئے کہا "بڑا گورا ہے!"

کلثوم فوراً پیچھے بیٹھ گئی، اور دوپٹے سے ناک سہلانے لگی، وہ سب سے کہہ دینا چاہتی تھی کہ اس زمانے میں تو رشید بہت گندا رہتا تھا، اور اُس کے کپڑوں میں جوئیں بھری رہتی تھیں، مگر اُس کا سانس پھول گیا تھا، اور گال بوجھل معلوم ہو رہے تھے۔

پھر وہ بڑ کھینچی اور چھوڑی جانے لگی۔

ہاں جب سلام پڑھنے کے دوران میں لوگ اس مصرعے ذوق سے "مولا میتہ" پر پہنچے تو کلثوم کا بدن جسے اس نے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا تھا، پھر گرم ہو گیا، اور اس کے سر میں فوارے چھوٹنے لگے۔ "عہد وحی سکینہ" سے بوا فاطمہ اور سپاہی دونوں کو اُپلوں والی سکینہ یاد آ گئی، بوا فاطمہ تو یہ سوچ رہی تھیں کہ اب سکینہ نے پیسے کے چھ پنجوں کے بجائے پانچ کر دیئے ہیں۔ اور انہیں لُوٹ رہی ہے، اور ساتھ ہی اُس کے اُپلے کتنے ہلکے ہو گئے ہیں مگر سپاہی کو اس پر ہنسی آ رہی تھی کہ وہ اپنی بہو کو لڑائی میں کیسی کیسی گالیاں دیتی ہے

جب اسمٰعیل اور رشید اُستاد سے رخصت ہو کر گلی میں مڑے تو اسمٰعیل نے قریب ہوتے ہوئے کہا "تو نے دیکھا تھا بے رشید؟ کون تھی وہ جو پردے میں سے جھانک رہی تھی؟ مجھے تو آنکھ ہی دکھائی دی بس .... آنکھ تو اچھی تھی یار! .... شیخ جی کی بیٹی تو نا تھی؟ ہے کوئی شیخ جی کے بیٹی اتنی بڑی؟"

مختلف علوم کی ابتدائی کتابیں ——— آسان اور عام فہم زبان میں

مکتبہ اردو نے ایک سال سے سستی کتابوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یہ کتابیں مختلف علوم و فنون کے ابتدائی مطالعہ کے لئے بہترین ثابت ہوئی ہیں۔ ذیل میں ان کتابوں کی فہرست دی جاتی ہے

سوشلزم — فریڈرک اینگلز | عناصرِ تہذیب — والٹیئر رنٹ | پھول کانٹے — گوپال متل | سبھاش بوس — گوپال متل

کارل مارکس — باری | عصمت انونو — ثریا اندریان | شہنشاہ حبشہ — اختر اوریتوی | اقبال اور اس کا پیام — خالد، خاور

انقلابِ فرانس — باری | سرمایہ داری — عبداللہ ملک | ہندوستان کے لیڈر — یوسف ظفر | رضا شاہ پہلوی — محمد اشرف عطا

زیر طبع کتابیں

راجہ اور کسان — لینن اور ٹالسٹائی | جاگیر داری — " " | محمد عربی — باری | ٹراٹسکی — نریندر ناتھ سیٹھ

سٹالن — مارشل وارشلوف | مشین اور مزدور — باری | گورکی کی ڈائری — حسن عباس | فاشزم — باری

مکتبہ اردو سے آپ کو مکتبہ جامعہ، انجمن ترقی اردو، مکتبہ برہان اور دوسرے تمام کتب خانوں کی کتابیں اکٹھی مل سکتی ہیں جس سے آپ ڈاک خرچ اور دیگر مصارف سے بچ سکتے ہیں۔

مکتبہ اردو لاہور

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

Midmeeze

[illegible]

[illegible]

جان:۔ مائیکل تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ سچ ہے بیسویں صدی کے
دوستوں میں ہمدردی اتنی افراط سے ملتی ہے جتنا پتھروں سے
تیل۔

مائیکل:۔ دیکھو جان۔ دوستی کو اس معاملے میں مت گھسیٹو۔ جہاں
تک دوستی کا تعلق ہے میری یہی نصیحت ہے کہ گھر واپس چلو اور
رات کو محبت کے انگاروں پر لوٹنے اور دن کو کڑھ جاناں کی
دھول پھانکنے کی بجائے اپنے گھائل دل کی مرہم پٹی کا بندوبست
کرو۔ اصل میں......

جان:۔ شش شش۔ وہ دیکھو۔ وہ سامنے لال رنگ کا مکان۔
وہیں رہتی ہے میرے مجروح دل کی ملکہ۔ میری بے نور زندگی
کی شمع.... میری.... میری....

مائیکل:۔ آنکھوں کی عینک۔ میرے دردِ جگر کی امرت دھارا.....
ارے گاؤدی یہ تو صوفیا کا مکان ہے۔ میں صوفیا کو اچھی طرح
سے جانتا ہوں۔

جان:۔ (متحیر ہو کر) تم جانتے ہو!

مائیکل:۔ یہ ایک راز ہے، جو آج تمہیں بتاتا ہوں۔ دوست میں نے
بھی اسی در سے عشق کا پہلا اور آخری سبق پڑھا تھا۔

جان:۔ تم نے بھی صوفیا سے محبت کی۔ پھر کیا ہوا؟

مائیکل:۔ بس یہی کہ ایک ہفتہ سول ہسپتال میں گزرا۔ ظالم لکڑی
کی ایڑی والی گرگابی پہنتی ہے اور دوسرے کے سر کو تو۔ پتھر
کا ٹکڑا سمجھتی ہے۔

جان:۔ مگر مائیکل تمہارا تو یہ حشر ہونا ہی تھا۔ تم محبت کرنا کیا جانو۔ محبت
کرنے کے لئے پُرسوز، رومان سے لبریز شاعرانہ دل چاہیئے۔
مگر تمہارا دل تو سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور برف میں لگا کر تمہارے
سینے میں رکھا گیا ہے۔

مائیکل:۔ اچھا بھائی۔ تم اپنا بھٹی میں تپایا ہوا دل پیش کر دیکھو۔ ہماری
الوداع ہے۔

جان:۔ ٹھہرو مائیکل۔ دیکھو مجھے اُن سے انٹروڈیوس کرا دو۔ خدا کیلئے

مائیکل:۔ انٹروڈیوس!! ناممکن۔ ہم نے تو اس کعبہ سے دو فرلانگ
کے فاصلہ پر ہی رہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ ہاں کچھ ٹھہر جا:
صوفیا کا بھائی بمبئی سے آنے والا ہے۔ وہ ہائی سکول میں میرے
ساتھ پڑھتا تھا۔ اُس سے انٹروڈیوس کرا دونگا۔ پھر تم اپنا
راستہ نکال لینا۔

جان:۔ دیکھو صوفیا کا بھائی۔ کیا نام ہے؟

مائیکل:۔ جیمز۔

جان:۔ بمبئی سے آنے والا ہے؟

مائیکل:۔ ہاں۔

جان:۔ کب گیا تھا؟

مائیکل:۔ کوئی چھ سال ہوتے۔

جان:۔ چھ سال۔ ہوں۔ چھ سال میں آدمی کافی بدل جاتا ہے۔ کس
عمر کا ہوگا۔

مائیکل:۔ بس یہی میری تمہاری عمر کا۔

جان:۔ (اچھل کر) تو بس کام بن گیا۔ مائیکل اب تم جا سکتے ہو۔ اس کعبہ
سے دو فرلانگ نہیں دو میل دور رہ سکتے ہو۔

مائیکل:۔ (جان کے چہرہ کو بغور دیکھتے ہوئے) خیریت تو ہے
جان۔ اگر مناسب سمجھو تو پاگل خانے میں خبر کر دوں۔

جان:۔ شٹ اپ۔ تم نہیں سمجھتے۔ ہمارے دماغ میں ایک ریڈی میڈ
(Full Boiled) فل بائلڈ (Ready Made)
سکیم سرایت کر گئی ہے۔ تم جا سکتے ہو دوست۔

مائیکل:۔ اور تم۔

جان:۔ ہم چلے جاناں کے ہاں۔

جاتے ہیں آج یار سے شطرنج کھیلنے
آئیں گے جیت کر جو یہاں داؤں چل گیا

ارے دیکھو میرے پاس کاغذ قلم نہیں ہے۔ تم فوراً اس شعر کو

نوٹ کرلو۔ کہیں کام آئیگا۔

مائیکل:۔ بہت بہتر۔ آپ جائیے اور میں ایمبولنس کا انتظام کرتا ہوں۔

(منظر بدلتا ہے۔ اُدھر جان بیابان کو جاتا گنگناتا ہوا صوفیا کے گھر کی طرف جاتا ہے۔ اُس کے قدم اور دل کا تابیک وقت مکان کے دروازے پر رُکتے ہیں۔ جان Call Bell بجاتا ہے)

اندر سے ایک معمر عورت کی آواز } کون ہے؟

جان:۔ مدر میں ہوں جیمز۔

وہی آواز:۔ جیمز!!! (مسز ڈینیل دروازہ کھولتی ہے)

جان:۔ (آؤ تاؤ دیکھے بغیر مسز ڈینیل سے لپٹتے ہوئے) مدر۔ میں ہوں تمہارا جیمز۔

مسز ڈینیل:۔ (حیرت سے چیخ کر اُٹھتی اور اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے) ہٹو پرے۔ گدھا۔ بیوقوف۔ کون ہو تم؟

جان:۔ مدر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (صوفیا دوڑتی ہوئی آتی ہے)

صوفیا:۔ کیا ہوا۔ مدر؟

جان:۔ (ماں کو چھوڑ بیٹی سے لپٹنے کی کوشش کرتے ہوئے)۔ صوفیا! بہن!!

صوفیا:۔ (ہوا یا چپت رسید کرتے ہوئے) ہٹو مردود کون ہو تم؟

جان:۔ (استعجاب ظاہر کرتے ہوئے) مدر۔ صوفیا۔ تم دونوں اپنے جیمز کو بھول گئیں۔ پہچانتی تک نہیں؟

صوفیا:۔ (ماں سے) کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔

مسز ڈینیل:۔ شرابی دکھائی دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اسے جیمز کا نام کیسے معلوم ہوا؟

جان:۔ مدر۔ کیا چھ سال کے عرصے میں اتنا بدل گیا ہوں کہ تم پہچان بھی نہیں سکتیں

مسز ڈینیل:۔ بھاگو یہاں سے۔ مردود۔ نہیں تو پولیس کو اطلاع کرتی ہوں۔

جان:۔ (ٹھٹکا کر) پولیس کو اطلاع دینے کی کیا ضرورت ہے مدر۔ میں کچھ بدل تو ضرور گیا ہوں۔ بمبئی میں ایک آدھ بار Boxing Match کھیل بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناک نقشے میں کچھ تغیر آگیا۔ مگر مدر میں ایسا بھی کیا بدل گیا ہونگا؟ صوفیا۔ تم بھی ۔ ۔ ۔

مسز ڈینیل:۔ صوفیا۔ چلاؤ۔ سن کر کوئی آجائے گا۔

صوفیا:۔ میں کیوں چلاؤں۔ میں اس پاگل سے نہیں ڈرتی۔

مسز ڈینیل:۔ (صوفیا سے۔ دبی آواز میں) تو کیا کرنا چاہیئے؟

صوفیا:۔ (سرگوشی کے لہجے میں) اسے اندر بٹھاتے ہیں۔ میں اسے باتوں میں لگاؤں گی۔ تم چپکے سے اُٹھ جانا اور کانسٹیبل کو بلا لانا

مسز ڈینیل:۔ ٹھیک ہے۔ (بآوازِ بلند) آؤ جیمز بیٹا۔ اندر بیٹھو۔ یہاں کھڑے کھڑے تھک جاؤ گے۔ سفر سے آتے ہو نا۔

جان:۔ (جس کے کانوں میں ماں بیٹی کی سرگوشیوں کی بھنک پڑ گئی ہے) نہیں۔ نہیں۔ اگر آپ لوگ مجھے پہچانتے ہی نہیں تو یہاں ٹھہرنے سے کیا حاصل۔ میں جاتا ہوں۔

صوفیا:۔ نہیں جیمز یہ بات نہیں۔ بہت دیر بعد لوٹے ہو نا۔ مدر کی نظر اور میرا حافظہ کچھ کمزور ہیں۔ اندر آؤ۔ ذرا بیٹھ کے باتیں کریں۔ پرانے دنوں کی یاد تازہ ہو گئی تو یہ اجنبیت خود بخود دور ہو جائے گی۔

جان:۔ (جھجکتے ہوئے) اچھا ۔ ۔ ۔ مگر ۔ ۔ ۔

صوفیا:۔ ارے یہ سوچنے کیا لگے۔ آؤ بھی (دھکیلتے ہوئے اندر لیجاتی ہے)

دوسرا سین

(صوفیا کا ڈرائنگ روم۔ سامان ایسا جیسا کہ نچلے درمیانے طبقہ کے گھرانوں میں ہوتا ہے۔ ایک دیرینہ صوفہ۔ دو ایک کرسیاں انگیٹھی کے دونوں کونوں پر گلدان۔ دیواروں پر اخباروں سے نکالی ہوئی اور فریموں میں لگائی ہوئی چند تصویریں وغیرہ وغیرہ

(صوفیا، جان اور مسز ڈینیل داخل ہوتے ہیں)

صوفیا:۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) اس کرسی پر بیٹھ جاؤ جیمز!

جان:۔ (بیٹھے ہوئے) صوفیا۔ ار۔ . . . . ار۔ . . یاد ہے تمہیں جب میں بمبئی گیا تھا اور تم اور مدر مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے گئی تھیں۔ اُس دن میرے پر سر رکھ کر کتنی روئی تھیں تم۔

صوفیا:۔ ہاں، ہاں جیمز۔ وہ سین تو اب بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔

جان:۔ اور جب گاڑی چھوٹی تو تم دونوں آنکھوں سے اوجھل ہونے تک اپنے رومال ہلاتی رہیں۔

صوفیا: سب کل کی طرح یاد ہے جیمز۔

مسز ڈینیل:۔ صوفیا تم جیمز کو چائے پلاؤ۔ میں ابھی تھوڑا سا کام کرکے آتی ہوں۔

صوفیا:۔ تم فکر نہ کرو مدر۔ میں بھائی کی اچھی طرح آؤ بھگت کرونگی۔

(مسز ڈینیل جاتی ہے)

جان:۔ (گھبراہٹ میں) مدر کہاں گئی ہیں۔

صوفیا:۔ ساتھ ہی پڑوس کے ایک مکان میں گئی ہیں۔ ڈیلوری کا کیس ہے ابھی آجائیں گی۔

جان:۔ مگر مدر کی عمر کچھ زیادہ ہو چکی ہے۔ اور باہر سردی بھی بلا کی پڑ رہی ہے۔ ماں کو اکیلا باہر نہ جانا چاہیئے۔ میرا خیال ہے میں بھی اُن کے ساتھ جاؤں۔ (کرسی سے اُٹھتا ہے)

صوفیا:۔ (طنزاً) اب بہادری کافور ہوگئی؟ بُزدل!

جان:۔ بُزدل۔ صوفیا!

صوفیا:۔ بند کردو یہ ناٹک۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم نہ جیمز ہو نہ پاگل بلکہ مائیکل کے ایک سرپھرے دوست ہو۔ ہر روز تو میرے پیچھے سائے کی طرح لگے رہتے ہو اور اب یوں بنتے ہو گویا میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ بڑے چالاک بن کر آئے تھے۔ اب کھیل بگڑتا دیکھا تو لگے بھاگنے۔

جان:۔ مس صوفیا۔ آ۔ آ۔ آ۔ آپ کہیں تو ٹھہر جاتا ہوں۔

صوفیا:۔ مجھے کیا پڑی ہے۔ تم تو ڈر کے مارے بید مجنوں کی طرح کانپ رہے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ نو دو گیارہ ہو جاؤ۔

جان:۔ م۔ م۔ مس صوفیا۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ (دھم سے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ مگر ٹانگیں بدستور کانپنے میں مصروف رہتی ہیں۔)

صوفیا:۔ مدر کانسٹیبل لیکر آتی ہونگی۔

جان:۔ (مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) تو کیا ہوگا؟

صوفیا:۔ ہوگا کیا بس یہی جیل کی سیر تمہیں اپنی گستاخی کی سزا ملنی ہی چاہیئے۔

جان:۔ مس صوفیا۔ میں ج۔ ج۔ جیل سے نہیں ڈرتا۔ قصور میرا نہیں میرے دل کا ہے۔ میرے پُرسوز۔ رومان سے لبریز شاعرانہ دل کا۔ جو تمہاری محبت کا شکار ہو چکا ہے۔ تمہاری ہی محبت نے مجھے یہ چال چلنے پر مجبور کیا۔ تم چاہو تو مجھے قانون کی گرفت میں جھونک دو مگر میری استدعا ہے کہ مجھے اپنے دل کی جیل میں قید کر ڈالو۔

صوفیا:۔ شٹ اپ۔ تم بڑے زبان دراز ہو۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ۔

جان:۔ تو کیا مجھے اپنی گستاخی کی سزا نہیں ملے گی؟

صوفیا:۔ بہتر ہے کہ مدر کے آنے سے پہلے چلے جاؤ۔ ورنہ پولیس کے ڈنڈوں سے محبت کا نشہ ہرن ہو جائیگا۔ (کانسٹیبل کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے) ارے مدر تو واپس آگئیں۔ لو بڑے صوفے کے پیچھے چھپ جاؤ۔ میں مدر سے کہہ دونگی۔ تم بھاگ گئے ہو۔

(جان اُچک کر صوفے کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے۔ مسز ڈینیل کانسٹیبل کے ساتھ اندر داخل ہوتی ہے)

کانسٹیبل:۔ (اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) کہاں ہے وہ پاگل؟

مسز ڈینیل:۔ صوفیا وہ پاگل کدھر گیا؟

کی زبان میں بات کرو۔

جان:۔ کیا کہوں صوفیا میرے سینے میں جذبات اُبلے پڑتے ہیں۔ ایک سوال پوچھوں۔ صوفیا؟

صوفیا:۔ کیوں نہیں۔

جان:۔ میرا آج یہاں آنا تمہیں ناگوار تو نہیں گزرا؟

صوفیا:۔ نہیں تو!

جان:۔ (ہونٹ کانوں تک پھیل جاتے ہیں) تو خوشگوار گزرا ہے؟

صوفیا:۔ کیوں نہیں

جان:۔ خداوند یسوع۔ تمہارا لاکھ لاکھ شکر ہے مجھ سا خوش قسمت کون ہوگا۔ (صوفیا کی طرف بازو پھیلا کر لپکتا ہے)

صوفیا:۔ ارے دور دور رہ کر بات کرو۔ یہ اُوپر کیوں چڑھتے آتے ہو۔ (کرسی پر دھکیلتے ہوئے) ذرا اطمینان سے بیٹھو۔ لو میں تمہارے لئے چائے تیار کرواتی ہوں۔ میری۔ ارے میری۔ کہاں مر گئی تو؟

میری:۔ آئی جی آئی۔ (اندر آتی ہے) کیا حکم ..... (چونک کر) ارے رابرٹ۔ رابرٹ میرے پیارے شوہر!!! (جان کو اپنے بازوؤں کی لپیٹ میں لیتی ہے) مائی ڈارلنگ۔ بولتے کیوں نہیں ہو۔ کہاں رہے، اتنے دنوں؟

جان:۔ (جیسے کوئی منہ پر لحاف لیکر بول رہا ہو) اُو۔ آپ کو غلطی ہوئی ہے (بمشکل میری کی آہنی گرفت سے آزاد ہوتا ہے)

میری:۔ (چیخ کر) غلطی! کیا میری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں؟ کیا میں اپنے پیارے شوہر اپنے دو بچوں کے فادر (Father) کو پہچاننے میں غلطی کرسکتی ہوں؟ مائی ڈارلنگ (دوڑ کر جان کو گلے ملنے کے بہانے دبوچ لیتی ہے) اب مذاق ختم کرو۔ بہت ستایا مجھے۔ کیا کہوں تمہارے پیچھے میرے دن کیسے کٹے . . .

جان:۔ (جیسے منوں بوجھ کے نیچے دبا ہو) اُف۔ اُف۔ معاف کرو مجھے۔ مجھے مارے گا کیوں گھونٹتی ہو۔ میرا نام رابرٹ نہیں۔ میں تو بندہ جان ہوں۔

صوفیا:۔ (ہنسی کو روکتے ہوئے۔ ٹھکانہ لیجے میں) میری چھوڑ دو اسے بیچارے کو۔

میری:۔ (چھوڑتے ہوئے) مس صوفیا یہ میرے شوہر ہیں۔ دو سال ہوئے مجھے اور بچوں کو چھوڑ کہیں روپوش ہو گئے آپ تو میری داستان مصیبت سے واقف ہی ہیں (پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے)

صوفیا:۔ مت رو میری مت رو۔ یہ تمہاری محبت کے قابل نظر نہیں آتا

جان:۔ (اپنے کوٹ کی تہ ٹھیک کرتے ہوئے) مس صوفیا۔ تو مجھے اب اجازت دیجئے۔

میری:۔ (چلا کر) اجازت!!! اب پھر بھاگتے ہو رابرٹ اب تو تمہیں کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں گی۔

(جان بھاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر میری آ لیتی ہے)

جان:۔ ارے۔ چھوڑو۔ چھوڑ دو مجھے۔

صوفیا:۔ (بے اختیار ہنستے ہوئے) میری تمہارا خاوند بہت طوطا چشم معلوم ہوتا ہے۔ اچھی طرح قابو کرو اسے۔ نہیں تو پھر روپوش ہو جائے گا

میری:۔ (جان کو بھینچتے ہوئے) اب نہ جانے دوں گی مس صاحبہ۔

جان:۔ (صوفیا سے لجاجت آمیز لہجہ میں) اُف۔ اُف۔ مس صوفیا۔ خدا کے لئے مجھے اس عذاب سے چھٹکارا دلاؤ۔ عمر بھر تمہارا احسان مانوں گا۔

صوفیا:۔ ہی۔ ہی۔ ہی..... (اچھا میری تم جاؤ..... ہی۔ ہی۔ ہی ..... اور اپنے بیش قیمت خاوند کو میرے پاس چھوڑ دو۔ اطمینان رکھو۔ میں انہیں بھاگنے نہیں دونگی۔ بلکہ سمجھا بجھا کر ٹھیک راہ پر لانے کی کوشش کروں گی۔

میری:۔ شکریہ مس صاحبہ (جان سے) ڈارلنگ اب کہیں نہ جانا۔ (جان کو چھوڑ دیتی ہے اور جاتی ہے)

جان:۔ اُف۔ توبہ۔ یہ عورت کہاں تھی۔ ناک میں دم کر دیا کمبخت نے۔

صوفیا:۔ فرط محبت میں بیچاری کو تمہاری جسمانی تکلیف کا خیال نہ رہا۔ دو سال بعد بچھڑے ہوئے شوہر کو ملی تھی نا!

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گڑگڑا کر کہا ——— اس سنسار میں میرا کوئی نہیں ہے۔ اگر میرے سر پاس دھن ہوتا تو مجھے دم توڑتے دیکھ کر رشتے دار کتوں کی طرح للچائی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے۔ اور ہر طرح کی خدمت کے لئے آمادہ نظر آتے۔ لیکن آج کسی کا پتہ نہیں۔ بھگوان ہی جانے کہ اس مٹی کی کیا گتی ہوگی۔ اور پھر بھیّا جیتے جی کون درد شا باقی ہے۔ جو مرنے کی بھی فکر کروں۔ بھائی اس لڑکی کا باپ میں نہیں ہوں۔ یہ لڑکی تمہاری ہے مجھے پورا بھروسہ ہے کہ تم مجھ سے کہیں زیادہ اس کا خیال رکھو گے۔ اسی لئے ...... آہ ...... بڑا درد ہے ...... ان انت مرتے وقت بولا بھی نہیں جاتا ...... بھیا تم بولتے کیوں نہیں ......؟"

ملاوی چل بسا۔ گھمنڈی کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ کشوری کو گھر لانا پڑا۔

× × × × × × ×

"ادھر کھڑی ہو کر کیا دیکھتی ہے پاگل لڑکی ؟ چاول پک گیا ؟ ہائے رام میں کہتی تھی کہ یہ مصیبت مول نہ لینا۔ لیکن نہ جانے کیوں انہیں میری باتوں سے ضد سی ہو گئی ہے۔"

"اماں جی چاول تو پک گئے ہیں۔ اب اگر روٹی پکا لیجیے تو اندر چلیں۔"

"پکا کیوں نہیں لیتی ؟ کیا ہاتھ کٹ جائیں گے ؟ اب میں بات بات پر تجھ سے کہا کروں کہ یہ کر۔ وہ کر۔ ارے کچھ سلیقہ سیکھو۔"

کشوری کو روٹی پکا لینے میں کوئی عذر نہ تھا۔ صرف حکم ملنے کی دیر تھی۔ راج رانی سے وہ بہت ڈرتی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ جب کبھی وہ کوئی کام اپنی مرضی سے کرتی تو رانی اسے ٹوک دیتی۔ اور یہ الزام لگاتی کہ مجھ سے پوچھا کیوں نہیں۔؟ سارا کام چوپٹ ہو گیا ہے اور اگر پوچھنے کا انتظار کرتی تو کام نہ کرنے۔ بھول جانے۔ نیز بات بنانے کا الزام لگتا۔ کیلاش ساڑھے نو بجے تک اسکول چلا جاتا تھا۔ اس لئے کھانا نو بجے تک تیار رہنا ہوتا تھا۔ گھر میں کل چار نفر تھے لیکن راج رانی کچھ اس طرح سارا گھر سر پر اٹھا لیتی۔ جیسے بارات آئی ہو۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ چیخ و پکار کرتی۔ اگر کشوری کی آنکھوں میں آنسو آجائیں تو اور بھی برس پڑتی۔ رانی اب کشوری کو چھوڑ بھی نہ سکتی تھی۔ اسے حکومت کرنے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ بھلا بغیر تنخواہ کے ایسی خادمہ کہاں ملتی ؟ اور اگر ملتی بھی تو اس پر اتنی آسانی سے حکومت نہیں کی جا سکتی تھی۔ آدمی روپے اور روٹی دونوں کا غلام ہے۔ روپے کا احسان فراموش کیا جا سکتا ہے۔ روٹی کا نہیں۔ نمک خوار طعنہ زنی کے خوف سے کانپ جاتا ہے۔ روپے پانے والا ملازم مالک کی باتوں کا جواب دے سکتا تھا لیکن دونوں وقت روٹی کے چند روکھے سوکھے ٹکڑے پانے والی کشوری بھلا کیسے لب کشائی کی جرأت کرتی ؟

کیلاش میں آہستہ آہستہ جوانی کا وہ خمار کروٹیں لے رہا تھا جو جوان آدمی کو یہ سمجھنے پر مجبور کرتا ہے کہ دنیا کی ہر حسین شے کا اس سے بہتر حقدار دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ کشوری کی طرف سے بے پروا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے بند تھیں۔ اسے فرصت ہی نہ تھی۔ کہ وہ کشوری کی طرف متوجہ ہوتا۔ دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔ جو ہر روز کے رونما ہونے والے واقعات کے باعث وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی جب کبھی ماں کشوری پر خفا ہوتی تو وہ سمجھتا کشوری سے ضرور غلطی ہوئی ہوگی۔ اس وقت "اپنی ماں" اور "پرائی بیٹی" کا خیال سخت دل ماں کی اس بے رحمی کو بھلا دیتا تھا۔ جب وہ ایک پیسے کے لئے سارے دن گڑگڑاتا رہتا تھا۔ اور وہ ایک دھول اور جھڑکیوں کے سوا کچھ نہ پاتا تھا۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گھمنڈی لال مستقبل قریب میں کشوری کو کیلاش کی دلہن بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

ان کے نزدیک ایسا کرنے سے جہاں دوستی کا حق ادا ہوتا تھا وہیں کیلاش کو حسین بیوی بھی ملتی تھی۔ اور بیاہ شادی کے اخراجات سے بھی بچتے تھے۔ یہی خوش آئند خیالات انہیں بیوی کی سخت سست باتیں سننے پر مجبور کرتے تھے۔ اگر وہ تھوڑی سی ہمت سے کام لیکر راج رانی سے اپنے ارادے کا اظہار کر دیتے تو بات

صاف ہو جاتی۔ اور اس طرح یا تو کشوری بہو کی طرح ناز و نعم سے رکھی جاتی۔ یا گھر میں سے کان پکڑ کر نکال دی جاتی۔ لیکن گھمنڈی لال کے نزدیک ایسا کرنا جرم کرنے سے پہلے خود کو مجرم بنانا تھا۔ وہ چاہتے تھے جب تک بات ملی رہنے دو۔ وقت آنے پر دیکھا جائیگا۔ راج رانی پہلے ہمیشہ بیٹھی تو رہے گی نہیں۔

اسی فکر میں صبح و شام ہوتی رہی ——

سردیوں کے دن تھے۔ غضب کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ گھمنڈی لال سویرے ہی جاگ جاتے۔ چار ہی بجے سے کھانسنا شروع کر دیتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ بیٹا کیلاش میں جاگ گیا ہوں۔ میری گڑگڑی تازہ کر دے۔ لیکن آج حسب معمول کوؤں کی کاؤں کاؤں کے ساتھ لحاف کے اندر سے اٹکی کمزور آواز بالکل نہ سنائی دی۔ کیلاش اپنے وقت سے جاگ گیا تھا لیکن اسے کیا پڑی تھی کہ دادا کو جگا کر درد سر مول لیتا۔ جب خوب اجالا ہو گیا اور گھر کے سب لوگ اٹھ کر اپنا اپنا کام کرنے لگے تو اس نے گڑگڑی تازہ کر کے دادا کی چارپائی کے پاس رکھ دی۔

چلم جل گئی۔ لیکن گھمنڈی نے منہ نہ کھولا۔ راج رانی ادھر سے جا رہی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر لحاف الٹی تو دیکھا وہ منہ پھاڑے آنکھیں بند کئے پڑے ہیں۔ راج رانی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔

× × × × × × × ×

راجیشور گھمنڈی لال کا چھوٹا بھائی تھا۔ شہر کی کسی مل میں کلرک تھا باپ ہی کے زمانے سے دونوں بھائی الگ رہتے تھے۔ بے چارا باپ ایک وقت گھمنڈی کے ہاں کھاتا اور دوسرے وقت راجیشور کے ہاں۔ اگرچہ وہ دل سے یہی چاہتا تھا کہ اس کی خدمت کا بار بسنتی بہو اپنے سر لے لیکن بسنتی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ یہ کہتی کہ اب بابا اسی کے ہاں رہیں گے اور نہ بابا ہی میں اتنی ہمت تھی کہ راج رانی کی روکھی سوکھی روٹیوں کو ٹھکرا کر اس کے یہاں آ جمتے۔ بوڑھا سوچتا تھا۔ کیوں کسی سے بیر بڑھائیں۔

بسنتی کا لڑکا منوہر بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ بچپن میں بہت ہی شریر تھا۔ اور پڑھنے کے نام سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ لیکن اب تو دن رات کتاب کا کیڑا بنا رہتا۔

ایک روز راج رانی کہیں باہر گئی تھی۔ کشوری کو حکم ملا تھا کہ وہ جلدی سے کھانا پکا کر بچیا کو کھلا دے۔ جب گھر میں تلاش کرنے پر دیاسلائی نہ ملی تو دوڑی ہوئی بسنتی کے گھر گئی۔ بسنتی نے اسے بہت کم دیکھا تھا اور ان دنوں وہ پہلے سے بہت دبلی بھی ہو گئی تھی۔ اس نے دیاسلائی دیتے ہوئے پوچھا ——

"تو کون ہے بیٹی —— ؟"

کشوری کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہہ کر اپنے بارے میں بتلائے۔ اتنے میں منوہر بول اٹھا ——

"اماں! نہیں تم نہیں جانتیں؟ چچا کے یہاں تو یہ بہت دنوں سے رہتی ہیں۔"

"چل مجھ سے ہنسی کرتا ہے؟ کیا میں نے اسے دیکھا نہیں ہے؟ گوری گوری سی سندر چھوکری اور پھر وہ تو اب بیاہنے کے لائق ہو گئی ہو گی۔"

منوہر کو ماں کی باتوں پر ہنسی آ گئی۔

بسنتی نے اس وقت کشوری کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں اس سے کبھی کبھی اپنے گھر آنے کے لئے ضرور کہا۔ کشوری دیاسلائی لینے آئی تھی۔ لیکر چلی گئی۔

× × × × × × × ×

شام کو جب راجیشور گھر آیا تو بسنتی نے کشوری کا تذکرہ کیا۔ اور کہا لڑکی اچھی ہے اور منوہر کے لئے بہت موزوں ہے۔ راجیشور کو کوئی عذر نہ تھا۔ لیکن سوال تو راج رانی کی رضامندی کا تھا۔ بسنتی نے کہا کشوری کو کبھی کبھی اپنے ہاں بلایا کریں۔ اگر راج رانی اس کے آنے میں مزاحم نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ کام بننے کی توقع ہے ورنہ تو اپنا اختیار ہی کیا ہے۔

"چلو چلتی ہو رمیش کے ہاں؟" راجیشور نے کہا۔

"ہاں بیٹی کو ضرور دو لیکن منوہر نہیں ہے۔ کبھی کسے دوں؟"

"تو میں جاتا ہوں تم کل چلنا۔"

راجیشور وہیں رہا تاکہ منوہر آ گیا۔ اس نے اندر گھستے ہی کہا۔

"اماں جی! تو آج اس پر بہت بگڑ رہی تھیں۔"

"کس پہ ———؟" راجیشور نے پوچھا۔

"اسی لڑکی پر جو ان کے ہاں رہتی ہے۔"

اتنے میں سسکتی ہوئی کشوری بھی آ گئی۔

"آ گئیں بیٹی؟ آؤ ادھر چلی آؤ۔" بسنتی نے اس طرح کہا جیسے اسے کچھ معلوم ہی ہو۔ کشوری اندر آ کر بیٹھ گئی۔ راجیشور باہر چلے گئے۔ بسنتی نے پوچھا ——— "کیا ہوا بیٹی ———؟"

کشوری منہ سے کچھ نہ بولی۔ لیکن بھیگی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ جو کچھ ہوا خود سمجھ لو۔ آخر بسنتی نے ضد کیا تو اسے کہنا ہی پڑا ———

"ماں نے آج مجھے اس لئے مارا کہ میں دیا سلائی لینے تمہارے ہاں کیوں آئی۔ میں نے کہا۔ گھر میں آگ تھی نہ دیا سلائی۔ تم پیسے ہی دے گئیں تھیں سو چولہا مانگ کر کام نہ چلاتی تو کیا کرتی؟ اس پر انہوں نے کہا ——— تم نے پہلے ہی پیسے کیوں نہ مانگ لئے؟ میں نے کہا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ دیا سلائی بند کر کے چلی جائیں گی تو پیسے مانگنے کی کیا ضرورت تھی جو دیا سلائی ہی نہ مانگ لیتی۔ بس اتنی سی بات پر جل کر خاک ہو گئیں اور مجھے پکڑ کر مارنے لگیں۔ کسی نے باہر سے زنجیر کھٹکھٹائی۔ تو میری جان بچی۔ نہیں تو میں نے سمجھا تھا کہ جان ہی لیکر چھوڑیں گی۔"

اب سے دو برس پہلے اگر کوئی کشوری کو تھپڑوں کی بجائے جوتوں سے مارتا تو اسے جسمانی تکلیف کے سوا اتنی روحانی اذیت نہ ہوتی۔ وہ وقت کھیلنے کھانے اور کام کا تھا۔ لیکن یہ سن تو روٹھنے اور منانے کا تھا۔ اس سن میں جب دنیا مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تھپڑوں کی مار سے آنسو گرانا ہو وقت کی بات ہے ہنستی ہوئی دنیا کو دیکھ کر رونا بھی پڑتا ہے۔"

"تم نے غلطی کی بیٹی! مجھے خیال ہی نہیں رہتا نہیں تو میں سمجھا دیتی۔ منوہر کے باپ اور کیلاش کے والد دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ لیکن راج رانی کی بدولت ہم لوگ کوئی تیرہ برس سے علیحدہ ہیں۔ وہ ہم لوگوں کو دیکھتی ہے تو جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ تم یہاں ہو تو گالیوں کی جھڑی لگا دے۔"

"انہوں نے مجھے یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"اس نے تمہیں روکا نہیں ———؟"

"انہوں نے کہا کہ نانی کے یہاں جاتی ہے۔ میں تو جب جاؤں جب گھوم پھر کر میرے ہاں نہ آئے۔"

منوہر کی ماں نے ایک منٹ تک آنکھیں بند کر کے سوچا۔ پھر کہا ——— "اچھا اب وہاں پھر کبھی نہ جانا۔ اب میرے ہی یہاں رہو۔"

ایک دبی ہوئی آہ کے ساتھ احسان مندی کے دو گرم آنسو کشوری کے رخساروں پر ڈھلک گئے۔

× × × × × × × ×

کشوری اتنے دنوں تک پتھر کے نیچے دبی ہوئی گھاس تھی ——— اب آزاد فضا کی آب و ہوا نے اسے نکھار دیا۔ اسے راج رانی کا گھر چھوڑے ہوئے سوا مہینہ ہو گیا تھا۔ اس درمیان میں بسنتی پر کئی حملے ہو چکے تھے۔ راج رانی یہاں وہاں کہتی کہ کشوری اس کے سارے گہنے اٹھا کر بسنتی کو دے آئی ہے۔ کبھی پڑوسیوں سے روپے چوری جانے کا ذکر کرتی۔ غرض نت نئے الزام تراشتی۔

ایک روز راج رانی نے جھینگر کی بہو سے کہا ——— "موتی میرے سو روپے اٹھا لے گئی۔"

رمیا نے کہا ——— "چل جھوٹی کہیں کی۔ ابھی تو میں نے رودیا کے گونے میں تجھ سے دس روپے مانگے تھے تو تو نے بیس حیلے بہانے کئے تھے۔ بھلا اس ادھاگن کے جاتے ہی تیرے پاس روپے تو ہو گئے۔"

راج رانی کو بات بات پر منہ کی کھانی پڑتی تھی۔ لیکن وہ آسانی سے ماننے والی عورت نہ تھی۔ آگ کی پیاس پانی سے نہیں بجھتی۔ آگ کی پیاس تو اسی وقت بجھتی ہے جب اس کی لپیٹ میں آنے والی ساری چیزیں جل کر خاک ہو جائیں۔ ابھی راج رانی کے پاس کئی ذرائع

تھے۔ اور اس کا سب سے بڑا حربہ تو اسکی کبھی نہ تھکنے والی زبان تھی۔

× × × × × × ×

مسافر شرق آہستہ آہستہ افق مغرب کی سمت گامزن تھا ایام سرما کی کانپتی ہوئی دھوپ سارے دن کی ہنگامہ خیزیوں کے بعد کائنات کو سکون کا پیغام سنا رہی تھی۔ دن بھر چارے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے والے طائر اپنے بچوں کی خبر لینے کے لئے آشیانوں کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔ سرسوں اور السی کے نیلے پیلے پھول مٹر کی سرخ و سپید اور قرمزی کلیاں بسنت کی آمد آمد کی خبر دے رہی تھیں۔ کہیں کہیں کنوؤں سے کھیتوں کو پانی دیا جا رہا تھا۔ اپنا کام دوسرے دن پر چھوڑنے والے کسان بے زبان بیلوں کو مار رہے تھے۔ شام کی اس خاموش فضا میں ان کے پیٹنے کی آواز دور تک صاف سنائی دیتی تھی۔ چھوٹے بچے الاؤ کے لئے لکڑیاں اکٹھی کر رہے تھے۔ غرض ہر طرف ایک سہانا سماں اور دلکش منظر تھا۔

آم کے ایک گھنے درخت کے نیچے راج رانی اور راجیشور کے جھگڑے کا تصفیہ کرنے کے لئے پنچایت بیٹھی تھی۔ معاملے کا اصل موضوع یہ تھا کہ کشوری کا حقیقی حقدار کون ہے ــــ؟ اپنے اپنے مال اور ملکیت کے حصول کے لئے لوگ پنچائت جمع کرتے ہیں۔ لیکن ایک پرائے دھن پر قابض ہونے کے لئے یہ انوکھی پنچائت بٹھائی گئی تھی۔

پنڈت چھوٹے رام سرپنچ تھے۔ ان کے بڑے بوڑھوں نے کبھی زمانے میں سنسکرت پڑھی ہوگی۔ آپکو ہزاروں سال کی اس قدیم زبان سے دلی نفرت تھی۔ پنڈت جی تھوڑی سی انگریزی جانتے تھے۔ ان کو سرپنچ بناتے وقت لوگ ان کی معاملہ فہمی اور دوررسی کے مقابلے میں ان کے دھنی ہونے کا زیادہ لحاظ رکھتے تھے اور بکمال منت اتنا اصرار کرتے تھے کہ پنڈت جی کو چار و ناچار اقرار کرنا ہی پڑتا تھا۔

پنڈت جی نے کھنکھار کرتے ہوئے پوچھا ــــ "کہیئے بات کیا ہے؟ اب تو اس گاؤں میں روز پنچایت ہی ہوتی رہتی ہے۔ کسے اتنی فرصت ہے جو کام کاج چھوڑ کر اسی کا ہو رہے؟"

راجیشور نے کہا ــــ اس کا جواب بھابی دیں گی۔"

راج رانی کے نزدیک حاکم کے سامنے پہلے اپنی بات کہنی آدھی جیت کے برابر تھی۔ اس نے یہ موقع ہاتھ سے دینا عقلمندی کے خلاف سمجھا۔ اس نے کہا ــــ مہاراج! میرے گھر والے نہیں تو آپ جانتے ہی ہونگے۔ آپکے پاس گھٹنوں بیٹھے سرتی بنایا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ پنڈت جی پورے دیوتا ہیں۔ ہاں تو وہ اپنے دوست کی ایک لڑکی پرورش کی غرض سے لائے تھے۔ اب ان لوگوں نے اسے بہکا کر اپنے ہاں رکھ لیا ہے۔ اور مانگنے پر واپس نہیں کرتے۔ مہاراج آپ سے میری یہی پرارتھنا ہے کہ وہ مجھے واپس دلا دی جائے۔ اگر یہ لوگ اسے رکھنا چاہتے ہیں تو اتنے دنوں کا خرچ مجھے دلا دیا جائے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔"

"لڑکی کا کیا سن ہوگا؟"

"یہی کوئی چودہ پندرہ برس"

پندرہ برس کی لڑکی تو بہکائی نہیں جا سکتی۔ اچھا میں اس سے پوچھ لوں۔ اگر وہ تمہارے ہاں جانے کو راضی ہوگی تو تمہیں دلا دی جائیگی۔

"مہاراج اسے ایسی پٹی پڑھائی گئی ہے کہ وہ ہمارے گھر آنے کے لئے اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتی۔ پنچ یا تو اسے میرے یہاں جانے کے لئے مجبور کرے یا خرچ دلائے۔"

مقدمہ چھوٹے مہاراج کی قانونی سمجھ سے باہر ہو گیا۔ اس طرح خرچ دلانے کی کوئی نظیر انہیں نہیں ملتی تھی۔ انہوں نے جھگڑو کی طرف سر کھجاتے ہوئے دیکھا۔

جھگڑو نے تمباکو کی پیک تھوکتے ہوئے کہا ــــ مہاراج لڑکی چاہے دلا دی جائے۔ روپیہ کے نام پر انہیں کچھی کوڑی نہ ملنی چاہیئے۔ ان کے گھر لڑکی کو تکلیف تھی۔ اس وجہ سے بھاگ گئی۔ اپنے بچی اسے پرورش کی غرض سے لائے تھے۔ اگر یہ اس کا پیٹ نہیں بھر سکتیں تو یہ پانچ روپیہ ماہوار راجیشور کو دیا کریں۔ پنچ کا یہی فیصلہ ہے۔ ورنہ یہ لڑکی سے باز آئیں سیدھی بات تو یہ ہے۔"

سب نے جھگڑے کے فیصلہ پر صاد کیا۔ چھوٹے مہاراج نے کہا
— "ایسا بےلاگ فیصلہ تو عدالت بھی نہیں کر سکتی۔ دودھ کا دودھ
پانی کا پانی چلو چلیں بھنگ چھاننے کو دیر ہو رہی ہے۔"
سب لوگ ایک ایک اٹھے۔ اور ادھر اُدھر چھٹک گئے۔ راج رانی
آم کے پیڑ کے نیچے گڑی جا رہی تھی۔

× × × × × × × ×

مئی کا مہینہ تھا اسکول اور کالج بند ہو گئے تھے۔ کیلاش حساب
میں فیل ہو گیا تھا۔ جولائی میں اس کا دوبارہ امتحان ہونے والا تھا۔ ابھی
آنکھوں میں اعداد کی شکلیں گھوم رہی تھیں۔ پشمین نے اس کا نام
لیکر پکارا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا — موہنی بالا کا خط آیا ہے۔"
وہ ایک سرخ لفافہ لئے منہ لٹکائے اندر آیا اور اعداد و شمار کے
ساگر میں پھر ڈوب گیا۔
"کیا ہے —؟" راج رانی نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ . . ."
"نہیں کچھ تو ضرور ہے۔"

"منوہر کی شادی کشوری سے ہو رہی ہے۔"
"کون میری کشوری —؟" بیا ایک اس کے منہ سے نکلا کشوری
کالا منی سا جسم گوری گوری باہیں۔ اور بڑی بڑی آنکھیں۔ اس کی
آنکھوں میں پھر گئیں — وہ تو میری بہو بھی ہو سکتی تھی۔ مگر ہائے رام!
میں نے اسے "پرائی بیٹی" سمجھ کر بھلا دیا "اپنی بہو" کیوں نہ سمجھا...؟
بیاہ میں ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوتا۔ لڑکی کے ماں باپ کی آتما کتنی
خوش ہوتی۔ کیلاش کے بابا مجھے معاف کرنا۔ مجھ سے گھور اپرادھ ہوا۔
کیلاش کے پرلوک باسی باپ کے آخری وقت کی تصویر راج رانی
کی آنکھوں میں پھر گئی۔ وہی کھلا ہوا منہ۔ بند آنکھیں جیسے اس سے
کہہ رہی ہوں — "ہاں تم نے غلطی کی —!"
راج رانی کے رخساروں پر گرم آنسوؤں کی لڑھکتی ہوئی بوندوں نے اس کی تائید کی۔
دور سے بارات کے باجے کی سامعہ نواز آواز کانوں میں آئی۔
کیلاش حساب کی کتابیں بند کر رہا تھا
موہنی بالا کا خط نہ ملنے سے وہ افسردہ خاطر تھا۔ اس کا دل کام میں
نہیں لگ رہا تھا۔

ہندوستان کے ہر دلعزیز اور نامور شاعر حضرت مولانا ماہر القادری کا پہلا مجموعہ کلام

محسوساتِ ماہر

شائع ہوگیا

محسوساتِ ماہر کے نغمے غریبوں کی جھونپڑیوں اور امیروں کے محلوں میں گائے جا رہے ہیں جذبات کے شعلے حسن و جمال
کے پھول محبت کے نغمے اور گرمی میں ڈھلی ہوئی زبان تڑپتی ہوئی روحوں کے لئے سامان تسکین سوتے ہوؤں کیلئے تیر و نشتر۔
کاغذ پر نغمہ و فریاد اور حسن و محبت کی تصویریں دیکھنا ہوں تو فوراً آرڈر دیجئے اور نہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔
ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ ولایتی کاغذ سنہری جلد رنگین گرد پوش قیمت صرف دو روپیہ۔ علاوہ محصول ڈاک۔
ملنے کا پتہ۔ محمد اقبال سلیم گاہندری مہتمم عبدالحق اکیڈیمی شاہراہ عثمانی حیدرآباد (دکن)

سلام اختر ایم اے

ایک منظر

وہ صبح کی خنکی میں پرندوں کے طرارے
بکھرے ہوئے ہر سمت نظارے ہی نظارے

قطرات کا پانی کے تموّج سے اُچھلنا
جیسے کہ بڑی دُور چمکتے ہوں ستارے

شاخوں پہ لچکتی تھی ٹپکتی ہوئی شبنم
منہ جیسے چھپاتا ہے کوئی شرم کے مارے

بیتاب سی بے خواب سی پھرتی تھیں ہوائیں
یہ برہ کی آہیں تھیں یا آہوں کے شرارے

تھی قلب کی دھڑکن میں بھی نغمات کی جنبش
یا نور کی موجوں میں اُبلتے تھے فوارے

ناگاہ سوئے گھاٹ نظر اُٹھی تو دیکھا
ہیں جمع زن و مرد وہاں سارے کے سارے

بچے بھی ہیں اس بزم میں بوڑھے بھی جواں بھی
اور وہ بھی جو آجاتے ہیں لاٹھی کے سہارے

کچھ ایسے بھی رستے میں جنہیں مل گئے کچھ لوگ
اور کھینچ کے لے آئے انہیں ندی کے کنارے

کچھ وہ بھی جنہیں سونے نہیں دیتی جوانی
جو رات کو لیٹے ہی تکا کرتے ہیں تارے

یہ منظرِ دلچسپ کچھ اس طرح حسیں تھا
میں آگے بڑھا اور تپِ شوق کے مارے

دیکھا کہ بلایانِ فلک ناز و سمن پوش
بیٹھی ہیں ٹکے ہوں جیسے افلاک پہ تارے

گھونگھٹ کو اٹھائے کوئی ساڑھی کو سنبھالے
پلو کو جھکائے کوئی پاؤں پسارے

چھیڑیں کبھی تاکیں کبھی چونکیں کبھی جھانکیں
جیسے کہ کرے چاند ستاروں کو اشارے

شاکر علی

بڑوں کی موت

پہلے تو لوگ روز مرتے ہیں لیکن ——
بڑوں کی موت !؟
ایک شور اٹھا: فخرِ قوم و فخرِ ملت الحاج مولانا —— کا انتقال ہوگیا! مولانا کیا، مر سے ایک قیامت آگئی، محشر بپا ہوگیا!!
یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ اِدھر اُدھر شہروں کو تار اور ٹیلیفون کھڑکھڑائے جانے لگے۔
لوگ باور نہیں کرتے تھے، کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ بھلا مولانا مرنے کی چیز تھے!!
کئی کئی بار تصدیق کرنے پر بھی ہر ایک یہی پوچھتا تھا۔
"کیا واقعی مولانا کا انتقال ہوگیا!؟"
"مولانا سچ مچ مر گئے کیا؟"
"ارے میاں کیا یہ سچ ہے؟"
پھر دیر بعد آخر سب کو یقین آگیا کہ مولانا واقعی سدھار گئے۔ اب اپنے پرائے، مخالف موافق سب مولانا کی موت پر افسوس کر رہے تھے۔ انکی اچھائیاں اور قربانیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر گنوا رہے تھے!
ہندوستان واقعی بڑا مردہ پرست ملک ہے، مولانا مرحوم سچ فرماتے تھے
اخبارات اس خبر کو لے اڑے، ضمیمے پر ضمیمے شائع ہو رہے تھے۔ انکی زندگی کے معمولی سے معمولی کام کو نئے رنگ اور نئے انداز سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اخبارات خوب بک رہے تھے۔
شام کے اڈوں اور چوراہوں پر اخبار فروش دوڑے دوڑے پھر رہے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر صدائیں لگا رہے تھے۔
قومی انجمنیں اور ان کے زیر تحت مدرسے بھی بند کر دیئے گئے۔

بچوں کو مولانا کی موت کا صدمہ ہوا یا نہ ہوا لیکن چھٹی ملنے پر ضرور خوش تھے۔ اور مولانا کے احسانمند بھی!——
اساتذہ اور دوسرے کارکن بھی مطمئن تھے کہ آج کی چھٹی میں اُن کے چند ضروری کام طے پا جائیں گے۔
مثلاً ایک صاحب کو تو حجامت ہی بنوانا تھا!——
اگر مولانا اسمبلی کے ممبر تھے اور ضرور تھے —— کیونکہ ہر بڑا آدمی ہوتا ہے تو وہاں پر بھی التوا کی تحریک پیش ہوئی۔ ہر پارٹی کے ممبر نے اپنی تقاریر سے مولانا کے انتقال پر ملال پر اظہارِ افسوس کیا۔ یاد رہے کہ ان میں وہ ممبران بھی شامل تھے۔ جن سے مولانا کی برابر نوک جھونک ہوتی تھی۔ آج وہ بھی ان کا لوہا مان گئے۔ انہیں بھی ان کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔
اسمبلی کے باہر ان کے تمام ہمعصر لیڈران نے بھی اپنے اپنے دلی تاثرات کا اظہار کیا۔
'مرحوم کی موت سے وطن کو بہت بڑا نقصان پہنچا'
'مولانا آزادیٔ وطن کے ایک بہادر سپاہی تھے'
'مرحوم کی خدمات قابلِ قدر اور قابلِ عمل بھی'
مرحوم کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا۔ امیر غریب، بچے، خوشحال، جوان، بوڑھے، سیکڑوں کی تعداد میں تھے —— اور کیوں نہ ہوتے کوئی دھنے جلاہے کا تو جنازہ تھا نہیں، مولانا کا تھا مولانا کا!!——
ویسے مرنے کو تو لوگ یوں روز ہی مرتے ہیں۔
کئی فاقوں سے نڈھال ہو کر، تو کوئی بد ہضمی کا شکار بنکر۔
لیکن بڑوں کی موت!؟ —— سبحان اللہ ——

نقد و نظر

ادارہ

دستور الاصلاح

اس صنفِ ادب میں اس سے پیشتر مصنف مرزا ایران نے دو جلدیں میں مشاطۂ سخن اور جناب شوق سندیلوی نے اصلاحِ سخن کی صورت میں اپنی کاوشوں کے نقوش چھوڑے ہیں اور دونوں کتابیں ادبا و شعرا کے لئے چراغِ راہ ہیں۔ لیکن مولینا سیماب نے دستور الاصلاح کو اس رنگ میں پیش کیا ہے۔ کہ بیک مطالعہ یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ کتاب استادوں کیلئے زیادہ مفید ہے یا شاگردوں کیلئے۔ میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ مولینا نے جس نظریہ سے کتاب لکھی ہے۔ کامیاب ہے۔ وہ شاگردوں کے لئے ہو یا استاد کے لئے

صفحہ نمبر ۲۳ پر شعرائے متقدمین کا طریقہ اصلاح۔ میں متقدمین کی اصلاحیں اور خلعتیں و انعامات کا ذکر کرکے فرماتے ہیں۔ کہ سطورِ بالا کی تحریر سے میرا مطلب یہ ہے کہ دورِ ماضی میں اساتذہ اور مشاہیر شعرا کو ان کے اولو العزم اور ادیب پرور شاگرد فکرِ معاش سے بے نیاز رکھتے تھے اور انعام و عطایا سے ہمیشہ نوازتے رہتے تھے،، ممکن ہے۔ کہ اس تحریر کو کوئی ناتمام استاد یا خود غرض شاگرد، یا بے فکرا اور محدود طبقہ کا ادیب جس طلب سمجھے مگر میں تو یہ کہونگا۔ کہ اگر ایسا ہے تو کوئی بری بات نہیں جب دنیا میں کمتر سے کمتر انسان کے وقت اور محنت کی قیمت ہوتی ہے۔ تو کیا شاعر اور ادیب ہی کا وقت ایسا ہے۔ کہ جس کی کوئی بھی قیمت نہ ہو۔ اور جبکہ شاعر اور ادیب کو ملکی اخلاق و تمدن میں ریڑھ کی ہڈی مانا جاتا ہے۔ مولینا سیماب جیسے کثیر التلامذہ استاد اور خادمِ ادب تھے اگر ان کے شاگردوں کا یہ پیام ہجوم انہیں فکرِ معاش سے بے نیاز نہیں کر سکتا یا نہیں کر سکا۔ تو استاد کی بد نصیبی اور شاگردوں کی بے حسی قابلِ افسوس نہیں تو اور کیا ہے اردو شاعری کی آرائش و حیات اور ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اس بزرگ نے جس قدر روحانی کرب اور مالی نقصانات خاموش جگرداری سے برداشت کئے ہیں۔ کوئی ادیب شہیر یا استاد محترم تعمیر اردو میں اس طرح منہمک نظر نہیں آتا۔ اور اس ہجوم کار کے باوصف تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی بدستور جاری ہے۔ اگرچہ یہ بھی اسی ذوقِ ادب اور روحانی کرب کا اظہار ہے۔ اس صورت میں اور ایسا انسان اگر اپنے شاگردوں سے اپنے حقوق چاہتا ہے۔ تو آخر کیا قیامت آگئی

تمہید میں مولینا نے شعرا کی تین قسمیں بتائی ہیں (۱) متکلمین ماضی (۲) محدثین عہد (۳) پیغمبران مستقبل اور فرمایا ہے۔ کہ اول و دوم قسم کے محتاجِ اصلاح ہوتے ہیں۔ لیکن پیغمبران مستقبل کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ خود مصلح ہیں اور دونوں طبقوں کو اصلاح کا فیض ان سے پہنچتا ہے۔ اس تحریر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ شعرا ادبا کے طبقہ سے ہوتے ہیں یا کوئی اور باطنی قوت ہے کیونکہ مولینا نے یہ ایسی گول بات لکھی ہے کہ ان اوصاف کی کوئی ہستی ذہن میں نہیں آتی۔

خیر ایسی ایسی باتیں سے کتاب کا مفہوم فوت نہیں ہوتا۔ یہ تو ان ہی لوگوں کا کام ہے۔ جو تنقید کے لئے قلم کے بجائے خنجر لیکر بیٹھتے ہیں۔ اور دوسروں کی تخریب کے درپے ہو کر اپنی تعمیر کو مسدود کر لیتے ہیں۔ ہمیں تو دیکھنا یہ ہے۔ کہ کتاب ادب و ادیب کے لئے کسی پہلو سے مفید بھی ہے۔ یا نہیں اور اس نظریہ سے دستور الاصلاح نظرانداز نہیں ہو سکتی۔ یہ مشاطۂ سخن اور اصلاحِ سخن سے زمانہ کے مطابق ترقی یافتہ کارنامہ ہے۔ اور موجودہ دور کی گمراہ کن فضا کے لئے ایک مفید اور قابلِ دید کتاب ہے۔

سرگزشتِ ادارہ ادبیات اُردو۔ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد مدیر سب رس و مہتمم ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا خطبا خشند کتاب میں ادارہ ادبیات اردو کی سوانح حیات دی گئی ہے ایسے ادارہ کی تشکیل کا خیال پہلے پہل جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور صاحب کے دل میں پیدا ہوا اور انہوں نے کس شدت کے ساتھ حیدرآباد کے مصنفین و مولفین کے لئے ایک مرکز کی ضرورت محسوس کی۔ اور پہلے سے عمل جامہ پہنایا کس طرح ریاستی سرپرستی اور جناب زور اور دوسرے حضرات کی انتھک

کوششوں سے ادارہ پروان چڑھا۔ یہ سب کچھ اس کتاب میں وضاحت بیان کیا گیا ہے۔

تسبیح خیال۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۱۱۹ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ مطبوعہ معین دکن پریس چھتہ بازار قیمت ۸ آنے

یہ جناب شہید یار جنگ صاحب شہید کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ جس میں نہ تو گل و بلبل کے افسانے ہیں، اور نہ شراب خانوں کے اشتہار بلکہ رباعیات ہیں تصنع سے پاک تحسین سے بے نیاز جن میں جگہ جگہ شرافت اور اخلاق کا درس ہے۔

تجلی ۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ ۱۰۴ صفحات کی کتاب اچھی طباعت اور کتابت سے تیار کی گئی ہے۔ یہ کتاب جناب محمد حسین اختر لودیانوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس کے شروع میں بہت سے اصحاب کی رائیں ضمانت ہیں۔ اس کے حسن و خوبی کی جس میں جناب اختر رضوانی صاحب قابل ذکر ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے شاعر علامہ اقبال کا معتقد معلوم ہوتا ہے۔ ویسے ہر شاعر کے کلام کا لطف اس مجموعے میں موجود ہے۔ اور یہ دلیل ہے شاعر کے گہرے مطالعہ اور تاثر کی۔

"**پھر یری**" مصنفہ عظیم بیگ چغتائی پبلشرز کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳ ۔ مجلد طباعت خاصی، حجم پونے تین سو صفحے قیمت دو روپے

چغتائی صاحب کے چودہ افسانوں کا مجموعہ، جن میں بیشتر مزاحیہ ہیں تاہم کچھ اور عبرتناک افسانے بھی شامل ہیں۔ "باغی" پلونہ کی تاریخی جنگ کی داستان ہے، جسے پڑھتے ہوئے مجھے یہی خیال رہا کہ کہیں یہ سنجیدہ کہانی مزاحیہ نہ بن جائے۔ کیونکہ چغتائی صاحب دیکھئے کس وقت اچھی خاصی سنجیدگی کو مسکراہٹوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ "برضا و رغبت" اور "ماسٹر کی معیت" دو مزاحیہ ڈرامے ہیں، جو اور کہانیوں جتنے اچھے تو نہیں۔ لیکن پھر بھی کافی کامیاب ہیں، چغتائی کی قلم سے جو کچھ بھی نکل جائے غنیمت ہے۔

"شکار"، "اونٹ گاڑی" "پیرو" "انجیری دل" اور "وفادار احمد" نہایت دلچسپ افسانے ہیں۔ جن میں چغتائی کا مخصوص طرز تحریر نمایاں ہے، پُر لطف شگفتہ فقرے اور نو ایجاد محاورے، مثلاً ——— مسٹر اور مسز گنبد علی اور مسٹر پاندان —!

"ہماری تانگہ نکا۔ جس میں حکیم صاحب اور ج ستے"

... قوجیوں کا باپ جو گاندھی جی والی ترکیبوں سے واسطہ پڑا ——"

"لالہ جیوا مل کے یہاں پہلوٹی کی لڑکی ہوئی۔ تو والدہ بولیں، "رانڈ مر جائے تو اچھا" —— اور اس کے بعد اس کو باضابطہ ماندہ کا لقب عطا کر دیا گیا"

"بسا اوقات بیل صاحبان راستے میں نان کو آپریشن کر دیتے ہیں جناب قبلہ اونٹ صاحب البتہ کام دیتے ہیں"

"طرفین کی جانب سے اپنے اپنے پٹنے کے واقعات پر ہنسی مذاق ہی میں کافی روشنی ڈال کر جنرل تبصرہ اور ریویو فرمایا گیا" وغیرہ وغیرہ"

دیس کی لیلا:۔ مصنف میاں عبدالمجید بھٹی پبلشر ہونہار بکڈپو لاہور ضخامت ۴۰ صفحات قیمت ۴ آنے

قارئین ادب لطیف کے لئے بھٹی صاحب کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ وہ ادب لطیف کے صفحات پر کئی بار جلوہ گر ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ دیس کی لیلا آپ کے قومی گیتوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں کا ایک آدھ گیت پڑھ کر ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ شاعر کا دل خلوص سے لبریز ہے وہ اس عہد کے بعض نوجوان شاعروں کا نقال نہیں۔ بلکہ جو کچھ کہتا ہے اُسے پوری طرح محسوس بھی کرتا ہے۔ زبان کی سادگی اور جذبات کے بے ساختہ پن نے موضوع سخن کو اس خوبی سے نبایا ہے۔ کہ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ گیتوں کے مضامین کی ترتیب اس خوبی کی حامل ہے۔ کہ حب وطن کے تمام مدارج تدریجی طور پر سامنے آگئے ہیں۔ شاعر اپنے دیس کو الفت اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ غلامی کے خلاف پوری شدت سے صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ اور حصول آزادی کے لئے اتحاد واتفاق کی دعوت دے کر، "بے خوف بڑھے جاؤ" کا نعرہ لگاتے منزل کی طرف بڑھتا نظر آتا ہے —— یہ گیت پڑھ کر ایک بار تو وہ مردہ دل بھی تڑپ اُٹھیگا۔ جو بدیشی راج پر مو سہت ہو رہے ہیں۔ ہر وطن دوست اور صاحب دل کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے۔

ادارہ

فلم کا تصور اب مجنوں کی صحرا نوردی اور فرہاد کی کوہکنی نہیں رہا
ملک و ملت اور دین و دنیا کے اہم مسائل کے حل فلم میں پیش کئے جاتے ہیں
شانتارام کے سال بھر کی دماغی کاوش کا ثمر

نفرت اور خود غرضی پر محبت

محبت اور قربانی کا حامی

پڑوسی

اپنے شہر میں نمائش کے منتظر رہیے

سنت تکھو

بہت تیزی سے فلمایا جا رہا ہے
ہنساداکر اس کا مرکز ہے۔

عمر خیام

کی مہورت بہت جلد ہونے والی ہے۔ اس فلم میں شانتارام ہدایات کا
فتح لال آرٹ کا اور ڈاکٹر عابد حسن مکالمے کا کمال دکھائیں گے۔

نمائش کار:- فیمس پکچرز لمیٹڈ بمبئی دہلی مدراس

امرت دھارا برتنے والے اصحاب

بہت سستی امرت دھارا جلدی خرید لیں!

کیوں؟

لڑائی جب سے شروع ہوئی ہے سب چیزیں دن بدن مہنگی ہو رہی ہیں۔ ہم نے پچھلی لڑائی میں بھی قیمتیں بہت بڑھ جانے پر کچھ نفع نہ ہوتے ہوئے بھی امرت دھارا کی قیمت وہی برقرار رکھی تھی۔ اس بار بھی ہمارا ارادہ یہی ہے (مالک پورا کرے) کہ ہم امرت دھارا کی قیمت کو نہ بڑھاویں۔ ہماری ادویات کی قیمتیں اس وقت چار گنا ہو گئی ہیں تو بھی ہم نے امرت دھارا کی قیمت میں اضافہ نہیں کیا ہے۔ مگر لڑائی لمبی ہو رہی ہے۔ حالات جلدی جلدی بدل رہے ہیں قیمتیں اوپر جا رہی ہیں اس واسطے کہا نہیں جا سکتا کہ کیا نتیجہ ہو۔ اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی قیمتیں بڑھانے کے واسطے مجبور ہو جاویں۔ اس وقت ہمارے مہربان شکایت نہ کریں کہ ہم کو پہلے خبر نہیں دی۔ اس واسطے بذریعہ اس نوٹس کے کہا جاتا ہے کہ احتیاطاً جتنی بھی زیادہ سے زیادہ امرت دھارا آپ خرید کر رکھ سکتے ہیں رکھ لیجئے۔ یہ کبھی خراب ہونے والی چیز نہیں۔ کام بھی ہمیشہ اس نے دینا ہے۔ واجب جان کر عرض کر دیا ہے۔ امرت دھارا ہر شہر میں مل جاتی ہے۔ دگرنہ سیدھی ہم سے منگوا لیں۔ نقلوں سے محتاط رہیں۔ ہمیشہ امرت دھارا کا نام اور پنڈت جی کی تصویر پیکٹ پر دیکھ لیں!

میسرز جیسا اینڈ سنز بھاگلپور ہمارے سول ایجنٹ ہیں دوکان دار ایجنسی کے واسطے

ان سے بھی خط و کتابت یا بات چیت کر سکتے ہیں۔ کمیشن برابر ایک ہی ہوگا!

قیمت بڑی شیشی دو روپیہ آٹھ آنہ -/۸/۲ نصف شیشی ایک روپیہ چار آنہ -/۴/۱ نمونہ کی شیشی آٹھ آنے -/۸/-

خط و کتابت و تار کے لئے پتہ: امرت دھارا ۳۴ لاہور — **المشتہر** مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہو جائینگے

سائنس کی حیرت انگیز ایجاد جو سیاہ اور بدنما جلد کو سفید اور دلکش بنا دیتی ہے

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہو جائینگے۔ یہ فلوروزون کی ہو بہو مشہور عالم فرم کا دعویٰ ہے کہ جو گزشتہ کئی برسوں سے اس معاملہ کی ریسرچ کر رہی تھی۔ اس ایجاد سے ہر ایک شخص گورا ہو سکتا ہے۔ یہ گھر دفتر، ازدواجی زندگی اور سوسائٹی میں عزت اور مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ رات کو سوتے وقت فلوروزون کے چند قطرے ہتھیلی پر ڈال کر چہرے پر دو چار منٹ مالش کیجئے۔ صبح چہرے کو نیم گرم پانی سے دھو ڈالئے متواتر چار ہفتہ ایسا کیجئے۔ اور اس کے بعد آئینہ میں اپنی شکل دیکھئے۔ آپ حیران ہو جائیں گے۔ وہ چہرہ جو سیاہ، گندمی رنگ کا تھا۔ یا کیل، مہاسے اور چھائیاں وغیرہ جھریوں سے بدنما ہو رہا تھا۔ چاندنی کی طرح۔ سفید سیب کی طرح سرخ اور بہار کی طرح حسین اور دلکش ہو گیا ہے۔ کیل، مہاسے چھائیوں وغیرہ کا نام نشان باقی نہیں رہا۔ اور بدنما مرجھائے ہوئے چہرے پر پھر سے جوانی اور بہار آ گئی ہے۔ فلوروزون سائنس کی حیرت انگیز ایجاد ہے۔ اسکے ہر قطرے میں اوزون رتیزا آکسیجن گیس سائنٹیفک طریقوں سے شامل کی گئی ہے۔ جو جلد کی سیاہی کو اپنے آپ میں جذب کر لیتی ہے۔ اور جب آپ سوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت آپکے چہرے کی سیاہی، کیل، مہاسے، چھائیاں وغیرہ آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہیں اور چند ہفتوں میں بدنما چہرہ حسین اور دلکش ہو جاتا ہے۔ ہر ایک مرد عورت اس سہل سائنٹیفک ایجاد سے دائمی خوبصورتی اور جاذبیت حاصل کر سکتا ہے۔ فلوروزون کے استعمال کے بعد عارضی خوبصورتی حاصل کرنے کے لئے کریم پوڈر وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فلوروزون چہرے کے علاوہ جسم کے ہر ایک حصہ پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ قطعی بے ضرر ہے۔ فلوروزون مکمل کورس تین روپے آٹھ آنے میں ملتا ہے۔ ڈاک خرچ الگ۔

ہندوستان کے ہزاروں مرد و عورتیں "فلوروزون" سے فائدہ اٹھا چکے ہیں

تیار کنندگان:۔ فلوری کیمیکل انڈسٹریز

ہندوستان کے نمائندگان

فلوروزون ڈپو۔ پوسٹ بکس نمبر A-L-۱۲۰۰ بمبئی

اُردو کے جواں سال اور جواں فکر شاعر

ن۔ م۔ راشد

گذشتہ دس سال کے عرصہ میں اردو دنیا نے راشد کے مجموعۂ کلام سے بڑھکر کسی کتاب کا انتظار نہیں کیا۔ اس مجموعے میں راشد کی مقفیٰ نظمیں اور سانیٹ ہی شامل نہیں بلکہ وہ جدید آزاد نظمیں بھی ہیں جنہوں نے راشد کو موجد اور پیشرو کی حیثیت سے ایک لازوال شہرت بخش دی ہے

ماوراء

کو بجا طور پر اُردو میں ایک جدید شعری تحریک کا پیغامبر کہا جا سکتا ہے۔ اگر راشد کی نظم "دریچے کے قریب" اور "رقص" آپ کی نظر سے گذری ہے تو آپ کبھی اس مجموعے کو حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس مجموعے میں راشد کی قریباً چالیس بہترین نظمیں ہیں "ماوراء" کا تعارف کرشن چندر ایم۔ اے نے لکھا ہے۔ اور دیباچے میں خود حضرت راشد نے جدید آزاد شاعری کی تکنیک سے مفصل بحث کی ہے۔ کتاب کا سرورق ہندوستان کے سب سے بڑے مصور عبدالرحمٰن چغتائی کے موقلم کا نتیجہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

خاص ایڈیشن۔ نہایت اعلیٰ کاغذ، بہترین جلد، قیمت پانچ روپیہ۔

مکتبۂ اُردو لاہور

[illegible]

پیدائش ———— حوادث ———— موت

آپ اِن حوادث کی داستان منٹو کی زبانی سُنئے وہ زندگی کا ایک بڑا عکاس ہے۔ کائنات کے منہ سے نکلی ہوئی ایک چیخ اُس کے تخیل کی تمام وسعتیں نئی دُنیا کو اپنی گود میں لیتے ہیں۔ اور اُس کا ذرہ ذرہ اُس کی روشن خیالی سے تاباں ہے۔

منٹو نہ اصلاح پسند ہے نہ پراپیگنڈسٹ

اُس کی مخلوق ایسی نہیں جو اپنے خالق کے تخیل کی گہرائیوں میں کھو جائے۔ وہ اپنی فطرت کی تمام تر تاریکی اور روشنی سمیت ظاہر ہوتی ہے۔

منٹو کے افسانے

اُردو ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہیں

اُسکے کردار ہماری اور آپکی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ فن کاری تشبیہات کی جدت اور پرواز تخیل اُس کے افسانوں کی جان ہے

چند شریک کتاب افسانوں کے نام

ہتک، شغل، شرابی، شوشو، شہ نشین، پرنیا قانون، ٹوکا پیشہ، مسنر ڈی کاسٹا، نیا قانون، نعرہ، پچا باموسم کی شرارت، لالٹین، تماشا، دس روپے، منتر بگو وغیرہ

[illegible]

نقش فریادی!

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا"

پروفیسر فیض کے فکر و فہم نے اردو شاعری میں نئی راہ پیدا کی قدامت اور اس کی تمام روایات کو اس انداز میں ترک کیا گیا کہ پرانے اور نئے اسالیب کے امتزاج سے ایک فکر نو پیدا ہوا۔ پروفیسر فیض اردو شاعری کے جدید اسکول کے بہت بڑے مناد و شارح ہیں۔ وہ الفاظ کے بے جان پیکر میں ایک بے جان روح پیدا کر دیتے ہیں۔ فیض کی نگاہ تیز دلِ وجود کو چیر جاتی ہے۔ فیض کا ہر شعر قاری کے سامنے ایک ایسا راز فاش کرتا ہے۔ جسے فن کار صدیوں سے چھپائے ہوئے تھے۔ وہ غمناک ماحول کی عکاسی تو کرتے ہیں لیکن اُس کے ساتھ ہی پکار اُٹھتے ہیں۔ ع اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔

سوز اور خلوص — تغزل اور سیاسی تفکر — رُومانیت اور حقیقت پسندی

قیمت ——— مجلد ——— ایک روپیہ

آؤ

ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ سعادت حسن منٹو ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اس کے ریڈیائی ڈرامے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ریڈیو اسٹیشنوں سے کئی کئی بار براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں۔ قیمت عہ

آؤ

منٹو کے نو ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے

پاپی

اوپندر ناتھ اشک

حزنیہ ——— طنزیہ ——— مزاحیہ

اور طربیہ ناٹکوں کا خوبصورت مجموعہ جن میں زندگی کی تڑپ ہیجان اور رنگینی بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو سکولوں کالجوں اور ڈرامیٹک کلبوں میں بڑی آسانی سے کھیلے جا سکتے ہیں۔ اشک کے ڈرامے ہندوستانی معاشرت کے آئینہ دار ہیں۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ قیمت عہ

مکتبۂ اُردُو لاہور

دوسرا ایڈیشن

کمپنی کی حکومت

حال کے افسانے ماضی کی داستانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ابن آدم کی داستان تہذیب ایک ارتقائی عمل ہے تاریخ عالم کے اہم سے اہم حادثہ کو بھی دوسرے کارفرما عناصر سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی تاریخ بھی اسی عمل ارتقائی کا ایک نقش ہے۔ ہماری موجودہ سیاست میں ان حوادث کے نتائج کی جھلک صاف طور پر دکھائی دے رہی ہے جو ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئے۔ کمپنی کی حکومت کا عہد ہندوستان کی تاریخ کے ایک پرآشوب دور کی دردناک اور حیران کر دینے والی داستان ہے۔ اس دور کے اہم ترین حوادث کو اس زمانہ کے یورپی حوادث کے ساتھ ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے اس پرآشوب دور کے متعلق صرف کمپنی کی حکومت ہی ایک واحد کتاب ہے جس میں اس عہد کی خونچکاں داستان کو فلسفی مؤرخ باری نئے انداز میں پیش کرتا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں سو صفحوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ضخامت ۴۰۲ صفحات۔ قیمت دو روپے عہ

ٹوٹے ہوئے تارے

کرشن چندر کے افسانوں کا نیا مجموعہ۔ کرشن چندر اردو زبان کا رومان پسند افسانہ نگار ہے۔ ٹوٹے ہوئے تارے میں آپ کے شاہکار افسانے شامل ہیں (زیر طبع)

گرہن

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں زندگی کی تصویر ہوتی ہے اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "دانہ و دام" کے نام شائع ہو چکا ہے دوسرا مجموعہ "گرہن" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ (زیر طبع)

سیرت امام ابن تیمیہ

اسلام کے مجاہد اعظم امام المحدثین آخر المجتہدین شیخ الاسلام تقی الدین ابو العباس احمد بن ابن تیمیہ کی داستان حیات جسے سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد ڈاکٹر غلام جیلانی برق ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر گورنمنٹ کالج کیمبلپور نے مرتب کیا ہے۔ کتابت و طباعت بے حد خوبصورت

بگولے

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا مجموعہ

احمد ندیم قاسمی دیہاتی زندگی کا بہت بڑا عکاس ہے اس کے افسانے ہندوستان کی کثیر آبادی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شہر اور دیہات میں رہنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ (زیر طبع) عمر

قیمت عہ || رنگینیاں، دلآویزیاں اور دلکشیاں۔

ماتاہری

ماتاہری دنیا کی وہ عورت ہے جو قلوپطرہ ہیلن اور تائیس کے مقابلے میں جلوہ گر ہے۔ یہ ایک ایسی زندہ جاوید ساحرہ ہے جس نے اپنے سحر آمیز اشاروں سے دنیا اور عالم ادبیات میں ایک انقلاب عظیم بپا کر دیا۔ جرمن جاسوسہ ماتاہری کی

قیمت عمر

مکتبہ اردو لاہور

زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں۔

اردو ادب کا معیاری افسانوی لٹریچر

حسن کی قیمت — میرزا محمد شجاع
جب کسی قلم سے نہایت خوبصورت الفاظ، عجیب اسلوب اور دلفریب استعاروں میں اسرارِ حیات بے نقاب کیا جائے تو اس کا نام کیا ہو سکتا ہے۔ الفاظ میں بھرپور اعجاز رکھتے ہیں۔ حسن کی قیمت دوسرے افسانے [illegible]

بگولے
احمد ندیم قاسمی کے تازہ افسانوں کا مجموعہ (زیرِ طبع)

ہندوستان کے ترقی پسند ادب کی نمائندہ کتاب
نئے زاویے
ہندوستان کے بہترین لکھنے والوں کی بہترین کوشش۔ ہندوستانی ادب کے موجودہ دور کے بہترین [illegible] مصنف کی تحریریں اس کتاب میں موجود ہیں [illegible] شاعرانہ [illegible] اور سادہ [illegible] نہایت ہی [illegible]

دانہ و دام — راجندر سنگھ بیدی
ہر ایک افسانے میں زندگی سانس لیتی ہے۔ بیدی حیاتِ انسانی کی گہرائیوں کو دیکھتے ہیں، جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا مصنف ہی کی شدتِ احساس کے [illegible]

گرہن
راجندر سنگھ بیدی کے تازہ افسانوں کا دوسرا مجموعہ (زیرِ طبع)

رنگ و بو — عہ — پروفیسر فیاض محمود ایم۔ اے
موجودہ دور میں جن حضرات نے اردو افسانہ نگاری کو حدِ کمال تک پہنچانے میں انتہائی کوشش کی ہے، ان میں پروفیسر فیاض محمود کا نام پیش پیش ہے۔ صحیح ہندوستانی معاشرت کے خد و خال اگر آپ کو دیکھنے ہوں تو فیاض محمود کے افسانوں کا مطالعہ کریں۔ دلچسپی، قوتِ مشاہدہ، نفسیاتی تجزیہ، رنگین نگارش پر چار دل [illegible]

باسی پھول
علی عباس حسینی ایم۔ اے — عہ — خوبیاں ہر افسانہ میں۔ شگفتہ پھول کبھی نہ کبھی وقت مرجھا جاتے ہیں، ان کا حسن اور خوشبو جاتی رہتی ہے، مگر علی عباس حسینی کے "باسی پھول" گلشنِ ادب کے وہ گلہائے خندہ ہیں، جو کبھی بھی مرجھا نہیں سکتے۔ اردو کے تمام نقادوں نے ان افسانوں کو جدید افسانہ نگاری کا معراج قرار دیا ہے۔

شعلے
احمد علی ایم۔ اے۔ عہ — ان میں واقعیت بھی ہے اور رومانیت بھی۔ فطرتِ انسانی کے اسرار و رموز آشکار کرنے والے، ریاکاری کے خس و خاشاک جلانے والے افسانے۔ طنز بھی ہے اور شوخی بھی۔ وہ کتاب جسے ادیب، شاعر سب جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں۔ زبان کوثر میں دھلی ہوئی۔ شعلے فطرت کا آئینہ ہے۔ جسے دیکھ کر بدصورت شخصیتیں جھلاتی ہیں اور حسین و جمیل کردار پیش نظر رکھتے ہیں جسن، الفت، سرمایہ و محنت کی کشمکش۔

کونپل — اوپندر ناتھ اشک — عہ
اشک کے افسانے ہندی، اردو، پنجابی ہی نہیں، گجراتی، مرہٹی اور تامل میں ترجمہ ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اوپندر ناتھ کا اصول ہے کہ باقاعدہ ایک خاص فنی چیز لکھتے ہیں یا منشی پریم چند کی طرح کسی سماجی برائی کو مرکز بنا کر اسے گرد اپنی کہانی کا جال بنتے ہیں اور پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس برائی کا ایسا گہرا اثر ڈالتے ہیں جو مدتوں محو نہیں ہوتا۔ "کونپل" ان کی بہترین منتخبہ معاشرتی اور سماجی کہانیوں کا مجموعہ ہے جن میں ہر ایک افسانہ فنی لحاظ سے مکمل ہے۔

صحرا نورد کے خطوط
میرزا ادیب — ڈھائی روپے
میرزا ادیب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "صحرا نورد کے خطوط" جیسی دلچسپ اور رنگین کتاب آج تک اردو میں شائع نہیں ہوئی۔ صحرا نورد کے خطوط اردو میں لاثانی رومان نگار کا عرفانی شاہکار ہے۔ اس کے اثرات صحرا کی طرح بسیط ہیں۔ گل اور بلبل، ساربان، لیلیٰ کی سی [illegible] موجود ہیں۔

سرکش روحیں — مجلد ۱۲ر
غالب و مغلوب، حاکم و محکوم کے درد خیز تصادم — جبران خلیل جبران کے شاہکار افسانوں کا مجموعہ۔ خلیل جبران دنیا کے ان مصنفوں میں ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے عالمگیر شہرت جلد حاصل کر چکے ہیں۔ اس مصنف کے خطوط اور تمام تصانیف دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل چکی ہیں۔ "سرکش روحیں" فرانسیسی اس کی تمام تصانیف میں بلند سمجھی جاتی ہے۔ اردو میں پہلی بار ان کو عربی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ میں اصل کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

اور واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کے اسرار کا پہلا انکشاف جو دنیائے ادب کے مشاہیر ہند سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔
دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

- منٹو کے افسانے
- طلسمِ خیال
- ٹوٹے ہوئے تارے — زیرِ طبع
- سرکش روحیں
- محبت نفرت
- اندھی دنیا
- نظارے
- ہوائی قلعے
- سوزِ ناتمام
- مویسیاں کے افسانے
- دنیا کی حور
- حور تنکے افسانے
- پرواز لق لق
- حاجی لق لق کے افسانے
- جسارات
- حقیقت و افسانہ
- روسی افسانے
- چھپال
- پھول اور کانٹے

مکتبۂ اردو لاہور

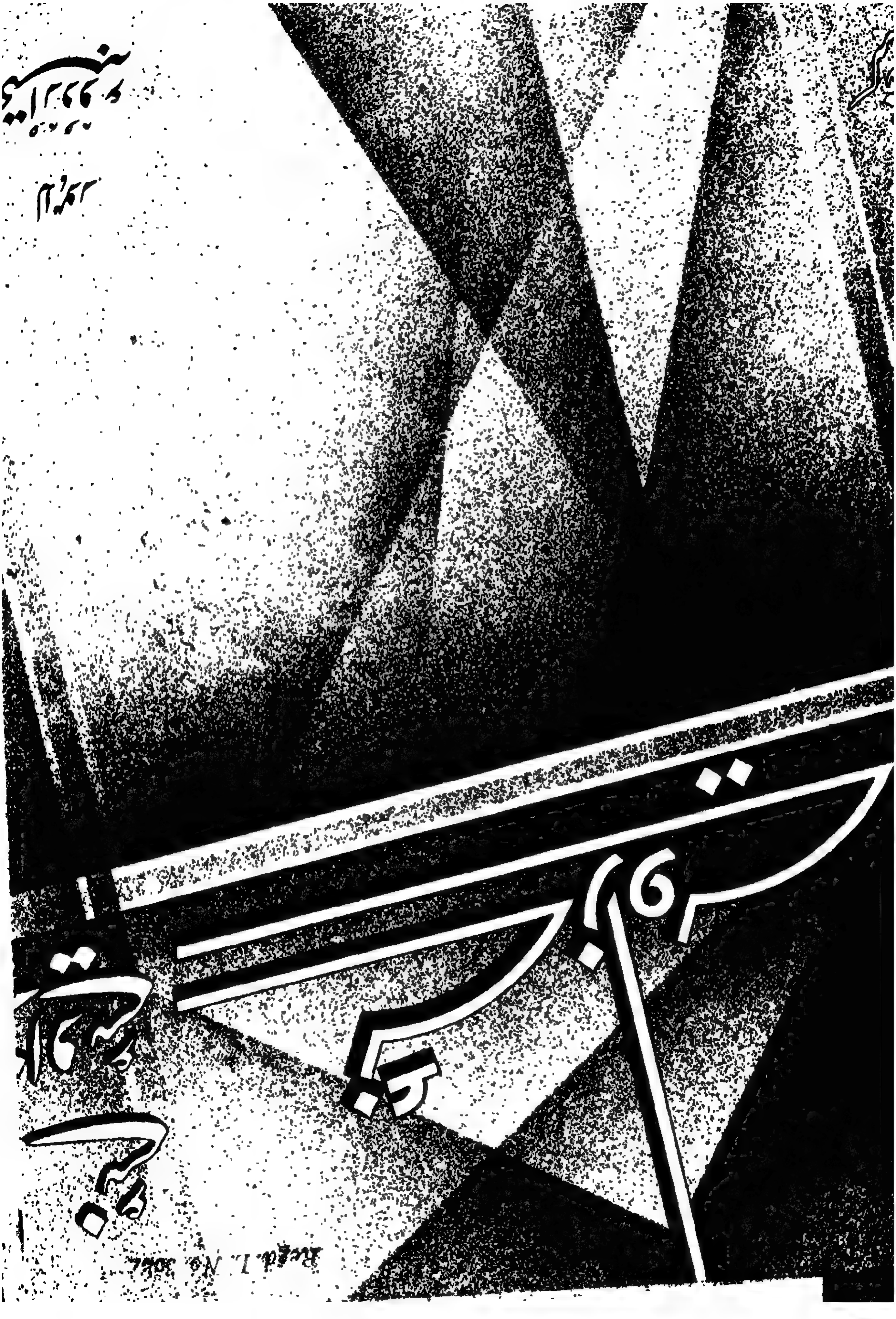

تبصرہ | مقالات | افسانے | منظومات | ڈرامے | 5 As.

۱۴—۲

جوش ملیح آبادی

ادبِ لطیف

اکتوبر ۱۹۴۱

اثر لکھنوی

اشارات	ادارہ	۱
بارگاہِ قدرت میں ٹیپ / اشتراکی رند کا مشورہ	جوش ملیح آبادی	۳
پیش لفظ	ماہم سرسٹ	۵
غزل	مرزا جعفر علی خاں اثر	۶
میری بیوی کے لیے	[illegible]	۷
تاثرات	محمد ندیم قاسمی	۱۱
سماج کی بیتا	علی امام ...	۱۲
آج کی رات	اسرار الحق مجاز	۱۵
احتساب	کنہیا لعل کپور	۱۶
پچھلا پہر	نصیر اختر	۱۸
پرائیویٹ سیکرٹری	فیض احمد فیض	۱۹
اسرار حیات	اختر ... بیانی	۲۴
جھوٹا	ملک راج آنند	۲۷
نئی دنیا میں کونجیں ... / ایک ہزار سال پہلے	محمد رشید جاوید	۳۰
اظہار ندامت	علی جواد زیدی	۳۲
بچپن	احمد ندیم قاسمی	۳۳
اندھیرا چھا رہا ہے	سلام مچھلی شہری	۴۰
دو بچے	شاکر علی	۴۰
پریم چند	خلیق ابراہیم	۴۲
غزل	راج بلدیو راج	۴۹
باقیات فانی	فانی بدایونی مرحوم	۴۹
وہ آ رہی ہیں	سجاد حیدر آفریدی	۵۱
بی بی	جگر ...	۵۳
لوبے شاہ	وہاب الدین	۵۷
نقد و نظر	ادارہ	۶۱

کنہیا لعل کپور

مکتبہ اردو لاہور

نگران
فیض احمد فیض

ایڈیٹر:-
چودھری برکت علی

چندہ سالانہ
چار روپے چار آنے

فی پرچہ
پانچ آنے

ادب لطیف لاہور

اشارات

فانی بدایونی

گذشتہ ماہ ڈاکٹر ٹیگور اور مرزا عظیم بیگ کے انتقال کی خبر آئی۔ اس ماہ یہ سنا کہ فانی بدایونی بھی رخصت ہو گئے۔ یہ سانحہ تو ملال انگیز تھا ہی لیکن ناقدرئ ابنائے وطن اس پہ اور اضافہ ہو گئی۔ سوائے دو ایک اُردو اخبارات کے ہمارے پریس نے اس اہم خبر کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ فانی مرحوم موجودہ غزل کے مستند علمبرداروں میں سے تھے۔ باوجودیکہ وہ عمر بھر اسی روایتی طرز ادا پہ قانع رہے اور کسی جدید تجرباتی شاعرانہ تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ اُن کا کلام موجودہ اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ فانی کی غزل بجائے خود ایک تجربہ ہے۔ جس میں اُنہوں نے بے مقصد مضمون آفرینی اور پراگندہ خیال آرائی کی بجائے ایک مستقل فلسفۂ زندگی اور ایک مخصوص جذباتی رجحان کی ترجمانی کرنی چاہی۔ اس رجحان میں ذاتی خلوص کے علاوہ بہت حد تک عمومیت بھی ہے۔ وہ یاس اور بیزاری، وہ زندگی سے اُکتاہٹ اور موت کی آرزو جسے فانی نے مختلف پیرایوں میں ادا کیا ہے۔ آجکل ذہین طبقہ کے اکثر بے نوا افراد مستقلاً محسوس کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک نے زندگی کے کسی نہ کسی دور میں اس خوفناک تاریکی کے خلاف جنگ کی اور کئی ایک ایسے ہیں جو اس سے باہر نہیں نکل سکے۔ فانی کی یاسیت کے خلاف سب سے عام اعتراض یہ ہے کہ اس میں نمائش کا عنصر غالب ہے۔ اس میں وہ ضبط اور وقار موجود نہیں جو کامیاب حزنیہ ادب کے لوازمات میں سے ہے۔ یہ اعتراض بہت حد تک صحیح ہے لیکن جو حضرات فانی کی زندگی کے متعلق کچھ جانتے ہیں اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گے کہ فانی مرحوم کے پاس اس گریہ و بکا کا فنی جواز ہو نہ ہو ذاتی جواز ضرور موجود تھا۔ بہر حال اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ فانی اُردو شاعری میں کئی ایک ایسے اشعار کا اضافہ کر گئے ہیں۔ جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

رسالہ کی اشاعت میں پھر تاخیر ہو گئی ہے! لیکن اچھے مضامین، اچھے کاغذ کی طرح نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اور رسالہ کے

معیار کو وقت کی پابندی پر قربان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں وقت انسان کی اپنی تخلیق ہے اور خالق کے لئے مخلوق کے آداب و قواعد کی جا و بے جا پابندی شایانِ شان نہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بے وجہ ان آداب میں خلل اندازی خلافِ مصلحت ہے۔

آجکل مسٹر چرچل کے تازہ بیان پر ہندوستانی اخبارات میں بہت لے دے ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ مسٹر چرچل نے جنگی مقاصد کی توضیح کرتے ہوئے کہا تھا کہ موجودہ جنگ کے بعد تمام ممالک کی آزادی بحال کر دی جائے گی۔ لیکن تمام ممالک میں ہندوستان او باقی برطانوی مقبوضات شامل نہیں ہیں۔ بہت سیدھی سی بات ہے۔ آخر وہ اور کیا کہتے؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جنگ میں فتحیابی کے بعد برطانیہ دیپ قلم دستے بالا رادہ دستبردار ہو جائے۔ یہ فتح کیا ہوئی خاک! اگر جنگ کے بعد برطانوی مقبوضات کو آزادی دینا ہی مقصود تھا تو سرے سے جنگ کی ضرورت ہی کیا تھی۔

سالنامہ کے متعلق ہم اپنے کرمفرماؤں کو دوبارہ یاد دہانی کرانا چاہتے ہیں۔ اگر مضامین کچھ قبل از وقت موصول ہو جائیں تو پابندی وقت کے علاوہ رسالہ کی طباعت وغیرہ میں ادارہ کو زیادہ سہولت رہے گی۔

ادارہ

زندگی کی داستان بہت مختصر ہے

پیدائش ——— حوادث ——— موت

آپ ان حوادث کی داستان منٹو کی زبانی سنئے۔ وہ زندگی کا ایک بڑا عکاس ہے، کائنات کے منہ سے نکلی ہوئی ایک چیخ اُس کے تخیل کی تمام وسعتیں نئی دنیا کو اپنی گود میں لئے ہیں اور اس کا ذرہ ذرہ اُس کی روشن خیالی سے تاباں ہے۔

منٹو نہ اصلاح پسند ہے نہ پراپیگنڈسٹ

اُس کی مخلوق ایسی نہیں جو اپنے خالق کے تخیل کی گہرائیوں میں کھو جائے، وہ اپنی فطرت کی تمام تر تاریکی اور روشنی سمیت ظاہر ہوتی ہے

منٹو کے افسانے

اُردو ادب کے ایک نئے دَور کا آغاز ہیں

اُس کے کردار ہماری اور آپ کی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ فن کاری تشبیہات کی جدت اور پروازِ تخیل اُس کے افسانوں کی جان ہے

سائز ۲۶×۱۷/۸ ضخامت ۲۷۲ صفحے۔ قیمت مجلد اڑھائی روپے (عہ/)

ناشر: مکتبہ اُردو، لاہور

جوش ملیح آبادی

بارگاہِ قدرت میں ایک اشتراکی رند کا مشورہ

اُٹھ، کہ اُٹھتی نہیں اب سینۂ ایام سے آگ
دلِ آفاق پہ برسا اُفقِ جام سے آگ

دامنِ تر کو بنا حاملِ برق و آتش
کہ نکلتی نہیں اب جامۂ احرام سے آگ

نہ رہا کوثر و تسنیم کے چھینٹوں میں اثر
اب دل و جاں میں لگا بادۂ گلفام سے آگ

آج اُسے کفر کے جھونکوں سے فروزاں کر دے
کل لگائی تھی کلیجوں میں جو اسلام سے آگ

کام کے اب نہ رہے قہر و غضب کے اخگر
اب زمانے میں لگا بخشش و انعام سے آگ

اب تو گفتار میں خود آ کہ ہے بجھنے کے قریب
تو نے بھڑکائی تھی جو نامہ و پیغام سے آگ

وقت آیا ہے کہ بے پردہ ہو اے برقِ جمال
اب دہکتی نہیں سینوں میں ترے نام سے آگ

برق رفتار جوانوں کو دکھا راہِ شرار
کہ بھڑکتی نہیں پیرانِ سبک گام سے آگ

خندۂ "خواجۂ خوش وقت" سے نکلے گا نہ کام
اب لگا اشکِ غمِ بندۂ ناکام سے آگ

حکم دے "شر" خوش آغاز کو ضو باری کا
کہ نکلتی نہیں اب "خیر" بد انجام سے آگ

"خلوتِ خاص" کے شعلے تو بہت دیکھے ہیں
آج برسا اُفقِ "جلوہ گہِ" عام سے آگ

دور ہے، وادیِ ایمن ہو کہ طورِ سینا
اب یہ موقع ہے کہ برسا دے ہر بام سے آگ

جوش کیا صبح کو ہو دیکھئے نظمِ عالم
آج روشن ہے مرے دل میں سرِ شام سے آگ

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کے افکارِ نو کا تازہ مجموعہ

آیات و نغمات

اُردو شاعری کے دورِ ارتقا کی جیتی جاگتی تصویر

جوش کا پیغام خوابیدہ روحوں کے لئے صورِ اسرافیل کا حکم رکھتا ہے۔ اُس کا نغمہ ایسی حرارت کا حامل ہے جو افسردہ دلوں کے خون کو بھی گرما سکتا ہے۔

آیات و نغمات میں شاعرِ انقلاب نے اپنے آپ کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ اُس کی رُوح کا عکس ہے۔ اُس کے نغمات میں اپنے دل کی دھڑکنیں سُنیں۔ آپ کے دل کے تار مدتوں مرتعش رہیں گے۔

اس نادر مجموعہ میں جوش کا تخیل، اور اندازِ بیان پختہ کاری اور بلندی کے آخری نقطہ پر پہونچا ہوا ہے اس میں ابواب کی کوئی تقسیم نہیں ہے اور نظموں کو ایسی ہم آہنگی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے کہ مضامین کی رنگا رنگی اور موضوعات کا تنوع حیرت انگیز دلچسپی میں غرق کر دیتا ہے۔ رومان، سیاست، حکمت، مناظر، نفسیات اور مستی و سرشاری کے ایسے بے پناہ نمونے اس مجموعہ میں پائے جاتے ہیں کہ انسانی عقل دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کتاب میں جوش کی نظم حسین اور انقلاب بھی شامل ہے۔ اور یہ وہ نظم ہے کہ میر انیس کے بعد آج تک اربابِ نظر نے کسی نظم کی اس قدر داد نہیں دی ہے۔ اور یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم میں حسین پر جوش نے جس نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی ہے۔ اس کی نظیر کسی لٹریچر میں نہیں مل سکتی۔ سائز ۱۷×۲۷ حجم ساڑھے تین صد صفحات۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے مجلد۔

لاہور

مکتبہ اُردو

سمرسٹ موہم

مترجمہ: حسن عباس

پیش لفظ

میرے افسانوں کے پچھلے مجموعے کی اشاعت پر ٹائمز نے "آمیزہ"* کے عنوان سے اس پر ریویو کیا۔ اس سے بیشک پری کی مقصود تھی لیکن میں قطعاً متاثر نہ ہوا اور اب میں نے اپنے زیرِ نظر مجموعے کا نام بھی یہی تجویز کیا ہے۔ افسانہ نگاری کے فن کا چالیس سال گہرا مطالعہ کرنے سے میرے ذہن میں یہ تصور پیدا ہو چکا ہے کہ میں اس کے متعلق بیشتر لوگوں سے بہتر جانتا ہوں۔ اس طویل مدت میں مجھے افق پر کتنے ستارے رینگتے نظر آئے جو ایک لمحہ آسمان پر تیزی سے چمک کر ایسی تاریک گہرائیوں میں ٹوٹ کر گرے کہ اب ان کے دوبارہ ظاہر ہونے کی کوئی امید نہیں۔ ہر لکھنے والے کا ایک خاص پیغام ہوتا ہے جس کا تجزیہ کرنے سے اس کی وہ شخصیت ظاہر ہوتی ہے جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔ اپنے نمو کے ابتدائی ایام میں وہ اپنی نمود کے لئے تاریکی میں ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور تقدیر اچھی ہو تو کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی شخصیت میں وسعت ہو تو وہ ایک طویل مدت تک امتیازی شان کا لٹریچر پیدا کر سکتا ہے اور بالآخر بڑھاپے میں سب کچھ دیکر اس کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ انسانی فطرت کو کرید کرید کر وہ جو کچھ نکال سکتا تھا اسے لوگوں کی نگاہوں کے سامنے پیش کر چکا۔ اس نے ایسے کردار تخلیق کئے جو درحقیقت اس کی اپنی شخصیت کے مختلف عکس ہیں۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ صرف تصور کی مدد سے کسی کردار کی تخلیق ممکن نہیں۔ کردار کو زندگی بخشنے کے لئے اس میں اپنی شخصیت کو کسی نہ کسی رنگ میں نمایاں کرنا ضروری ہے۔ شیکسپیئر کے لئے ہملٹ، بروٹس اور ریاگو کی تخلیق ناممکن تھی۔ اگر یہ کردار خود اس کی شخصیت میں پنہاں نہ ہوتے۔ لکھنے والا اپنے گرد ایک نئی پود دیکھتا ہے اور اس دنیا کی مصلحتوں کو سمجھنے کیلئے ایک خاص قسم کے میلانِ طبع کی ضرورت ہے۔ صرف سمجھنا ہی کافی نہیں بلکہ ناول نگار کو محسوس بھی کرنا ہے اور اس کا احساس صرف خارجی نہیں بلکہ یقینی طور پر داخلی ہونا چاہئیے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے مقام پر پہنچ کر وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ پڑھنے والے کو اس کی تحریر ناگوار یا غلط گزرتی ہے اسے چاہئیے کہ حالات کے پیش نظر لکھنا چھوڑ کر خاموشی اختیار کرے اس کی کسی تازہ تصنیف کو (جسے "آمیزہ" کا نام دیا جا سکے) پڑھنے والے بخوشی قبول کرلیں تو یقیناً اسے تسکین نہیں بلکہ حقیقی فرحت حاصل ہونا چاہئیے۔

افسانہ نگاری ایک اتفاقی امر ہے۔ ہر بازار کی نکڑ پر افسانے بکھرے پڑے ہیں۔ ممکن ہے افسانہ نگار اسے اٹھانے کے لئے اس لمحہ وہاں موجود نہ ہو۔ یا وہ یونہی کسی دوکان کی طرف دیکھتا ہوا گزر جائے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس پر پوری طرح غور و فکر کرنے سے پہلے ہی اسے الفاظ کا جامہ پہنا دے یا دیر تک ذہن میں محفوظ رہنے سے وہ اپنی تازگی کھو دے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنا زاویۂ نگاہ صحیح نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے ناکمل شکل میں پیش کرے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ کہ جب اس کے ذہن میں ایک افسانے کا تخیل پیدا ہو تو وہ اسے پختگی کے ساتھ مناسب وقت پر مکمل صورت میں پیش کر سکے لیکن پھر بھی کمال حاصل کرنا مشکل ہے اگر کسی پڑھنے والے کو افسانوں کے مجموعے میں ایسی باتیں نظر آئیں جن سے وہ محظوظ ہو سکے تو اسے کتاب بند کرنے یا انکے لکھنے والے سے کوئی شکایت نہ ہونا چاہئیے۔ میں ضعیف العمری اور موت کے درمیان افسانے لکھے ہیں اور اب آئندہ لکھنے کا ارادہ نہیں۔ میں اس پر مطمئن نہیں ہوں اگر ان افسانوں کے پڑھنے والا جس کے ذہن میں میرے کسی افسانے کی یاد محفوظ ہو اس بات پر متفق ہو کہ میں نے زیرِ نظر مجموعے کو "آمیزہ" کا نام دینے میں کوئی غیر معمولی جرأت سے کام نہیں لیا۔

---

* ڈبلیو سمرسٹ ماہم کی کتاب Creatures Of Mixture (آمیزہ) کا پیش لفظ۔

مرزا جعفر علیخاں اثرؔ

غزل

یاد تیری مے سرجوش ہوئی جاتی ہے
جو تمنّا ہے وہ مدہوش ہوئی جاتی ہے

اور پروانۂ جاں سوز کو کیا داد ملے
شمع اک حسن کی خاموش ہوئی جاتی ہے

کیا کیا اے دلِ بیتاب کہ صورت ان کی
اب تصوّر سے بھی روپوش ہوئی جاتی ہے

اللہ اللہ تری مست نگاہی کا سماں
پانی پانی مے سرجوش ہوئی جاتی ہے

لبِ نازک پہ تبسّم کی وہ ہلکی سی جھلک
تتلی تتلی سے ہم آغوش ہوئی جاتی ہے

مژدہ اے بیخودیٔ شوق وہ منزل آئی
ہوش سے بیخبری ہوش ہوئی جاتی ہے

موت سے چند چُراتے ہوئے لمحے ہیں کہ زیست
کیا یہ حالت دلِ غم کوش ہوتی جاتی ہے

راز دنیا کی تباہی کا ہے مضمر اس میں
مستیٔ عشق فراموش ہوئی جاتی ہے

ٹوٹی پڑتی ہے تمنّا پہ تمنّا اب اثرؔ
موج سے موج ہم آغوش ہوئی جاتی ہے

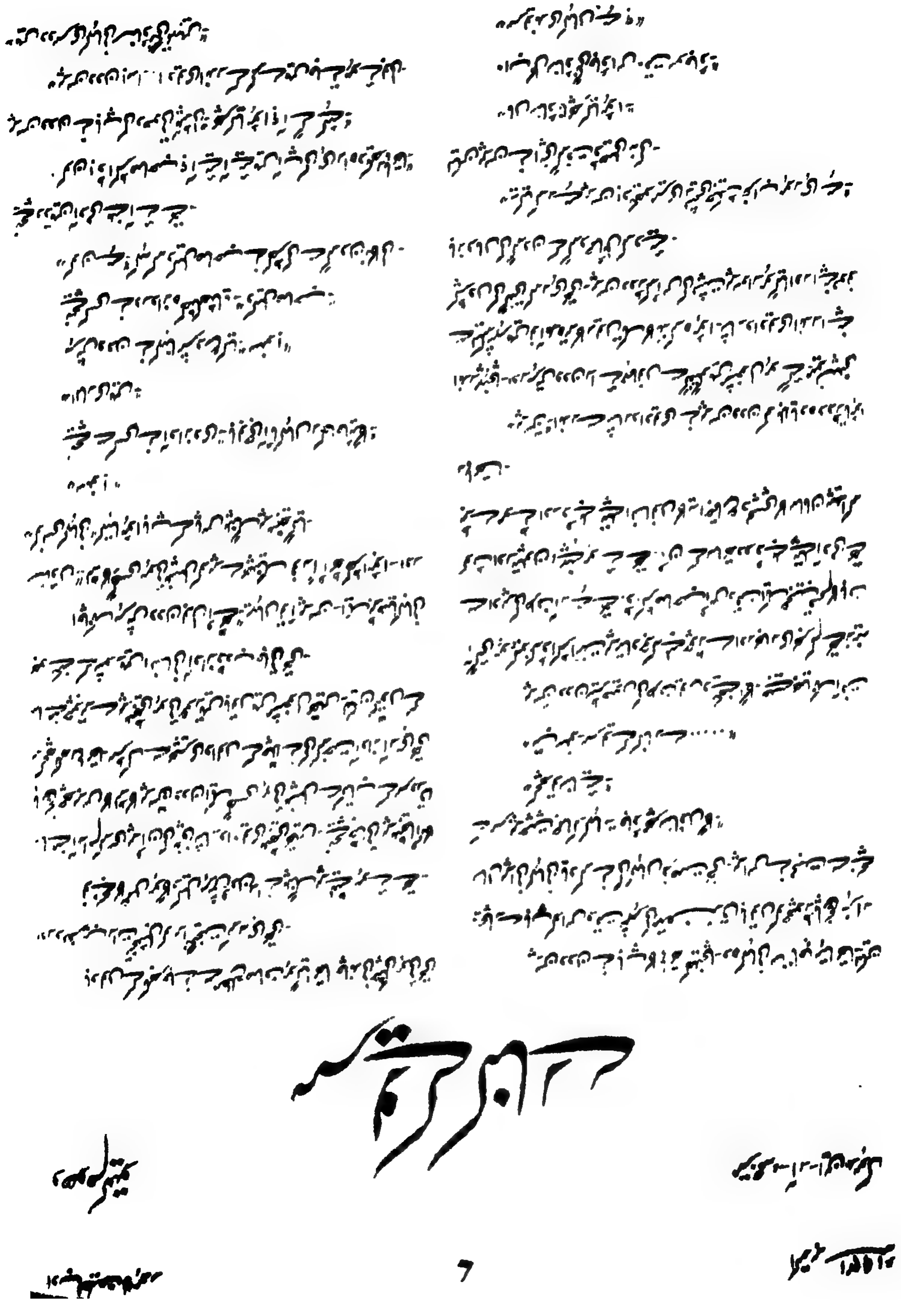

"اس وقت سو جاؤ بیٹا" شاردا دیوی نے جھنجھلا کر بولی۔

"ماں اس ندی میں مگر ہونگے؟ جہاز چلتے ہونگے؟ اور رہتا کون ہوگا وہاں ماں؟"

"تم سوتے ہو کہ تمہارے بابوجی کو بلاؤں؟"

پرسن وہاں چپ چاپ اپنے بچھونے پر جا کر لیٹ گیا پر اُس کا ننھا سا دماغ تخیل کے سمندر میں غوطے لینے لگا۔ اُس نے سوچا کہ ٹھنڈے اور لطیف پانی کی ایک ندی بہ رہی ہوگی۔ اُس پر آہنی پل ہوگا نیچے ندی میں جہاز تیر رہے ہوں گے۔ کنارے پر ایک بڑا شہر ہوگا جس میں ایک راجہ رہتا ہوگا۔ راجہ کی ایک رانی ہوگی پر اُس کے کوئی لڑکا نہ ہوگا۔ اور اور وہاں کیا نہ ہوگا؟"

"کیا ہوگا" سے ہٹ کر اُس کا ننھا دماغ "کیا نہ ہوگا" کی طرف مائل ہوگیا وہاں پاٹھ شالہ نہ ہوگی۔ ماسٹر نہ ہوں گے۔ امتحان نہیں ہوگا۔ ہوگا صرف سرو ندی میں تیرنے کا مزا۔ حقیقت میں سرو ندی کتنی دلفریب ہوگی!

اُسے باپ کے لفظ پھر یاد آتے۔ "سرو کے کنارے" اُس کے بعد ..... اُس سے یہ معلوم نہ ہوا وہ میٹھی خوابوں کی دنیا میں چسکیاں لینے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک ندی کے کنارے اکیلا گھوم رہا ہے اور وہ سرو ندی ہے۔ ندی کے کنارے جنگل ہے جس میں ایک شیر جیسا اُس نے سرکس میں دیکھا تھا، اپنی پیلی آنکھوں سے اُس کی طرف گھور رہا ہے.......

پرسن خوف سے چلا اُٹھا۔ "ارے باپ رے!" اُس کا جسم پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔

نزدیک کا دروازہ کھول کر ہرش وردن اندر داخل ہوئے سب بڑی باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ بڑی بڑی اہم باتوں کے ختم ہونے پر ہی انسان کو اپنی سب سے بڑی دولت یعنی اولاد کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ملتی ہے۔

"پرسن، وکیل صاحب نے لڑکے کی چیخ سن کر اُسے ہلایا لیکن وہ تو کروٹ بدل کر پھر سو گیا تھا۔ جب سویرے پرسن بستر سے اُٹھا تو سب سے پہلا سوال اُس نے یہ کیا۔ "بابوجی سرو کے کنارے پر......"

ہرش وردن محبت سے ہنس کر بولے: "پگلے تو ہر وقت سرو کے کنارے والی بات ہی یاد کیا کرتا ہے؟"

چائے کا پیالہ ہاتھ میں لئے ہوئے شاردا دیوی بولی "ماسٹر صاحب اب آنے ہی والے ہیں۔ پہاڑے یاد کر لئے ہیں؟"

پرسن کا چہرہ ایسے اُتر گیا جیسے پھول کملا گیا ہو۔ اسی وقت باہر سے پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ اور گاندھی ٹوپی اور کھدر کی قمیص پہنے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کا ماسٹر وارد ہوا۔ ہرش وردن نے مسکرا کر ماسٹر کی نستے کا جواب دیا: "دیر بولے پرسن جلدی کرو۔ دیکھو ماسٹر جی آگئے ہیں۔ لیکن ماسٹر صاحب اب تو پرسن ابھی محنت کرتا ہے نا؟" باہر گاڑی کی آواز سنائی دی اور کسی نے وکیل صاحب کا نام لے کر تین بار پکارا۔ جواب دینے کے لئے ماسٹر صاحب کا منہ بول کا توں کھلا رہ گیا۔ پرسن کا "سرو کے کنارے" والا سوال بھی ادھورا رہا۔ وہ ماسٹر کے ساتھ پڑھنے کے لئے گیا۔ لیکن پہلا سوال اُس نے سرو کے کنارے کے متعلق ہی کیا۔

"ماسٹر صاحب سرو ندی کے کنارے کیا ہے؟"

"سرو ندی کے کنارے؟ سرو ندی کے کنارے ایک خوبصورت گاؤں ہے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟"

اتنے میں شاردا دیوی داخل ہوئی اور بولی۔ ماسٹر صاحب پرسن پہاڑے بالکل بھول گیا ہے۔ ذرا پوچھ دیکھئے۔

"برو سترہ نواں؟" ماسٹر نے پوچھا۔

پرسن کے منہ سے نکل گیا "سرو ندی" پر جلدی وہ سنبھلا۔ "سترہ نواں.... سترہ نواں؟"......

شاردا دیوی نے غصے سے اس کی طرف دیکھا: "پرسن!"

سرو ندی کو دم بھر کے لئے بھول کر پرسن پہاڑوں کے چکر میں پھنس گیا۔

اب روز شام کو پرسن جب پاٹھ شالہ سے پڑھ کر لوٹتا تو راستہ بھر سرو ندی کے خیال میں ڈوبا ہوا گھر آتا۔ لیکن کسی دن پریم بھائی ہال میں لیکچر کی وجہ سے کسی دن میونسپلٹی کی میٹنگ ہونے سے۔ پرسن وردن کا مزا بگڑا تھا

لہ احمد آباد میں سابرمتی کا ایک مشہور پل

اُنہوں نے "انگلی کاٹ لی" یہ جھوٹ۔ جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔ اسے کوئی نہیں مان سکتا۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔

نیچے سے آواز آئی۔ "وکیل صاحب"

"موتی۔ دیکھو کون ہے۔"

موتی نے نیچے دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب کھڑے تھے۔

"ہرش وردن ہیں" ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔ وکیل صاحب کے اشارے کے مطابق موتی نے جواب دیا۔ "نہیں ہیں۔ باہر گئے ہیں۔"

"کب آئیں گے" موتی واپس آکر پھر اپنے کام میں لگ گئی۔

"ہاں پرستن اب میں تمہیں وہ کہانی سناتا ہوں سنو! سرجو کے کنارے"

"وکیل صاحب" نیچے سے پھر آواز آئی۔

"موتی یہ دروازے بند کر دو اور جو آئے اُسے کہہ دو آج گھر پر نہیں ہیں" ہرش وردن نے کہا۔

موتی نے حکم کی تعمیل کی اور حیرت سے باپ بیٹے کی طرف دیکھتی ہوئی کام میں لگ گئی۔

"آج تمہیں جانا نہیں ہے کیا" شاردا دیوی باہر سے آتے ہوئے بولی "بیٹھے کیوں ہو؟ کیا آج جانا نہیں چاہتے؟"

"کہاں؟"

"کہاں! کیا بھول گئے۔ آج تمہیں برادری کے صدر کا عہدہ لینا ہے"

"اُوف! یاد آگیا۔ پرستن سرجو کے کنارے" ہرش وردن کھڑے ہوکر کھونٹی پر سے قمیص اتارتے ہوئے بولے "بیٹا سرجو کے کنارے اجودھیا نام کی سندر نگری تھی اُس نگری میں دشرتھ نام ایک نیک دل راجہ راج کرتے تھے۔ راجہ کی تین رانیاں تھیں۔ . . ."

"تم بہت دیر کر رہے ہو جی!"

"اب جا رہا ہوں"

"پھر کیا ہوا کہیئے"

"ہرش وردن سیڑھیوں پر سے اُترنے لگے "راجہ کے تین رانیاں تھیں۔ لیکن اولاد کسی سے نہ تھی"

"ہاں پھر"

"وکیل صاحب! کیا چل رہے ہیں؟" نیچے سے برادری کے ایک رکن نے آواز دی۔

"آیا! آیا۔ زندہ رہتے آرہا ہوں" ہرش وردن نے پہلی سیڑھی پر کرتے ہوئے پوچھا "باقی کہانی تم سنا دوگی کیا"

"نہیں مجھے کل استری سبھا میں لیکچر دینا ہے اُسے تیار کرنا ہے۔ پرکل سنا دونگی پرستن!" شاردا دیوی بولی۔

پرستن وردن پُرنم آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ ہرش وردن نیچے اُتر گئے۔ اور اُن کے پیروں کی آہٹ باہر عورتوں کے گانے میں ڈوب گئی۔

Pakistan & Untouchability
CH: AFZAL HAQ.

The Ahrar leader has discussed this vexed problem from a new and original angle. He has subjected some of the current political slogans to a critical and searching analysis. Coming from the pen of a well-known political thinker and the leader of an important nationalist group this book will prove a useful contribution to Contemporary National literature.

Price **Rs. 1/12/-**

Publishers:—

Maktba-i-Urdu, Lahore.

احمد ندیم قاسمی

تاثرات

کسی کے ہاتھ میں تو نے تھما دیں غریبوں کے مقدّر کی لگامیں
کسی بدبخت کو بخشیں بصد ناز فسُردہ صبحیں اور پژمردہ شامیں

(۲)

اُدھر ابریشمی ملبوس کی دُھن اِدھر دھجّی پہ دھجّی چڑھ رہی ہے
اُدھر گلرنگ رُخساروں پہ غازہ اِدھر چہروں کی زردی بڑھ رہی ہے

(۳)

تری مدہوشی لے یُوں ڈالتی ہے خراشیں سطحِ احساس نہاں پر
کہ جیسے نصف شب کی خامشی میں ستارے ٹوٹتے ہیں آسماں پر

(۴)

اگرچہ زندگی ہے چاک در چاک جسے تارِ نفس سے سی رہا ہوں
مگر کچھ کم نہیں تیری عنایت محبت کر رہا ہوں — جی رہا ہوں

(۵)

بھلا اِس بے بسی پر رنج کیسا؟ بھلا یہ درد کیا درماں سے کم ہے؟
وُہ آئے اس طرح بہرِ عیادت کہ گردن خم ہے چشمِ ناز نم ہے!

(۶)

یہاں اِک کھیل ہے ذوقِ عبادت مجھے دَیرِ کہن سے دُور لے جاؤ،
کوئی سنتا نہیں، دِل لاکھ دھڑکے مجھے میرے وطن سے دُور لے جاؤ،

علی امام - ایم - اے

سماج کی ابتداء

اگر انسانی سماج کا ارتقاء کسی مقصد کے تحت واقع ہوتا تو شاید ہم خلقی ارتقاء کے سلسلہ میں بھی اس مقصد کو تلاش کر سکتے۔ غایاتی اسباب کے ماننے والے سائنس دان اس کشمکش میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر وہ مقصد کا صرف انسانی ارتقاء میں موجود ہونا ثابت کرتے ہیں تو مقصد ایک محدود شئے ہو کر رہ جاتا ہے چنانچہ وہ ادنےٰ جانداروں میں بھی مقصد کی جستجو کرتے ہیں جو غایاتی فلسفہ کے مترادف ہے۔ دراصل جہاں ادراک ہوگا وہاں مقصد بھی ضرور ہوگا۔ حتیٰ کہ ادنےٰ جانداروں میں بھی۔ مقصد بھی نظام عالم کے طبعی ڈھانچہ کا ایک حصہ ہے اور حیاتی ارتقاء کا ایک عمل۔

کیمیا۔ حیاتیات اور جدید سائنس کے تجربات نے غایاتی مقصد کے نظریہ کو مسترد کر دیا ہے۔ اس نے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ انسانی سماج کے ارتقاء کے اصول کسی ایسی اندرونی تحریک کے مرہونِ منت نہیں جو انسان کے لئے انوکھے اور حیاتی ارتقاء کے خلاف ہوں۔ اس ارتقاء کے سلسلہ کا تعین کیونکر ہوگا اور وہ کس قانون کے زیر اثر رہے گا؟ یہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں سماج کی ابتدا تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ ایک تو تاریخ کے ذریعہ آتے ہوئے قصے کہانیوں اور فرضی روایات سے مملو واقعات کا گہرا مطالعہ اور دوسرا اُن قدیم ترین افراد کے کردار کا تجزیہ جو موجودہ مہذب دور میں بھی موجود ہیں۔ مؤخر الذکر طریقہ ہی کے ذریعہ انسانی سماج کی ابتدا جانچنا زیادہ بہتر ہوگا۔ قدیم سماج کے مطالعہ سے انسانی سماج کی ابتدا اور ارتقاء کے اسباب معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ ارتقائی منازل کی پشت پر کوئی مافوق البشر سبب نہ تھا۔ قدیم انسان غیر مقلد تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ گروہوں میں رہنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ سماج کی ابتدا تحفظ کی حس سے ہوتی۔ اگر وہ غیر فطری طاقتوں کو تسلیم کر لیتا تو وہ کیوں خواہ مخواہ اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور رہوتا۔ اور اپنے تحفظ کے لئے دوسروں کی امداد ڈھونڈھتا۔ تحفظ ہی کے سبب وہ گروہوں اور فرقوں میں رہنے لگا۔

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ خود غرضی انسان کا اوّلین اصول تھا۔ اور انسان فطرتاً خود غرض تھا۔ لفظ "خود غرضی" مطعون ہو چکا ہے اور اصطلاحی حیثیت سے فی زمانہ سفلہ پن سے کم ذلیل نہیں لیکن یہاں خود غرضی کے معنی ہیں انسان کا اپنی ذات کے متعلق خیال رکھنا یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ جس وقت قدیم انسان اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ وہ اجتماعی طریقہ زندگی میں زیادہ آرام سے رہ سکتا ہے۔ اسی وقت انسانی سماج کا ارتقاء شروع ہوا۔ فرد گروہ میں ضم ہو گیا۔ اور اس کی ذاتی خود غرضی تمام فرقہ کی بہبود کے لئے وقف ہو گئی۔ جسمانی تحفظ سے مطمئن ہو جانے کے بعد ترقی کی حس بڑھنے لگی۔

سماج ابتداءً دو وجوہ کے باعث ظہور میں آئی۔ اوّل ذاتی تحفظ اور دوئم ذاتی کوششوں کو یکجا کر کے اجتماعی طور پر نیچر کے خلاف جد و جہد ایسا کرنے سے حصولِ معاش کے ذرائع میں نمایاں ترقی ہوئی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ انسانی فرقے زمین سے وابستہ ہو گئے۔ ابھی تک وہ جانور مار کر کھاتے تھے۔ لیکن اب زمین چیر کر معاش حاصل کرنا سیکھ گئے۔ کاشت کے شروع ہونے کے بعد ہی ایک منظم سماج کی بنیاد پڑی۔ سماجی ارتقاء کے سلسلہ میں دوسرا انقلاب اس وقت واقع ہوا جب جانور مارے جانے کے بجائے پالے جانے لگے۔ اس سے قبل تمام جسمانی کام

انسان خود ہی کرتا تھا۔ پالتو جانوروں کی وجہ سے انسان کو کام سے کچھ فرصت مل گئی اور اب وہ فرصت کے اوقاتِ زندگی کے دوسرے شعبوں کو بہتر بنانے میں صرف کرنے لگا۔ اسی زمانہ سے سماجی کلچر کا دور شروع ہوتا ہے۔ فرصت کلچر کی اولین شرط ہے۔ جسمانی مشقت کی طرف سے ذرا مطمئن ہونے پر انسانی کلچر اور فنونِ لطیفہ بڑھانے میں مشغول ہو گیا۔

یہ مختصر تشریح ہمیں اس نتیجہ پر پہونچاتی ہے کہ سماجی ارتقا غایاتی اصول پر نہیں بلکہ طبعی طاقتوں اور اُن قوانین کے زیرِ اثر ہوا جو انسانی زندگی میں فطرتاً موجود ہیں۔ چونکہ انسان خود نیچر کے مرتب نظام کا ایک طبعی جزو ہے۔ اسلئے اس کے ارتقا کا دارومدار بھی طبعی دنیا کے بنیادی اصولوں پر ہوگا۔ کچھ مدت قبل واقعات ہم تک تاریخ کے گورکھ دھندے کے ذریعہ پہونچتے رہے۔ نہ تو تاریخ پر کوئی نکتہ چینی ہوتی تھی اور نہ مؤرخ ہی کے معتبر یا غیر معتبر ہونے پر شک کیا جاتا تھا چنانچہ تاریخی واقعات ہمیشہ قصص اور کہانیوں کی شکل میں پیش کئے گئے۔ لیکن جدید سائنس کے رائج ہو جانے کے بعد انسان نے سماج کی ترکیب اور اس کے ابتدائی منازل کے متعلق سوچنا اور تجزیہ کرنا شروع کیا۔ سائنس کے طریقہ پر سماج کی ابتدا دریافت کرنے کی جستجو درجہ بدرجہ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ مابعد ان مؤرخ اس نتیجہ پر پہونچے کہ سماج کی ابتدا ایک بنیادی اصول پر ہوئی جو سو فیصدی طبعی تھا۔ سماج ایک درجہ سے دوسرے درجہ پر پہونچتی رہی۔ قدیم سرقبیلیت کے دور سے گذر کر وہ ملوکیت کے عہد میں آئی اور وہاں سے جاگیریت سرمایہ داری اور اشتراکیت تک۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ تبدیلی ہوتی کیوں ہے؟ سائنس کی تشریحات سے قبل اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ سائنس نے اس کا یہ جواب دیا کہ انسانی کردار اور معاشرت۔ سماج کا ڈھانچہ اور سماجی ارتقا کے تدریجی منازل وغیرہ سب ہی ایک اصول کے ماتحت ہیں۔ جسے ہم قوم کے ذرائعِ معاش میں تبدیلی کہتے ہیں۔

جب ایک قوم کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ کم سے کم محنت اور کم سے کم وقت میں اپنی معاش حاصل کرے تو وہ ایک نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس نئے دور میں حصولِ معاش کے ذرائع اس عہد کے آلات اور اوزاروں پر مبنی ہوتے ہیں۔ جو سماج کم وقت اور معمولی اجتماعی مشقت ہی سے معاش حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے وہ جلد ترقی کر لیتی ہے۔ اور اپنے ماحول پر زیادہ مضبوطی سے قابض ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مختلف سماجوں کے ارتقائی منازل ناہموار ہیں۔ اگر ایک سماج تہذیب کا گہوارہ بن گئی ہے تو دوسری قدامت پرستی کی آئینہ دار۔

قدیم قوم میں ابتداً ہم آہنگی تھی۔ انفرادی کوششیں اجتماعی جد و جہد میں ضم تھیں۔ اجتماعی محنت اور پیداوار اور مساوی تقسیم اس کا اصول تھا۔ لیکن پالتو جانوروں کے استعمال اور نئے اوزاروں کے استعمال کی وجہ سے قوم کو کام سے کچھ فرصت ملنے لگی جس کو وہ اوزاروں کے بہتر بنانے اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے طریقوں میں صرف کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ نئے اوزار انفرادی ملکیت ہوتے گئے۔ انفرادی ملکیت کی طرف انسان کے رجحانات کیونکر ہوئے بہ طوالت مضمون کے باعث ہمارے بحث سے خارج ہے مختصر یہ کہ اجتماعی محنت کے بعد فرصت کے اوقات میں انسان انفرادی منفعت اور ذاتی آرام کے ذرائع دریافت کرنے میں لگ گیا۔ دن کے باقی حصہ میں انفرادی محنت کی پیداوار کو ذاتی ملکیت تصور کرتا۔ ابھی تک چونکہ زمین کی کاشت اجتماعی تھی۔ اسلئے کوئی فرد کسی زمین یا کسی خوشہ خرمن کو ذاتی ملکیت تصور نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن جب کوئی فرد اپنے ذاتی ہتھیار سے کوئی جانور مارتا تو وہ شکار اس کی ملکیت ہو جاتی اور وہ اس ملک کو اپنا حق سمجھتا۔ ذاتی املاک کی ابتدا سے ایک دوسرے انقلاب کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ قدیم اجتماعی سماج کو درہم برہم کر دیتا ہے یہی اثرات اور اسباب آیندہ کی جاگیری اور سرمایہ داری سماج کے درہم برہم کرنے کا باعث بنے

اگر ہم موجودہ سماج کے مسائل کو سمجھنا اور اس کے نشوونما پر غور کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ سماجی ارتقا کے دو بنیادی اصولوں یعنی تحفظ اور ترقی کے شوق کو ہمیشہ مدنظر رکھیں۔ خود غرضی انسان کی قدیم حس ہے۔ یعنی خود غرضی تحفظ کے لئے۔ نشوونما کے ایک دور سے گزرنے کے بعد

[illegible]

کنہیا لعل کپور ایم۔ اے

اِنتساب

میرے دوست مسٹر کرشن چندر نے اپنی نئی کتاب "ہوائی قلعے" کا انتساب ان عجیب الفاظ میں کیا ہے: "اُس دیوانے کُتّے کے نام جس نے مجھے متعدد بار نہیں کاٹ کھایا" جہاں تک میرا خیال ہے۔ انتساب اُس شخص سے کیا جاتا ہے جس سے مصنف کو عقیدت ہو۔ مثلاً رشتے دار احباب وغیرہ۔ کرشن چندر نے دیوانے کتے سے اپنی کتاب منسوب کر کے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے کئی اور دوستوں کو اُلجھن میں ڈال دیا ہے ایک ذی عقل کتے سے نسبت اور عقیدت ہو سکتی ہے مگر دیوانے کتے سے راہ و رسم بڑھاتے ہوئے میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا سوچتا ہوں۔ کہ شاید یہ انتساب کرشن چندر کو اُن دنوں سوجھا ہوگا۔ جبکہ دیوانے کتے نے ابھی ابھی اُنہیں کاٹا تھا۔ اور وہ اس قسم کے شعر گنگنایا کرتے تھے۔

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ جی چاہتا ہے یارب
میرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا

یا شاید اس انتساب کی تہہ میں کوئی اور راز پوشیدہ ہے کیونکہ اُن کے مضمون "مجھے کتے نے کاٹا" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی دفعہ جب اُنہیں ایک دیوانے کتے نے لاہور میں کاٹا تھا۔ تو انہیں میو ہسپتال میں ٹیکہ لگوانے کے دوران میں ایک شوخ اور چلبلی قسم کی اینگلو انڈین نرس سے جان پہچان بڑھانے کا موقع ملا تھا۔ اور شاید یہی بات اس دفعہ بھی ہو۔ ورنہ ایک دیوانے کتے کا اتنے پرجوش طریقہ سے شکریہ ادا کرنے کا کیا مطلب۔ مگر مجھے یہ ڈر ہے۔ کہ اگر یہ بات دیوانے کتوں کے گوش گذار ہو گئی۔ تو اُن میں سے ہر ایک اس امید پر کہ کرشن چندر اپنی نئی کتاب کا انتساب اُس کے نام کریں گے۔ اُن کو کاٹنے کیلئے دوڑیگا۔ اور عین اغلب ہے۔ کہ آئندہ جب وہ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے باہر تشریف لائیں۔ تو آپ کی پیش قدمی کے لئے باہر دیوانے کتوں کا ایک ہجوم کھڑا ہو اور آپ کو متعدد کتب "اُن دیوانوں" کے نام منسوب کرنی پڑیں جنہوں نے آپ کو لاہور لکھنؤ اور بمبئی میں کاٹ کھایا مگر اس انتساب کی ایک اور شرح بھی کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ کرشن چندر کو دیوانے آدمیوں اور دیوانے کتوں سے ایک گونہ محبت ہے۔ اپنے دلچسپ مضمون "دو فرلانگ لمبی سڑک" میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلا چلا کر کہوں میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔"

اور "مجھے کتے نے کاٹا" میں فرماتے ہیں۔

"خود اپنی زندگی کے لئے ایسے لمحے گن سکتا ہوں جب میں نے اپنے آپ کو بالکل پاگل متصوّر کیا ہے۔"

دیوانگی کی خواہش صرف کرشن چندر پر ہی موقوف نہیں۔ غالب مرحوم نے کئی جگہ اس جذبہ کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً

دیکھا ہے۔ ہم نے جلوت و خلوت میں اسد کو
دیوانہ گر نہیں تو ہشیار بھی نہیں،

مگر اس ساری منطق کے باوجود ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو۔ اور اُنہوں نے یہ انتساب اسلئے کیا ہو کہ اس میں اچھوتا پن ہے۔ بیچارے ادبا کی مجبوریاں، لاچاریاں۔

آجکل ہر ایک آدمی اُن سے توقع رکھتا ہے۔ کہ وہ ہر چیز میں اجنبیت، رومانیت اور شعریت پیدا کریں چنانچہ جو ادیب اپنی کتاب کا انتساب سیدھے سادہ الفاظ میں کرتا ہے۔ اُس کو متفقہ رائے سے دقیانوس۔ تنگ نظر اور ضعیف الاعتقاد قرار دیا جاتا ہے مثال کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حامد۔ یہ نواب صاحب سے پوچھئے۔

سکرٹری۔ جی ابھی کے کمرے سے تو آرہا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ مجھے پبلک معاملات کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں ہے میرے پرائیویٹ سکرٹری سے پوچھئے۔ وہی جانتے ہیں کہ میں کون کون سے مضامین پہ تقریر کر سکتا ہوں۔

حامد۔ سبحان اللہ۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ اس ہفتے نواب صاحب بہت زیادہ مصروف رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آج شام یہاں ایک نہایت ضروری پارٹی دی جانے والی ہے۔ جس میں نواب صاحب کے بچوں کا سوسائٹی سے تعارف کرایا جائے گا اسلئے . . . اسلئے بہتر یہی ہوگا۔ کہ آپ لکچر کسی اور تاریخ پر اٹھا رکھئے۔

سکرٹری۔ آپ صحیح فرماتے ہیں مگر لکچر پر کمشنر صاحب صدارت فرما رہے ہیں۔ نواب صاحب کا خیال ہے کہ لکچر ہو جاتے تو بہت اچھا ہے۔ الکشن کے دن قریب آرہے ہیں اور خطابات کی فہرست بھی مرتب ہونے والی ہے۔

حامد۔ اگر ان کا یہی خیال ہے تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔

سکرٹری۔ بہت مہربانی آپ کی۔ ہماری سوسائٹی بہت مفید کام کر رہی ہے۔ ہم نے آجتک پانچ جلسے کئے ہیں۔ کوئی بیس کے قریب ریزولیشن پاس کئے ہونگے۔ جن میں سے چار تو اخبارات میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

حامد۔ خیر اب اس سے کیا بحث ہے۔ لیکن . . .

سکرٹری۔ آپ بات بھی تو سن لیجئے۔ آخر نواب صاحب تقریر کرینگے تو انہیں ہمارے متعلق بھی تو کچھ کہنا ہوگا۔ ورنہ تقریر کا فائدہ ہی کیا۔ کمشنر صاحب کو بھی تو معلوم ہونا چاہیئے۔ ہم کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا۔ ہماری سوسائٹی بہت مفید کام کر رہی ہے۔ ہمارے مقاصد یہ ہیں کہ شہر کی صفائی کا پورا انتظام کیا جائے۔ جب بھی کوئی افسر شہر میں آتا ہے تو اسے بازاروں سے گھن آتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بازار آئینے کی طرح شفاف ہوں۔ غلاظت اور بیماری کیخلاف جنگ کی جائے۔ لوگوں کو ٹیکے لگوانے کی تعلیم دی جائے اور . . . . . .

حامد۔ دیکھئے صاحب میں بہت مصروف ہوں۔ جیسے میں نے عرض کیا تھا۔ آج شام کو پارٹی ہے۔ صبح سے اس وقت تک فرصت کا ایک لمحہ میسر نہیں آیا۔ اور ابھی سب کام ویسے کا ویسا رکھا ہے۔ آپ کسی وقت پھر . . . . .

سکرٹری۔ جی نہیں مجھے بات تو ختم کر لینے دیجئے۔ آپنے ہماری تجاویز تو سنی ہوں گی۔ اگر تکلیف نہ ہو تو لکھتے جائیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سڑکوں اور خاکروبوں پر ٹیکس لگایا جائے۔ غریب محلوں کی جھونپڑیاں گرا کر خوبصورت مکان تعمیر کئے جائیں۔ خوانچوں اور پھیری والوں کو لائسنس دیا جائے۔

حامد۔ اُف! (دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

رحیم۔ صاحبزادے شوکت آتے ہیں!

حامد۔ (سکرٹری سے) اچھا تو آپ اب تشریف لیجائیے۔ نواب صاحب کے صاحبزادے آرہے ہیں (شوکت داخل ہوتا ہے)

شوکت۔ (تحکمانہ انداز سے) غضب کرتے ہیں حامد صاحب ابھی تک آپنے میرے لئے غزل نہیں لکھی۔ پارٹی میں چار ہی گھنٹے تو رہ گئے۔ اور پھر مجھے یاد بھی کرنا ہے۔

حامد۔ صاحبزادہ صاحب آپ ہی فرمائیے کہ اشعار کس وقت لکھتا۔ برتن منگوائے کھانے کی چیزوں کی فہرستیں بنوائیں۔ دعوتی رقعے پہنچائے، ہوٹلوں کی خاک چھانی۔ صبح سے ایک ٹانگ یہاں ہے ایک مال روڈ پر۔

شوکت۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے شعر لکھنے کے لئے آج ہی کا دن تو نہیں رہ گیا تھا۔ پہلے لکھ لئے ہوتے۔

حامد۔ ہر روز یہی قصہ ہے۔ صبح صبح آتا ہوں اور رات کے آٹھ نو یہیں بج جاتے ہیں۔ گھر پہنچتا ہوں جسم میں اتنی سکت نہیں

ہم ذرا جناب گورنر تک جا رہے ہیں۔ ہمارے لوٹنے تک ضرور
ختم کروا لیجئے کوئی نقص نہ رہ جائے۔ (جاتی ہے)

رحیم۔ حامد صاحب۔ آپ کو نواب صاحب اپنے کمرے میں یاد فرما رہے ہیں۔

حامد۔ یا اللہ خیر (جاتا ہے) (دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

نواب احتشام الدین۔ کون ہے؟ آجاؤ۔

حامد۔ آداب عرض ہے۔

نواب۔ آئیے۔ سب انتظام ہوگیا۔ تعجبی عجیب آدمی ہو۔ آج کیا معلوم کتنی تاریخ ہوگئی۔ ہماری ایسوسی ایشن کی اپیل ابھی تک اخباروں میں نہیں گئی۔ سالانہ جلسہ قریب آرہا ہے۔ کیا تاریخ ہے آج؟

حامد۔ بائیس حضور۔

نواب۔ بائیس ٹھیک۔ اور وائسرائے کے نام ابھی تک تار بھی نہیں بھیجا تم نے۔ وہی طوفان کے مصیبت زدوں کے متعلق کسی اور نے پہلے تار بھیج دیا تو ناک کٹ جائیگی۔ آج کیا تاریخ ہے؟

حامد۔ بائیس۔

نواب۔ ہاں بائیس۔ تم نے پہلے بھی بتایا تھا۔ تو وہ اپیل لکھ ڈالو جلدی سے۔ آج ہی اخبارات میں چلی جائے۔

حامد۔ کیا لکھوں حضور؟

نواب۔ لکھو۔ ہماری ایسوسی ایشن عرصہ سے لوگوں کی خدمت کر رہی ہے اس کے ماتحت کئی ایک مفید کام ہو رہے ہیں۔ اور اگرچہ ہم نے آج تک کسی کے آگے دستِ دراز سوال نہیں کیا۔

حامد۔ حضور۔ دستِ سوال دراز کرنا بولتے ہیں۔

نواب۔ بیچ میں مت بولو۔ جو ہم لکھواتے ہیں لکھو

حامد۔ بہت اچھا سرکار۔ ارشاد۔

نواب۔ بس باقی جو تمہارے ذہن میں آتے لکھ دو۔ کچھ اسی قسم کی باتیں لیکن خوب پرزور ہو۔ اور یہ اخباروں کا پلندہ اٹھائے جاؤ۔

دیکھو جہاں جہاں ہمارا نام چھپا ہے کاٹ کے فائل میں رکھو
کیا معلوم آج ہی ضرورت پڑ جائے۔ اور وائسرائے کا تار
آج ضرور چلا جانا چاہیئے۔ کیا تاریخ بتائی تھی تم نے؟

حامد۔ بائیس حضور۔

نواب۔ اوہ بائیس۔ دیکھو تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ کیلنڈر میز پر میرے سامنے رکھا کرو۔ مجھے تاریخ کبھی یاد نہیں رہتی۔

حامد۔ کیلنڈر تو آپ کے سامنے ہی تو رکھا ہے

نواب۔ اوہ ٹھیک۔ پھر بھی۔ احتیاطاً پوچھ لینا چاہیئے۔ لیکن تم سے اور کیا کام تھا۔ ہاں غضب ہو گیا بھئی۔ سر جہانگ چند کو آج کی دعوت کا رقعہ ہی نہیں گیا۔ تم نے یاد کیوں نہ دلایا۔

حامد۔ جی میں نے تو آج تک ان کا نام بھی نہیں سنا۔

نواب۔ واہ یہ تمہاری واقفیت کا حال ہے۔ شہر کے رئیس کے نام بھی نہیں معلوم۔ جانے آپ لوگوں کو کالجوں میں کیا پڑھایا جاتا ہے۔ سر جہانگ تو بہت بگڑ رہے ہوں گے۔ اب یہی صورت ہے کہ خود جا کر انہیں رقعہ پہنچا دو۔ کہہ دینا کہ تم سے بھول ہوگئی تھی۔ یہاں سے تین میل ہی تو ہے۔ گھنٹہ بھر میں لوٹ آؤ گے بس لپک کے جاؤ۔

حامد۔ لیکن۔

نواب۔ لیکن ویکن کیا۔ نوجوانوں کو مستعد ہونا چاہیئے۔ بائیسکل پر ٹانگ رکھو۔ اور ہوا ہو جاؤ۔ گاڑی جمیلہ لے جا رہی ہے ورنہ اس پہ چلے جاتے۔ تھوڑی تکلیف تو ہوگی . . . .
اور دیکھو پارٹی کے انتظام میں کوئی نقص نہ رہ جائے۔

حامد۔ جی۔

نواب۔ تو جاؤ . . . . . یہ کیا تم بھیگی بلی کی صورت بنا لیتے ہو۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے تھپڑ کھینچ مارا ہو۔ خوش خوش نظر آیا کرو

حامد۔ بہت اچھا حضور۔

رحیم۔ حامد صاحب سلیمہ بی انتظار کر رہی ہیں (جاتا ہے) (دارہ مرتیم کی آواز)

(دروازہ کھلنے کی آواز)

سلیمہ۔ کہاں غائب ہو گئے تھے آپ۔ اتنی دیر سے میں انتظار کر رہی ہوں۔ وہ گیت میں نے تیار کر لیا ہے۔ اب آپ سن لیجئے

حامد۔ (عاجزی سے) پھر کبھی سلیمہ بی۔ اس وقت معاف کیجئے

سلیمہ۔ کیا خوب۔ اب اور کون وقت آئیگا۔ ایک بجنے کو آیا تین ہی گھنٹے تو باقی ہیں۔

حامد۔ تو آج کوئی پرانا گیت ہی سنا دیجئے۔ دیکھئے نا سارا کام ویسے کا ویسا دھرا رکھا ہے۔ اور ابھی مجھے سرہری پھاٹک کے ہاں جانا ہے۔ دو گھنٹے میں مشکل سے لوٹوں گا۔ خدانخواستہ پارٹی میں کوئی بات رہ گئی تو شامت آ جائے گی۔

سلیمہ۔ میں کیا جانوں۔ دو گھنٹہ مغز ماری کر کے میں نے گیت یاد کیا۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ پرانا گیت سنا دو۔ یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے۔

(اوٹ پٹانگ سروں میں حفیظ کا گیت سناتی ہے)

پیارے
جھوٹا سب سنسار پیارے جھوٹا سب سنسار
لوبھ کا دریا، موہ کی نیا، کاگ کھیون ہار
موج کے بل پر چل نکلے تھے
آن پھنسے منجدھار
جھوٹا سب سنسار پیارے ....

(ہر مصرع کے بعد حامد مہیب سروں میں گا کے سناتا ہے۔ اسی طرح گیت کا ایک بند ختم ہو جاتا ہے)

(شوکت داخل ہوتا ہے)

شوکت۔ اسی پرانے انداز میں، حامد صاحب میرے شعر ہو گئے۔

حامد۔ اوہ معاف کیجئے۔ ابھی پانچ منٹ میں ہوئے جاتے ہیں۔

شوکت۔ میں تو پانچ منٹ نہیں ٹھہر سکتا میرے دوست انتظار کر رہے ہیں۔

حامد۔ تو آپ ذرا سی دیر میں تشریف لے آیئے۔

شوکت۔ جی اب بار بار آپ کے لئے اُٹھ کے آؤں۔ واللہ آپ نے تو ہمارا کھیل بالکل بدمزہ کر دیا۔

حامد۔ تو ذرا ٹھہریئے۔ میں ابھی لکھے دیتا ہوں۔

سلیمہ۔ پہلے میرا گیت تو ہو لینے دیجئے۔

حامد۔ ہاں آپ گایئے۔ گایئے۔

پیارے
جھوٹا سب سنسار .....
تن کے اُجلے من کے میلے۔ دھن کی دھن لہرار
اوپر اوپر پردہ تنا ہیں۔ اندر سے بٹ مار
پیارے
جھوٹا سب سنسار ...

(سلیمہ پھر انہیں مکروہ سروں میں گانا شروع کر دیتی ہے اور گاتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی حامد کے گنگنانے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔)

عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے
ساری دنیا سے دور ہو جاتے
تھی مگر اتنی رائیگاں بھی نہ تھی آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے
ساری دنیا سے دور ہو جاتے جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے
نہ گئی تیری بے رخی نہ گئی

(سلیمہ کا گیت ختم ہو جاتا ہے)

حامد۔ (آہستہ سے) کیا قافیہ تھا کم بخت .... بہت اچھا گائیں آپ ... بالکل ٹھیک ہے۔

سلیمہ۔ آداب عرض۔ (حامد گنگناتا رہتا ہے) جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

حامد۔ لیجئے شوکت صاحب غزل ہو گئی۔

شوکت۔ دیکھوں۔ جو حریفِ بہار ہو بیٹھے۔

حامد۔ حریفِ بہار۔

شوکت۔ ہاں ہاں ٹھیک۔ حریفِ بہار۔ حریفِ بہار ہو بیٹھے۔ جانے کس کس کو آج رو بیٹھے۔ تھی مگر اتنی رائیگاں بھی نہ تھی۔

حامد۔ رائیگاں بھی نہ تھی۔

شوکت۔ خیر اس سے کیا ہوتا ہے۔ تھی مگر اتنی رائیگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے

ساری دنیا سے دُور ہو جائے   جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے
نہ گئی تیری بے رُخی نہ گئی   ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے
پتہ سے وہ یہ پہنچ کے لوٹ آئے   عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے

بس اتنے ہی شعر ہیں۔ یہ غزل تو ایسی اچھی نہیں۔ لیکن خیر گذارہ ہو جائے گا۔ اب ذرا اسکی طرز بھی بنا دیجئے۔

حامد۔ شوکت صاحب۔ خدا کے لئے میرے حال پر رحم کیجئے مجھے ہزار کام کرنے ہیں۔

شوکت۔ تو آپکے خیال میں یہ کوئی کام نہیں ہے۔ مجھے آپ سے شکایت کرنا پڑیگی۔

حامد۔ اُف۔ اچھا لیجئے (ایک مصرع گنگناتا ہے)

(شوکت نہایت بھونڈی آواز میں دہراتا ہے)

حامد۔ بس بالکل ٹھیک ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے سرہری پھاٹک کے ہاں ....

شوکت۔ ساری غزل سُنئے۔

حامد۔ جی نہیں۔ کیا ضرورت ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ رحیم دیکھو۔ بہروں سے کہدو کہ سامان وغیرہ خود ہی ٹھیک کرلیں۔ تم بھی دیکھ لینا۔ میں کام سے سرہری پھاٹک کے ہاں جارہا ہوں تین چار میل ہے یہاں سے۔ شاید واپسی میں دیر ہو جائے

رحیم۔ اس دھوپ میں کہاں جائیے گا سرکار۔ لو چل رہی ہے۔ باہر نکلتے ہوئے ہول آتا ہے۔

حامد۔ ارے بھیا۔ گرمی سردی امیروں کیلئے ہے۔ نہ کہ ہمارے تمہارے لئے ہمارے لئے تو سب موسم ایک جیسے ہیں۔

رحیم۔ چھاتا لے جائیے۔ میرے ہاں ایک رکھا ہے۔ لُو لگ جائیگی۔

حامد۔ ارے۔ پاگل۔ یہ چھاتا کیا کام دیگا۔ اچھا تو میں جاتا ہوں کوئی میرا پوچھے تو کہدینا۔

رحیم۔ بہت اچھا حضور۔

(ایک مختصر سا وقفہ جس میں پلیٹوں وغیرہ کی کھنکھناہٹ سُنی جاتی ہے۔ گھڑی چار بجاتی ہے ایک ایک کرکے موٹروں کے رُکنے کی آواز)

قلندر علی۔ نواب تجمل حسین خاں۔ رائے بہادر گنگا پرشاد۔ کنور رجیت سنگھ۔ خان بہادر مشتاق احمد خاں۔ لیڈی پھاٹک رتلا کمل۔ مسز جان برنارڈ۔ سرفیروز جنگ۔ (آواز دوسری آوازوں میں مل جاتی ہے۔

سرفیروز جنگ۔ آداب عرض۔ کہئے نواب صاحب مزاج اچھے ہیں (شوکت صاحب مسز برنارڈ کو بتلائیے۔ (چائے اور پیالیوں کی آواز)

شوکت۔ ذرا ٹیلیفون پہ دیکھئے کون ہے۔ .....

(چائے کی پیالیوں اور چمچوں کی آوازیں)

لیڈی پھاٹک۔ بھئی اب تو سب آچکے۔ بچوں کو بلوائیے۔

سب۔ ضرور ضرور

نواب۔ خواتین و حضرات۔ بہت خوشی کا مقام ہے کہ آپ لوگوں نے ...... میری عزت افزائی کی ہے ...... میرا مطلب ہے کہ میرے بچے آپ ہی کے بچے ہیں۔ آپ کی مہربانی ہے۔ اور میں زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ سرفیروز جنگ اس تقریب کی صدارت بجا لائیں گے یعنی انجام دیں گے۔ اور بچوں کو بلائیں گے۔

سرفیروز۔ پہلے سلیمہ بی گانا سنائیں گی۔ (تالیاں)

(سلیمہ اسی بے تکی آواز میں گانا شروع کرتی ہے اور تقریباً دو بند گاتی ہے) (زور کی تالیاں)

ایک آواز۔ بھئی بہت خوب، بہت ہی خوب۔

حامد۔ (آہستہ سے) خاک!

ایک عورت کی آواز۔ حامد صاحب کیا کہا آپ نے۔

حامد۔ جی کچھ نہیں۔
دھیمی آواز۔ آپ بھی گانے کا شوق رکھتے ہیں۔
حامد۔ جی نہیں۔
سر فیروز۔ اب جمیلہ بی اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویر دکھائیں گی۔
(تالیاں)
جمیلہ۔ (کچھ ہنستے ہوئے) یہ دیکھئے۔ کچھ اچھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس ساری کا رنگ سرخ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن لیکن کچھ اسی طرح بن گئی۔ (پھر ہنستی ہے)
حامد۔ جی ہاں۔
آواز۔ کیا فرمایا؟ آپ کو بھی مصوری سے کچھ شغف ہے۔
حامد۔ جی نہیں۔
ایک آواز۔ بھئی کیا کہنے۔ بالکل زندہ معلوم ہوتی ہے۔ جمیلہ بی مبارک
نواب صاحب۔ واہ۔ واہ۔
سر فیروز۔ اب صاحبزادہ شوکت آپ کو شعر سنائیں گے (تالیاں)
شوکت تسلیمات (اسی بھونڈی آواز میں گاتا ہے)

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے — جانے کس کس کو آج رو بیٹھے
تھی مگر اتنی رائیگاں بھی نہ تھی — آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے
ساری دنیا سے دور ہو جاتے — جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے
زندگی تیری بے رخی نہ گئی — آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے
تیرے در پہ پہنچ کے لوٹ آئے — عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے

(ہر شعر کے بعد دادِ تحسین کا ہنگامہ بلند ہوتا ہے۔)
ایک آواز۔ بھئی خوب شعر کہتا ہے۔
ایک اور آواز۔ نواب صاحب آپ سا بھی کوئی خوش نصیب ہو گا۔ ایک لڑکی گانا جانتی ہے، ایک مصور ہے۔ لڑکا شعر کہتا ہے۔ اور ماشاء اللہ آپ خود فاضل اور مقرر مشہور ہیں۔ تربیت ہو تو ایسی ہو
سر فیروز۔ بھئی یہ پروگرام تو بہت جلد ختم ہو گیا۔ کوئی اور صاحب کچھ سنائیں!
ایک عورت کی آواز۔ حامد صاحب آپ بھی صورت سے شاعر معلوم ہوتے آپ شعر نہیں کہتے۔
حامد۔ جی نہیں۔
شوکت۔ جی یہ حامد صاحب بھی شعر کہا کرتے ہیں۔
سر فیروز۔ ہاں ہاں۔ میں نے بھی انہیں کسی مشاعرہ میں دیکھا ہے کچھ کہئے حامد صاحب۔
حامد۔ معافی چاہتا ہوں۔
بلند سی آوازیں۔ حامد صاحب۔ حامد صاحب (تالیاں)
حامد۔ (دھیمی آواز میں جس میں غصہ کی جھلک ہے) آپ شعر سنیں گے
آوازیں۔ ضرور۔ ضرور
حامد۔ مجھ سے؟
آوازیں۔ ضرور۔ ضرور۔
حامد۔ (یکایک جوش میں) میں شعر سناؤں؟ اور ابھی ابھی یہ لڑکا کس کے اشعار کا خون کر رہا تھا کیا آپ کے خیال میں یہ بن مانس شعر کہہ سکتا ہے۔ جسے دن رات تاش کھیلنے لونڈیاں تکنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں۔
شوکت۔ بکو مت (آوازیں کیا! کیا واقعی؟)
حامد۔ (اسکی آواز بالکل پاگلوں کی سی ہوتی جا رہی ہے) اور آپکے خیال میں یہ ریشم کی گڑیا تصویریں بنا سکتی ہے۔ یہ جسے منہ لال کرنیکے سوا کسی دوسری بات کا سلیقہ نہیں جو سیاہ اور سفید رنگوں میں تمیز تک نہیں کر سکتی۔ اور وہ لونڈیا جسکے گانے کی تعریفیں ہو رہی تھیں، برسات کی کوئی مینڈک اس سے بہتر ٹرا سکتی ہے۔ میں شعر سناؤں؟ اور یہ بوڑھا کھوسٹ جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے چہرہ پر کتنی آنکھیں ہیں۔
نواب۔ ناہنجار۔ ادھر ہو۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے ہرگز خیال نہیں رہا کہ میرے پرائیویٹ سکریٹری کو کبھی کبھی جنوں کا دورہ ہو جاتا ہے بیچارے کسنا دانی مرض ہے ایسے رحیم گلّن اللو، حامد صاحب کو لیجاؤ اور ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرو کہ فوراً یہاں پہنچیں انہیں پھر پرانا دورہ ہو گیا ہے۔ حامد۔ جی ہاں دورہ ہی پڑ گیا تھا۔
ایک عورت۔ بیچارہ غریب (لوگوں کے اٹھنے کی آواز ایک ایک کرکے موٹروں کے رخصت ہونے کی آواز) حامد۔ بیچارہ غریب!

اثر صہبائی

اسرارِ حیات

سطحِ دریا پر اُبھر آتے ہیں ہم
بُلبلے ہیں تیرتے جاتے ہیں ہم

تیر کر لیکن ذرا کچھ دُور تک
اِس نئی ہستی سے گھبراتے ہیں ہم

تنگ آ کر وحشتِ افکار سے
سر انہیں موجوں سے ٹکراتے ہیں ہم

ٹُوٹ کر دریا میں ہو جاتے ہیں غرق
پھر سکونِ بے خودی پاتے ہیں ہم

خُوب ہے نیرنگئ موت و حیات!
بس یُونہی بن بن کے مِٹ جاتے ہیں ہم

کیا وُہیں ہیں ہم جہاں تھے اے اثرؔ
یا کہیں جاتے ہیں یا آتے ہیں ہم

ملک راج آنند

جھوٹا

لبھو ہمارے گاؤں کا ضعیف العمر شکاری اور پیدائشی جھوٹا تھا اور اسی وجہ سے قرب و جوار میں وہ سب سے اچھا قصہ گو سمجھا جاتا تھا۔ ذات کا ملاح تھا مگر پھر بھی ہر شخص اس کا خیال رکھتا تھا اور جب بڑے برگد کے پیچھے چوپال میں آتا تو اسے بیٹھنے کو جگہ بھی مل جاتی۔ اور میری والدہ بھی اس کا اتنا خیال کرتی تھیں کہ جب میں گاؤں کے اور لڑکوں کے ساتھ اس کے پاس سے کہانیاں سُن کر آتا۔ تو مجھے بہانے کا حکم نہ دیتیں۔

لبھو دُبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی تھا۔ اس میں بھالے کی سی سختی اور تیر کی سی تیزی تھی۔ اس کا ماتحور دہ جسم بہت قوی تھا۔ وہ پہاڑیوں پر ہرنوں کا پیچھا کرتا تھا! اور دیپ سنگھ صوبہ دار کی گھوڑی کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ وہ تھا تو دیپ سنگھ کے گھر کا شکاری مگر جب کبھی دیپ سنگھ کا انگریز یا کوئی اور دوست مہمان اسے شکار کے دِکھانے کے لئے رکھ لیتا۔ تو وہ اس کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ شاید وہ اپنے جسم کی مضبوطی ہی کی وجہ سے شکاری بنا تھا لبھو کا رنگ بالکل سیاہ تھا جب کبھی وہ کوئی جوشیلا گیت گاتا یا کسی خوفناک کہانی کو ختم کرتا۔ تو اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگتے تھے۔ اس کی المیہ نظموں اور پھڑکدار کہانیوں کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں اس کا فرمانبردار شاگرد بن گیا۔ اور اس نے مجھے خرگوش کا پیچھا کرنا اور کتوں سے شکار کھیلنا سکھایا۔ اس نے مجھے یہ بھی سکھایا کہ تپتی گرمیوں میں دن بھر گھر سے غائب رہنے کے بعد ابا کو چکر دینے کے لئے کیسی کیسی واردات تراش کر سنا دوں۔

یہ شاگردی ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ میں اس کی باتیں بلا تنقید کئے نہیں مانتا تھا۔ میں اکثر کہہ اٹھتا تھا "لبھو! یہ تو نہیں ہو سکتا۔ ذرا شکار کا پیچھا اس وقت کیا جائے جب کوئی شخص پہاڑی پر کھڑا ہو۔"

اور وہ جواب دیتا "اچھا چپ رہو۔ یہ میں بعد کو بتا دوں گا۔ مجھے بات ختم کر لینے دو۔"

میں خاموش ہو جاتا، اور وہ سناتا رہتا کہ کس طرح وہ ہوا کی طرح پتھروں کو پھاندتا، بگولے کی طرح نکیلی چٹانوں پر سے کودتا اور پارہ کی طرح جھاڑیوں کے ایک گچھے سے گزرتا ہوا ایک چھوٹی سی جھاڑی پر جہاں بھاگی ہوئی ہرنی چھپی ہوتی جا پہنچتا تھا۔

میں نے کہا "چلو اچھا یہ بھی مان لیا کہ تم نے ہرنی کا اسی طرح پیچھا کیا تھا۔ لیکن وہ جو تم نے کہا تھا کہ ایک ہرنی کے بھیس میں چڑیل تھی وہ میں نہیں مانتا۔"

اس پر وہ کہتا "خدا گواہ ہے کہ وہ صحیح ہے یقین نہ آئے۔ تو صوبہ دار سے پوچھ لو۔ وہ کوئی ہوگی ہاتھی کے برابر۔ آنکھیں مرغی کے انڈوں کے برابر تھیں اور داڑھی مسجد کے مولوی شاہ دین کی جتنی لمبی۔ اس کا رنگ صرف مہندی جیسا سرخ ہی نہ تھا۔ بلکہ سیاہی مائل نیلا بھی تھا۔ اس کے کان ہاتھی کے کانوں کے برابر تھے۔ مگر وہ چلنے کی بجائے صوبہ دار کی گھوڑی کی طرح کنوتیاں بدلتے تھے۔ وہ دیوی پربت کی چوٹی جتنی بلند معلوم ہوتی تھی۔ ہم اور صوبہ دار شکار کی تلاش میں ۱۲۰۰ فٹ کی بلندی پر چڑھ گئے تھے۔ کہ اچانک وہ عالم ارواح سے نکل آئی۔ پہلے تو تیز سیٹیوں اور پتھروں کے لڑھکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر گرج ہوئی اور پہاڑ ایک طرف سے شق ہو گیا! اور اس میں سے یہ جانور نمودار ہوا۔ دُور سے صرف سیاہ دھبہ سا معلوم ہوتا تھا۔ ہم لوگ بدستور اس کی طرف بڑھتے رہے تھے یکبارگی نزدیک پہنچنے پر ہم نے دیکھا کہ وہ کیا ہے۔ وہ ہم کو اپنی مرغی کے انڈوں کی سی آنکھوں سے تکتی رہی۔ اور پھر پہاڑ کو ایک ٹھوکر مار کر غائب ہو گئی۔"

میں قصہ سے کچھ کچھ متاثر ہوا لیکن میں نے پھر کہا "نہیں ایسا نہیں

ہو سکتا۔"

"تمہیں ایسا ہی ہوا تھا۔ بیوقوف یہ کون چیز ہے۔ واقعہ تو وہ ہوا تھا جب ہم جان صاحب کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔"

پھر اس نے ایک عجیب و غریب سانپ کی داستان کہہ سنائی۔

میں اس پر بھی اعتراض کر بیٹھا۔ "جھوٹ۔ بالکل جھوٹ!"

اس نے بگڑ کر کہا۔ "اچھا تو جھوٹ ہی سہی پھر تم سنتے کیوں ہو؟ جاؤ اب میں تمہیں کچھ بھی نہ سناؤں گا!"

میں اس سے بگڑ کر چلا آیا۔ اور اب اس سے بیحد خفا تھا اور جو لوگ اس کی برائیاں کرتے تھے اب وہ منتا رہتا۔ اس کی برائی کرنے والوں میں میرے آبا اور صوبہ دار بھی حصہ لیتے تھے۔ کیونکہ وہ ذات میں تو ضرور اونچے تھے مگر اس جیسے شکاری نہیں تھے۔ صوبہ دار کہتے۔

"وہ کیا شکاری ہے کسی نالے کے پاس چھپ کر بیٹھ رہتا ہے اور ایک آدھ جو بھولا بھٹکا جانور آ جاتا ہے اسے مار گراتا ہے۔"

ابا کہتے ———۔

"وہ بک جھوٹا گپ اڑیا ہے۔ جب میرے ساتھ گیا تو صرف ایک خرگوش کے بچے کو مار سکا۔ وہ بھی گولی اس کے پاؤں میں لگی۔"

بھو سے میں ناراض تو تھا ہی اب جو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو میں نے جی میں کہا کہ اچھا آنے دو تو کہوں گا کہ ابا اور صوبہ دار سے معلوم ہو گیا۔ تم کیسے بہترین شکاری ہو!!!

جب بھو واپس آیا تو وہ لنگڑا اور بیمار معلوم ہوتا تھا۔ اسے عاجز دیکھ کر مجھے اتنا ترس آیا کہ میرا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ بیمار ہو کر اس میں ایک زبردست تبدیلی ہو گئی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح قصے نہیں کہتا تھا بلکہ ایک کنارے پڑا کراہتا رہتا اور آپ ہی آپ بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اور کبھی کبھی شام کو ایک بڑا سا ڈنڈا لیکر باہر نکلتا تھا۔ لوگ کہتے کہ اب جو اسے جھوٹے قصے سننے کو کوئی نہیں ملتا ہے تو اپنے آپ سے کہا کرتا ہے۔ اس پر سبھی آپس میں دو چار فقرے کس کر ہنسا کرتے۔

مجھے ایسا ترس آیا کہ ایک دن میں اس کے یہاں گیا۔ وہ اپنے کچے مکان میں پیپل کے نیچے ایک ٹوٹے ہوئے پلنگ پر پڑا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "کیوں گورو بھو۔ تم آ گئے؟"

"بیٹا مجھے آئے کئی دن ہوئے۔ تم کو ڈھونڈا بھی۔ مگر تم کہیں نظر نہ آئے۔ جانتے ہو کہ مُردہ تو اپنے گھر میں بھی نہیں جا سکتا۔ یہ میرا پاؤں ایسا تکلیف دیتا ہے کہ مجھ سے ہلا بھی نہیں جاتا۔"

مجھے خیال ہوا کہ پچھلا جھگڑا بھول گیا ہے اور مجھے وہی سمجھتا ہے جو پہلے سمجھتا تھا۔ میں نے پوچھا!

"کیا تم چٹان یا کہیں کسی اونچی جگہ سے گر پڑے؟"

"نا ——— نہیں!" یہ کہکر وہ خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"بیٹا تم جانتے ہو۔ . . . . ."

بھو نے کہنا شروع کیا۔ پہلے تو وہ ذرا رک رک کر کہہ رہا تھا پھر اپنے پرانے طرز پر مسکرا مسکرا کر کہنے لگا ———،

"میں کلدیپ سنگھ کے ساتھ نیپال گیا تھا۔ ان کو شکار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ کلدیپ سنگھ نے فوج میں جو کچھ بھی کیا ہو لیکن وہ ٹھوس نشانہ نہیں لگا سکتا۔ اور اس کے ساتھ جو صاحب لوگ تھے وہ ایسے اندھے تھے کہ میں اپنی چھڑی سے جانور دکھاتا اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ لیکن پھر بھی بندوق ایسی گڑبڑ رکھتے یا پاؤں سے ایسا دھم دھم کرتے کہ جانور بھاگ جاتے۔ میں چپ ہو رہتا اور کچھ نہ کہتا کیونکہ وہ بچے تھے۔ انہوں نے سینکڑوں کارتوس برباد کر ڈالے مگر شکار کچھ بھی نہ مارا۔ اور روز ہم سے کہتے کہ شکار لا دو۔

"پہلے تو میں نے کہا کہ شکار وہی شکار ہے جو آدمی خود مارے لیکن آخر مجھے ترس آ گیا اور میں نے کہا کہ اچھا ان کو کچھ شکار تو دلا ہی دو۔ میں نے ۲ شیر ——— ۵ چیتے اور بہت سارے ہرن سات دن میں مار دیئے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوئی شین کے سفرنامے کی جو سرکاری رپورٹ ہے اُس میں درج ہے کہ نئی دنیا کے باشندے بُدھ مت سے قطعی ناواقف تھے۔ بلکہ کابل کے رہنے والے پانچ بودھ بھکشو ۴۵۲ء میں امریکہ پہونچ گئے تھے جنہوں نے وہاں بودھ کی کتابیں، تعلیم اور مورتیاں رائج کیں۔ ان قدیم سیاحوں نے امریکہ کے بعض آدمیوں کو تبلیغ مذہب بھکشو (راہب) بنایا۔ اور سیاحوں کی صحبت کے اثر سے اہلِ امریکہ کے رسم و رواج بالکل بدل گئے۔ ہوئی شین نے امریکہ میں اگاوہ کپڑے کے بننے کا طریقہ اور درخت گادو پر سیب نما پھل لگتا ہے اُس کا حال بھی اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے۔ دیگر وہ اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ

"اُس ملک میں تانبا بکثرت ہے لیکن لوہے کا نام و نشان تک نہیں۔ یہاں سونے چاندی کی کچھ قدر نہیں کی جاتی۔ تجارت آزاد ہے۔ لیکن اشیا کی قیمتوں کے نرخ مقرر نہیں"

اس کے علاوہ وہ تمام رسم و رواج، تعاریب، میلے ٹھیلے، شہروں اور قلعوں کی بابت لکھتا ہے:۔

"اس ملک کے تمام رسم و رواج اصلاح کے محتاج نہیں، تعاریب بڑے شاندار پیمانہ پر منائی جاتی ہیں لیکن شہروں کی از حد کمی ہے قلعے بھی بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں"

جو باتیں ہوئی شین نے بیان کیں ہیں اُن کی تائید تمام و کمال اُن تحقیقات سے ہوتی ہے۔ جو سائنسدانوں نے میکسیکو میں آثار قدیمہ کے بارے میں کی ہیں میکسیکو میں روایت ہے کہ ۴۹۹ء میں یہاں ایک غیر معمولی شخص آیا تھا۔ جو سر سے پاؤں تک لٹکے ہوئے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں اور چادر میں ملبوس تھا۔ اُس نے لوگوں کو تمام برائیوں سے بچنے۔ زہد و اتقا اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے اور نشہ سے پرہیز کرنے کی تعلیم دی چند سال بعد لوگ اس شخص کو بہت ستانے لگے اور جب اُس کو اپنی جان کا خطرہ ہوا تو وہ یک لخت غائب ہو گیا۔ بعد میں اُس کے پاؤں کا نشان ایک اونچی چٹان پر پایا گیا۔ جو کیلیفورنیا میں واقع ہے۔ یہاں اُس کی یادگار میں "قدم شریف" کا نشان قائم کر دیا گیا ہے۔ اس کے شمال کی طرف سے پار کو کی راہ سے ایک اور مذہبی رہنما کوئیٹزا کواٹل نامی اپنے چند مریدوں کی معیت میں امریکہ آیا۔ یہ لوگ غالباً پہلے بودھ مت کے مبلغین تھے جو میکسیکو پہنچے۔ اگر پرانے ناموں کی تحقیق کی جائے۔ تو ان سے بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ میکسیکو میں بُدھ مت رائج تھا۔

واضح رہے کہ بُدھ نام ایشیا میں صرف بدھ ہی مشہور نہیں۔ بلکہ اکثر دیگر اسما کے ساتھ بھی لیا جاتا ہے۔ مثلاً گوتم یا ساکھیا گوتم نوان کا خاندانی نام اور ساکھیا اُن کی قوم تھی۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ "گواتیماہ" "ہواتماموا" یا "گواتموزن" میں لفظ گوتم موجود ہے۔ اسی طرح "اوکساکا" "کائیکاس" "ساکاوونات" "نیاساکا"، اور دیگر ناموں میں لفظ "ساکا" یا ساکھیا موجود ہے۔ مقام پالنیکو کے قریب بُدھ کا ایک بُت ہے جس پر لفظ "شایک مول" کندہ ہے۔ غالباً یہ "ساکھیا منی" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ دوسرا ثبوت یہ ہے۔ کہ شمالی چین کے مقتدیان مذہب کو "لامہ" کہتے ہیں۔ اور میکسیکو میں مذہبی صاحبِ اختیار شخص کو بھی "تلامہ" کہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ قدیم سنگ تراشی، لوحین بت، زیورات، منادر اور اہرام جو میکسیکو میں پائے جاتے ہیں۔ اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کسی زمانے میں بودھ مت پھیل گیا تھا۔ مقام کامپیشیہ میں ایک بہت بڑا بُت پایا گیا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بدھ مت کا عالم ہے۔ جو اپنے پورے مذہبی لباس میں ہے۔ دوسرا بُت بمقام پالنیوم ستیاب ہوا ہے جس میں بدھ مت کا ایک بھکشو دو شیروں کی پُشت پر آسن جمائے دکھایا گیا ہے۔ اوکسمائی اور پالنیکو کے پرانے مندروں میں اور قدیم مکانوں کی دیواروں میں طاقچوں پر بُدھ کی تصویریں بنی ملتی ہیں۔ پیرس کے عجائب گھر میں بُدھ کا ایک بُت ہے جو ریاست میکسیکو سے لایا گیا تھا۔ بہت سے مندروں کی دیواروں پر چینی اژدہا کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں مشرقی تہذیب و تمدن کا سکہ رواں تھا۔ اگر اسی قسم کی مزید تحقیقات کی جائے تو کولمبس کی شہرت اولیت خاک میں مل کر رہ جائے۔
(ترجمہ از نیویارک ٹائمز)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

احمد ندیم قاسمی

بچپنہ

اس وقت میری عمر یہی کوئی آٹھ دس برس کی ہوگی۔ شہتوت کے درختوں پر لمبے لمبے رس بھرے شہتوت لٹک رہے تھے جیسے وہ صرف میرے ہی حلق سے اُترنے کے لئے بیتاب ہیں۔ منہ میں پانی بھر آیا، لنگوٹا کھینچ تنے سے چمٹا اور اپنے ہمجولیوں کی "شاباش شاباش" کے نعروں کے سہارے اوپر چڑھنے لگا ہوں۔ تو میں یہ سوچتا ہی گیا کہ شہتوت کے درخت ایک جگہ جا کر ختم بھی ہو جاتے ہیں، منہ اُٹھا کر اوپر جو دیکھا تو صرف ایک نازک سی کونپل اپنے چوڑے پتے تھرتھراتی نظر آئی اور اس سے پرے صاف نیلا آسمان ——— اور نیچے!.....

نیچے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے، گنجان پتوں سے میری نگاہیں نہ چھن سکیں۔ لمبے لمبے رس بھرے شہتوت مجھے زہریلے کیڑوں کی طرح ٹہنیوں سے لٹکے دکھائی دینے لگے ——— اب اُتروں کیونکر!—

ہاتھ پیر پھول گئے! حلق خشک ہو کر کڑوا محسوس ہونے لگا جیسے بے جانے بوجھے کوئین کی گولی چبالی ہو، روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اور خوف و دہشت کی دھن میں مجھے تعجب ہونے لگا۔ کہ میں یہاں تک چڑھا کیسے! جس ٹہنی سے میں چمٹا ہوا تھا وہ دوسری ٹہنیوں سے یوں الگ تھلگ کھڑی تھی جیسے امیر لڑکیوں کے مجمع میں ایک مفلس چھوکری ——— پھیپھڑوں کی پوری قوت اور گلے کے پورے پھیلاؤ سے کام لیکر میں پکارا: "بھائی عبداللہ!"

اور نیچے میرے خلیرے بھائی عبداللہ نے آواز دی: "کب کے ہم لوگ چادریں پھیلائے کھڑے ہیں، کوئی ٹہنی دھیمی جھٹکاؤ۔ اوپر بیٹھے اکیلے شہتوت نگلے جا رہے ہو!"

کلیجے پر جیسے کسی نے مرچیں چھڑک دی ہوں! میں چیخ اُٹھا۔ "ارے میں اُتروں کیسے؟"

اور عبداللہ بولا: "جیسے چڑھا ہے ویسے ہی اُتر آ ——— لیکن اگر اُترنے سے پہلے تو نے ٹہنیاں نہ جھٹکائیں تو ہم مار مار کر ناتی بنا دیں گے تجھے ——— بلّی کی طرح اوپر چڑھتا گیا اب گلہری کی طرح نیچے اُتر آ!"

اور میں رونے لگا: "قسم خدا کی، میں گر جاؤں گا، میں یہاں بہت اونچا چڑھ آیا ہوں!"

دور جا کر عبداللہ اور دوسرے ساتھیوں نے جو دیکھا تو آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اور پھر ہدایات کا طوفان شروع ہو گیا: "ارے لٹک کر نیچے والی ٹہنی پر انگوٹھے ٹکا دے ——— اور جب تک انگوٹھے اچھی طرح نہ ٹک جائیں اوپر سے ہاتھ نہ چھوڑیو! اور دیکھو۔ نیچے والی ٹہنی پہ بہت زور نہ دیجو ورنہ ٹوٹ جائیگی ——— بہت کمزور دکھتی ہے!"

آنکھ کے ایک پلکارے میں میں نے ہزار بار ارادہ کیا کہ نیچے لٹک جاؤں۔ لیکن نیچے والی ٹہنی مجھے اتنی دور دکھائی دیتی تھی کہ خوف سے میری ہتھیلیوں اور پاؤں کے تلووں میں آگ سی جلنے لگتی تھی۔ آخر اللہ کا نام لیکر میں جونہی لٹکا ——— اور انگوٹھوں کو نیچے والی ٹہنی پر جمایا ہے کہ تڑاخ کی آواز آئی اور میں موٹی موٹی ٹہنیوں سے ٹکراتا، پتوں کے پردوں کو پھاڑتا دھب سے نیچے آ رہا! کہتے ہیں میں بہت دیر تک بیہوش رہا۔ پورے دو مہینے ہسپتال میں رہا اور جب وہاں سے نکلا تو ڈاکٹروں نے صرف اتنا کہا کہ ویسے تو تندرستی بالکل اچھی ہے۔ صرف دماغ پر ضرب آئی ہے۔ اس کا اثر زندگی بھر زائل نہ ہوگا۔ اس کی نگرانی کی جائے!

میری نگرانی یوں ہونے لگی کہ مجھے گھر سے باہر قدم دھرنے کی اجازت نہ تھی۔ گلی ڈنڈا کھیلو تو گھر کی چار دیواری میں! چھپن چھوت کا شوق ہو تو اپنے مکانوں ہی میں! کبڈی کی دھن سماتے تو اپنے دالان ہی میں خاک اڑاؤ ——— چند روز تو طبیعت میں بےچینی سی رہی۔ چاندنی راتوں

میں جب لڑکے باہر کھیتوں میں کبڈی کھیلتے اور اُن کی مسرت بھری چیخوں کی گونج میرے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی تو میں بیتاب ہو کر پلنگ پر بیٹھ جاتا ——" امی۔ مجھے جانے دو" —— امی مجھے ہولے سے تھپکا کر کہتی: "نہیں نہیں میرے ننھے۔ آج کل سانپ اور بچھو اور کنکھجورے اور —— اور جن بھوت گلیوں میں رینگتے پھر رہے ہیں —— اتنے اتنے لمبے سانپ اور بیرِ بچھو! اور میری انگلیوں جتنے لمبے کنکھجورے اور —— اور اس بیری جتنے اُونچے اُونچے بھوت —— کھا جاتے ہیں کبڈی کھیلنے والوں کو!"

اور میں دہشت زدہ ہو کر کہتا: "لیکن باہر دوسرے لڑکے ——"

"یہ لڑکے!" امی کے ہاتھ کی تھپک تیز ہو جاتی ہے: "یہ لڑکے تو چڑیلوں کے بچے ہیں۔ اور تم اپنی امی کے لال!"

عقل کی منطق کا پیٹ بہت مشکل سے بھرتا ہے۔ میں کہتا: "لیکن عبداللہ بھی تو اُن میں شامل ہے۔ پھر خالہ اماں بھی چڑیل ——"

میرے منہ پر ماں ہاتھ رکھ دیتی: "وہ —— وہ عبداللہ! اُس پگلے کی یہ آوارہ مزاجی کبھی رنگ لائے گی۔"

لیکن آخر گھر کی چار دیواری میں ہی ساری کائنات سمٹ آئی اور صحن میں گلی ڈنڈا کھیلتا رہتا —— جو گلی چار دیواری سے اُچھل کر پرے جا گرتی، تو کھیل ختم ہو جاتا۔ امی کا حکم تھا کہ "ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر ایک چڑیل بیٹھی رہتی ہے جس کے لمبے لمبے دانت ہیں، اُلٹے پاؤں ہیں۔ اور ماتھے پر صرف ایک پاؤ بھر کی آنکھ ہے۔ اگر تو باہر گیا تو دبوچ لے گی تجھے!"

میں کہتا ہوں مگر امی۔ ابھی ابھی تم بھی باہر گئی تھیں پھر چڑیل نے تمہیں کیوں نہ چھیڑا؟" —— وہ جواب دیتی: "اُسے صرف تجھ سے ضد ہے۔ خبردار باہر جانے کا نام تک نہ لینا!"

میرے دل میں خلش سی رہتی۔ کہ یہ چڑیل صرف میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے، میں ایک بار چپکے سے ڈیوڑھی کے باہر جھانک بھی آیا لیکن چڑیل مجھے نظر نہ آئی اور پھر امی نے بتایا کہ چڑیلیں نظر نہیں آیا کرتیں!

ایک بار میں ایک کمرے میں بیٹھا تیسری جماعت کی کتاب پڑھ رہا تھا

کہ دوسرے کمرے میں مجھے امی اور ابا کی باتیں سُنائی دیں۔ امی کہہ رہی تھیں: "اب ننھے پر یہ قید کب تک رہے گی؟ خیر سے خاصہ سیانا ہو گیا ہے تم نے ڈاکٹروں کی بات یوں پلّے باندھ لی ہے جیسے اس ڈیوڑھی سے باہر اُس کے لئے خدانخواستہ —— خدا نہ کرے، کوئی کھائی کھدی ہوتی ہے!"

اور ابا نے کہا: "باہر نکل کر اگر وہ کوئی اُلٹی سیدھی بات کر بیٹھا تو الزام مجھ پر ہی آئیگا۔ ڈاکٹر میرا ہی منہ نوچیں گے

اُس کا دماغ نت نئی باتیں سوچتا ہے، ابھی کل ہی دیوار میں دو گز اونچی کیل ٹھونک کر اور اُس پر جوتا رکھ کر اُسے پاؤں سے گرانے کی کوشش کر رہا تھا!"

اور امی بولی: "لیکن شاید تم بھول گئے ہو کہ اپنے وقت میں تم نے ایک خاصے اُونچے مکان کی منڈیر پرسے پاؤں مار کر جوتا گرا لیا تھا لوگ کہتے رہے کہ گردن توڑ بیٹھو گے لیکن تم ہرن کی طرح قلانچیں بھرتے نیچے۔ دیوار پر دو ڈگ بھرے اور جوتا ہوا میں اچھل گیا۔ میں ایک کوٹھے پر سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ یاد ہے نا؟"

"لیکن میں شہتوت کے درخت سے نہیں گرا تھا!" ابا ہنس کر بولے۔

اور امی تنگ آ کر کہنے لگی: "تو پڑا سڑنے دو بیچارے کو۔ تم بوڑھے ہو گئے تو کمائے گا کون۔ آسمانوں سے ہمارے لئے من و سلویٰ اُترنے سے تو رہا۔ عقل کے ناخن لو!"

اور دوسرے تیسرے روز مجھے اسکول بھیج دیا گیا۔ میری ذہانت کی دھاک بندھ گئی۔ پہلی جماعت کا طالب علم ہوتے ہوئے میں تیسری اور چوتھی جماعت کی کتابیں فر فر پڑھنے لگا۔ چوتھی میں وظیفہ حاصل کیا۔ آٹھویں میں وظیفہ حاصل کیا۔ اور دسویں کا امتحان نزدیک تھا تو ابا چل بسے!

آنکھوں سے آنسو خشک ہوئے تو چار طرف کہرا سا اُتر آیا۔ مستقبل کا ہیولیٰ غولِ بیابانی کی طرح میرے خیالات کے ارد گرد منڈلانے لگا گھر میں گوشت کے بجائے دال پکنے لگی! دودھ کے بجائے چھاچھ ملنے لگی! گائے بک گئی تو چھاچھ کی جگہ تالاب کے گدلے پانی نے لے لی ۔ گل

میں فیس کی معافی کی درخواست دی جو نامنظور ہوئی۔ نام کٹا کر گھر آ گیا۔ عزیزوں سے قرضہ مانگا کہ دکان کھول لوں مگر ہر طرف سے ٹکا سا جواب ملا۔ مزدوری کرنے سے جی ڈرتا تھا کیونکہ خاندان کی عزت کا پاس تھا ـــــ تھک ہار کر بیٹھ رہا!

سردیوں کے دن تھے، امّی انگیٹھی میں بجھتے ہوئے اُپلے رکھ کر اندر لے آئی اور کہنے لگی "ذرا اُتر کھاٹ سے اور ہاتھ پیر سینک لو۔ بلا کا جاڑا پڑ رہا ہے!"

میں نے کھاٹ سے اُترتے ہوئے مایوسانہ لہجہ میں کہا "لیکن امّی یہ اُپلے تو ابھی راکھ بن جائیں گے!"

امّی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولی "تو کہاں سے لاؤں میں پتھر کے کوئلے کہ رات بھر جلتے رہیں تیرا ابا روپیہ بچانا تو جانتا ہی نہ تھا۔ تُو ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھا ہے۔ ادھر شہروں کی طرف نکل جا۔ کہتے ہیں وہاں پڑھے لکھوں کی ضرورت رہتی ہے۔ اور اللہ رکھے تو تو نو جماعتیں پاس کر چکا ہے"

امّی مجھ سے تنگ آ چکی تھیں۔ اُن کی مادرانہ محبت میں مجھے شک نہیں لیکن بے روزگار فرزند کو کبھی نہیں بھاتا اور امّی تو آخر انسان تھیں میں نے اُس رات شہر میں جا کر قسمت آزمائی کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اور جب امّی کو اس ارادے سے آگاہ کیا تو خاموش ہو گئیں۔ اور بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد رونے لگیں! میں نے تسلیاں دیں تو بولیں "لیکن بیٹا مجھے یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا مجھے، ڈاکٹر کہتے تھے کہ ـــــ" اُس کی آواز بھرّا گئی!"

"جہنم میں جائیں دُنیا بھر کے ڈاکٹر" میں نے تنگ آکر کہا "ایک بار شہتوت کے درخت سے گرا اور ابھی تک اُس چوٹ کا تذکرہ چلا آتا ہے میں بھلا چنگا ہوں۔ تم میری ماں ہو۔ مجھے پالنے پوسنے والی ـــــ میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ امّی۔ تم تو بھولی ہو!"

اور امّی نے میری گردن چوم لی!

دوسرے دن میں پانچ روپے لیکر گاڑی پر سوار ہوا اور راولپنڈی جا نکلا۔ یہاں پولیس کے ایک انسپکٹر صاحب کے ہاں ایک کام مل گیا۔ اُن کا ایک بچہ دوسری اور ایک تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں اُن کا ٹیوٹر مقرر کر دیا گیا۔ پندرہ روپے تنخواہ تھی اور روٹی کپڑا مفت۔ آسان کام تھا چند دنوں میں دل لگ گیا۔ ایک مہینے کے بعد امّی کے پاس دس روپے بھیج دیئے۔ دل پر سے غم واندوہ کا غبار ڈھل گیا۔ زندگی پیاری اور دُنیا حسین معلوم ہونے لگی!

میرا کمرہ بڑے پھاٹک کے متصل تھا۔ ایک رات میں ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ کہ پھاٹک پر دستک ہوئی! زنجیر کھولی تو دو عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی اور دوسری نوجوان۔ برقعے اوڑھے اور چہرے کھلے! ہاتھوں میں ننھے ننھے چرمی تھیلے! ادھیڑ عمر والی خاتون بولی "تم کب سے آئے ہو یہاں؟"

میں نے کہا "جی بس ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے۔ یہاں بچوں کو پڑھاتا ہوں!"

اور وہ دونوں اندر چلی گئیں!

میں صبح سویرے اُٹھا۔ ننھے میرے کمرے میں آئے تو میں نے پوچھا "یہ نئے مہمان کون آئے ہیں تمہارے ہاں؟"

جواب ملا "ایک ہماری خالہ ہیں اور دوسری ہماری خلیری بہن ہے ثریا!"

"کب تک ٹھہریں گی یہاں" میں نے پوچھا۔

"خدا جانے" جواب ملا۔

جب میں بچوں کو پڑھا چکا اور یونہیں چہل قدمی کے لئے صاف کپڑے پہن کر باہر نکلا۔ تو پھاٹک پر ثریا کھڑی تھی!

مجھے دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں اور ایک طرف ہو گئی۔

اور راولپنڈی کی صاف ستھری اُونچی نیچی سڑکوں پر چلتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں کسی نے عنبر اور لوبان اور قوسِ قزح گھول دی ہے۔ اور جیسے میرے دل کے دریچے اچانک پھٹ کر کھل گئے ہیں اور اُن میں سے خوشبوؤں کی لپٹیں اور رنگوں کے مرغولے اندر آئے ـــــ میں یونہیں بلا وجہ مسکراتا۔ اور گنگناتا

رہا اور جب مسکراتے اور گنگناتے تھک گیا تو ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور شہر کے حسین ترین حصوں کے چکر لگاتے، جب لوٹا تو ایک بج چکا تھا گھر کی ملازمہ زینت پھاٹک پر کھڑی میری راہ تک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پکاری "آپ نے تو بہت دیر لگا دی منشی جی"

اور جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو بولی "لے آؤں کھانا"

"لے آ" میں نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

کھانا لے آئی تو بولی "پانی لے آؤں!"

"لے آ" میں نے کہا۔

پانی لے آئی تو بولی "جاؤں؟"

"جا" میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

اور جب وہ جانے لگی تو میں نے محسوس کیا کہ اس نے دروازے پر جا کر مجھے پلٹ کر دیکھا ہے۔

اس کا یہی معمول تھا۔ لیکن آج اس کی ہر حرکت میں مجھے کئی اسرار پنہاں نظر آ رہے تھے۔ آج تو جیسے میرے چھوٹے سے دماغ کو کسی نے تیز دھونکنی سے دھکا دیا تھا۔ مجھے دیوار پر لٹکے ہوئے کلنڈر کی تصویر میں بھی نئے رنگ جھلکتے نظر آئے، اور باورچی خانہ میں کام کرتی ہوئی زینت کے کپڑوں کی آواز میں کئی دلربا نغمے سنائی دینے لگے۔ میں ان رنگوں اور نغموں کے ہجوم میں گھرا بیٹھا تھا۔ کہ آواز آئی "اور پانی لا دوں؟"

"لا دے" میں نے کہا اور جب میں نے گلاس اٹھا کر زینت کے ہاتھ میں تھمانا چاہا۔ تو میرا انگوٹھا اس کی انگلیوں سے مس ہو گیا اور وہ گلاس کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر ہاتھ جھٹکاتے ہوئے بولی "ہے ہے منشی جی! آپ کا ہاتھ کتنا گرم ہے!"

اور جب وہ پانی لیکر آئی تو ساتھ ہی کونین کی دو گولیاں بھی لیتی آئی "کونین بھی لے لیجئے۔ کہیں بخار نہ ہو جائے آپکو۔ آج آپ کا چہرہ بھی لال ہے۔"

"بہت اچھا" میں نے کہا "میں ممنون ہوں تمہارا"

اس نے مسکرا کر برتن اٹھائے، اور جب دروازے تک پہنچی تو مجھے پلٹ کر دیکھا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر بہت پیاری مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اور میں پسینہ کا روغن کھرچنے لگا!

دروازے سے نکلی تو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی! اور پھر ایک طرف سے پلٹ کر چل دی۔ ادھر سے ثریا میرے دروازے کے قریب سے گزرتی پھاٹک تک گئی اور پھر دروازے تک آ کر بولی "کیا وقت ہے منشی جی؟"

"جی میرے پاس گھڑی نہیں" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اور وہ دیر تک پھاٹک پر کھڑی رہی اور جب اندر جانے کے لئے میرے دروازے کے سامنے سے گزری تو میری طرف دیکھا اور اپنے پاؤں کی ہر چاپ پر میرا دل دھڑکاتی گئی۔ دیوار پر کلنڈر والی تصویر جیسے اپنی ہتھیلیوں کو گھما گھما کر ناچنے لگی ہو میں نے جاسوسی ناول کو اٹھا کر الماری میں پٹخ دیا۔ اور دیر تک بے معنی باتیں سوچتا رہا اور جب بہت سوچ چکا تو میرا دماغ بے سرو پا خیالات کے ہجوم سے پھٹا پڑا تھا۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند کوسوں دور تھی۔ آرام کرسی پر جا کر بیٹھا تو جیسے زمین نیچے سے ہٹ گئی ہو۔ دیر تک کمرے کے چکر کاٹتا رہا۔ اور جب تھک گیا تو بچے پڑھنے آ گئے۔

رات پڑتے ہی میرے دل کے نہاں خانوں سے خیالوں کے پتنگے ابل پڑے اور دو روشن چہروں کے ارد گرد منڈلانے لگے۔ میں نے اپنے احساسات کے کارواں کو دوراہے پر کھڑا محسوس کیا۔ ادھر ثریا تھی اور ادھر زینت! ادھر تکمیل بیگانگی تھی اور ادھر دھندلکوں میں لپٹی ہوئی دلچسپی! لیکن ادھر حسن کے ارد گرد زریں ہالا تھا اور ادھر گرد و غبار۔ قدم ڈگمگائے۔ لڑکھڑایا اور میرے سارے جذبات کے پتنگے میرے ارادے کے تیز جھونکوں میں اڑے اور ثریا کے چہرے کے زریں ہالے کا طواف کرنے لگے! زینت کے تصور کی دھندلی شمع

نسما کر بجھ گئی۔ میں خواب اور بیداری کے درمیان دھندلے خلا میں
رات بھر محو پرواز رہا۔ اور جب صبح آنکھ کھلی تو سامنے زینت کھڑی تھی۔

"چائے نہ پئیں گے آپ؟" اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

"لے آؤ" میں نے کہا۔

وہ دروازے تک جا کر واپس پلٹی اور کہنے لگی: "بخار اُتر گیا ہے کیا؟"

——— اور وہ میرے قریب آکر بولی: "دیکھوں تو۔"

اور اُس نے میری کلائی تھام کر نبض کی تلاش شروع کی۔

"آج تو شاید تمہیں بھی بخار ہے۔" میں نے کہا: "تمہاری انگلیاں بھی
تپ رہی ہیں۔"

اور وہ میری کلائی دبا کر بولی: "جی ہونا چاہیئے تھا مجھے۔ میں رات
بھر جاگتی رہی۔"

میں نے اُوپر دیکھا تو اُس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں اور گال تمتما
رہے تھے۔

جب میں چائے پی چکا تو کچھ دیر کے بعد بچے پڑھنے آ گئے۔

میں بچوں کو اردو پڑھا رہا تھا کہ ادھر سے ثریا گزری۔ بچوں کو
دیکھ کر اندر چلی آئی اور دری پر بیٹھ کر بولی: "بچے کیسے ہیں منشی جی؟"

"اچھے ہیں۔" میں نے ثریا کی مرمریں گردن پر بکھرے ہوئے
نیم زریں نیم سیاہ بال دیکھتے ہوئے کہا: "خالد کو اپنی کتاب کی بیشتر
نظمیں یاد ہیں اور ریاض جمع تفریق کے سب سوال نہایت آسانی سے
حل کر لیتا ہے۔"

اور وہ خالد کی پیٹھ ٹھونک کر بولی: "شاباش خالد تم شاعر ہو گے
اور ریاض صاحب کلرک بنیں گے ضلع کچہری میں۔ ریاض تم کیا بنو گے؟"

ننھا ریاض حیران آنکھیں جھپکا کر بولا: "ڈپٹی کمشنر۔"

"اور تم خالد؟"

"شاعر۔"

"کوئی شعر یاد ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولا۔

"سناؤ تو ایک" ثریا بولی۔

اور خالد بولا۔ "ہیں لوگ وہ جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے"

"شاباش" ثریا بولی: "بڑے پتے کا شعر یاد کر رکھا ہے۔"

اور ثریا میری طرف دیکھ کر بولی: "ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اپنا
ننھا بھائی یہاں بھیج دیں۔ خالو میاں آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔"

جب وہ چلی گئی اور بچے بھی کچھ دیر کے بعد کھیلنے کے لئے باہر نکل
گئے تو میں پلنگ پر بیٹھ کر اپنی کتابیں الماری میں سجانے لگا۔ کچھ دیر کے
بعد ثریا آئی اور بولی: "کوئی اچھی سی ادبی کتاب ہوگی آپ کے پاس؟"

میں نے پرانے رسائل کی ایک فائل جھاڑ کر کہا: "یہ ادبی
رسالے ہیں۔"

"آپ کو ان میں کونسا افسانہ یا نظم پسند ہے؟" اُس نے
جھک کر پوچھا۔

میں نے ایک افسانہ نکال کر کہا: "یہ" ——— اوپر دیکھا تو
وہ افسانے کی بجائے مجھے دیکھ رہی تھی۔

آنکھیں جھپک گئیں ہم دونوں کی۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز
میں پوچھا: "کونسی بات اچھی ہے اِس میں؟"

"مرد عورت کی غیر فانی وفا" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ اور
اُس نے مسکرا کر فائل اُٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور میں دن بھر مسرور رہا کہ میں ایک ایسی بات کہنے میں کامیاب
ہو گیا تھا جو بڑے بڑے حوصلہ مند نوجوان برسوں کی کوشش کے بعد
بھی ادا نہیں کر سکتے!

شام کو جب بچے پڑھ چکے تو وہ پھر میرے پاس آئی اور بولی۔
"بہت اچھی کہانی تھی۔ میں نے اُسے دو مرتبہ پڑھا ہے، لیکن ———"
اور وہ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

اور وہ میرے قریب آکر بولی: "لیکن افسانہ نگار نے مرد کو بہت

زیادہ وفا شعار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ در اصل مرد کی محبت
عورت کی محبت کے پاسنگ بھی نہیں ہوتی!"

یہی وقت تھا جب تذبذب کے قلعے کا آہنی
دروازہ کھٹ سے کھل گیا۔ اور اس کے بعد راتوں
کی سنسناتی ہوئی تنہائیوں میں میں نے اُس کمرے میں ثریا کی زلفوں کے
خم گنے۔ اس کے ماتھے کے نور اور اُس کے ہونٹوں کے رس اور
اُس کی باہوں کے گداز کی باتیں کیں۔ کائنات میرے لئے بہت وسیع
ہو گئی۔ اور میرے دل و دماغ میں بھوک اور غم کی سڑاند بکھرنا پیدا ہو گئی
تنخواہ پندرہ کے بجائے بیس روپے ہو گئی جو نت نئے لباسوں پر خرچ
ہو جاتی تھی۔ بالوں میں کنگھی کرنے میں میں آدھ گھنٹہ صرف کر دیتا۔
گلے میں ٹائی باندھنے کے جدید طریقے میں نے ہر شناسا سے دریافت
کئے۔ میں نے ایک گھڑی خرید لی!

ثریا بلا کی ذہین اور طباع دوشیزہ تھی۔ جب وہ باتیں کرتی
تو اچھے مصنفوں کی کتابیں گرد معلوم ہونے لگتیں۔ جب وہ مسکراتی
تو روشندانوں کے شیشوں میں سے جھانکتے ہوئے ستارے ماند پڑ
جاتے۔ جب وہ میرے قریب ہوتی تو ساری کائنات دم سادھ لیتی!

لیکن جب صبح ہوتی تو زینت مسکراتی ہوئی میرے سامنے چائے
کا طشت رکھ کر کہتی: "آپ خاموش کیوں ہیں؟" تو چاروں طرف غیر مرئی
اجسام ناچ ناچ کر تالیاں بجانے لگتے اور میرے روئیں روئیں میں دل
دھڑکنے لگتا۔ ایک روز جب میں چائے پی رہا تھا اور وہ خاموش
میرے پاس کھڑی تھی تو میں نے یونہی اُوپر دیکھا وہ مسکرا رہی تھی!

میں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا: "تم یہاں آ کر ہر وقت مسکراتی رہتی
ہو، یہ ٹھیک نہیں۔ میں ایسا کم ظرف نہیں کہ گھر کی ملازمہ سے عشق کی
پینگیں بڑھاؤں۔ مجھے اور بہت سی مصروفیتیں ہیں۔ سُنا؟"

اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اپنے گلے کو ایک ہاتھ سے
دبا کر بولی: "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ——"
اور وہ کمبخت رو دی!

میں نے کہا: "تم میرے کمرے میں نہ آیا کرو۔ سمجھیں؟ کوئی
اور ٹھکانا ڈھونڈو۔ مجھ پر ان شعبدوں کا اثر نہیں ہو سکتا۔ میں آوارہ
نہیں!"

وہ چلی گئی اور شام پڑتے ہی میں اپنے پلنگ پر چادر کی شکنیں
درست کر رہا تھا تو اُس نے ہولے سے دروازہ کھولا اور کچھ بولنے
کے لئے لب ہلائے کہ میں نے کہا: "نکل جاؤ میرے کمرے سے
نکل جاؤ! ورنہ میں بی بی جی کو بتا دوں گا!"

"منشی جی!" اُس نے ہراساں آواز میں کہا: "منشی جی۔ بی بی
کے لئے ——— میں نے ———"

اور میں بات کاٹ کر بولا: "منشی جی کی بچی! دور ہو جا میرے
سامنے سے۔ گھر کی نوکرانی سے مجھے عشق کرنا نہیں آتا۔ میں ایسا ذلیل
نہیں!"

اور دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے وہ
کاٹنے کیلئے کسی تیز چھرے کی تلاش میں جا رہی ہے!

رات کے دس بجے تھے۔ کہ حسب معمول ثریا چپکے سے کمرے
میں آئی چٹخنی چڑھا کر پردے کھینچ دیئے۔ اور میرے پلنگ پر گر پڑی۔
ہر روز کی دہرائی ہوئی باتیں ہوتی رہیں۔ اور جب وہ تھک گئی
تو میں نے کہا: "ثریا۔ میں نہیں جانتا۔ کہ ہمارا مستقبل کیا ہو گا۔ لیکن باور
کرو۔ کہ میری زندگی کا ہر ہر لمحہ تمہارے نام سے منسوب ہو چکا ہے۔ قانون
اور رواج کے بھوت ہمارے دلوں پر کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس
مقدس حرم میں ان ناپاک روحوں کا گزر نہیں۔ میں تمہارے قدموں پر ——"

چھنا چھن! میرے کمرے کے دروازے کا شیشہ ٹوٹ کر فرش پر
بکھر گیا۔ ایک ہاتھ نے پردہ چُن کر ایک طرف کر دیا! زینت کی پھٹی پھٹی
آنکھیں ہم دونوں کو گھورنے لگیں۔ اور پھر آواز آئی: "ہوں۔ یہ بات ہے!"

اور وہ لوٹ کر بھاگی اور پکاری: "بی بی جی۔ بے بی بی جی!"

ثریا گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میرا دماغ بم کے دھماکے سے
پھٹ گیا۔ میں وحشیوں کی طرح بھڑک کر اٹھا۔ ثریا سے ٹکرایا۔ اور وہ

زنکھٹا کر میرے بکس پر جاگری۔ اور جب اُٹھی تو کونے میں مکڑی کے جالے
س کے بالوں سے لپٹ گئے!

چٹخنی کھول کر میں باہر بھاگا۔ پھاٹک کا دروازہ کھول رہا تھا کہ
زنانخانے سے زینت کی آواز آئی۔ "دونوں بی بی جی! دونوں اکٹھے
ایک پلنگ پر ماشٹی جی اور ثریا بی!" ——— میں پھاٹک کھول کر
باہر لپکا۔ اور آن کی آن میں راولپنڈی کی اونچی نیچی سڑکوں پر اُڑتا
اسٹیشن پر پہنچا

اور جب گاڑی چلنے لگی تو اچانک امی یاد آگئی۔ اور امی
کی یاد نے میری گذشتہ زندگی کے سارے ورق تیزی سے اُلٹنے
شروع کر دیئے۔

اور جب میں گھر پہنچا۔ تو نو بجے رات کا وقت تھا۔ امی انگیٹھی میں
بجھتے ہوئے اُپلے ڈالے ہاتھ سینک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر میری
طرف بڑھی۔ میری گردن کو چوما۔ اور فرط محبت سے بولی۔ "تو کتنے پیسے
لایا ہے میرے لال؟"

اور میں پھوٹ پھوٹ کر روتا فرش پر لیٹ گیا۔ میری جیب سے
ساڑھے تین آنے نکل کر انگیٹھی کے نیچے لڑھک گئے!

جدید ہندوستانی ادب کے ہر مدرسۂ فکر کو آپ اسمیں پائیں گے!

ترقی پسند فسانہ نگاروں، شاعروں اور مقالہ نویسوں کے خیالات

کا البم

نئے زاویئے

مرتبہ

کرشن چندر

ہندوستانی ادب کے موجودہ دور کے ہر بڑے مصنف کی تحریر اس کتاب میں موجود ہے

فہرست:۔ راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، ایس۔ ایچ واتسائن، ن۔ م۔ راشد، احمد علی، احمد عباس، احمد ندیم قاسمی
موہن سنگھ، فیض احمد فیض، دیواندر ستیارتھی، ملک راج آنند، پریس (دھرم پرکاش آنند)، اختر اورینوی، ممتاز مفتی، گوپال متل،
شیلا بیبر، شانتا کیرنن، سہیل عظیم آبادی، سنت سنگھ سیکھوں، سلام مچھلی شہری، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، مطلبی فرید آبادی،
میراجی، نیم چندر، حسن نذیر، احسان دانش، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، کرشن چندر۔ قیمت بلا جلد عہ۔ مجلد مع ڈسٹ کور تین روپے۔

مکتبہ اُردو لاہور

سلام مچھلی شہری

اندھیرا چھا رہا ہے!

یہاں سے میل بھر کے فاصلے پر عیش گاہوں میں
ان ہی پگڈنڈیوں سے دُور اُن شفاف راہوں میں
یہیں اس جھونپڑے کی رہنے والی کی نگاہوں میں ——— اندھیرا چھا رہا ہے!

یہ ساری زیبِ تن اب اس کا کر لینا ہی بہتر ہے
یہ سیندور، ہاں مِرا اب مانگ بھر لینا ہی بہتر ہے
غرض جس طرح ہو پہلے سنور لینا ہی بہتر ہے ——— اندھیرا چھا رہا ہے!

"ان ہی کے گھر پہ کیوں دولت کی آخر ڈھیر ہوتی ہے؟"
"طبیعت کیا ان ہی دو بوتلوں میں سیر ہوتی ہے؟"
"ذرا کچھ تیز کر دو کار مجھ کو دیر ہوتی ہے!" ——— اندھیرا چھا رہا ہے!

یونہی بے ربط سی کچھ منتشر آواز آتی ہے
سیاہی شہر کی سڑکوں پہ لیکن چھاتی جاتی ہے
اور اُس کوٹھی پہ "رک کر" کامنی "کچھ مسکراتی ہے ——— اندھیرا چھا رہا ہے!

"تو کیوں فرصت نہیں "سرکار" کو، یہ کون آیا ہے؟
یہ کس نے چھیڑ کر ساز ایک نغمہ گنگنایا ہے؟
سپاہی! جا رہی ہوں، اس قدر کیوں تلملایا ہے؟" ——— اندھیرا چھا رہا ہے!

"یہی اُمید تھی آئندہ سے کیا آسرا ہوگا!
"وہ" اتنے دن سے بیمار، اب دوا کا کل سے کیا ہوگا
ارے موہن ابھی تک راہ میری تک رہا ہوگا!" ——— اندھیرا چھا رہا ہے!

"تو ہاں! روٹی کا اب گھر میں سہارا ہی نہیں شاید
وہاں، کوٹھی پہ خود تو نے پکارا ہی نہیں شاید
پھر آج اچھی طرح خود کو سنوارا ہی نہیں شاید!" ——— اندھیرا چھا رہا ہے!

ادبِ لطیف

نومبر ۱۹۴۱ء

جوش ملیح آبادی
عبدالرحمٰن چغتائی
فیض احمد فیض
راجندر سنگھ بیدی
رشید جہاں

مکتبہ اردو لاہور

پانچ آنے

نگران
فیض احمد فیض

ادارت
چودھری برکت علی

چندہ سالانہ
چار روپے چار آنے

فی پرچہ
پانچ آنے

ادبِ لطیف لاہور

جلد ۱۳ — نومبر ۱۹۴۱ء — شمارہ ۳

مندرجات

اشارات	[illegible]	۳
غزل	مرزا محمود بیگ شاد	۴
[illegible]	فیض احمد فیض	۵
[illegible]	جوش ملیح آبادی	۷
[illegible]	مجید لاہوری	۸
[illegible]	راجندر سنگھ بیدی	۹
[illegible]	فیض احمد فیض	۱۴
[illegible]	کرتار سنگھ دُگل	۲۰
[illegible]	احمد ندیم قاسمی	۲۳
[illegible]	عبدالرحمٰن چغتائی	۲۴
[illegible]		۲۵
اُردو شاعری اور قنوطیت	مسعود احمد قریشی	۲۹
خواب	شاہد صدیقی	۳۳
نیلوفر	[illegible] شریا	۳۴
غزل	تپش ایم۔ اے	۳۹
رخصت	محمد امین شرقپوری	۴۰
غزل	توقیر طاہر	۴۲
آنسو	یوسف ظفر	۴۳
ذکر	ترجمہ بالکرشن مضطر	۴۵
ٹھڈ پک	شفیق الرحمٰن	۴۹
ہوسٹل کا ایک کمرہ	ابراہیم جلیس	۵۵
ملک پیا کی نگر میں حسرت	رشید جہاں	۵۶

اشارات

موجودہ ادب۔ ادبِ اُردو کے موجودہ رجحانات کے متعلق مختلف اطراف سے مختلف قسم کے شبہات اور خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ موجودہ شاعری کے متعلق نقادانِ فن کی آرا خاص طور سے متناقض ہیں۔ موجودہ شاعری کا کوئی مستقبل ہے یا نہیں، موجودہ تجربات کا کوئی جواز ہو بھی یا نہیں، موجودہ تحریک سے ادبِ اُردو کو فائدہ پہنچا ہے یا نقصان، یہ تحریک ہماری مشرقی روایاتِ ادب سے کہاں تک مطابق ہے۔ اس قسم کے کئی سوالات ہر روز سننے میں آتے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ بحث کچھ بے کار سی ہے۔ اس لئے کہ ہم سے چند ایک کی تحریر یا گفتگو اس کا رخ نہیں بدل سکتی۔ اگر ہمارے سامنے مختلف اسالیب اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے لکھنے والے ادیب موجود ہوں تو ہم ان میں سے کسی ایک گروہ کی تحسین اور کسی دوسرے گروہ کی مذمت بھی کر سکتے ہیں لیکن اس وقت تو یہی موجودہ ادب اچھا بُرا جیسا بھی ہے ہمارے سامنے ہے۔ پرانے لکھنے والے یا لکھنے سے بالکل دست بردار ہو چکے ہیں یا اتنا کم لکھتے ہیں کہ ان کی تحریریں کافی تعداد میں ہمارے سامنے نہیں آتیں۔ اس لئے ہمیں بخوشی یا بجبر یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ ہمارے ادب کا مستقبل یہی نئے لکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے اور اب اگر ہم یہ چاہیں کہ یہ لوگ اپنی افتادِ طبع کے مطابق نہیں ہمارے اقتضائے ذہنی کے تحت لکھا کریں تو یہ ہمارا تحکم بھی ہوگا اور کوتاہ بینی بھی۔ رہا یہ سوال کہ ان تجربات کا کوئی جواز ہے یا نہیں تو اس کے متعلق مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہر ادبی تجربہ کا خارجی جواز اس کی کامیابی اور مقبولیت اور داخلی جواز اس کا یقین اور محسوس حسن۔ موجودہ ادب کی مقبولیت کے متعلق زیادہ شک کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ البتہ اس کا ادبی حسن بحث طلب مسئلہ ہے لیکن یہاں دقت یہ آن پڑتی ہے کہ ہم تمام موجودہ ادب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانے کے ادب میں اچھے لکھنے والے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی لیکن موجودہ ادب پر بحث کرتے وقت ہم اس تقسیم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دورانِ بحث میں اگر آپ کسی ایک اچھے لکھنے والے کا نام پیش کریں تو معترض صاحب فرماتے ہیں کہ اسے تو ہم بھی مانتے ہیں لیکن ہمیں فلاں اور فلاں پر اعتراض ہے۔ رفتہ رفتہ یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں چند ایک ایسے لکھنے والوں سے اختلاف ہے جن کی تحریریں پہلے ہی سے ہر معیار کے ناقص ہیں۔ مشرقی اور مغربی روایات کا مسئلہ اور بھی زیادہ آسان ہے۔ زبان یا ادب کا ارتقا ایک مسلسل عمل ہے جس میں ہر نوع کے اثرات نفوذ پذیر ہوتے رہتے ہیں اور آپ کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس کی مدد سے آپ ان اثرات کو روک سکیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر ادب میں چند بنیادی خصوصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان پیہم انقلابات کے باوجود قائم رہتی ہیں۔ جیسے ایک انسان کی شخصیت عمر کے مختلف ادوار اور تجربات کی مختلف اقسام سے گزرنے کے بعد بھی ایک ہی رہتی ہے جس طرح ان تمام انقلابات کے باوجود [illegible] کئی تجربات کو سرے سے قبول کر لینے کی اہل نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہر زبان اپنی لچک اور وسعت کے باوجود کئی ایک تغیرات کو اپنا نہیں سکتی۔ جدید ادب میں بھی چند عناصر ایسے بھی ہوں گے جو شاید ہماری زبان کا مستقل جزو نہ بن سکیں لیکن ان کے مقابلہ میں کئی ایک رجحانات ایسے بھی ہیں جن سے ہماری زبان کو مجبوراً مفاہمت کرنی پڑے گی۔

سالنامہ۔ سالنامہ کی تیاری شروع کر دی گئی ہے۔ شعراء میں سے جوش، جگر، جلیل، فراق، راشد، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیارپوری، حفیظ جالندھری، احسان دانش، امین حزیں، ساغر صہبائی، گوپال متل، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی [illegible]

[illegible] کی نظموں، غزلوں، افسانوں اور ڈراموں کا نہایت ہی خوبصورت اور دلکش ایک دوسرے شعراء کی شرکت کی توقع ہے۔ مضامین کے لئے اختر شیرانی، سید امتیاز علی تاج، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، اور افسانوں کے لئے احمد علی، رشید جہاں، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، اختر اورینوی، اختر انصاری، احتشام حسین رضوی، ملک راج آنند، اختر حسین رائے پوری، پروفیسر فیاض محمود ایم۔ اے، احمد ندیم قاسمی، اوپندر ناتھ اشک، مرزا عبدالقادر، حجاب امتیاز علی، سہیل عظیم آبادی، شفیق الرحمٰن، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، مسعود جاوید، شکیلہ اختر، سراج الدین احمد نظامی، دھرم پرکاش دیپ ریشی، پروفیسر کنہیا لال، چراغ حسن حسرت اور کئی ایک ممتاز اہل قلم کو دعوت دی جا چکی ہے، اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی آرٹ کے چند نادر نمونے بھی بغرض اشاعت دستیاب ہو چکے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ سالنامہ کو ہر لحاظ سے ایک معیاری حیثیت حاصل ہو لیکن اس کوشش کا اتمام ہمارے پرانے اور نئے کرمفرماؤں کے ہاتھ میں ہے۔ امید ہے کہ وہ ہمیں مایوس نہیں فرمائیں گے۔

تازہ مطبوعات

نقشِ فریادی پروفیسر فیض کے فکر و فہم نے اردو شاعری میں نئی راہ پیدا کی، قدامت اور اس کی تمام روایات کو اس انداز میں ترک کیا گیا کہ پرانے اور نئے اسالیب کے امتزاج سے ایک فکرِ نو پیدا ہوا۔ پروفیسر فیض اردو شاعری کے جدید اسکول کے بہت بڑے مبلغ اور شارح ہیں۔ وہ الفاظ کے بیجان پیکر میں ایک ہیجان سے پیدا کر دیتے ہیں۔ فیض کی نگاہ تیز مل و موم کر چیر جاتی ہے۔ فیض کا ہر شعر قاری کے سامنے ایک ایسا راز فاش کرتا ہے جسے فن کار صدیوں سے چھپائے ہوئے تھے۔ قیمت عہ

آیات و نغمات شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کے افکارِ نو کا تازہ مجموعہ۔ اردو شاعری کے دورِ ارتقا کی جیتی جاگتی تصویر۔ قیمت سے

ماورا اردو کے جواں سال اور جواں فکر شاعر ن۔ م۔ راشد کے کلام کا مجموعہ۔ اس مجموعے میں راشد کی مقفیٰ نظمیں اور سانیٹ ہی شامل نہیں بلکہ وہ جدید آزاد نظمیں بھی ہیں جنہوں نے راشد کو موجد اور پیشرو کی حیثیت سے ایک لازوال شہرت بخش دی ہے۔ لکھائی چھپائی، گرد پوش بہترین، قیمت عہ، خاص ایڈیشن صہ

منٹو کے افسانے زندگی کی داستان بہت مختصر ہے، منٹو نہ اصلاح پسند ہے نہ پراپیگنڈسٹ۔ منٹو کے افسانے اردو ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہیں۔ لکھائی چھپائی گرد پوش بہترین۔ سائز ۲۷×۱۷ قیمت دو روپے آٹھ آنے

آؤ سعادت حسن منٹو کے دس ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ قیمت عہ

پاپی اوپندر ناتھ اشک کے آٹھ حزنیہ، طنزیہ، مزاحیہ اور طربیہ ڈراموں کا مجموعہ، جو سکولوں، کالجوں اور ڈرامیٹک کلبوں میں بڑی آسانی سے کھیلے جا سکتے ہیں۔ قیمت عہ

مکتبہ اُردو — لاہور

مرزا محمود بیگ ساز

غزل

تشکیلِ نشیمن کیوں کیجے تخریبِ گلستاں کیوں کیجے
ہر برق کو دعوت کیوں دیجے ہر شاخ کو لرزاں کیوں کیجے

ہر در پہ آنسو بہہ نکلے اُمید کبھی دل ٹوٹ گیا
جب صبر کا دامن چھوٹ گیا تسکین کا ساماں کیوں کیجے

اپنوں سے اُمیدیں ٹوٹ گئیں دنیا کی یہی جب ریت رہی
کیوں اور کسی کا دم بھریئے برباد دل وجاں کیوں کیجے

جب بارِ محبت اُٹھ نہ سکا جب عہدِ وفا تک توڑ دیا
اب آپ بھلا کیوں نادم ہوں اب حال پریشاں کیوں کیجے

اک آس لگی تھی ٹوٹ گئی اُمید تھی پوری ہو نہ سکی
اپنی ہی تمنا جھوٹی تھی اب شکوہ دوراں کیوں کیجے

اُمید کی کشتی ساحل تک آنے ہی لگی تھی ڈوب گئی
بے بیٹھے بلائیں موجوں کی اب دل کو ہراساں کیوں کیجے

اب ساز گذر ہی جائیگی، اے درد کے دعائیں یہ کیسی
جس درد نے سب کچھ لوٹ لیا اس درد کا درماں کیوں کیجے

فیض احمد فیض

حالی ایک ادبی باغی کی حیثیت سے

بظاہر مولانا حالی کیلئے باغی کا لفظ کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں باغی کے معنی گمراہ کے ہیں اور ایک شریف امن پسند شہری کے ذہن میں باغی کا تصور کچھ ناخوشگوار سا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ باغی ایک سرپھرا اوباش سا آدمی ہوتا ہے جو شریفوں کی طرح چپ چاپ زندگی کے دن پورے کرنے کی بجائے بیٹھے بٹھائے کوئی فساد کھڑا کر دیتا ہے۔ سوچ بچار، عقل و شعور، معاملہ فہمی اور موقعہ شناسی سے قطعاً سروکار نہیں رکھتا۔ جوشیلا، خود سر، تیز مزاج، کم فہم انسان لیکن یہ تصویر ایک ناکام باغی کی ہے۔ جب کوئی باغی کامیاب ہو جائے تو یہ تمام برائیاں دھل جاتی ہیں پھر وہ باغی نہیں رہتا مصلح یا ریفارمر یا ہیرو یا نبی یا ولی بن جاتا ہے۔ اس کے بعد ہمیں اس میں خوبیوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ سوچ اور تفکر، زمانہ شناسی اور تدبر، خلوص اور ایثار یہ سب صفات ہم ایک کامیاب باغی کی ذات میں موجود پاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ گمراہ ہونے کی بجائے رہنما بن جاتا ہے۔ اس کی اطاعت کو سلامت روی اور اس کی نافرمانبرداری بغاوت تصور کی جاتی ہے۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ دنیائے ادب میں مولانا حالی باغیوں کے کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی بغاوت کی نوعیت کیا تھی اور اسے کہاں تک کامیابی ہوئی۔ ادیب سماج کی زبان ہے۔ ادب کی دنیا سماج کی دنیا کا ایک خاکہ ہے۔ جو تحریکیں سماج کی دنیا میں رائج ہوتی ہیں انہیں کا عکس ادبی رجحانات پر بھی پڑتا ہے۔ جب سماج میں کوئی انقلاب آتا ہے۔ یعنی پیداوار، صنعت و حرفت، آمد و رفت کے ذرائع بدلتے ہیں۔ رہنے سہنے کے طریقوں میں فرق آتا ہے۔ طرز حکومت مختلف ہو جاتی ہے۔ تو سماج کے خیالات اور جذبات میں بھی انقلاب آتا ہے اور یہی انقلاب ادبی بغاوتوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جس طرح سب لوگ سماجی حالات کے بدلتے ہی اپنی وضع قطع تبدیل نہیں کر ڈالتے ہیں اسی طرح بہت سے لکھنے والے بھی وقت کے تقاضے کو نہیں پہچانتے اور پرانی لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں۔ البتہ جو ادیب زیادہ حساس ہوتا ہے جس کی نگاہ زیادہ تیز اور جس کا مشاہدہ زیادہ صحیح ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے پہلے اپنی تحریروں کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے ایسے ہی ادیب کو ہم مصلح یا ریفارمر یا کامیاب باغی کہتے ہیں جب تک سماج کی ناؤ دھارے پر آرام سے بہتی چلی جائے اس کے کھینے والے جنہیں ادیب بھی شامل ہیں آنکھیں بند کئے ہاتھ پہ ہاتھ رکھے کسی ایک انداز میں بیٹھے بہتے چلے جاتے ہیں انہیں یہ ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ گرد و پیش دیکھیں یا کشتی کو کسی نئی رو میں ڈالیں۔ لیکن جب چلتے چلتے یہ نیا کسی بھنور میں پھنس جائے تو آنکھیں کھولے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ ہوا کا رخ، پانی کا بہاؤ، ساحل کا فاصلہ، کسی نئے دھارے کی تلاش، نیا والوں کو ان سب باتوں پر غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی آنکھیں اور بھی زور سے میچ لیتے ہیں کہ رام بھلی کرے گا۔ مولانا حالی کے زمانہ میں ہماری سماج ایک ایسے ہی بھنور میں تھی۔ مغلی حکومت کا چراغ بجھ چکا تھا۔ ملک میں ایک نئی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ پرانا جاگیری نظام ختم ہو چکا تھا۔ سماج ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ نئے حالات سے مفاہمت پیدا کرنے کے لئے لکھنے، سوچنے اور رہنے سہنے کے طریقوں میں ترمیم کی ضرورت تھی اور شعراء میں سے مولانا حالی نے سب سے پہلے اس انقلاب کی طرح ڈالی۔

ہماری پرانی اردو شاعری فارسی کی غزلیہ شاعری کا چربہ ہے۔ داخلیت، رومانیت اس شاعری کی صفات ہیں۔ فارسی میں یہ شاعری اس وقت کی پیداوار ہے، جب دنیا میں شاہیت کا زور تھا۔ جب سلاطین اور امراء کی طاقت انتہا پر تھی۔ جب دربار خوشحال تھے اور شعراء مالا مال۔ خلاف اس کے اردو

شاعری کا عروج اُس زمانہ میں ہوا جب دنیا میں شاہیت کا چراغ گل ہونے کو تھا۔ وہی شاعری جو فارسی میں ایک خوشحال بڑھتے ہوئے طبقہ کی ترجمان تھی اُردو میں ایک مٹتے ہوئے جاں بلب طبقہ کی نمائندگی کرنے لگی۔ ہندوستانی نوابوں اور اُن کے شعرا کو دنیا تاریک نظر آتی تھی اسلئے اُنہوں نے اُدھر سے منہ موڑ لیا۔ نہیں تفکر اور خیال سے ڈر لگتا تھا۔ اسلئے اُنہوں نے خیالات کے دروازے بند کر لئے۔ اُن کے مضمحل تھکے ہوئے قویٰ گہرے اور پُرجوش جذبات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اسلئے اُنہوں نے جذبات کے کھل کھیلنے اور کھول سے دل بہلانے کی کوشش کی۔ تیغ زنی اور معرکہ آرائی کی نقل میں مرغ بازی اور بٹیر بازی اور شاعری کی بجائے شعر بازی کا مشغلہ رائج ہوا۔ جب تک دربار قائم رہے یہ کھیل بھی چلتا رہا۔ دربار مٹے تو شعر کی کاغذی ناؤ بھی ڈولنے لگی یہی وہ وقت تھا جب مولنا حالی نے یہ کہہ کے پتوار سنبھالی کہ

ہو چکے حالی غزلخوانی کے دن — راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

اور

ہے وقتِ رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں — آخر ہوئی رات اور ابھی یاں شام ہے گویا

اُن کی بغاوت کا پہلا اور سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ اُنہوں نے شاعری کا رُخ داخلیت سے خارجیت کی طرف موڑ دیا۔ اپنے دل کی گہرائیوں کو کریدنے کی بجائے باہر کی دنیا کے حالات کو منظوم کرنا شروع کیا اور ان بدلتے ہوئے حالات میں قوم کے لئے ایک نیا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ دہلی کا مٹا ہوا شہر، پُرانے حکمرانوں کی ذلت، اپنی قوم کی تباہی بہت سے اجنبیوں وطن کی غداری یہ سب کچھ اُن کے سامنے تھا۔

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف — چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا — ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز

ہٹتے جاتے ہیں زورمند ضعیف — بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز

ہے نہنگوں کو رہگزر میں خطر — رہزنوں نے کئے ہیں ہاتھ دراز

ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم — بھیڑیوں کے ہیں غول میں ترلب آز

دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس — اور یاروں کے یار ہیں غمّاز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر — موج حائل ہے اور ہوا ناساز

خارجی حالات کو بیان کرنے کے لئے پُرانے رومانی نقطۂ نظر سے ہٹ کر واقعیت اور حقیقت کی طرف جھکنے کی ضرورت تھی۔ پرانے داخلی مضامین اور تصورات کی بجائے نئے تصورات اور نئے مضامین کی تلاش لازم تھی۔ چنانچہ دل جگر، رقیب، معشوق کی جگہ مولنا نے سب سے پہلے قوم اور وطن کے تصورات اُردو شاعری میں داخل کئے۔ ان کے لئے جذباتی معانی وضع کئے اور عوام میں ان کے لئے خلوص اور محبت پیدا کی۔ مولنا حالی اُردو کے پہلے قومی اور وطنی شاعر ہیں۔ اسلئے کہ مقامی تعلقہ داروں اور نوابوں کے زمانہ میں قوم اور وطن کا کوئی واضح جذباتی تصور موجود تھا ہی نہیں۔ پُرانے اُردو شعرا کی جذباتی وفاداری تمام تر نواب یا معشوق سے وابستہ تھی لیکن جب غیرملکی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے تمام قوم کی سیاسی سطح ایک ہو گئی۔ تمام ملک کا سیاسی نظام یکساں ہو گیا تو قوم اور وطنیت کے خیالات اُبھرنے شروع ہوئے اور مولنا حالی نے سب سے پہلے ان کی ترجمانی کی۔ نئے مضامین، نئے خیالات اور نئے نقطۂ نظر کے لئے نئے الفاظ، نئے اسالیب اور نئے طرزِ بیان کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مولنا حالی کی ادبی بغاوت کا دوسرا پہلو ہے۔ اُردو شاعری نے درباروں کی زیبائشی، پُرتکلف اور محدود فضا میں پرورش پائی اور شعرا نے اپنے لئے اسی کے موافق زبان انتخاب کی جس میں سادگی، متانت اور وقار کی بجائے نمائش پسندی، تصنع اور چھچھورا پن زیادہ غالب تھا۔ مولنا نے اپنے مضامین کی طرح اپنی زبان کو زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کی۔ اُن کی زبان بیانگ دہل

برستے ہوئے سے موسم میں

مجید لاہوری

[حیاتِ غالب کے اُن پر کیف لمحات کی نذر ــــ جو شغلِ نادِ نوشش کی نذر ہوئے ــــ مجید]

اُلجھے اُلجھے ہوئے سے ہیں افکار ــــ بگڑے بگڑے ہوئے سے ہیں اطوار
اِس برستے ہوئے سے موسم میں ــــ ہے فلک پر نگاہِ غم آثار
ہم کو ہے شکوۂ تہی دستی ــــ اور بھرپور ہے ترا بھنڈار
جام اشکستہ اور شیشہ تہی ــــ کچھ کھنچا سا ہے ابرِ بادہ بار!
زندگی پُر بہار، کیا معنی! ــــ زندگی جب ہو زندگی پر بار
ایسے جینے سے موت بہتر تھی ــــ موت کو بھی مگر ہے ہم سے عار
ہم نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں ــــ ہے عجب کشمکش میں جانِ نزار
اور سنتے ہیں اَن سُنی کر کے ــــ دکھ بھرے دل کی تو سنے گا پکار
واسطہ تجھ کو تیری رحمت کا ــــ تیرا دامن بھرا رہے بھنڈار
وہ سلامت رہو، جو ہے نہرِ وِلا میں ــــ جس سے ہے زاہدوں کے دل کو قرار
ہم وہاں بھی رہیں گے تشنہ دہاں ــــ تو جو دے گا ہمیں "عذاب النار"
جوشش میں یہ شیخ جی یہ کہتے ہیں ــــ "میکشو! تم پہ ہو خدا کی مار"
یہ جو ہم سے یہاں اُلجھتے ہیں، ــــ خلد میں بھی کریں گے یوں تکرار
ان بلاؤں سے رکھ ہمیں محفوظ ــــ جن سے جنت بھی ہو جہنم زار
یا ہمیں ہم ہوں خلد میں یارب ــــ یا ہوں یہ "زادگانِ استغفار"
ہم گنہگار اور جنت میں! ــــ ہے یہ گرتی سی وہم کی دیوار
تیرا قانون ہے اٹل یارب ــــ معدلت گستری ہے تیرا شعار
حق بحقدار ہو تو اچھا ہے، ــــ ہم ہوں اِس پار اور یہ اُس پار
اہلِ دوزخ جو ہیں وہ دوزخ میں ــــ خلد میں جنتوں کے "ٹھیکیدار"
مطمئن سی ہے "توبہ کی اولاد" ــــ کسی پہلو نہیں ہے ہم کو قرار
در ترا چھوڑ کر کہاں جائیں ــــ میکدے سے ملے نہ جن کو ادھار
اُن کے حقے کی ہم نہیں پیتے ــــ ہم کو دوزخ کی آگ سے ہے پیار
بخش دے ہم کو "آتشِ سیال" ــــ جام ہو حائلِ "عذاب النار"

آگ بن جائے آج پانی بھی
جاگ اٹھیں جاتے زندگانی بھی

راجندر سنگھ بیدی

(فارس، ایک ایکٹ)

اَب تو گھبرا کے......

افراد

خلیل بی کام . . . . بینک کلرک
جی گڈوانی . . . . بینک کا سپروائیزر
سردار صاحب، شریمتی جی . . . . . . بینک کے گاہک
خالقِ کائنات کی بھاری اور گڑگڑاتی ہوئی آواز، ریل گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے مشابہ
فرشتۂ موت

منظر

بینک کا ایک حصہ۔ کونٹر پر دو تین کلرک بیٹھے ہیں۔ ان کے پیچھے وہ الماریاں ہیں جن میں لیجر قرینے سے پڑی ہیں۔ الماریوں میں خالی جگہ اس بات کی مظہر ہے کہ کچھ لیجر حسبِ ضرورت نکالی گئی ہیں۔ کچھ کتابیں بے ترتیبی کے ساتھ سپروائیزر کی میز اور کونٹر پر پڑی ہیں۔ لیجروں کے پیچھے سے سپروائیزر کا صرف سر ہی دکھائی دیتا ہے۔

سپروائیزر کے پیچھے ایک ڈیس (Dais) پر سپرنٹنڈنٹ کی میز رکھی ہے۔ اس پر ٹیلیفون پڑا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب غائب ہیں۔

آجکل ششماہی کے دن ہیں۔ اس لئے سب سود لگانے میں مشغول نظر آتے ہیں۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے عجلت کا یہ عالم ہے کہ سپروائیزر صاحب اور ایک دو کونٹر کلرک عصبی طور پر بیمار نظر آتے ہیں۔

خلیل کچھ زیادہ ہی گھبرایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غالباً اُس کی بیوی گھر میں بیمار پڑی ہے۔ جس کی تیمارداری کے باعث وہ شب بھر آنکھ نہیں جھپک سکا۔ اسلئے کام کی زیادتی کے باوجود وہ کبھی کبھی ایک آدھ پل کے لئے اُونگھ جاتا ہے۔

وقت اور تاریخ۔ جیسا کہ کلاک اور کیلنڈر سے ظاہر ہے ساڑھے بارہ کے قریب، ۲۷ جون ۱۹۳۶ء

ایک کلرک:۔ (خلیل کے شانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے) چھٹی ملی خلیل میاں؟... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے چھٹی کیلئے درخواست دی تھی۔

خلیل بی کام:۔ (ایک لیجر کو بند کرتے ہوئے) چھٹی؟ کہاں ملی چھٹی...... عرضی ابھی اپنا بیوروکریٹک سفر طے کر رہی ہے۔ غالباً وہ سپروائیزر کی میز سے آگے نہیں جانے پائی۔ ابھی تک سپرنٹنڈنٹ کی میز صبح سے خالی ہے

کلرک:۔ بیگم کا مزاج کیسا ہے؟

خلیل:۔ میں کیا جانوں بھائی —— غالباً جی رہی ہوگی۔ صبح اُسے حرارت زیادہ تھی۔ بچے نے ابھی تک ماں کا دودھ نہیں پیا۔ ماما دودھ میں روئی بھگو کر اُسکے حلق میں ٹپکا رہی ہے۔ حالات تشویشناک ہیں۔

(لیجروں کی طرف دیکھ کر)

اُف اتنی لیجریں جمع ہو گئی ہیں۔ ابھی حساب دار آئیں گے اور پاس بُک کا تقاضا کریں گے۔ مسٹر گڈوانی بہت آہستہ کام کرتے ہیں۔ مکمل

زیادہ دیر تک خلیل میاں شریمتی جی کھڑی نہ رہیں۔ آپ
بینک کی دیرینہ سرپرست ہیں سمجھے؟ مسز سی ایل نہرو، مسٹر نہرو بھی
ہمارے مہربان ہیں محکمہ نہر میں ایگزیکٹو انجینئر ہیں شاید آپ جانتے
ہوں گے؟ (شریمتی جی سے) مسز نہرو، آپ کی انٹری ایک منٹ
میں کر دی جائے گی۔ تشریف رکھیں آپ، تشریف رکھیں ـــــ
(مسز نہرو ملتفت نہیں ہوتیں)

گڈ وانی:۔ (خفیف ہو کر) تم آ دیکھ رہے ہو خلیل۔

خلیل:۔ (رجسٹر دیکھ کر) آج کیا تاریخ ہے؟

(کوئی جواب نہیں دیتا)

(اونچی آواز سے)

سوبھی! او سوبھی ـــــ مسٹر گڈوانی سوبھی برابر ایک گھنٹہ سے
غائب ہے۔ میز پر لیجر پڑے ہیں، شکایات کے لئے میں ذمہ دار
نہیں ہوں۔ اور گر بڑ ایٹ ہونے کے لئے بھی۔ ۔ ۔ ۔

(گڈوانی صاحب خود لیجر اٹھاتے ہیں اور دستخط وغیرہ کرنے
ہوئے پاس بک شریمتی جی کو دے دیتے ہیں۔ شریمتی جی پاس بک
لیکر کچھ دور تک چلی جاتی ہیں۔ لیکن پھر پاس بک کھول کر بیلنس
دیکھتی ہوئی واپس آجاتی ہیں)

شریمتی جی:۔ مسٹر گڈوانی، دیکھئے یہ جو پاس بک آپ نے مجھے دی ہے یہ میری نہیں
ہے۔ یہ کسی آڑ ووالے کی ہے۔ سخت افسوس کی بات ہے کہ آپ
پاس بکوں کے بارے میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیتے ملاحظہ۔۔۔

خلیل:۔ آڑھوالا نہیں محترمہ ـــــ آهلو والیہ!

گڈ وانی: ہی ہی تخلص نہیں ـــــ کمبخت ذات ہے۔ ۔ ۔ ۔ اسمیں آپ
کا کیا قصور ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ہی ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ہی ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے بھی۔ ۔ ۔

شریمتی جی:۔ اوہ، آئی سی۔ ۔ ۔ ۔ تبھی تو میں حیران ہو رہی تھی کہ آڑھوالے
کے پاس دو اڑھائی ہزار روپیہ کیسے آسکتا ہے (تیز ہو کر) مجھے میری کاپی
ذرا واپس دے دیں۔ چوہدری روڈ پر میری کوٹھی بن رہی ہے اور مجھے وہاں فوراً
پہنچنا ہے معاف کیجئے۔ بینک کا نظام کچھ اتنا قابلِ تحسین نہیں ہے

میرے شوہر ایگزیکٹو انجینئر ہیں اور منیجر صاحب کے ذاتی دوست ہیں
شکایت کرونگی۔ Rubbish Bank This!

(سپرنٹنڈنٹ کی میز پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ گڈوانی پہنچ کر
رسیور اٹھاتا ہے)

گڈ وانی:۔ منیجر صاحب ہیں؟ ـــــ کل کی؟ ـــــ وہ چیک پر دستخط نہیں
ہوئے؟ مجھے افسوس ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تعجب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں ابھی
حاضر ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ آئندہ نہیں ہوگا جی ۔ ۔ ۔ ۔ کاؤنٹر پر ایک شریمتی جی
کھڑی ہیں ذرا ۔ ۔ ۔ ۔

(ٹیلیفون رکھتا ہے۔ دو قدم کاؤنٹر کی طرف جاتا ہے۔ پھر گھنٹی بجتی
ہے اور گڈوانی واپس آکر ٹیلیفون اٹھاتا ہے)

ہلو ۔ ۔ ۔ ۔ سردار امر سنگھ جی آہلو والیہ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ہاں ۔ ۔ ۔ ۔
جی ہاں ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں جی جی ۔ ۔ ۔ ۔ ایڈیٹ؟ (Idiot)
۔ ۔ ۔ ۔ کیا مطلب ہے آپ کا؟ ۔ ۔ ۔ آپ اپنی کاپی لے جائیں اور
مسز نہرو کی واپس کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ای بلاک؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ایڈیٹ؟

شریمتی جی:۔ نان سنس! ربش بینک دس!

گڈ وانی:۔ (ٹیلیفون رکھ کر) منیجر صاحب بھی بلا رہے ہیں۔ شریمتی جی! میں
ابھی چلا ۔ ۔ ۔ ۔ میں ابھی آیا ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے منیجر صاحب
کی طرف چلا اور آپ کی طرف آیا ۔ ۔ ۔ ۔

(کبھی جاتا ہے اور کبھی آتا ہے اور اپنی سراسیمگی میں نہایت مضحکہ خیز
دکھائی دیتا ہے)

(شریمتی جی کچھ دور جاکر ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں۔ خلیل اپنا سر
بوجھل محسوس کرتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں میں رکھ لیتا ہے
اور اونگھ جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ گویا وہ مر چکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ خالق
کائنات اور فرشتۂ موت نمودار ہوتے ہیں۔ خالقِ کائنات کو
بس پردہ، ایک تحکمانہ اور بھاری آواز سے ظاہر کیا جا سکتا ہے
فرشتۂ موت ایک سفید ریش، پرجلال ہستی ہے۔

منظر وہی ہے۔ لیجر اسی طرح پڑے ہیں۔ صرف وقت

لڑکی پیپر ویٹ اور شو پیس ہی وہاں سے چلے جاتے ہیں روشنی
بہت مدہم کر دی جاتی ہے)

خالق کائنات:۔ (پس پردہ آواز ـــ گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ
کے مشابہ) فرشتۂ موت۔

فرشتہ:۔ خالق کائنات۔

خالق:۔ نیا منشی کیسا ہے؟

فرشتہ:۔ مالک دو عالم! آپ کے ڈر سے بھی زیادہ دُم ہلاتا ہے
اور کان پھٹکتا ہے۔ گر بجوایٹ ہے۔ بی کام۔ گو شعبۂ اقتصادیات
میں مفید معاون ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے بینک میں اس کی
بہت ضرورت ہے۔

خالق:۔ تو وہاں اسے اسسٹنٹ منیجر بنا دیا جائے ـــ کیا
خیال ہے تمہارا؟

فرشتہ:۔ خداوندا! یہ شخص زندگی بھر کرشر کلرک رہا ہے۔ اسے
اس جگہ کا بہت تجربہ ہے۔

خالق:۔ کام تو بہت اچھا کرتا ہوگا ـــ گریجوایٹ ہے۔

فرشتہ:۔ خط نہایت عمدہ ہے۔ عالیجاہ ایک بات کہوں۔

خالق:۔ کہو۔

فرشتہ:۔ گھبراتا بہت ہے۔

خالق:۔ (ہنستے ہوئے) یہ اس کی سرشت ہے ـــ میری
کردار نگاری کا ایک نمونہ ہے۔

فرشتہ:۔ صرف گھبراتا ہی نہیں۔

خالق:۔ اور کیا کرتا ہے؟

فرشتہ:۔ کام کرتے کرتے اونگھ جاتا ہے۔

خالق:۔ دیکھو بھئی، اس کی بیوی بیمار ہے جس کی وجہ سے بیچارہ
رات بھر سو نہیں سکا۔

فرشتہ:۔ یہ تو دنیوی باتیں ہیں مالکِ کل ـــ یہاں کا کام تو
رکنے سے رہا۔

خالق:۔ اچھا! اس کی یہ عادت چھڑانے کے لئے اسے کان سے
پکڑ کر جگا دیا کرو۔

(فرشتہ خلیل کا کان مروڑتا ہے خلیل بہت درد محسوس
کرتا ہوا اور کراہتا ہوا جاگ پڑتا ہے)

خلیل:۔ (چونک کر) آج کیا تاریخ ہے؟

(کوئی جواب نہیں دیتا)

(اپنے ماحول سے واقف ہو کر)

اوہ! اب میں بینک میں نہیں ہوں۔ اے سفید ریش بزرگ
آپ کون ہیں؟ آپ کا پرجلال چہرہ مجھے بہت پسند ہے میں
آپ کا بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے بینک سے میری گلو خلاصی
کروائی لیکن ایک عرض ہے آپ سے نورانی چہرے والے
بزرگ سے میں کان پکڑ کر جگانے والے سلوک کا ہرگز متوقع
نہیں ہوں۔ وہاں تو مسٹر گڈوانی بھی کبھی اتنی جرأت نہ کر سکے اور
آپ.....

فرشتہ:۔ میں فرشتۂ موت ہوں۔

خلیل:۔ لیکن آپ گڈوانی سے بڑھ کر کیا ہوں گے؟

فرشتہ:۔ اچھا تو اب تم کیا چاہتے ہو؟

خلیل:۔ اول تو یہ کہ مجھے کان پکڑ کر نہ جگایا جائے۔ اور دوم میری
بیوی کو صحت کا جام بخشا جائے۔

فرشتہ:۔ مجھے دنیا کا صرف ایک کام سونپا گیا ہے اس سے بڑھ کر
اچھا صحت کا جام اور کیا ہوگا کہ میں انہیں یہاں لے آؤں۔

خلیل:۔ ٹھہرو، ٹھہرو ـــ مجھے آپ کے مخصوص کام کی ضرورت
نہیں۔ ابھی تو میری بیوی کے تین لڑکے ہیں اور ایک لڑکی
صحت کے جام کا آپ اُلٹا مطلب لیتے ہیں بزرگوارم!

فرشتہ:۔ دنیوی اقدار کے مطابق یہ بُری بات ہے حالانکہ حقیقت
ہے کہ کسی کی روح قبض کرنا اسے دنیا کی تمام تکالیف سے
نجات دلانا ہے۔ اس لحاظ سے یہ صحت کا جام نہ ہوا تو اور کیا

تھا؟ تم نے خود ابھی ابھی جیک سے گلوخلاصی کروانے کا
مشکر بیان کیا ہے۔ اس صورت میں تو......

(جانے لگتا ہے)

خلیل:۔ لیکن..... ٹھہریئے.....ماں کے تین لڑکے اور ایک لڑکی
فرشتہ:۔ انہیں بھی ساتھ لیتا آؤں؟
خلیل:۔ نہیں نہیں، یہ بات نہیں۔ مجھے دراصل ایک دن کی چھٹی چاہیئے
فرشتہ:۔ چھٹی؟..... یہاں کبھی چھٹی نہیں ہوتی... دوسرے لفظوں
میں یہاں ہمیشہ چھٹی ہے۔
خلیل:۔ کوئی بات نہیں میں ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ دے دوں گا۔
فرشتہ:۔ یہاں کوئی ڈاکٹری سرٹیفکیٹ منظور نہیں کیا جاتا۔ یہاں کی
چھٹیوں کو کوئی Fundamental اور
Apply رول Supplementary
نہیں کر سکتے۔ نہ ہی یہاں کوئی سول سروس ریگولیشن ہیں۔ جانتے
ہو خدا کے قوانین کی غیر مرئی کتاب اور دنیوی کتابوں میں کیا فرق
ہے؟

خلیل:۔ کیا فرق ہے؟
فرشتہ:۔ بس یہی کہ دنیوی کتابیں چھپتی ہیں۔ اور پھر رہتی دنیا تک اس
میں تبدیلیاں اور Correction Slips لگتی رہتی
ہیں۔ لیکن خدا کی غیر مرئی کتاب میں کبھی Correction
Slip نہیں لگی۔
خلیل:۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔
فرشتہ:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خدا کا قانون اٹل ہے۔ ایک دفعہ جو لکھا گیا
ہمیشہ کیلئے لکھا گیا۔ اس میں کسی غلطی یا ترمیم کا امکان نہیں۔
خلیل:۔ تو چھٹی کا سوال عذت؟
فرشتہ:۔ چھٹی؟..... جیک میں چھٹی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہاں بہت
کام ہے۔ کل کائنات کا حساب رکھا جاتا ہے۔ (لیجروں کی طرف
اشارہ کر کے)... یہ زحل کا، یہ مشتری کا...... اور کرنے

میں یہ چھوٹا سا لیجر زمین کا ہے۔
خلیل:۔ آہ!

(سرد آہ بھر کر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

اُف! اتنی لیجریں جمع ہو گئی ہیں۔ ابھی حسابدار آئیں گے۔
اور پاس بکوں کا تقاضا کریں گے۔ تعجب ہے اے فرشتہ
موت۔ یہاں بھی کام گھونگے کی رفتار سے ہوتا ہے۔ آپ بھی
مکمل ویرو فراخی دکھائی دیتے ہیں..... مسٹر گڈوانی کی سمع
آپ میں حلول کر گئی ہے کیا؟

(چپراسی کو بلاتا ہے)

سوہنی..... او سوہنی..... آقا! سوہنی متواتر دو گھنٹے
سے غائب ہے۔ یہ کام کیسے چلے گا؟ لیجریں کون اٹھائیگا؟
فرشتہ:۔ عزیز من! ابھی سوہنی کے اکیس سال اور دنیا میں باقی ہیں وہ
یہاں کیسے آسکتا ہے؟
خلیل:۔ تعجب ہے بزرگوارم! مگر وہ تو اس دنیا میں بھی موجود نہیں تھا۔
فرشتہ:۔ کیا مطلب؟
خلیل:۔ یہی کہ جب میں اُس دنیا میں تھا تو شاید کسی دوسری دنیا میں اس
کے اکیس سال باقی تھے۔

(کچھ دیر بعد ـــــ ایک بھاری لیجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

تو یہ لیجریں کیسے اٹھیں گی؟
فرشتہ:۔ یہ تمہارا اپنا کام ہے۔
خلیل:۔ واہ فرشتہ صاحب! اچھے رہے۔ مجھ سے یہ کام نہیں ہونے
کا...... آپ ہیں عزرائیل تو میں ہوں خلیل۔
فرشتہ:۔ یہاں کام نہ کرنے والے کو روحانی اذیت دی جاتی ہے۔
خلیل:۔ کیا روحانی اذیت دی جاتی ہے؟ کسی بے وفا عورت کے عشق
میں گرفتار کیا جاتا ہے؟
فرشتہ:۔ ٥٥٥ ـــــ اس انگلی کے اٹھنے پر ایک غیر مرئی کوڑا
حاضر کی روح کیساتھ پیوست ہو جاتا ہے۔

دُ نُھلی اُٹھاتا ہے ..... خلیل ایک آدھ منٹ کے لئے فرش
پر ادھر اُدھر لوٹتا ہے۔ اُٹھنے کے بعد مچکے سے اپنی پیٹھ پر
لیجریں لدوا لیتا ہے اور پھر ہانپتا ہوا اپنی جگہ واپس آتا ہے)

فرشتۂ موت :۔ دیکھو خلیل ــــ سینکڑوں کتابوں میں سود لکھنے
والا ہے ...... اور دیکھو کلکتہ میں سن کے ایک کارخانے
میں دو مزدور ایک عورت جھاریا نامی کے لئے لڑ رہے ہیں
ابھی ان دونوں نے مشین کے پٹوں میں آ کر مرنا ہے۔ پھر
۲۲۲ میں سب سیکشن کلکتہ نکالو۔ اور ان کے حساب بند کر دو۔

(خلیل کانپ جاتا ہے۔ کسی مشین کے بھاری بھرکم پہیوں کی آواز
آتی ہے۔ پھر مختلف ہلکی سی چیخوں کی جو ..... جھاریا .....
جھاریا ..... پر ختم ہو جاتی ہیں)

اور میں خود بھی تو یہاں سے نہیں ہلا۔ دودھ پڑا پڑا ٹھنڈا
ہو گیا ہے تمہاری قسم ..... اب تو پینے کو جی نہیں چاہتا۔

خلیل :۔ تعجب ہے۔

فرشتہ :۔ تعجب کس بات کا؟

خلیل :۔ یہی کہ آپ بھی دُودھ پیتے ہیں۔

فرشتہ :۔ اس کے سوا کوئی جی ہی کیسے سکتا ہے؟

خلیل :۔ کیا یہاں خالص دُودھ مل جاتا ہے۔ آپ کے سامنے بھینس
دوہتے ہوں گے۔ تو پھر آپ کے ہاں مسز عزرائیل بھی ہوں گی۔

فرشتہ :۔ ہمارے ہاں تمہارے ایسا دودھ نہیں ہوتا۔ ہمارا دُودھ
اور دہی غیر مرئی ہوتے ہیں۔ نہ وہ میٹھے ہوتے ہیں نہ پھیکے
وہ ہماری روح کی خوراک ہیں اور ہمیں ابدی زندگی بخشتے ہیں۔
ہماری بیگمیں نُوری ہوتی ہیں۔

خلیل :۔ جی سمجھ گیا ــــ سُنا ہے کہ خالق برتر کا یوم ولادت نزدیک ہے۔

فرشتہ :۔ تمہارا مطلب چھٹی سے ہو گا ــــ ارے بابا!
کہہ جو دیا یہاں کوئی چھٹی نہیں تمہیں کام کرنا پڑے گا۔

خلیل :۔ محترمی! کیا یہاں بھی بات ایریل (Half Yearly
یعنی ششماہی کے دن آ گئے ہیں

فرشتہ :۔ یہاں ڈیلیز (Dailies) ہوتی ہیں یعنی روزانہ
احتساب کتاب ہوتا ہے۔

خلیل :۔ (اُچھل کر) اوہ! پھر تو مرے۔

فرشتہ :۔ تمہیں موت نہیں آ سکتی تمہیں ابدی زندگی عطا کی گئی ہے

خلیل :۔ ایک ابدی زندگی بلا تعطیل کے کتنی حیرت کی جگہ ہے۔ کہ
خالق برتر کے یوم ولادت کو بھی کوئی چھٹی نہیں۔

فرشتہ :۔ بات یوں ہے خدا برتر کبھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ سے
ہے (اُوپر دیکھتے ہوئے) اور ہمیشہ رہے گا۔
(سجدہ کرتا ہے۔ خلیل بھی اُسے دیکھتے ہوئے حیرت سے
سر بسجود ہو جاتا ہے۔)

خلیل :۔ (اُٹھ کر) اوہ یہاں دن میں چوبیس گھنٹے کا کام کرنا پڑتا ہے
خدائے ذوالجلال کے یوم ولادت کو بھی چھٹی نہیں۔ .....
اور ..... پھر بھول گیا۔ خدا ذوالجلال کبھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ
ہمیشہ سے ہے اوپر دیکھتے ہوئے) اور ہمیشہ رہے گا۔
(پھر سجدہ کرتا ہے اور اس کے گھٹنے کانپتے اور آپس میں
ٹکراتے ہیں۔ عزرائیل بھی اُس کے ساتھ ایک بار سجدہ کرتا ہے)
(ایک طرف) .....
اے خدا! تجھ سے تیرا خدا اچھا!
(فرشتے سے)
محترمی! اس کا مطلب ہے کہ ایک سال میں یہاں ایک سو
اسی گھنٹے کا کام ہوا ..... اور وقت .....

فرشتہ :۔ عزیزمن! ایک سو چالیس گھنٹوں کا۔

خلیل :۔ وہ کیسے؟

فرشتہ :۔ خدا نے چھ دن دنیا بنائی اور ساتویں دن آرام کیا۔

خلیل :۔ تو ساتویں روز چھٹی ہوگی؟

فرشتہ :۔ لیکن ساتویں روز نعمت شاہ نگرانی پڑتا ہے۔ اس دن

تمہاری باری ہے۔

خلیل :۔ لیکن میری بیوی .... یہاں بیوی کا سوال ہی نہیں۔ ایک
چوالیس گھنٹہ کیا ایک سو اڑسٹھ گھنٹہ کا کام۔ یہ تو بہت مشکل ہے۔
مرے کو مارے (غیب سے آواز آتی ہے)

آواز :۔ شاہ مدار

خلیل :۔ آپ کا نام عزرائیل نہیں ہونا چاہیے۔

فرشتۂ موت :۔ تو کیا ہونا چاہیے۔

خلیل :۔ شاہ مدار

فرشتہ :۔ لیکن اس تبدیلی کی ضرورت کیوں؟

خلیل :۔ آپ مرے ہوئے کو مارتے ہیں۔

فرشتہ :۔ (انگلی اٹھاتا ہے) بس

(خلیل صاحب پھر فرش پر لوٹتے ہیں اور اٹھنے پر یوں محسوس کرتے
ہیں۔ جیسے اُن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی ہو)

خلیل :۔ (کچھ ہوش میں آکر) میری بیوی بیمار ہے... قبلہ شاہ مدار...
عزرائیل .... خداوندا .... تعجب ہے . . . .
یہاں بھی کوئی فریاد رسی نہیں۔ یہاں بھی ہمدردی نہیں...
دفتر میں چوبیس گھنٹے کی حاضری......

فرشتہ :۔ خداوندا! ... دفتر نے ایک اوور ڈرافٹ
(Over Draft) شے دیا ہے۔ آپ کے
حکم کے مطابق ایک روسی بنام خروشچف کو روسی پرج (Purge)
کا شکار ہو جانا چاہیے تھا۔ خروشچف ایک زبردست ناشکین
ہے۔ آج لینن گراڈ کی قتل گاہ میں......

خلیل :۔ (کانپتے ہوئے) اوور ڈرافٹ؟ ... لائیے میں سرخ سیاہی
سے ٹھیک کر دوں.... قبلہ عزرائیل آپ تو بزرگ ہستی ہیں۔
لیکن مکتب کے بچوں کی طرح شکایتیں کرتے ہیں ... ماسٹر جی!
لیکن میری دوات میں سے ڈبی لے گیا ماسٹر جی! مجھے
نند لال چڑاتا ہے اور میری ماں کو بلی کہتا ہے....

اس میں بطالبات ہو گیا ہے۔ لائیے میں سرخ سیاہی سے
ٹھیک کر دوں۔

خالقِ کائنات :۔ یہاں ایک دفعہ جو لکھا گیا اسے کوئی سرخ
سیاہی درست نہیں کر سکتی۔

فرشتہ :۔ خالق! ... آپ کا عتاب اس گستاخ پر نازل ہونا
چاہیے۔ یہ مجھے مکتب کا بچہ کہتا ہے۔

خالق :۔ کتنا اوور ڈرافٹ دیا گیا؟

فرشتہ :۔ حضور دو عالم! دو ماہ کا!

خالق :۔ خلیل کی بیوی کی زندگی میں پورے دو ماہ باقی ہیں۔ خروشچف
کی بجائے خلیل کی بیگم کا حساب بند کر دو۔

خلیل :۔ (کانپتے ہوئے) لیکن سرخ سیاہی تو..... سرخ سیاہی تو
..... میرے خالق ...... میری بیوی! اب میں کدھر جاؤں

خالق :۔ اب خلیل میاں کو ساتویں روز بھی چھٹی نہیں ہوا کرے گی۔

خلیل :۔ کیا ہفتہ میں ایک سو اڑسٹھ گھنٹہ کام کرنا پڑے گا۔ آپ
جانتے نہیں تحریک شروع ہے کہ دکانوں کے ملازموں اور
بینک کے کلرکوں سے ہفتہ میں چوالیس گھنٹہ سے زیادہ کام
نہ لیا جائے؟

فرشتہ :۔ جب تک میری یہ انگلی سلامت ہے۔ یہاں کوئی تحریک جاری
نہیں کی جا سکتی۔ (انگلی اٹھاتا ہے)

خلیل :۔ بس بس.... بزرگوارم ..... لیکن کیا اوور ٹائم کا الاؤنس
ملے گا؟

فرشتہ :۔ (نفرت سے) چھی! الاؤنس (بڑھ کر ایک چپت رسید
کرتا ہے) لو .... یہی الاؤنس ملتا ہے یہاں۔ ہمیں تم سے
بہت توقع ہے تم گریجویٹ ہو۔

خلیل :۔ (سسکتے ہوئے) آہ! اس سے موت اچھی ہے۔

فرشتہ :۔ تم حیات و ممات سے پرے ہو۔

خلیل :۔ (چیخ کر) کیا میں حیات و ممات سے پرے ہوں؟

(بے ہوش ہو کر گرتا ہے اس چیخ کے ساتھ ہی آنکھ کھل
جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے پھر منظرِ اوّل ہے۔ سب کام
ویسے ہی ہو رہا ہے۔ اور مسٹر گڈ وانی ویسے ہی دہشت زدہ
ادھر اُدھر بھاگتے نظر آتے ہیں۔)

شریمتی جی:۔ (کونسٹر پر) Rubbish Bank This!

گڈ وانی:۔ لیجئے اپنی کاپی ---- سردار امر سنگھ نے واپس بھیج دی
ہے۔ دیکھئے نا یہ سب کچھ کلرک کی غلطی سے ہُوا۔۔۔۔ کلرک
کی غلطی سے۔۔۔۔۔ کلرک کی۔۔۔۔۔

(شریمتی جی چلی جاتی ہیں)

خلیل:۔ بہ خوب! کاپی تو آنجناب نے دی تھی اور غلطی میری۔

گڈ وانی:۔ دراصل کام ہی بہت ہے۔ شش ماہی کے دنوں میں ایسا
ہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ایسے ہی ہوتا ہے۔۔۔۔ ایسے ہی۔۔۔

خلیل:۔ آپ کو شکر کرنا چاہئے کہ یہاں (Dailies) نہیں
یہاں سرخ سیاہی بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ یہاں کے قوانین
میں ترامیم ممکن ہیں۔ یہاں ہفتہ میں ایک سو اڑسٹھ گھنٹہ کام
نہیں کرنا پڑتا۔ یہاں موت ممکن ہے۔ یہاں۔۔۔۔

گڈ وانی:۔ (کلرک سے) خلیل میاں پاگل ہو رہے ہیں گھبرا کر خلیل میاں
۔۔۔۔ میں تمہیں اپنی ذمہ داری پر ایک سال کی چھٹی دیتا ہوں۔

(پردہ)

ادبِ لطیف کا سالنامہ

سنہ ۱۹۴۲ء

ہندوستان کے بلند پایہ ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور مفکروں
کی نگارشات کا حسین و جمیل مرقع، اردو زبان کے سرکردہ اہلِ قلم کی ذہنی
کاوشوں اور فکری بلندیوں کا آئینہ

شعر و سخن، افسانوں اور علمی مقالات کا دلکش مجموعہ

مقالہ نگاروں کے اسما کی فہرست اشارات میں ملاحظہ فرمائیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کرتار سنگھ دگل

وزیر آباد کے اسٹیشن پر

ٹھیک ایک بجے گاڑی وزیر آباد کے اسٹیشن پر پہنچی۔ تیزی سے چلتی ہوئی ٹرین کی چھکا چھک سے میرے کان مانوس ہو چکے تھے۔ یہ اچانک خاموشی عجیب سی معلوم ہوتی۔ میری آنکھ کھل گئی۔

تیسرے درجے کے اس چھوٹے سے کمرے میں صرف بیس مسافروں کے لئے جگہ تھی۔ لیکن چھوٹے بڑے سب ملا کر ہم پینتیس کے قریب آدمی اس میں بند تھے۔ جن کو سیٹوں پر جگہ نہ ملی وہ نیچے ہی بیٹھ گئے۔ اور بعض سامان رکھنے کے بالائی تختوں پر چڑھ گئے۔ میری دائیں طرف والی سیٹ پر بستہ بچھا کر ایک ہندو بابو گہری نیند سویا پڑا تھا۔ گاڑی چلتے وقت بہت سے مسافر چیخے چلائے۔ لیکن اس نے ایک انچ بھی جگہ خالی نہ کی۔ . . . . پرے کونے میں ایک بڈھا سو رہا تھا جس کے خراٹوں کی آواز بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی . . . . . . ایک گڑھوالیا لڑکا اونگھتا ہوا اس کے ساتھ کے مسافر کے کندھے پر گر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند اور منہ کھلا تھا۔ ایک رال بہتی ہوئی اس کی ٹھوڑی تک پہنچ چکی تھی . . . . . ادھیڑ پوربن کی ناک چپٹی تھی۔ ایک آنکھ کانی تھی۔ کالے سیاہ چہرے کی ہڈیاں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ سامان کے پاس پڑی وہ ایک بوری پر سر رکھے سو گئی تھی۔ اس کا کالا کلوٹا بچہ جونک کی طرح اس کی سوکھی چھاتیوں سے چمٹا ہوا تھا . . . . . ابکی بار معافی دے دیجیو بابو جی! درمیانی سیٹ میں گھٹنوں پر سر رکھ کر سویا ہوا ایک مالی بڑبڑا رہا تھا . . . . . . سیٹ کے نیچے اس طرف ماجھے کا ایک سکھ جاٹ چت پٹ پڑا تھا۔ اس کی آدھی کھلی ہوئی آنکھیں ڈراؤنی سی تھیں۔ منہ بند تھا۔ ایک وزن دار گٹھڑی کھسک کھسک کر اس کی چھاتی پر آ ٹکی تھی۔ جاٹ جب اپنے فولادی پھیپھڑوں میں سانس بھرتا تو گٹھڑی کی دنیا میں طوفان سا آ جاتا۔

گاڑی بہت دیر تک کھڑی رہی۔ چلتے وقت سردی سے بچنے کے لئے ہم نے سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر لئے تھے۔ اس خاموش اور انسانی سانس سے گرم فضا میں آخر میرا دل ذرا گھبرانے لگا میں نے اپنے قریب کی کھڑکی کھول لی اور باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پلیٹ فارم کے لیمپوں کی روشنی اپنے قمقموں کے ساتھ کشمکش کر کے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ریلوے کے ایک دو ملازم جلدی جلدی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ نہ کوئی مسافر اسٹیشن پر اترا اور نہ کوئی سوار ہوا۔

"وقت کیا ہو گا سردار صاحب؟" میرے قریب لیٹے ہوئے کسی انگریز افسر کے بیرے نے چونک کر پوچھا۔

میں نے کہا "ایک"

وہ چپ ہو گیا۔

"کیوں صاحب کو دیکھنے جاؤ گے کیا؟" میں نے مذاق سے کہا۔ بوڑھا بیرہ میری بات نہ سمجھ سکا۔ پھر کوئی دو منٹ بعد آپ ہی آپ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور تختے پر سر رکھ کر سو گیا۔

لاہور سے چلنے کے بعد جب تک اس کا آقا جاگتا رہا۔ وہ فسٹ کلاس کے کمرے کی طرف چکر لگاتا رہا۔ "کیا کریں سردارجی، ملازمت ٹھہری"۔ اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور لیٹے لیٹے ہی بولا: "پہلی بار گیا تو اس کے بوٹوں کے تسمے کھولے۔ موزے اتارے اور تلوے سہلاتا رہا۔ دوسری دفعہ گیا اخبار کا ایک ورق سیٹ کے نیچے گر پڑا تھا اٹھا کر صاحب کو دے آیا۔ کام تو کوئی زیادہ نہیں لیکن حاضری پوری ہوتی

دینی پڑتی ہے۔"

سردی بڑھ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر لی۔ سب کے پاس کمبل یا لوئی تھی لیکن اوڑھنے کے لئے کچھ نہ کچھ موجود تھا۔ صرف میں ہی ایک ایسا مسافر تھا جو نسواری رنگ کا ایک ہلکا سا سوٹ پہنے تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک چمڑے کا اٹیچی کیس تھا جس میں کچھ رسالے اور کچھ کاغذات پڑے تھے۔ کاغذوں پر کچھ لکھا ہوا تھا اور کچھ کٹا ہوا۔

"چائے گرم! ہندو چائے! چائے گرم!" کوئی پکارتا ہوا ہمارے کمرے کے پاس سے گذر گیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب خالی تھی۔ مجھے یاد آیا چلتے وقت پیسے نکال کر میں نے اٹیچی کیس میں رکھ لئے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے کھولا۔ میرے ساتھ کے مسافر نے اپنی کہنی اس پر رکھی ہوئی تھی۔ چائے والا اتنی دیر میں آگے بڑھ گیا۔ کھڑکی کھول کر میں نے اس کے لوٹنے کا انتظار شروع کر دیا۔

کالا کوٹ پہنے ایک دراز قد لڑکی ہمارے ساتھ والے زنانہ کمرے میں سے نکلی۔ دور برآمدے میں گارڈ ایک چھوٹا لیمپ لئے ٹہل رہا تھا۔ جلدی جلدی اُس کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔ پھر لڑکی نے جیب میں سے ایک کاغذ نکالا۔ لیمپ کی معمولی روشنی میں دونوں جھک جھک کر اُسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب اُس نے چٹھی کو تہ کر کے جیب میں ڈالا تو نوجوان گارڈ نے لیمپ اُٹھا کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر بعد لڑکی گاڑی کی طرف آگئی۔ گارڈ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

چائے والا واپس آ رہا تھا۔ ابھی تین چار ڈبے دور ہی تھا کہ میرے دل نے کہا: "میں چائے نہیں پیوں گا۔ کل ہی تو ڈاکٹر نے منع کیا تھا۔ کچھ پینا ہی ہو تو کوکو پیو۔ کافی پیو۔ چائے تمہارے لئے زہر ہے۔ آخر یہ انتڑیوں کی گڑگڑ بھی تو خطرناک ہے" میں ڈر گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چائے نہیں پیوں گا۔ علاج کے ساتھ ساتھ بد پرہیزی۔ یہ کوئی عقلمندی نہیں۔ یوں بھی پڑھنے لکھنے والے لڑکوں کے لئے چائے کوئی اچھی چیز نہیں۔ "چائے اچھی چیز نہیں ہے! چائے چربی پگھلا دیتی ہے"۔ جیب میں دودھ کی جگہ چائے پر اصرار کرتا تھا تو میری والدہ سمجھایا کرتی تھیں۔

"چائے گرم! ہندو چائے! چائے گرم!" چائے والا ہمارے کمرے کے سامنے سے گذر گیا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ مری میں بینا کس طرح میرے لئے چائے بنایا کرتی تھی۔ چپ چپ کے ہم گیلری میں بیٹھ جاتے کس طرح وہ چمچہ چمچہ میرے منہ میں ڈالتی۔ بینا کی چائے کتنی اچھی تھی اور چائے بھی چربی پگھلا دیا کرتی تھی! ایک ایک چمچہ شراب کی طرح کیف آور ہوتا تھا۔

سارے کا سارا کمرہ بخ ہو گیا۔ سب مسافر اپنی اپنی جگہ پر سکڑنے لگے۔ خود میں سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ میں نے کھڑکی دوبارہ بند کر لی۔ اس پر بھی میں کانپ رہا تھا۔ "کیا حرج ہے۔ اگر ایک پیالی پی لی جائے۔ کوئی چسکے کے لئے تھوڑا پینے لگا ہوں"۔ چائے کا پلڑا پھر بھاری ہو رہا تھا۔ "اس سردی میں کس طرح رات کٹے گی؟ نہ میرے پاس کچھ اوڑھنے کو۔ نہ بڑا کوٹ۔ چائے میں دودھ پڑتا ہے۔ چائے میں شکر پڑتی ہے۔ بس دو پتیوں کے لئے چائے بری ہو گئی؟ میں نہیں مانتا۔ کیسی فضول بات ہے۔ ساری دنیا چائے پیتی ہے۔ فخر سے لوگ چائے کی دعوتیں کرتے ہیں۔ اور خوشی سے اُن میں شریک ہوتے ہیں۔ صرف میرے لئے ہی چائے خراب ہو گئی۔ یہ تو ڈاکٹروں کی عادت ہے۔ کوئی کڑوی دوائی دیدی۔ پانچ سات چیزوں سے پرہیز بتا دیا۔ اور بس۔ پھر ایک پیالی سے کون قیامت آ جائے گی۔ اس پیٹ میں تو پتھر بھی پگھل جاتے ہیں گرم گرم چائے کی پیالی سے ساری رات آرام رہے گا"۔

میں نے کھڑکی پھر کھول لی۔ چائے والا گاڑی کا چکر کاٹ کر واپس آ رہا تھا۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ وہ کافی نزدیک پہنچ چکا تھا۔ مگر........ "پھر اندر سے کسی نے کہا" مگر تکلیف کی بات نہیں۔ چائے پی لی تو ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ پہلے بھی جب کبھی بھول چوک کر رات کو چائے پی لی۔ ساری ساری رات آنکھ نہیں

نہیں لگی۔ ایک ہی دن کے لئے پنڈی جا رہا ہوں۔ سارا دن معلوم نہیں کیا کیا کام کرنے ہیں۔ چائے بغیر ہی اچھا ہوں۔ شاید بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ جائے۔"

"چاء گرم! ہندو چاء! چاء گرم!" چائے والا گزر گیا۔ گزرتے گزرتے اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی آنکھیں کہہ رہی ہیں "سردار صاحب! پیتی ہے تو پی لو۔ دل تو آپکا چاہتا ہے۔ بار بار مجھ سے نہ آیا جائیگا!"

اتنی سخت سردی میں اس ذہنی کشمکش کی وجہ سے میرے ہاتھوں میں پسینہ آ رہا تھا۔ مٹھی میں پکڑی ہوئی اکنی میری ہتھیلی کے ساتھ چپک رہی تھی۔

"پی لیتا تو پی لیتا" میرے دل میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔

"چلو نہ پی تو کونسا ظلم ہو گیا" کسی اور نے زور سے میرے اندر سے کہا

"لیکن سردی کڑاکے کی ہے۔ ابھی ٹھنڈک اُڑ گئی جہلم تک نہیں پہنچا"

"پھر پی لوں گا کسی اور اسٹیشن پر" اکنی میں نے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ بدمزہ سا ہو کر میں کھڑکی کو بند کر رہا تھا کہ کالے کوٹ والی دراز قد لڑکی ہمارے کمرے کے سامنے سے گذری۔ خوب شگفتہ تھی۔ اُس کے گلابی چہرے سے کامیابی سی ٹپکتی تھی۔

"چائے والا گذر گیا ہے سردار جی؟" میرے پاس بیٹھے ہوئے بہرے نے مجھ سے دریافت کیا۔ "پھر آئے تو ذرا اُسے کھڑا کرنا۔"

"میں بھی پی لوں گا" جھٹ میرے دل میں خیال گزرا۔ کالے کوٹ والی پتلی لمبی لڑکی کتنی گرم تھی!

"نہیں! بالکل نہیں! اتنا کمزور ارادہ!" کسی اور نے میرے اندر سے کہا۔

"کیوں بابا! تیرا کیا خیال ہے چائے اچھی چیز ہے یا بری؟" میں نے بہرے سے پوچھا جو چائے کے انتظار میں کبھی آنکھیں میچتا کبھی کھولتا۔

"خراب! کھانے کی چیزیں کبھی خراب ہوتی ہیں؟ جب لگے تو تین دفعہ مل جائے انکار نہیں کرتے۔ میں خود دن میں تین دفعہ پیتا ہوں۔ چائے تو......؟"

"مگر مجھے تو ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔"

"پھر تو... پھر تو دوسری بات ہے" مسکراتے ہوئے اُس نے سوچکر جواب دیا۔ "چاء گرم! ہندو چاء! چاء گرم!" چائے والا آ رہا تھا۔ بہرا اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

"جو گرم ہے تو ایک پیالہ دینا بھائی!" اُس نے چائے والے کو کھڑا کر لیا۔ ہندو چائے والے نے بہرے کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ سٹینڈ پر رکھتے ہوئے اُس نے زور سے پکارا "ہندو چاء! چاء ہندو!"

اصل بات دونوں سمجھ گئے مگر دونوں چپ رہے۔

"واہ! واہ! جیتے رہو۔ خوب گرم ہے!" بہرے نے ایک گھونٹ بھر کر نوجوان ہندو چائے والے سے کہا۔

ہندو چائے والا چپ رہا۔

میرے منہ میں پانی بھر آیا مجھے اور زیادہ سردی لگنے لگی۔ میں چائے پیتے ہوئے بہرے کی جانب دیکھے جاتا تھا۔ ہندو چائے والا میری سمت تاک لگائے ہوئے تھا۔ میرا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب سے نکل کر خود بخود اٹھا جا رہا تھا۔

"نہیں!" گویا کسی نے جھنجلا کر میرے اندر سے کہا۔

میں سہم گیا۔ سوچتا رہا سوچتا رہا۔ آخر اکتا کر میں غسلخانہ میں چلا گیا۔ کوئی تین منٹ بعد جب میں واپس آیا تو بہرا ابھی تک چائے پی رہا تھا۔ ہندو چائے والے نے میری طرف آخری بار دیکھا تو "پینی ہے تو پی لو سردار جی۔ پھر وہ آنے بہانے بنائیں گے ساری رات جاگتا رہا ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے گھر میں بلک رہے ہیں۔ اُن کے منہ میں کچھ پڑ جائیگا۔ ہم میاں بیوی بھی پیٹ میں کچھ ڈالیں گے۔"

غسلخانہ میں ہاتھ دھونے سے مجھے اور زیادہ سردی لگنے لگی۔ بہرا گرم گرم چائے پی رہا تھا۔ اسکا چہرہ لال ہوتا گیا۔ اسکے ماتھے پر پسینہ کے قطرے سے نکلنے لگے تو ہندو چائے والے نے مایوس ہو کر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ اُسکا کوٹ پھٹا ہوا تھا۔ اُسکی قمیص کے اوپر کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ اُس کی چھاتی ننگی نظر آ رہی تھی۔ ابھی ٹھنڈک اور بڑھیگی جہلم کے آس پاس۔

"ایک پیالہ مجھے بھی دیدو بھائی!" آخر میں نے آہستہ سے کہا۔ ہندو چائے والے نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی بہت کوشش کی پر نہ روک سکا۔

"مجھے معلوم تھا تم ہو گے میرا اندازہ کبھی نہیں غلط ہوتا" پیالی مجھے پکڑاتے ہوئے اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

احمد ندیم قاسمی

مجبُور کی دُعا

دعا مانگوں، مگر ہمت کہاں اب ہاتھ اُٹھانے کی
کہ ہاتھ اُٹھتے رہے، چلتی رہی چکّی زمانے کی

بہت مانگا مگر پانے کے بدلے کھو رہا ہوں میں
بس اب دل سے تمنّاؤں کے دھبے دھو رہا ہوں میں

بہت رویا مگر پھیکا تبسّم بھی نہیں ملتا
بہت طوفاں اُٹھائے ایک پتّہ تک نہیں ہلتا

وہ میرے گریہ پر تاروں کی پھلجھڑیاں اُڑاتا ہے
وہ میری بے سروسامانیوں پر مسکراتا ہے

دلِ صد چاک میرا شدّتِ وحشت سے لرزاں ہے
بساطِ کہکشاں پر وہ بصد انداز رقصاں ہے

نہ بسترِ نرم کلیوں کا، نہ یارا رنگ رلیوں کا
میری تقدیر میں لکھا تعفّن تنگ گلیوں کا

نہ ملبوسِ حریری اور نہ آب و تابِ سلطانی
مجھے بخشی ہے اُس نے منعموں کے در کی دربانی

تمہیں اصرار ہے میں گڑگڑا کر پھر دعا مانگوں
تمہیں بتلاؤ اُس نے کیا دیا ہے اور کیا مانگوں

دعائیں مانگنے پر جب مجھے مجبور کرتے ہو
میری خودداریوں کے آبگینے چور کرتے ہو

مگر لو، اپنے ہاتھوں دل پہ پھر نشتر چلاتا ہوں
ذرا ہشیار ہو جاؤ کہ میں پھر ہاتھ اُٹھاتا ہوں

مرے احساس کا دم گھونٹ کر پتھر بنا مجھ کو
وگرنہ اس جہاں کا اور کوئی رُخ دکھا مجھ کو

عبدالرحمٰن چغتائی

پیاسی

ہم عشرت کی روز افزوں شراب سے سیراب نہیں ہوئے۔
وہ چپ تھے۔
میں نے کہا آپ رخصت ہونے کے لئے آئے ہیں۔
وہ مسکرا سے دیئے۔
میں بولی یہ جوانی اور یہ ایوان اسی طرح راہ دیکھتے رہیں گے۔
وہ پھر بھی چپ تھے۔
چاند تیز تیز چلا جا رہا تھا۔
وہ اتنا خوبصورت کبھی نظر نہ آیا تھا۔
وہ اتنا خوبصورت کبھی نظر نہ آئے گا۔
جب تک ہمیں پھر یہیں کھڑا نہ پائیگا۔
لیکن وہ ابھی تک خاموش تھے۔
آنسو پلکوں تک آکر رُک گئے۔
دور جھیل میں کنول کے پھول
ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے۔
اُنھوں نے لب تک نہ ہلایا۔
میں صحن چمن میں کھڑی بے تابی سے راہ دیکھتی رہوں گی۔
اور یہ چاند ستارے۔ یہ فضا یہ مناظر اسی طرح ناچ رہے ہوں گے۔
وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔
اگر میں واپس نہ آیا۔ تو سمجھ لینا کہ میں زندہ ہوں۔

عبدالرحمٰن چغتائی

تریاق

اس نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا۔ اور یہ سوچتے سوچتے اس کا رنگ زرد ہوتا جا رہا تھا کہ کھانے والا وقت پر پہنچ جائیگا یا نہیں۔ ذرا سی آہٹ پر اس کا دل بیٹھ جاتا تھا۔ دروازے کے اس پار ایک اور دروازہ تھا۔ اسی طرح اس کا خیال قبر کے دروازے تک اس کو لے جاتا۔ وہ جو کچھ سوچ رہی تھی آج سے پہلے کبھی نہ سوچ سکی۔ ہر آہٹ پر یہ سمجھتی تھی۔ کہ وہ سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ اور صحن میں پہنچتے ہی اس کا پہلا سوال یہ ہوگا۔ کہ کھانا لاؤ۔ کمبخت کھانا لاؤ۔ ترشی اور کھٹاس بھی۔ آج بہت پی گیا ہوں۔ ترشی اور شراب مل کر تریاق تو نہیں بن جاتے۔

اس نے خیال کیا اگر وہ جلد نہ آیا۔ اور اسی طرح سے دیر ہوتی گئی۔ تو زہر غذا کے رگ و ریشہ میں سما جائیگا۔ اور پھوٹ نکلیگا۔ رات کے بارہ بج چکے۔ سب شرابی اپنی اپنی بیویوں کے پاس لوٹ آئے ہونگے یہی تو وقت ہے۔ برسوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

اس کی نظر دروازے پر اور کان ہر آہٹ پر لگے ہوئے تھے کہ دروازے کے ساتھ والی سیڑھیوں پر سے جہاں اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بلی دبے پاؤں اُتری اور اُتر کر دہلیز پر بیٹھ گئی۔ اسکی مونچھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ کچھ کھا گئی ہے۔ پھر اس کی نظر اس کے جسم پر پڑی۔ اس پر پانی کے قطرے چمکتے نظر آئے۔ بہت سے خیالات جو اس کے ذہن میں آ جا رہے تھے۔ بلی کے آ جانے سے رُک گئے۔ اور وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ جو دروازے کے سامنے بازار کی طرف کھلتی تھی۔ باہر مینہ برس رہا تھا۔ برسات کچھ زیادہ نہ تھی بالکل ایسی تھی۔ جیسے لطیف ہوا میں ننھی ننھی بوندیں کبھی متواتر اور کبھی غیر متواتر پڑ رہی ہوں۔ کہتے ہیں۔ برسات کا موسم ہو۔ ہوا خوشگوار ہو۔ تو شراب پینے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور یہ موسم ان کیلئے بخشش سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ اس نے انتہائی کوشش کی کہ وہ ذہن سے اس بات کو نکال دے کہ وہ مینہ کے باعث آج گھر نہ آئیگا۔

وقت گزرتا گیا۔ وہ انتظار میں کھوئی ہوئی، ذہنی کشمکش میں گرفتار کچھ سوچتی رہی۔ وہی تو ہے جس نے میری زندگی کے تمام نشیب و فراز کو ہموار کر دیا ہے۔ جس نے میری تمام معصوم امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے اور میں دن بدن بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہوں۔ کل وہ سامنے والی ہمسائی کہہ رہی تھی۔ جس کی موت مانگو اس کی زندگی لمبی ہوتی جاتی ہے۔ ماؤں کی بددعائیں بچوں کے لئے دعائیں بن جاتی ہیں۔ دعاؤں اور بددعاؤں کا اثر مائیں ہی جانتی ہیں۔

وہ اپنا مدعا، اپنے الفاظ اور جملے برابر سوچتی رہی۔ یہ سوچتی رہی۔ کہ اگر وہ نہ آیا۔ تو یہ غذا ساری کی ساری زہر بن جائے گی۔ کھڑکی میں کھڑی کھڑی اُکتا گئی۔ تو پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ بلی نے خُرخُر کرنا شروع کیا۔ وہ پالتو تھی۔ بلی سب کی پالتو ہوتی ہے۔ گھر گھر کا نمک کھاتی ہے۔ سب کے گن گاتی ہے۔ وہ مالکہ کے اشارے پر آگے بڑھی اور مالکہ کے پہلو میں جا بیٹھی۔ اس نے دو ایک لقمے اس کے سامنے ڈال دیئے بلی غراتی رہی جو ملا تھا کھاتی رہی۔ مالکہ کی طرف دیکھ بھی لیتی تھی۔ جیسے شکر یہ ادا کر رہی ہے۔ بلی کو جو ملا تھا۔ کھا کر اُوپر کی منزل میں چلی گئی۔ کھانے میں زہر اس نے خود ہی ملایا تھا۔ پر اس کے لبوں پر کوئی مسکراہٹ نہ تھی۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں کسی احساس نے ضرور کروٹ لی تھی۔

اس کی شادی ہوئے تین چار سال ہوئے تھے۔ لیکن وہ دن نہ آئے جن کے لئے اس کے باپ نے دعائیں کی تھیں۔ وہ حسین جن کے خواب وہ خود ماں باپ کی غریب دنیا میں دیکھا کرتی تھی۔ اسے نظر نہ آیا۔ باپ نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی قسمت بدل دے گا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کسی ایسے گھرانے میں کریگا۔ جہاں اس کی اکلوتی لڑکی کے بھاگ جاگ اٹھیں گے۔ اور وہ زندگی کے دکھوں سے کبھی دوچار نہ ہو

غریب کی دنیا ہی کتنی ہے۔ اور اس کی اولاد کے نصیب۔ . . .

باپ نے بیٹی کی شادی کا انتخاب بڑے فکر اور چاؤ سے کیا تھا۔ جس کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی۔ ایک امیر گھرانے کا لڑکا تھا۔ وہ شرابی، بدکار اور بدعہد تو تھا ہی۔ لیکن بیوی کے لئے اس سے بھی زیادہ خرابیاں اس میں موجود تھیں۔ لیکن ان سب پر پردہ ڈالا گیا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ کا خیال تھا کہ ان کا لڑکا شادی ہو جانے کے بعد ایک قابلِ رشک انسان بن جائیگا۔ اس کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ بدکاری، آوارگی سب کچھ دور ہو جائے گا۔ میاں بیوی کی زندگی دولت کی دنیا ہوگی۔ ایک غریب لڑکی کے لئے اس سے زیادہ اور چاہیئے بھی کیا۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہوا۔ اور ایک مفلس لڑکی رواج اور سماج کی بھینٹ چڑھ گئی۔ تو اس سے دنیا میں کونسی کمی واقع ہو جائے گی۔

شادی ہو گئی۔ جو کچھ پیش آیا وہ لڑکی کا لکھا تھا۔ وہ یہ لکھا دیکھ کر کڑھتی رہتی اور یہی سوچا کرتی کہ۔ باپ کی دعائیں انتقام کی صورت بن گئی ہیں۔ کیا یہ وہی جنت ہے جس میں اس نے ہزار آرزوں سے مجھے بھیجا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ یہ سب کچھ جانتے تھے۔ جو کچھ اسے پیش آ رہا تھا سب سے واقف تھے۔

غریب ماں باپ اپنی لڑکیوں کے متعلق کچھ زیادہ ہی سوچتے ہوں گے۔ مگر ستاروں کا ہیر پھیر امیروں کا حصہ ہے۔ غریب باپ کی مخلص دعاؤں نے ان تک رسائی حاصل نہ کی تھی۔ وہ شہد کی مکھی کی طرح زہر کو شہد بنانے پر تلی رہی۔ دکھوں کا مقابلہ بھی کرتی رہی اور ہر لمحہ اسی آرزو میں گزارتی۔ کہ اس کا مالک اس کو اپنا سکھ سمجھے لیکن کامیاب

شادیاں ماں باپ کے اختیار میں نہیں ہوتیں۔

وہ ابھی بچہ تھی۔ لیکن واقعات نے اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ ہاتھ منہ مرجھائے جا رہے تھے۔ جلد کی رنگت ماند پڑ گئی تھی۔ پیشانی پر بڑھاپے کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اور انکی گہرائیوں میں روشنی کی کوئی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی۔ آوازمیں ہچکیاں سنائی دیتی تھیں۔ اٹھتی بیٹھتی سہارا چاہتی تھی۔ غم نے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ سب ذمہ داریاں اس پر ڈالی گئی تھیں۔ سسرال میں ہر کوئی خیال کرتا تھا کہ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس جہنم کے انگارے کو جس سے وہ جل رہی ہے، اٹھا کر جنت کی کسی ایسی روش پر پھینک دے۔ جہاں وہ مستقبل میں ایک روشن ستارہ نظر آئے۔

بادل چھٹ کر چاند نکل آیا تھا۔ اور چاند اپنی منزل کی جانب کشاں کشاں چلا جا رہا تھا۔ زرد رو اور خاموش۔ ایسی راتوں میں اس کا رنگ ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ رنگ فق تھا۔ دو بچے بھٹے چاند کی مانند کھانے میں زہر ملاتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پاس پڑی ہوئی چھڑی کو کھانے میں ڈال دیا اور اٹھا کر دیکھتی رہی۔ بولی ابھی رنگ نہیں بدلا۔ پھر چاند پر نظر جا پڑی۔ زرد پہلے سے زیادہ زرد، سہما ہوا، سہما ہوا۔ جیسے چلتے چلتے رک گیا ہو۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ سوائے سنسان رات اور اس کی خاموشی کے۔

آسمان اور زمین پر جہاں نظر پڑتی تھی۔ مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی۔ چاند تھا جو سرد ہوتا جا رہا تھا۔ مکانوں پر راستوں پر دور دور تک جہاں روشنی پڑتی تھی پھیکا سا اور سہمی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا دل افسردہ ہو گیا۔ ایسی بے نور زرد روشنی اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

بلی پھر نیچے اتر آئی اور اس کے پہلو کے ساتھ آ بیٹھی۔ بلی

وہ کیوں اتنی دیر محو خیال رہی۔ یہ وہی جانتی تھی۔ آنکھیں ساکت تھیں۔ اور جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ چاند پھر بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا۔ وہ اس ذرا سی تبدیلی سے سہم گئی اور سمٹ سمٹا کر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔ غذا کا رنگ تو بالکل نہیں بدلا ابھی تک تو کوئی نہیں گیا۔ وہ ضرور آئے گا۔ وقت اور انتظار کی انتہا ہو گئی ہے۔ اسے آنا چاہیئے وہ ضرور آئے گا۔

فاحشہ عورتوں میں بھی تو یہ جذبہ ہوتا ہوگا۔ ان کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ کسی نے آنے نہ دیا ہوگا۔ برسات بہار ہے دلکش فضا۔ جوانی میں ایسی راتیں کم آتی ہیں۔ دُور دُور تک کچھ دکھائی نہ دیا۔ یا دیسی رات ختم ہو رہی ہے۔ باپ کے خلاف اس کا غم و غصہ زیادہ بھڑک اُٹھا نہایت تندی اور تلخی سے وہ اس کے فعل پر نکتہ چینی کرنے لگی۔ جس نے اسے جہنم میں جنت کہکر دھکیل دیا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اگر میں فاحشہ ہوتی تو میں بھی بیویوں کے خاوند چھین لینے میں کامیاب ہوتی۔ میں اپنے خاوند کو بھی اپنے پاس نہ رکھ سکی۔ اتنی اہلیت ہی کہاں جو میں ایسا کر سکتی۔ ماؤں کے بچے۔ بیویوں کے خاوند جدا کر سکتی۔ انہیں بھکاری، غلام بناتی۔ ان کی دولت، عزت چھین لیتی۔ انتقام نے دم ناک میں کر رکھا تھا۔ جو سوچتی تھی۔ خود ہی اس کا جواب اپنے ذہن میں ڈھے لیتی تھی۔ دیر اور دیر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نہ آئیگا۔ اسے ضرور آنا ہوگا۔ وقت چلا جا رہا تھا۔ وہ زیادہ بیتاب ہوتی جا رہی تھی۔ اور زیادہ بے چین۔ کہتی رہی زہر ہی تو ہے۔ آخر اتنی جلدی اسے ملانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

یکایک سیڑھیوں پر سے کسی کے اُترنے کی آواز آئی۔ بڑا سا دھماکا جیسے کوئی گر پڑے۔ یہ بلی تھی۔ بالکل بیہوش لڑکھڑاتی گرتی پڑتی مالکہ کے سامنے پہنچکر گر گئی۔ اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئی تھیں۔ حیرت میں اس کے منہ سے نکلا۔ بے گناہ غریب بالکل بے گناہ۔ کیا اس کے اعتماد کا یہی صلہ تھا۔ مجھے بھی زہر کھا لینا چاہیئے۔ آخر کیوں نہ کھاؤں۔ اس جینے سے تو مر جانا ہی بہتر ہے وہ رک گئی۔ خیال آیا کہ وہ آ جائے تو دونو مل کر کھا لیں گے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مر جائیں گے۔ منہ سے جھاگ بہہ نکلے گی۔ دانت پیوست ہو جائیں گے اور آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ زندگی یونہی ختم ہو جائیگی۔

آخر بلی نے کیا بگاڑا تھا میرا کیا بگاڑا تھا۔ کتنی محبت کرتی تھی۔ اسے مجھ پر کتنا اعتماد تھا۔ پہلا لقمہ دوسرا لقمہ اور تیسرے نے تو اس کا کام ہی تمام کر دیا۔ زہر۔ زہر۔ زہریلے جراثیم کا مرکب ہے۔ جب میں کھانے میں زہر ملا رہی تھی۔ تو بار بار یہی دل چاہتا تھا۔ کہ خود ہی کھا لوں۔ اسے چکھ لوں۔ بلی نے آخری بار کروٹ لی۔ اس نے اسے گود میں لے لیا۔ اور بولی آہ مسکین بلی۔ پالتو۔ گھریلو بلی آخر تیرا کیا قصور تھا۔

میں قاتل ہوں۔ خونی ہوں۔ میں نے ہی تو بلی کو کھلایا تھا۔ میری بلی تو کس قدر اچھی بلی ہے۔ ۔ ۔ وہ ایک لقمے تو اور کھالے اس کا ہاتھ خود بخود غذا کی طرف اُٹھ گیا۔ لیکن بلی ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی تھی۔ اور اس کا لقمہ سے بھرا ہوا ہاتھ ہوا کا دھارا ہو گیا وہ بلی کی تہیدستی پر ہنسی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ اور اسی پاگل پن میں لقمہ سے بھرا ہوا ہاتھ اپنے منہ کی طرف لے گئی۔ اور لقمہ منہ میں ڈال کر نگل گئی۔ پھر دوسرا۔ تیسرا اسی طرح بہت کچھ کھا گئی۔ اُٹھنے کو دل چاہا۔ لیکن اُٹھ نہ سکی۔ آن کی آن میں رگیں تن گئیں اور بالکل بے حس و حرکت۔ دروازہ، پھر دوسرا دروازہ، اسی طرح قبر کا دروازہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ بلی گود سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ کچھ کہنے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن کہہ نہ سکی۔ اور انجام کار خود بخود پیچھے کی طرف بے جان جسم نے انتظار کو ختم کرنے کے لئے گر پڑی۔ وہ یہی کچھ سوچتی جو اس نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا۔

اطلاع

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے۔ دسمبر کا پرچہ سالنامہ سالگرہ ہے اور خاص نمبر حضرات ڈاک میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسلئے اطلاعاً لکھا جاتا ہے کہ جو حضرات اپنا سالنامہ بحفاظت وصول کرنا چاہتے ہیں بمعہ ازی ۲ ر آنے کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے بھیجدیں۔ اس صورت میں رسالہ کے گم ہونے کا کوئی احتمال نہیں (مینجر رشید احمد)

مسعود احمد قریشی

اُردو شاعری اور قنوطیت

آجکل کے تنقیدی زمانے میں قنوطیت کو کوسنا کچھ فیشن سا ہو گیا ہے اور فیشن کی مقبولیت میں شک کفر۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اِس ہندوستان کے لوگ اس ہجوم میں سب سے آگے ہیں۔ جن کو زندگی کے معمولی حقوق بھی حاصل نہیں۔ جو ایک طرف تو یہ نعرے لگاتے جا رہے ہیں کہ ادب کو زندگی کا عکاس اور ناقد ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف اگر کوئی پرخلوص، در سوچنے سمجھنے والا ادیب زندگی کے عناصر کا تجزیہ کر کے اپنے مشاہدے اور تجربے کی ایک جھلک ادب میں دکھانا چاہتا ہے تو اُس پر حقارت آمیز نظروں اور لفظوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔ نئی روشنی کے لوگ فرماتے ہیں یہ فرسودہ باتیں ہیں — بالکل بے فائدہ حاضر پرست جذباتی کہتے ہیں یہ میر و غالب کی تقلید کر رہا ہے۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگا تیلی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ہمیں اس طوفان بےتمیزی سے بچنے کے لئے اور ادب میں قنوطیت کی ضرورت اور اس کا درجہ دیکھنے کے لئے زندگی کے مختلف عناصر کا تجزیہ کر کے اس میں غم اور خوشی کی مقدار کا تعین کر لینا چاہیئے کیونکہ ادب آخر زندگی ہی تو ہے۔

زندگی کی دو مختلف قسمیں ہیں۔ ایک تو حیوانی زندگی جو ہر جاندار شے میں جاری و ساری ہے اور بدلی نہیں جا سکتی۔ دوسری انسانی یا اجتماعی زندگی جو صرف انسانوں کا ہی طرہ امتیاز ہے اور جو ہر طبقے، قوم، ملک، گروہ میں جدا جدا ہے۔ اجتماعی زندگی، ماحول اور زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہی بدلتی رہتی ہے۔ پہلی زندگی مطلق ہے اور یہ دوسری اضافی۔ اب ہمیں سب سے پہلے حیوانی زندگی کا تجزیہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہی بنیادی چیز ہے اور دوسری قسم کی اجتماعی زندگی اسی سے ہی اثر پذیر ہوتی رہتی ہے۔

حیوانی زندگی انفرادی زندگی ہے۔ اگر کسی انسان کو ہر طرح کے ماحول کے اثرات سے آزاد کر دیا جائے اور بغیر کسی خارجی طاقت کی مداخلت کے اُس کو بڑھنے اور پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے تو اُس کے تمام ارادے اور عمل اُس کی اپنی ذات کے گرد ہی گھومیں گے یہ خصوصیت تمام جانداروں کی مشترکہ خصوصیت ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا انسان تہذیب، اخلاق یا کسی اور مقصد کی خاطر اس بنیادی خصوصیت کو بدل سکتا ہے۔ جذبات کی قربانیاں ہی چھوڑیئے۔ ان کے زیر اثر تو ہر طرح کی غیر فطری باتیں کی جاتی ہیں۔ لیکن بقائی ہوش و حواس جب کبھی بھی دو انسانوں کے مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں تو اخلاق و خلاق سب دھرا رہ جاتا ہے۔ ریاکاری کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ اُن کی فطری حیوانیت عود کر آتی ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کے مقابل میں ڈٹ جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن میں سے کوئی ابن الوقتی سے کام لیکر کسی خاص مقصد کی خاطر کچھ دیر کیلئے خاموش ہو جائے۔ اب کوئی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ یہ خود غرضی ہر جگہ اور ہر شخص میں تو نہیں ہے۔ دنیا کے لوگ شروع سے ایک دوسرے کی مدد اور دوسروں کی خاطر قربانی کرتے آئے ہیں۔ مثلاً جنگ میں لاکھوں شخص اپنی زندگیاں اپنے وطن اور اہل وطن کیلئے قربان کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ذرا غور سے ریاکارانہ الفاظ کے پردے اُٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ اجتماعی مفاد بھی جس کی خاطر لوگ قربانیاں دیتے ہیں انفرادی اور ذاتی مفاد کی ہی دوسری شکل اور انفرادی خواہشوں کی ہی پیداوار ہے۔ ان لوگوں کو جذباتی یقین دلایا جاتا ہے کہ اس جنگ سے اُن کی قوم کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ جس کے وہ بھی حصہ دار ہوں گے اور شکست کی صورت میں اُن کو اُن کے کنبے کو اور اُن کی قوم کو مصیبت اور غلامی کی زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

میں ذاتی آرام و آسائش کی خواہش اُن کو جنگ کے لئے اُبھارتی ہے۔ اور ہاں یہ میرا ملک اور میری قوم پھر تو اُن کی انفرادی خواہشوں کی آئینہ دار ہے کچھ تو جذباتی پروپیگنڈا اور "کچھ میرا" "میری" کی کشش زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے لئے کافی ترغیب ہے۔

اس فیصلہ کے بعد حیوانی زندگی بنیادی طور پر انفرادی رنگ اور اثرات کی حامل ہے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ اس انفرادی زندگی میں غم اور خوشی کا کیا تناسب ہے۔ یہ ہم اس طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ زندگی کا آئیڈیئل دیکھا جائے اور معلوم کیا جائے کہ وہاں پہنچنے میں انسان کہاں تک ناکام یا کامیاب ہُوا ہے۔ یہاں ہم بحیثیت ایک پریشان کن حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ آج تک زندگی کا کوئی آئیڈیئل اور کوئی منزل ہی مقرر نہیں کی جا سکی۔ زندگی کی پہلی اور سب سے بڑی ناکامی! پچھلے زمانے میں انسان کو سچائی اور قربانی کا سندیس دیا جا رہا ہے لیکن یہ ادھورا ہونے کے باعث ناکام ہو چکا ہے۔ آخر وہ کونسی منزل ہے وہ کونسا مقصد ہے جس کے لئے قربانی دی جائے سچائی اختیار کی جائے؟ قربانی قربانی کی خاطر تو ایک مضحکہ انگیز سی بات ہے۔

یہ منزل کا غیر معین ہونا ہمیں زندگی میں اپنی جگہ کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہمیں کیا حاصل کرنا ہے۔ کیا حاصل کر چکے ہیں اور کیا باقی ہے چونکہ مسرت کی کوئی قطعی اور واضح شکل ہمارے سامنے نہیں اس لئے ہم کسی منزل پر بھی پہنچ کر مطمئن نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے ہم حال سے بیزار، حاضر کی یادوں یا مستقبل کی اُمیدوں پر زندگی گزارتے ہیں۔ ہل من مزید کا نعرہ ہر موجود کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے وہ صرف تمہید ہے اُس کی جو ہمیں حاصل کرنا ہے۔ یہ صرف سامان ہے جو منزل تک پہنچنے میں ہماری مدد کرے گا۔ ہماری تمام زندگی یہی سامان مہیا کرنے میں ہی گزر جاتی ہے اور منزل افق کی طرح آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ ہماری یہ حالت ہے کہ منزل پر پہنچ کر مجھے منزل نہ ملی" ہماری تمام زندگی زندگی بسر کرنے کی تیاری میں ہی گزر جاتی ہے اور ہم تیاری ہی تیاری میں ختم ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد زندگی کا بنیادی تعلق ہے موت سے زندگی دکھوں کا مجموعہ سہی۔ بے منزل سفر سہی۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ موت زندگی کی تمام کامیابیوں، چمکتی آرزوؤں اور مستقبل کے حسین خوابوں کو بے معنی بنا دیتی ہے۔ جب ان تمام چیزوں نے مٹ ہی جانا ہے تو آخر یہ کوششیں اور ان کی خاطر مصیبتیں کیوں؟ حیاتِ بعد لممات ایک تو کچھ یونہی غیر یقینی سی چیز ہے۔ چاہے وہ آواگون کی صورت میں ہو یا قیامت کے بعد کی زندگی کی صورت میں، اور پھر جہاں تک اس دنیا کے لوگوں کا تعلق ہے وہ ہے بھی تو بے معنی۔ جب اُس دوسری زندگی کو اس زندگی سے کوئی نسبت ہے ہی نہیں۔ یہاں کے ادھورے کام ادھورے ہی رہیں گے یہاں کی حاصل ہوئی چیزیں اور اُن کی یادیں یہیں ختم ہو جائیں گی تو پھر ہمیں اس سے کیا! وہ تو چاہے ہم دوبارہ زندہ ہو جائیں چاہے کوئی اور ہمیں اس سے کیا غرض؟

تیسری بنیادی ناکامی انفرادی کوششوں اور خواہشوں اور اجتماعی زنجیروں کا تصادم ہے۔ انسان کے فطری جذبات جن کو وہ ہمیشہ کے لئے دبا نہیں سکتا بدل نہیں سکتا۔ اُسے کسی عمل پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن اجتماعی پابندیاں، اخلاق، تہذیب، مذہب، قانون نہ جانے کیا کیا اُسے بے بس کئے ہوئے ہے اور ان دونوں متضاد طاقتوں میں سے جو بھی ناکام ہوئی وہ انتقام لیتی ہے۔ فطرت کا انتقام اور خود ساختہ انسانی خداؤں کا انتقام! گویا کہ فطرت اور مجموعی طور پر انسانوں کی جنگ میں انفرادی انسان ہمیشہ پستا رہتا ہے۔ چوتھی بات خود انفرادی زندگی کا تضاد ہے۔ ایک وہ پہلے ہی حاسد، کینہ ور اور بے پناہ طاقت یعنی فطرت اور انسانی تہذیب کے خارجی تیروں کا نشانہ ہے۔ دوسرے خود داخلی طور پر وہ تضاد کے بے رحم چکی میں پس رہا ہے۔ دنیا میں کوئی چیز بھی مطلق اچھی یا بُری نہیں، ہر چیز ہر خواہش اور ہر جذبے کے دو پہلو ہیں۔ اُس کا دل اور دماغ کسی ایک کے حق میں بھی فیصلہ دے کر تسکین حاصل نہیں کر سکتے۔ لرزتے رہتے ہیں۔ ڈولتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ واقعہ خود بخود اپنے وقت پر ظہور

پذیر ہو کر چلتا جاتا ہے اور اپنے پیچھے "کاش" اور "اگر" کا غمگین ہجوم چھوڑ جاتا ہے۔

تو ثابت ہوا کہ حیوانی زندگی اپنے بنیادی عناصر کے لحاظ سے ایک مکمل ٹریجڈی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں روزانہ کے مشاہدے سے بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں بھی ٹریجڈی کامیڈی سے زیادہ دیرپا اور مقبول ہوتی ہے۔ چاہے فنی طور پر وہ ناکام ہی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں آپ کو اپنی زندگی کی تصویر نظر آتی ہے۔ اور کامیڈی ایک خیال یا زیادہ سے زیادہ کسی دوسرے کی داستان معلوم ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر انسان کو کامیڈی کسی دوسرے کی ہی زندگی نظر آتی ہے۔ کامیڈی ہمیشہ ایک ہلکی پھلکی اور سطحی چیز ہوتی ہے۔ اس میں روح کے نامعلوم اور گہرے تاروں کو چھیڑنے کی قدرت نہیں ہوتی۔ تمام فنونِ لطیفہ جب اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر روح پر اثر انداز ہوتے ہیں تو اُن کا اثر ایک مبہم سی افسردگی ہوتی ہے۔ کوئی بہترین شعر، رقص، تصویر، گیت آپ کو قہقہے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ قہقہہ ہمیشہ کسی بگڑی ہوئی حقیقت کے مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن آنسو زندگی کا راز پا لینے کا انجام۔ جبھی تو سوچ انسان کو افسردہ بنا دیتی ہے۔

یہ تو ہوئیں زندگی کی بنیادیں یعنی نہ بدلنے والی حیوانی زندگی۔ اب کہئے کہ ان کو بیان کرنے والا ادب قنوطی ہونے کے علاوہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ اس میں تو کسی اور زاویۂ نگاہ کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ یہ اس قدر مکمل اور مطلق ہے کہ اسے صرف ایک زاویۂ نگاہ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ یا ہر زاویۂ نگاہ کا اثر ایک ہی ہے۔ اب آئیے اجتماعی زندگی کی طرف۔ چونکہ یہ مقامی حالات کے ساتھ ساتھ ہی بدلتی رہتی ہے اور ہر خارجی طاقت اور وہ واقعات اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا اُردو شاعری میں اس کا عکس دیکھنے کے لئے ہمیں مردہ ہندوستان کے اور وہ بھی جہانگیر، شاہجہان وغیرہ سے لیکر آج تک کے سماجی اور اقتصادی ماحول اور سیاسی حالت پر غور کرنا پڑے گا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان زبردست بادشاہوں کے زمانے میں حکومت کی باگ ڈور کو عوام کے ہاتھوں نے چھوا تک نہیں تھا۔ بلکہ وہ شخصی حکومت اور جاگیردارانہ نظام کے رحم و کرم پر تھے۔ کسی بادشاہ کا رحم دل یا رعایا پرور ہونا کوئی وقتی اور سطحی تبدیلی تو پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن یہ بات طرزِ حکومت، خود حکومت اور نظام پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جاگیرداروں کے ذاتی مفاد کی کشمکش اور چپقلشوں کی چکی میں پسے جا رہے تھے۔ اور پھر مغلیہ سلطنت کی بنیادیں ہلیں تو بس خدا کی پناہ۔ شاعروں کے جاگیردارانہ نظام ہر بادشاہ کے عہد میں عوام کو جکڑے ہوئے تھا اور اُن کی مالی حالت اور خود ان کی زندگی ہر وقت ایک غیر یقینی سی بات تھی۔ حساس دلوں کو تو چھوڑ، سپاہیوں کے سنگین اور سرد دل بھی تڑپ اُٹھے۔ پھر درباری نوازشیں جو اُن کو دین و دنیا سے بے فکر اور بے خبر کر کے محلوں میں قصیدوں کی سنہری قیدوں میں جکڑے ہوئے تھیں ختم ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں اگر اُردو شاعری قنوطی نہ ہوتی تو اور ہوتی ہی کیا۔

ہاں ایک تلخ بات اور۔ اس زمانے کے شاعر بھی پوری طرح بری الذمہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اُن کی قنوطیت سراسر ماحول کی پیداوار ہونے کی بجائے تقلیدی عنصر کی زیادہ مرہونِ منت تھی۔ جو فارسی میں غلط تصوف کی پیداوار تھا۔ کسی بھی پرانے اُردو شاعر کا کلام پڑھ جائیے۔ آپ اُن واقعات کی ایک جھلک تک بھی نہ دیکھ سکیں گے۔ جو اُس زمانے میں ماحول اور سماج پر اثر انداز ہو کر اُسے اور بھی تاریک بنا رہے تھے۔ کہیں بھی یہ معلوم نہ ہو گا کہ ذاتی مفاد سماج پر چھا رہا تھا۔ غدار سلطنتوں اور قوموں کو بیچ بیچ کر چلتے جا رہے تھے۔ بوسیدہ نظام گر رہا تھا اور اُس کے ملبے میں عوام کچلے جا رہے تھے۔ اُن کے اندازِ نظر اور قنوطیت میں انفرادی رنگ بالکل ناپید ہے۔ سماجی مسائل کی طرف تو اُنکی کبھی نظر بھی نہیں گئی۔ شاعری کا تمام تر سرمایہ فرضی عشق کی وارداتیں ہیں۔ فرضی اس لئے کہ ایک تو وہ بہت حد تک اَن نیچرل ہیں۔ شاید اصل زندگی میں اُنہیں کسی سے اُلفت نہ ہو لیکن اس سے ہمیں کیا غرض۔ ہمیں تو اُن کے کلام اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اُس سے مطلب ہے اور یہ رسمی باتوں سے اس قدر پٹا پڑا ہے کہ اگر کوئی حقیقت ہے بھی تو وہ اس انبار میں چھپ کر رہ گئی ہے۔ وہی تقلیدی بندھن ہر جگہ قلم کو جکڑے ہوئے ہیں۔ جنسی مسائل کا کوئی صحت مندانہ نظریہ یا حل تو وہاں ڈھونڈنا ہی بے سود ہے۔ آپ کہیں گے کہ اُس زمانے کے لوگ اس چیز کی کھلی بحث کی کبھی اجازت نہ دیتے۔ مگر یہی تو میں کہتا

ہوں کہ وہ تقلید اور رسوم میں اس قدر جکڑے ہوئے تھے کہ کوئی نئی بات کر ہی نہ سکتے تھے۔ یہ اعتراض تو بالکل فضول ہے کیونکہ کسی زمانہ میں ایسا تھا۔ وہ شاعر ہی کیا جو زمانے سے بلند نہ ہو سکے۔ آخر یہ جو آتی کا آمد اور نئی باتیں پیدا ہوئی ہیں زمانے کی مخالفت ہی سے تو ہوئی ہیں۔ ہم غالب کو بھی تو بڑا شاعر کہتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے گرے ہوئے مذاق سے بہت بلند اُٹھ گیا اور لوگوں کی کوئی پروا نہ کی جبکہ ذوق اسی دلدل میں پھنسا رہا۔ غالب اگر یہ بغاوت کر سکتا تھا تو اُس نے ان مسائل کے صحت مندانہ حل ڈھونڈنے میں اپنی ضمیر کو لوگوں کے تابع کیوں نہ کر دیا۔ نہیں بھائی وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ ایک شاعر پر کتنی بڑی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ اور کس طرح اُسے ان سے عہدہ برا ہونا ہے۔ قہرِ خدا کا لوگ تو کہتے ہیں کہ خدا نے دنیا میں کوئی بھی دو صورتیں ایک سی نہیں بنائیں لیکن یہاں محبوب میں بھی انفرادیت نام کو نہیں۔ کسی حسین جلاد کا مضحکہ خیز حرکات مائل کوئی بت بنا ڈالئے بس تمام شاعروں کے محبوبوں کا مجموعہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب شاعر زماں و مکاں کی قیود کو توڑ پھوڑ کر ایک ہی ستم پیشہ پر مرے جا رہے ہیں۔

اب لیجئے، موجودہ حالات کو عوام کے لئے ماحول آج بھی وہی ہے جو تین سو سال پہلے تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ جاگیردارانہ نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام لے چکا ہے (وائے قسمت!) اور شخصی حکومت اپنی فطرت بدلے بغیر صرف خدوخال کو بدل کر جمہوری چولا پہن چکی ہے۔ عوام کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہے۔ دنیا کی اقتصادی الجھنیں ہندوستان پر اور بھی شدت سے اثر انداز ہو رہی ہیں (زلزلہ بر عضوِ ضعیف می ریزد) لیکن ایک اُمید کی کرن بھی جگمگا رہی ہے۔ عوام کا زاویۂ نگاہ بدل چکا ہے۔ اُن کی قوتِ احساس جاگ اُٹھی ہے۔ سیاست اور سماج سے مذہبی تقدس کا ملمع اُتر چکا ہے۔ لوگ اب ہر چیز کو پہلی سی آسانی اور یقین سے برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ دُکھ درد اور مصائب اب گناہوں کی سزا نہیں سمجھے جاتے۔ ان کی ذمہ داری اب خدا کے کاندھوں سے اُتار کر انسانوں کے کاندھوں پر رکھی جا چکی ہے۔ آسمان کی گردش کو کوسنے کی بجائے تیز تیز نظریں اب سماج کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ لوگ سمجھ چکے ہیں کہ قوانین، رسوم اور سماجی نظام انسانی خداؤں کے اپنے فائدے کی خاطر بنائے ہوئے بت ہیں جن کا توڑنا ضروری ہے۔ بھوک اور جنسی مسائل تو بہ کر اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ وہ عورت، محبت، شادی اور طرزِ حکومت کو موجودہ حالات اور فطری جذبات کے مطابق حل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لفظ محبت سن کر کھوئے نہیں جاتے۔ بلکہ جرأت کے ساتھ اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ اس لفظ کو اب زندگی کی تلخیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے استعمال نہیں کرتے۔ وہ مجنوں اور فرہاد کی مریضانہ محبت سے مطمئن نہیں۔ وہ ان مسائل کا تسلی بخش حل چاہتے ہیں اور سماجی خداؤں کی زنجیروں کو توڑنا چاہتے ہیں۔ مستقبل کی بابت اُن کے دلوں میں امیدیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اور بے ڈھنگی بنیادوں کے باوجود وہ عمارت کو حسین بنانا چاہتے ہیں۔

زندگی کی اس قابلِ تبدیل عمارت یعنی انسانی زندگی کے متعلق آپ پرانے شاعروں کا اندازِ نظر تو دیکھ چکے اُنہیں تو چھوڑیئے لیکن موجودہ زمانے کی زندگی کے ناقد یعنی ترقی پسند شاعر سے آپ سطح پر مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ ان حالات میں وہ مسرت کے بھدّے گیت گائے۔ وہ ادبی خودکشی کئے بغیر زندگی کو ادب سے کس طرح نوچ پھینکے اور زندگی آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ آپ اُسے اس دیوانگی پر مجبور نہیں کر سکتے۔ کسی کو پیٹے، چھیتے دیکھ کر ہنسنا دیوانگی ہی تو ہے۔ ہاں اتنا یقین کی ایک کرن ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ اس عمارت کو بدلا جا سکتا ہے۔ موجودہ شاعر کو اس کرن کو ہاتھ میں لیکر اس سے ماحول کی تمام تاریکیوں کا مقابلہ کرنا اور اسے چھانا ہے۔ موجودہ شاعر پر ماحول کی عکاسی کے علاوہ ایک اور فرض بھی عاید ہوتا ہے۔ اسے صرف احساسِ زیاں ہی نہیں دلانا بلکہ اُمید بھی پیدا کرنا ہے۔ اُس پر ایک اخلاقی اور قومی فرض بھی ہے۔ اُس کا زندگی کی عمارت کو حسین بنانے میں سب سے زیادہ ہاتھ ہونا چاہیئے۔ اُسے عوام کے بیدار شعور سے فائدہ اُٹھا کر اُنہیں مفید کاموں پر آمادہ کرنا ہے۔ اُمید کا پیام دینا ہے تاکہ قوم بددل ہو کر عمل سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔ اُسے تو یہ کہنا ہی پڑیگا۔ لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔ اور

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے!

یہیں وہ مقام ہے جہاں شاعر کو پیغمبر ہونا ہے اور اس لحاظ سے اُردو شاعری کا موجودہ دور کچھ ایسا مایوس کن بھی نہیں۔

خواب

شاہد صدیقی

ہمنشیں! کل دل کی دُنیا پر اُداسی چھا گئی
قوم کے غمگیں تخیل میں مجھے نیند آ گئی

دیکھتا کیا ہوں، مرا بیکس وطن آزاد ہے
پنجۂ صیاد سے جانِ چمن آزاد ہے

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اک سہانی روشنی
روشنی دل کش، سہانی آسمانی روشنی

عرش سے تا فرش ہے انوارِ عشرت کا ہجوم
فرش سے تا عرش ہے گلبانگِ آزادی کی دھوم

رقص کرتی ہے صُراحی، دَور میں پیمانہ ہے
میکشانِ حُریت کی ہر ادا رندانہ ہے

کوئی میکش اپنے حصے کی بچا سکتا نہیں
اور میخانے میں کوئی غیر آ سکتا نہیں

اپنی محفل، اپنا ساقی، اپنا ساغر، اپنی مے
اپنی مستی، اپنا بربط، اپنا نغمہ، اپنی لے

پا چکے ہیں اپنی محنت کا صلہ، اربابِ کار
اور مجبوروں کو حاصل ہو چکا ہے اقتدار

مٹ گیا ہے امتیازِ مفلس و سرمایہ دار
اُٹھ گیا ہے پردۂ روئے غلام و تاجدار

آدمیت کی ہوا میں پل رہی ہے زندگی
زندگی کے راستوں میں چل رہی ہے زندگی

جابر و مجبور میں کچھ تفرقہ باقی نہیں!
بندگی و خواجگی کا سلسلہ باقی نہیں!

ایک ہی منزل پہ آ پہونچے ہیں آقا و غلام
کوئی رہرو سست ہے اور نہ کوئی تیز گام

کوئی بچہ بھوک کی تکلیف سے روتا نہیں
اور اک میلی سی گدڑی اوڑھ کر سوتا نہیں

کوئی ماں اپنے بڑھاپے پر نہیں ہے اشکبار
جھانکتا ہے سب کی آنکھوں سے بزرگی کا وقار

کوئی بیوہ جشن کے بازار میں آتی نہیں
چند پیسوں کی غرض سے ناچتی گاتی نہیں

صبح سب کی صبح ہے اور شام سب کی شام ہے
مختصر یہ ہے کہ فطرت کی عنایت عام ہے

سب کی باتوں سے نمایاں ہے مسرت کی جھلک
سب کی نظروں میں ہے کیفِ کامرانی کی چمک

سب کے سینوں میں ہے اک آزاد و خود مختار دل
خود نما و خود پرست و خود سَر و خود دار دل

سب کی آوازِ عمل میں ہیں خود آگہی کے زمزمے
زندگی کے زمزمے، تابندگی کے زمزمے

الغرض ہر سمت اک دُنیائے نَو آباد ہے
اس غلام آباد میں شاہنشہی آباد ہے

یک بیک مجھ کو کسی آواز نے چونکا دیا
ہوش کی منزل پہ آ کر نیند نے دھوکا دیا

میں وہی تھا اور وہی میرا شکستہ سا مکاں
جس کی دیواروں کے روزن ہیں غلامی کے نشاں

پرتھوی ناتھ شرما

نیلوفر

نیلوفر تالاب میں کھلتے ہیں۔ جھیل میں پرورش پاتے ہیں یا کہیں اور، یہ ہمیں معلوم نہیں۔ کبھی کبھی شہر کی گلیوں میں گندے ماحول میں بھی ایسے پھول کھلتے ہیں۔ تر و تازہ، شگفتہ، شفاف، نازک اور انتہائی درجہ کے پاکیزہ۔ جو ہاتھ لگانے سے مرجھا جائیں اور ان گلیوں کی رنگت کبھی کبھی ایسے پھولوں کی موجودگی سے نکھر جاتی ہے۔ پاکیزہ روشنی کا ایک ذرہ کبھی کبھی اندھیرے میں اتنی ضو فشانی کرتا ہے۔ کہ تاروں بھرا آسمان نیچے جھک کر اس روشنی کا مطالعہ کرے۔

میلو کی ماں جب اسے چھیڑ رہی ہوتی تھی اور اس کے گال کبھی سرخ اور پھر کبھی کبھی ہلکے نیلے پڑ جاتے تھے۔ تو اس کا بھائی کہتا تھا: بنا میا نیلوفر اب کی بار شرارت کی تو ایک کی بجائے دو نیلوفر کے پھول کھلیں گے۔ کبھی میلو کتنی بھولی ہے۔ میلو! نیلوفر! نیلوفر!!" اور نیلوفر کے نام سے میلو کو بہت چڑ تھی۔ وہ منہ بنا کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی۔ اس وقت اس کے نقش و نگار دلکشی کی غیر منتہی گہرائیوں میں کھو جاتے تھے اور وہ کوئلے کا ایک ٹکڑا اٹھا رسوئی کے فرش پر ٹیڑھے ترچھے نقوش کھینچنا شروع کر دیتی۔ چھوٹے موٹے ضرب تقسیم کے سوال۔ ہندوستان کا نقشہ یا پھر انگریزی کے سوال۔ ہندوستان کا نقشہ، یا پھر انگریزی کے چھوٹے چھوٹے لفظ۔ سی۔ اے ٹی کیٹ۔ معنی بلی۔ آر اے ٹی ریٹ۔ معنی چوہا۔ بلی اور چوہا۔ اس کی ماں بلی اور میلو ایک ننھا سا چوہا جو بلی کی شراب سے چمکنے والی آنکھوں کو دیکھ کر سہم جائے۔ کونے کونے میں دبکا دبکا پھرے۔ لیکن بلی کی آنکھیں لال پیلی ہوتی رہیں۔ ایک روز اس کی ماں نے میلو کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ کر سمجھے میلو گھر کا کام سنبھالے یا سکول کا۔ گھر کی استانی کہتی ہے برتن مانجھو، روٹی پکاؤ۔ بچوں کو سنبھالو۔ مدرسے کی استانی کہتی ہے انگریزی کا سبق دو بار کرو۔ کم از کم دس سوال نکال کر لاؤ۔ کرکے لاؤ خوب پٹے۔ گھر کی استانی کا کام نہیں کرتی تو بیلنوں اور چمٹوں سے خبر لی جاتی ہے اور مدرسے کا کام نہیں ہوتا تو بید سے آخر ایک نازک ہستی کیا کیا کام کرے۔ میلو کی ماں چیختی چلی گئی اور میلو چپ چاپ سسکیاں بھرتی رہی۔ اور جب اس کی ماں نے تمام کسر نکال لی تو وہ چپ چاپ اٹھی بستے کو کھولا، کتاب اور کاپی نکالی اور سر کی پنسل خاموش قدم رکھتی وہ دالان میں آگے بڑھی۔ رسوئی سے دالان اور دالان سے صحن اپنی غصیلی ماں کے نگاہوں کے تاروں میں الجھتی الجھاتی، اپنے آپ کو سنبھالتی کتاب، پنسل، اور کاپی ایک عظیم بوجھ جو ایسے کندھوں پر لاد دیا گیا جو جو اسے نباہ نہ سکیں۔ نزاکت اور بوجھ سراسر بے انصافی۔ مگر کیا نزاکت پر غصہ والوں میں من ڈیڑھ من بوجھ کو کہیں جگہ نہیں ملتی۔ اور شاید وہاں نیلوفر کے پھول بھی کھلتے ہیں لیکن عادی ان کی حقدار نہیں۔ بے دردی کے نہایت بے ڈھنگے ہاتھ سے ان کو نہایت بیدردی سے توڑ لیا جاتا ہے۔ اور تپتی ہوئی چٹانوں پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ رنگ و تر و تازگی کھو جاتی ہے۔ اور نیلے آسمان کی رنگت جذب کئے ہوئے نیلوفر کے پھول دھوپ میں تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ میلو آگے بڑھی۔ اس کے رخسار طمانچے کھاتے کھاتے نیلے پڑ گئے تھے۔ نیلوفر ایسے نیلوفر ایک ظالم ماں کی آتش فشاں جبینی میں تڑپ رہا ہو۔ سسکتا جا رہا ہو۔ بجا ہے ہر لمحہ، ہر ثانیہ وقت کے بیدار قیاس کٹھن ہیں۔ اس کی تر و تازگی تڑپ تڑپ کر زندگی کے مراحل طے کرتی ہے۔ معصومیت کی موت بیسویں صدی کے فرشتے قتل گاہ میں سکول، گھر، بعض زندگی کی تربیت گاہیں ہیں مکمل اخلاقیات، جمالیات کی تعلیم و تربیت ہے۔ اور گھر خانہ داری کی۔ بیسویں صدی میں ہم نے اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھ لیا ہے کہ حتیٰ نزاکت کے احساس کو سنبھالتی ہوئی معصوم بچیاں ایک کانٹے کے بعد دوسرے میں الجھتی

سلسلہ بھوتی جیسی سکول کے تالاب میں کئی بار گر ہو سکتے ہیں اور بگڑی
ذہنوں میں صرف ایک سا اور ہر ایک ساتھ گیم کھیل کی ہیئت کا صحیح اندازہ
فلسفہ کا منکر ہوتا ہے اور یہ تجربہ انسان کا ہنگامہ پہنچتا ہے جیسے بیسویں صدی
میں ہندوستان کی بساط پر کھی ہوئی تجربہ گاہیں اور میرا ذہن بھی اسی تجربہ گاہ
کا آلۂ کار یا پھر بنیادی خشتہ بن چلی تھی۔ ماں شہر کی پیٹ کا اس کا ایک گوشتی
کی صحیح تعلیم بنا چاہتی ہے اور مدرسے سے صرف علمی مضامین پڑھ کر چا
کر بیچتی اور ترقی کی لہر دکھانا چاہتی ہے۔ اور ان دونوں کی پیداوار ایک شخصیت
عجیب ہستی بن جاتی جو اس مقناطیس کی سوئی کی مانند ہے جس کو شمال کا
کبھی صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ جو جدھر زیادہ کشش دیکھتی ہے اُسی طرف مائل
ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ سراسر غلطیوں سے بھری مقناطیس ہے جس نے
بیسویں صدی میں شمال کا ٹھیک پتہ نہیں لگایا۔ جو کشش دیکھی جو۔
ضرور ہے لیکن کوئی بھی کچھ بات ہے اور یہ مقناطیسی سوئی سخت انتشار
کی حالت میں کبھی کبھی غلط رجحانات کی جانب بھی اگر ایسی اسی سمتوں کی طرف
راغب ہو جاتی ہے کہ موثر تاثر یا زبردستی صحیح شمال کی طرف دکھانا ایک
سعی لاحاصل بن کر رہ جاتا ہے۔

میری مقناطیس کی سوئی جس کو دھرتی میں صحیح شمال کو کیا کسی سمت
کا ذرہ بھر خیال نہیں۔ دھرتی یا دالان میں پہنچتے پہنچتے شمال کے
خیال میں ڈوب گئی۔ صحیح شمال، اس دھرتی یا دالان میں یا صحن اس
کی ماں کی جھجک کی آتشناک شعلوں کی جانب نہیں۔ اُن غلط شماروں کی
الجھن سے آزاد ہو کر زینہ کے ذریعے، زیریں صحن اور صحن کے سامنے
متوسط درجہ کی بیٹھک میں۔ میلو اُن زینوں سے آہستہ آہستہ اُتری اور
نیلوفر کے پھول، اُس کے معصوم رخساروں پر کھلے ہوئے نیلوفر کے
پھول تھوڑی بہت دیر تک کھلے تھے وہ چپ چاپ صحن میں آگئے
تھی۔ آنسوؤں کی ہلکی ہلکی بوندیں رخساروں پر رواں تھی۔ اُس نے دھوتی
کے آنچل سے اُن کو صاف کیا اور بیٹھک میں گھس گئی۔

• ممی •

• نمستے ممی، میتو روتی ہے بنگلی۔ سال جی نے پیشادہ تیری اماں کی

سکتے ہیں سوچتی ہیں۔

• اوہ ہونہہ۔ میتو نے نیچے چہرے بناتے ہوئے کہا
• بیٹھنے کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ بس پڑھو اور گھر بیٹھے۔ ہوں۔

• میتو تو انگریزی سکول میں پڑھتی ہے۔ بھلا سکول میں پڑھنے
والی لڑکیاں روتی ہیں۔ مسز شرما نے بچکی سے سمجھایا۔

• اچھا نہیں روتی۔ آنسوؤں کو پونچھ نا۔ ہمارے سوال کر دو گے
ایک!

• کیوں نہیں۔ تمہارا بھائی کہاں گیا ہوا ہے۔ وہ تو بہت شیخی
بگھارتا ہے کہ میں یہ جانتا ہوں میں وہ جانتا ہوں۔ اس سے پوچھ لیتی۔

• بتانے ہی تو بتائیے۔ اور اس وقت نیلوفر کے پھول ایک
عجیب انداز سے کھلتے ہوئے دکھائی پڑے۔ کتنے دلکش اور جاذب
پھول۔ لیکن ماں کی بے جا مار سے پیدا شدہ پھولوں سے مختلف۔ پاکیزہ،
لطیف، روح پرور۔

• اچھا بھئی۔ تجھے تو بتانا ہی پڑیگا۔ اگر تجھے نہیں بتایا تو
اتنی بڑی حویلی میں ہمیں کون رہنے دیگا۔ مالک مکان بھی نوٹس دے دیگا
اور یہ بیٹھک خالی کرنی پڑے گی۔

سوال، زندگی کے سوالوں سے کتنے مختلف۔ تفریق، جمع، ضرب،
تقسیم، کسر اعشاریہ، جمع، تفریق، تجارت، وقت و کام وغیرہ وغیرہ۔ بالکل
غیر ضروری چیزیں۔ دماغ کو سوچا دینے والے مرحلے۔ میتو برابر مسز نگم کے
سے شرما کے ہاتھوں اور ماتھوں کے بعد کاغذ پر سوالات کے حل کر دیکھ
جا رہی تھی۔ اور ہاں ہاں میں ہاں ملاتے جا رہی تھی۔ سمجھ سمجھنے کی قطعی ضرورت
نہیں۔ بالکل یہی یہی وہی حل وہ دھرتی کی مدھم روشنی والی لالٹین کے
سائے میں بیٹھ کر اپنی کاپی میں نقل کرے گی اور اُستانی کے سامنے پیش
کر دے گی۔ اگر گھر کا استاد ناراض ہو تو مدرسے کا مدرس راضی۔ اور اگر
گھر میں سب کام ٹھیک تھا تو مدرسے میں غصہ کا مظاہرہ، بے جا فضول۔ کیا اُن
ننھی معصوم بچیوں کیلئے دفتروں کی کرسیاں، ہسپتالوں کی کوچیں خالی پڑی
ہیں۔ نہیں! تو پھر کیوں یہ سلسلہ وقوع میں آتا ہے۔ یہ دریافت کرنا پھر مقناطیسی

سوئی کے ٹھیک شمال کا اندازہ لگانے کے مترادف ہے۔ شمال، ادھر لٹکتا
تمہاری جاگتی آنکھوں کی پتلیوں میں عکس تھے الٹا جغرافیہ شمال، اس کا صحیح
اندازہ لگانا کتنا مشکل امر بن چلا ہے۔ ایک، دو، تین، چار...... پورے
دس سال۔ مقناطیس کی سوئی کو درست سمت کی طرف دھکیلنے کی کوشش!
دباؤ، بوجھ...... سرلش چپکے چپکے کہنے لگا اور میتو خاموشی کے ساتھ دیکھے گئی:

"بس آؤ؟"

"نہیں۔ تھینک یو" میتو نے تمتماتے ہوئے رخساروں کو سرلش کی طرف پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ! میتو تو تو بالکل فرنگن بن گئی ہے۔ فرنگی۔ خالص یورپین تھینک یو۔ اوفوہ"

اور مِنی، مادموزیل (Madamoiselle) بن گئیں۔

اور پھر وہی گل نیلوفر، لنڈن، رنگت بدلنے والا نیلوفر، پنسل، کاپی اور کتاب لادو ماما۔ نہیں ہندوستانی لڑکی کی نجات۔ بیسویں صدی! امیتو کتابوں کے بوجھ نیچے دب جانے والی ہستی، نازک، لاغر۔

"جلدی نکلی۔ ماں جی پھر تو نہیں ماریں گی؟"

"جانے دو۔"

میتو کی زندگی کے تالاب میں نیلوفر کے پھول کھلے۔ باقاعدگی تو خیر نہیں تھی مگر کبھی کبھی ہفتہ دو ہفتہ، مہینے دو مہینے میں ضرور کھلتے۔ اور وہ رسوئی اور دالان سُوکھی تپتی ہوئی چٹانیں بن ہو گئیں۔ تمازتِ آفتاب اور غصہ کی گرمی سے لوہے کے کارخانے کی بھٹیوں کو تلہ کھا جانے والی بھٹیوں ایسی نارِ جہنم کو مات کرنے والی ساس بیٹھتی اور میتو ناچتی۔ رسوئی میں مقناطیس کی سوئی کی طرح ناچتی شمال کی تلاش میں اور ایک کے بعد ایک نیلوفر کے پھول کھلنے شروع ہو جاتے جب اُن تپتی ہوئی چٹانوں پر یہ پھول اضطراب کی آغوش میں لا انتہا بے قراریوں کا شکار ہو چٹکتے تو پھر زینہ، زینہ کے بعد صحن اور صحن کے بعد بیٹھک کے خاموش برف ایسے ٹھنڈے ماحول میں پناہ لیتے۔ لرزتے، کانپتے، ڈرتے، ڈرتے، ادھر اُدھر دیکھتے۔ جنوب، مشرق، مغرب، اور شمال وہ اتنا

موہوم کیوں ہے کیا جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر تک بھی نہیں کیا جاتا۔ بیشک ہے مقناطیس کی سوئی کو کسی حد تک شمال کا اندازہ تو لگ جاتا مگر درست شمال، قطب شمالی کے برفستانی علاقوں کا چھوٹا سا شمال غائب، قصّہٴ ماضی، سدرۃ المنتہا کا باشندہ، موت کی آغوش اور نا قدری کے پاؤں تلے کچلا جانے کے بعد تڑپتا ہوا شمال۔

سرلش دیکھتا تھا کہ میتو حق الوسع گھر اور مدرسہ کا کام نپٹانے کی کوشش کرتی ہے مگر تیز چکی اور تکمیل کہاں ملتی ہیں۔ وہ دھیمی چال سرخ چشموں کے دھڑکتے ہوئے سینوں میں شفق کے جھلمل نقاب ہیں۔ آخر کہاں۔ یا پھولوں کی غصیلی آنکھوں کے سامنے ہیں کہیں نہیں۔ یہ سوال صدیوں پرانا ہے۔ روزِ ازل کا تخیل، متاعِ قدرت کی امید مگر تکمیل اب بھی ایک غیر حل شدہ مرحلہ ہے۔ بیسویں صدی کہتی ہے ہم نے تکمیل کو پا لیا کیسے، کس طرح۔ جنگی مشینوں کی گھڑگھڑاہٹیں، یا مدھم روشنی کی لالٹین کے سایوں میں شاندار عمارتیں، گھاس پھوس کی جھونپڑیاں، وہ یا پھر جنگی تکمیل، انسانیت کا تشنۂ تعبیر خواب، ایک جستجو جو ماضی سے حال اور حال سے مستقبل میں گم ہوتی نظر آتی ہے۔

میتو جوں جوں زندگی کی منازل طے کرنے لگی۔ توں توں سرلش کے پاس اس کا آنا کم ہوتا گیا۔

ایک، دو......

میتو سرلش کے پاس آئی۔ اس کی ماں کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ سرلش اپنی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔

"میتو" زندگی کے پندرہ سال نبھانے والی میتو۔ بیٹھک میں کھڑی ہوئی تھی۔ "آؤ بیٹھو۔"

میتو نے ایک خط اپنے ہاتھ سے سرلش کی میز پر رکھ دیا۔ "دیکھئے مجھے ذرا اس کا مطالعہ کر لیجئے......" اور وہ واپس جاتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"ذرا ٹھیرو، آخر میں اس خط کا کیا کروں۔"

"پڑھ لیجئے گا۔" اور میتو آئندہ پریشان جھکی جھکی نگاہیں لئے پھر اپنے دالان میں جا کر بیٹھ گئی۔

غلامیوں صدی کی محبت کا ایک نامرشدہ کسی شوقین مزاج نے میلو کو کہا تھا کہ وہ اس پر شیدا ہے۔ ہزار دل و جان سے اور مقصد صرف نفس ہیجیلی تسکین۔ جنسی تسکین۔ عجب گویا محبت اتنی ڈھل چکی ہے۔ میلو ایسی لڑکیاں سکول میں پڑھ کر یونہی نکھرتی ہیں۔ کہ ان کو خواہشات کا شکار بنایا جائے ..... میلو نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا۔ کہ سرلیش کے پاس وہ خط پہنچا دیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ سرلیش عقلمند انسان ہے۔ سرلیش عجیب کشمکش پیچ میں تھا کہ کیا کرے۔ میلو کو اس نے سینکڑوں سوالات کے حل کر کے دیئے ہیں۔ وہ میلو کا اُستاد ہے۔ کیونکہ میلو نے اس کی عزت اور احترام کا خیال رکھا اور آج میلو نے پھر اس کو ایک عجیب سوال حل کرنے کے لئے دیدیا۔ کتنا مشکل اور اہم مرحلہ۔ کیا بزرگ افسان اس کو حل کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ان میں اتنی فراخدلی کہاں۔ انہوں نے ابھی ٹھیک شمال کا اندازہ کہاں لگایا ہے۔ اور اُن کے بچے اُن کی طرف امداد مانگنے کے لئے دیکھتے ہیں مگر نہیں ملتی۔ آخر وہ کیا کرے۔ خط اس کے سامنے میز پر پڑا تھا۔ میلو کی ہمت کا کرشمہ اور انسانی خباثت کا نمونہ .....

میلو تیسرے روز پھر آئی۔ سرلیش کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

"میلو۔ بیٹھ جاؤ میں نے وہ خط دیکھا ہے میلو۔ تم سکول میں کب تک پڑھو گی؟"

"یہ آخری سال ہے پھر ....."

"پھر کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ ماتا جی کہتی تھیں کہ میلو کو اس سال کے بعد سکول سے اُٹھا لیں گے!"

"اچھا! پھر آپ کا کیا خیال ہے اس خط کے بارے میں ....؟"

"آپ ہی سوچ لیجئے۔ میرے لئے آپ ہی سب کچھ ہیں مگر میں کون سوچ سکے گا ......" آنسو شرافت کے قطرے۔ کیا یہ ہر ہندوستانی لڑکی کی آنکھوں میں نہیں آتے۔ ایسے وقت ان لمحات میں؛ اور یہ مقناطیسی سوئی کی صحیح شمال کے اندازہ لگانے کی بے قراری ہے۔ تڑپ ہے۔ اضطراب ہے۔ میلو کے رخساروں کے پھول مرجھا سے گئے اور وہ پھر واپس چلی گئی۔ ماں کی نگاہوں کے تاروں میں اُلجھی اُلجھی پھرنے کے لئے۔ تپتی ہوئی چٹانوں پر سکون کی تلاش، فضول جستجو میں خراب ہو جانے کے لئے۔ میلو ایک ایسا پرندہ بلکہ ننھی چڑیا جو عقاب کی نظر میں آچکی ہو۔ اور جسے جھپٹنے کے لئے عقاب بیقرار ہو۔ اور سرلیش جس کے ذمہ اس عقاب سے چھٹکارا دلانے کا کام سپرد کر دیا گیا ہو۔ سرلیش کیا کرے؟"

پھر آئی ___ میلو سرلیش سے دریافت کرنے پھر آئی۔

"سوچا آپ نے"

"سوچ رہا ہوں۔ بہت شدت کے ساتھ میلو۔ مگر میں دیکھتا ہوں میرے ہاتھ کٹ گئے ہیں۔ اور میری زبان وہ ___ کچھ نہیں میں کیا کروں کیا کہوں، کیا کہوں۔ اچھا تم جاؤ۔ مجھے سوچ لینے دو۔" میلو پھر چلی گئی۔

مکان کے ملحق ایک باغیچہ تھا۔ اور چھوٹا سا مندر، عورتیں صبح و شام ادھر جاتیں تو جا درشن کر کے واپس آجاتیں۔ میلو بھی اکثر ادھر جایا کرتی۔ اکثر اپنی ماں کے ساتھ اور کبھی کبھی اکیلی۔ اُدھر آدمی کا گذر بہت کم تھا۔ سرلیش کبھی کبھی اپنے کام سے فراغت پا ادھر الگ جا بیٹھتا تاکہ اس کا دماغ تر و تازہ ہو جائے۔ وہ کالج کا ذہین طالب علم تھا۔ ذہین، عقلمند اور کچھ آزاد خیال۔ ایک روز وہ شام گئے وہاں جا پہنچا۔ بیٹھا رہا سوچتا رہا آخر میلو کو کیا رائے دے۔ اپنے شاگرد کو کس طرح ٹھیک راستے پر لگائے اس کے ہاتھ میں صحیح شمال موجود تھا۔ وہ شمال جسے میلو کی مقناطیس چاہتی تھی۔ قطب شمال کی برفستانی چوٹیوں کو چومتا ہوا شمال۔ اور اس تڑپتی ہوئی مقناطیس کو صحیح شمال دکھا سکتا تھا۔ اور نیلوفر کے پھولوں کو تپتی ہوئی چٹانوں پر سوکھنے سے بچا سکتا تھا ....

سرلیش کو بیٹھے بیٹھے بہت دیر ہو چلی۔ نیلے آسمان کو تختہ سیاہ بنا کر خیالاتی چاک سے سوال حل کرنے کے لئے آکر بیٹھا تھا۔ لیکن شام کے اندھیرے میں ہائے اس تختہ سیاہ پر لکھا سب مٹا مٹا سا دکھائی پڑتا۔ شفق کے ڈسٹر نے اس کو ایک سرے سے مٹا دیا۔ اور سرلیش کی

ہماری محنت اندھیرے میں ڈوبتی نظر پڑی، مٹتے مٹتے نقوش، دھندلے دھندلے خیال، پریشانی اور اضطراب، ایک سوال کُشتہ کی ناکامیابی۔ اُس نے کوشش تو بہت کی کہ شفق کے ہاتھ سے اُس خونیں ڈسٹر کو چھین لے

عجب! نیلے آسمان پر شفق اپنا ڈسٹر پھیرتی ہے۔ تو نیلا آسمان کیوں سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور جب میتو کی ماں اُسے خوب پیٹتی ہے تو اُس کے رخسار کیوں نیلے کے بجائے سُرخ نہیں ہوتے۔ نیلوفر آسمان کی غیر منتہی جھیل میں کھلنے والے نیلوفر، میتو کا سایہ اُس جھیل میں پڑتا ہے۔ لرزتا، تڑپتا ہوا سایہ۔ میتو.....

"میتو۔ ارے تم یہاں اتنی دیر سے؟"

"ہاں! کچھ سوچا۔ بتائیے نا سوال کا جواب دیجئے۔ آپ نے اتنے سارے سوال حل کر ڈالے" میتو نے بڑے سادہ انداز میں جواب دیا۔

"سوچ رہا ہوں۔ یہاں آیا کس واسطے تھا سوال حل کرنے کیلئے تمہارا سوال حل کرنے کے لئے۔ بہت اہم سوال ہے۔ بہت وقت سے حل ہو سکے گا۔"

"اتنا آسان سوال....." میتو نے گھاس کے نازک تنکوں کو پودوں سے جُدا کرتے ہوئے کہا۔

"آسان سوال۔ تم جاؤ میتو۔ مجھے اس سوال کا جواب سوچ لینے دو جاؤ دیر ہو رہی ہے۔ ماتا جی انتظار کر رہی ہوں گی۔" سُرلش نے نصیحت آمیز انداز میں میتو سے درخواست کی۔

"چلی جاؤں گی۔ تو آپ اس سوال کو حل نہ کر سکے؟" اور میتو اندھیرے کی طرف دیکھنے لگی۔ جو جلد ہی اُس منظر اور ماحول کو اپنی لپیٹ میں لینے والا تھا۔ آسمان کے سُرخ اور نیلے رنگ کے ملاپ سے پیدا شدہ اندھیرا سُرلش بھی غیر ارادی طور سے میتو کی نگاہوں کی پیروی کرنے لگا۔

"اچھا نمستے"

"نمستے۔"

"ارے۔ او..... (میری آواز میں) میتو۔ میتو۔ ٹھیرو۔ میں تم کو سوال کا حل بتا دوں گا۔"

سُرلش کے قدموں میں گلاب کے دو پھول پڑے ہوئے تھے۔ میتو کے سوال کا حل لیکن میتو نے گلاب کے نیلے پھول کہاں سے پائے نیلوفر بھی تو نیلا گلاب ہے۔ نیلے آسمان کی جھیل میں نیلوفر کے پھول کھلتے ہیں۔ اور میتو کا سایہ اُس میں پڑتا ہے۔ وہ اُس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹ لائے گا نیلوفر کے پھولوں کی ہمسائگی سے کھینچ لائیگا اور گھسیٹتا ہوا لے جائیگا حتیٰ کہ رات کی دیوی اُن دونوں کو اپنے آنچل میں پناہ نہیں دیتی۔ میتو، میتو.....

اور سُرلش نے اُس باغیچہ میں اپنے پاؤں تلے بچھا ہوا تالاب میں نیلوفر کھلتا ہوا دیکھا، بہت شبنم آلود مسکراتا ہوا نیلوفر۔ تالاب جس کی وسعتیں آسمان کی جھیل سے بھی زیادہ، اور لاانتہا نیلوفر کے پھول، وہ اُن کو ایک کے بعد ایک توڑتے جائیگا اور کہے گا میتو یہ نیلوفر کے پھول۔ تم تو نیلا گلاب ہی لائی تھی میں نیلوفر کے پھول لے آیا۔ اس کو سنبھالو اپنی نازک آغوش میں سنبھالو یہ ہی تمہارے سوال کا حل ہے۔ میتو میں نے اسے حل کر لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس سے پیشتر کہ شفق اپنے ڈسٹر سے آسمان تختہ سیاہ کو صاف کرے میں اسے حل کر چکا تھا۔ اب نہیں صدیوں پہلے۔ اور اپنی بیٹھک میں کئی مرتبہ میں نے اس کو حل کیا ہے میتو۔ میتو میں تمہاری چوٹی کو گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا حتیٰ کہ رات کی دیوی ہم کو اپنے آنچل میں پناہ دے۔ میتو.....

سُرلش کے پاؤں تلے سوکھتا ہوا تالاب، مرجھاتے ہوئے نیلوفر اور اندھیرا ..... وہ کچھ جھومتا سا اُٹھا۔ ناچتا سا چلا۔ آخر اُس نے سوال حل کر ہی لیا کتنا مشکل سوال اور کتنا آسان حل، کالج میں دن رات ریاضی کے مرحلے ..... پیچیدہ سوال اور دماغ تھکا دینے والی باتیں۔ لیکن اصل سوال تو اُسے میتو نے حل کرنے کے لئے دیا اور وہ چٹکیوں میں حل ہو بھی گیا۔

. . . .

"اتنی اتنی دیر میں آتی ہے باہر سے ہیں!" اور میتو کے نازک رخساروں پر تڑسے طمانچہ پڑا۔

ایک!

دو!!

تین!!!

اور نیلوفر کھلنے شروع ہو گئے۔

"ماں میرے نیلے گلاب کے پھول!" میتو کے بھائی نے کہا۔

"اس جگہ رکھے تھے نامعلوم کہاں گئے۔ کون لے گیا کمبخت....؟"

"میتو۔ تُو تو نہیں لے گئی؟"

"نہیں ماتا جی میں نہیں لے گئی، ماتا جی!" میتو کانپنے لگی۔

"پھر جھوٹ بولا۔ بتا کہاں ہیں وہ نیلے گلاب کے پھول؟"

اُس روز میتو کو خوب پیٹا گیا۔ اور وہ سُبک سُبک کر رونے لگی۔

نیلے گلاب کے پھول سرش کی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ چپ چاپ دیکھتا رہا تھا۔ اور پھر اسے کچھ ایسا دکھائی دیا کہ میتو کے سُرخ رخساروں کا نیلا رنگ ہلکے گیروے رنگ میں پھیل رہا تھا۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے ..... نہیں! بلکہ اُسے بچوں کی چیاؤں میاؤں سنائی دی۔ بڑھیا کی ڈراؤنی اُس جھینک میں نظر آئی..... اور میتو اُس کا سایہ آسمان کی جھیل میں پڑتا ہے جہاں نیلوفر کے پھول کھلتے ہیں۔ وہ اُس کی چوٹی گھسیٹ کر کبھی وہاں سے کھینچ کر لا نہیں سکتا تھا کہ رات کی دیوی اُسے اپنے آنچل میں پناہ دے۔

سرش کی مقناطیس کا صحیح شمال میتو۔ مگر شمال آجکل کے زمانے میں کہیں ملتا ہے! وہ مقناطیسی سوئی تڑپتی رہیگی۔ اضطراب بیقراری کی بے پناہ وسعتوں کو کھوجیگی سچے شمال کی جستجو میں، شمال، قطب، منجمد شمالی کے برفستانی علاقے میں گم ہو جانے والی سمت۔

تپش ایم۔ اے

غزل

یہ کون ہے سرگرمِ تماشا نہیں معلوم — منظورِ نظر کس کی ہے دنیا نہیں معلوم

کب راز کھلے اپنی بقا کا نہیں معلوم — کب دیکھئے اُٹھتا ہے یہ پردہ نہیں معلوم

بے فائدہ نقشِ قدمِ غیر کا شکوہ — تم کو مری تقدیر کا لکھا نہیں معلوم

مشکوک ہے ہنگامۂ فردا ابھی ابھی تک — کیا جانیئے کیا ہو پسِ فردا نہیں معلوم

کیا جانے کہاں جا کے کھُلے قیس کا پردا — کس حال میں ہے ناقۂ لیلیٰ نہیں معلوم

بے ربطیِ اندازِ کرم دیکھ رہا ہوں — جیتا ہوں مگر جی کے کروں کیا؟ نہیں معلوم

ٹھوکر کے سوا کون ہے اس خاک کا پرساں — کم بخت کہاں جائے ٹھکانا نہیں معلوم

رہبر کی تلاش اور تپشِ ذوقِ طلب میں
گم گشتگیِ ذرّۂ صحرا نہیں معلوم؟

محمد امین شرقپوری

رخصت

جمعہ دو روز کی رخصت پر گھر آیا ہوا تھا، گاؤں کے جوان چھوکرے اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، وہ مزے سے پلٹن کے حالات سنا رہا تھا اب تک اُنہوں نے پٹواری کے ونڈے سے جنگ کے واقعات تو سُنے تھے مگر پلٹن اور ایک فوجی کے حالات جمعہ جس انداز سے سُنا رہا تھا، کریم کے منہ میں پانی بھر گیا، گاؤں میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ زندگی کی دیگر ضروریات بھی گراں ہو گئی تھیں، گاؤں کا بنیا سادہ لوح آبادی کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔ کریم نے جمعہ کو مسکرا کر دیکھا اور بولا: "جمعہ بھائی میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ!"

"تم کیا جاؤ گے" جمعہ مسکرا دیا جیسے اُسے کریم کی بات کا اعتبار نہیں تھا۔

"جھوٹ نہیں کہتا ہوں جمعہ بھائی" کریم بولا۔

اس نے اپنے ہاتھ سے بھاری بھرکم کریم کے ہاتھ کو گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا "جاتو رہے ہو مگر تمہاری بیوی" وہ ہنسنے لگا۔ جیسے وہ کہنا چاہتا تھا۔ ابھی تو ہوئی ہے تمہاری شادی۔ نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟"

کریم ہمت کر کے بولا: "جمعہ بھائی اگر بیوی کو چھوڑ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ چھوٹا بھائی ایسا نہ کر سکے" جمعہ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، اُس کی بیوی جدائی کے احساس سے کس شدت سے رو رہی تھی، جب وہ بھرتی ہونے کے لئے بلاس پور جا رہا تھا، اور جب اُس نے دامن پکڑ کر کہا تھا "مجھے کس پر چھوڑ کر جا رہے ہو!" ایک لمحہ کیلئے جمعہ کا پتھر سا دل بھی پسیج گیا۔

"مجھے جانے دو حُسنا!" وہ بولا، حُسنا سُرخ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی "بہت جلدی لوٹ آؤں گا۔ تمہارے آنسوؤں کا نم بھی خشک نہیں ہونے پائے گا کہ میں پیڑوں کے جھنڈ کے پار خاکی وردی پہنے مسکراتا آؤں گا"

پیڑوں کا جھنڈ، جمعہ کی آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔ حُسنا کا ہاتھ محبت سے سہلانے لگا، گورا نازک ہاتھ جس کی اُنگلیاں مہندی سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ دباتے ہوئے ہونٹوں تک لے گیا۔ حُسنا نے شرما کر گردن جھکا لی، جس کے ساتھ اُس کے کانوں کے جھومتے ہوئے بُندے جمعہ کے دل کی طرح دھڑکنے لگے، سُرخ رنگ پر شاید کوئی آنسو کا قطرہ گر پڑا تھا۔ اُس نے بھیگی پلکیں جھپک کر جھکی جھکی نظروں سے شوہر کو دیکھا، رنگ پر کانپتا ہوا قطرہ پھسل کر ٹھوڑی پر پھیل گیا۔ کاجل بھری آنکھیں بدلی کی طرح اُمنڈ آئیں۔ جمعہ کا دل چڑے سے چھلکے سینے میں [illegible]

جمعہ نے کریم کا ہاتھ چھوڑ دیا، اُس کا بھاری ہاتھ اس طرح لٹک گیا جیسے وہ بے حس تھا۔

"تنخواہ کیا ملے گی جمعہ بھائی؟" جمعہ چونک کر بولا "تیس روپے اور اس کے علاوہ دونوں وقت کا کھانا، صبح چائے اور بسکٹ بھی ملتے ہیں" یہ کہتے ہوئے اُسے اپنا حلق خشک محسوس ہونے لگا، حُسنا کے ہاتھ کی موٹی روٹی میں جو لذت محسوس کرتا تھا بسکٹوں میں ایک دن بھی اُسے مزہ نہ آیا۔

کریم نے چہرے پر مسرت کی ایک جھلک اُبھارتے ہوئے جمعہ کا فقرہ دہرا کر کہا، "چائے اور بسکٹ بھی ملتے ہیں؟" بسکٹ کا نام اُس نے پہلی مرتبہ سُنا تھا۔

"ہاں ہاں" وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا، اُس کی خاکی پگڑی کا طرہ ہوا سے لہرا رہا تھا، قمیض کی آدھی آستینوں سے اس کی مٹیالی کہنیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بولا "چلو گے نا میرے ساتھ؟"

"ہاں" کریم خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "چھٹی تو ملے گی نا؟"

"ہاں" جمعہ بولا "جب تک بلاس پور میں، آ جا سکتے ہیں، مگر ایک دم"

جمعہ بولا "کہیں دُور چلے گئے تو شاید جلد نہ لوٹ سکیں" پھر اُسے جیسے حُسنا

کی بات یاد آگئی تھی: "اگلے اتوار کو بھی آؤ گے تا؟" اور اُس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے آنا نہیں ہوتا، جھوٹ موٹ کہدیا تھا، "ضرور آؤں گا"

ایک لمحہ کیلئے اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی چھاگئی۔

"چلنے کی تیاری کرو۔"

کریم پگڑی جھاڑتے ہوئے بولا: "مجھے کونسی تیاری کرنی ہے۔ ڈھور ہیں چاچا دیکھ بھال کرلیگا اُن کی ——!"

جمعہ ہنس پڑا، کریم کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اُس کی بات کو!

"نادان ہے۔" وہ بولا: "بیوی کو کِس پر چھوڑے گا؟"

کریم مُسکراتا چلا جارہا تھا۔ سکینہ کا جھُومر بیاہ کے دوسرے روز بعد بنیئے نے بیس روپے کے عوض ہتھیا لیا تھا، آج اُسے بیوی کے ماتھے پر جھُومتا ہُوا نظر آرہا تھا۔ کتنی خوش ہوگی سکینہ جھُومر کو پاکر! اور ایک بیگھے کا کھیت جہاں سرسوں بڑی مقدار میں پیدا ہوتی تھی اور اس کے دہانہ کے لمبے پیڑ دور سے کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح مسکراتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کریم کے قدم تیزی سے اُٹھنے لگے، جیسے وہ سچ مچ فوجی تھا، بیس روپے تنخواہ کا فوجی ——!

. . . .

دونوں جارہے تھے، کریم چھوٹے کنارے کی لُنگی باندھے ہوئے تھا، گلے میں ململ کا ڈھیلا کُرتہ تھا اور چاندی کا تعویذ، سر پہ سرخ پگڑی تھی جس نے اُسے دُولہا بنا دیا تھا۔ بیاہ کے بعد دوسری مرتبہ یہ کپڑے اُس نے پہنے تھے، ایک دفعہ جب وہ سکینہ کو لینے گیا تھا اور آج جبکہ وہ بھرتی ہونے کے لئے جارہا تھا اور آج جبکہ وہ بھرتی ہونے کے لئے جارہا تھا جمعہ بھائی کے ساتھ، ریل کا اسٹیشن پانچ کوس پر تھا۔ جمعہ اُسے دفعدار کی دلچسپ باتیں سُنارہا تھا، راستہ باتوں میں کٹ رہا تھا، دفعدار جس کی مونچھیں اُبھرے ہوئے گلوں پر اس طرح چپکی رہتی تھیں جیسے کوئی سانپ کنڈلی مارکر بیٹھا ہے، جمعہ مُسکراتے ہوئے بولا: "دفعدار کی عمر پچاس سے اُوپر ہے مگر اپنی عورت کو ہر تیسرے دن خط لکھواتا ہے۔"

"بڑی محبت ہے اُسے عورت سے!" کریم بولا،

جمعہ ہنس کر بولا: "سچ پوچھو تو عورت دُور جاکر ہی یاد آتی ہے!"

کریم کا دل دھڑکنے لگا۔ سکینہ کے کئی بار پوچھنے کے باوجود اس نے نہیں بتایا تھا اُسے کہ وہ فوج میں بھرتی ہونے جارہا ہے، بلکہ یوں کہہ کر ٹال دیا۔ کہ وہ جمعہ بھائی کے ساتھ شہر جارہا ہے۔

"عورت کا دل بہت چھوٹا ہوتا ہے!" جمعہ کریم کے چہرے پر آنکھیں گاڑتے ہوئے بولا۔ کریم کے جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی: "سکینہ کا دل بھی چھوٹا ہے ——!" سوچتے ہوئے بولا، کریم کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔

"تھک گئے کیا؟" جمعہ بولا۔ جواب میں کریم پاؤں تیزی سے اُٹھانے لگا۔ جمعہ مسکرا کر بولا: "دن میں دو مرتبہ پریڈ ہوتی ہے، بندوق کاندھے پر رکھ کر چلنا پڑتا ہے۔ قدم ایک ساتھ اُٹھتے ہیں!" جمعہ کے بھاری بُوٹ چرچرا رہے تھے، کریم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے پاؤں کسی نے جکڑ لئے ہیں! اور وہ ٹانگیں گھسیٹتے ہوئے جارہا ہے۔

اسٹیشن پر دھندلا دھندلا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں ہر چیز پر سیاہی پھیل رہی تھی۔

"چُپ کیوں ہوگئے؟" جمعہ کریم کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"نہیں تو!" کریم جیسے سوتے ہوئے چونک پڑا تھا۔ جمعہ نے جیب سے سگریٹ کا بکس نکالا، سُلگا کر بولا: "آگیا اسٹیشن بھی، گاڑی تیار ملے گی!" یہ کہتے ہوئے سگریٹ کا لمبا کش لگایا جیسے وہ حقہ پی رہا تھا، پگڑی کو اُتار کر دیکھا، اُس کا طرہ کسی قدر ڈھلک گیا تھا، بوٹ گرد سے اٹے پڑے تھے۔ جھاڑتے ہوئے کریم کو دیکھا۔ اور کریم سگریٹ کے سفید دھوئیں میں دیکھ رہا تھا جمعہ کا بشاش چہرہ، اُس کی چھاتی میں کسی قدر تناؤ پیدا ہوگیا تھا، مونچھوں سے رعب ٹپک رہا تھا، بڑے بڑے بوٹ پلیٹ فارم پر چلنے سے چرچر کی آواز دے رہے تھے، کریم کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی اُس کی چھاتی پر ہتھوڑے مار رہا ہے۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جارہی تھی،

. . . .

بیس روپے کا منی آرڈر دیتے ہوئے ڈاکیہ کریم کے چچا کا پتہ پوچھ رہا تھا

سکینہ نے کیوں اُس کی طرف سے دیکھا اور بولی: "کیسے پوچھتے ہو؟"
"حسن خاں کا گھر یہی ہے، منی آرڈر آیا ہے۔"
"کریم نے بھیجا ہوگا" بڈھا حسن خاں لکڑی ٹیکتے ہوئے آ رہا تھا،
ڈاکئے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دو نوٹ بڈھے کے ہاتھوں میں کانپ رہے تھے، مسرت سے سکینہ کے ہونٹ تھرتھرائے، بولی: "کب آئیں گے؟"
بڈھا مسکرا کر بولا "یہ تو لکھا نہیں، جمیل کی ماں کہہ رہی تھی کہ آجکل آنے والے ہیں۔"
اُسی روز بڈھا بیٹے سے جھومر لے آیا۔ سکینہ نے پہن کر آئینہ دیکھا، "کتنے خوش ہوں گے جھومر دیکھ کر" کسی نے شانے پر ہاتھ رکھا، سکینہ نے پلٹ کر دیکھا، تحسنا کھڑی تھی، بولی: "کب آ رہے ہیں، سنا ہے خط آیا ہے تمہیں۔!"
سکینہ کے چہرے کی سرخی مات پڑ گئی، تحسنا کی بیٹھی آنکھوں سے دیکھنے لگی، "خط میں یہ تو لکھا نہیں کہ کب آئیں گے" وہ تحسنا بولی:
"آٹھ روز ہوئے تمہارے بھائی کا خط آیا تھا، آج آنے کو لکھا تھا ۔۔۔!" رکتے ہوئے بولی: "شاید رخصت نہ ملی ہو!" اُس کی نظریں پگڈنڈی کے جھنڈ کی طرف اُٹھ گئیں، جہاں ایک روز اُس کا شوہر جھومتے ہوئے آ رہا تھا۔
سکینہ کا دل ٹوٹ گیا، اُس کا جھومر کانپ رہا تھا، تحسنا کے کاندھے پر سر ڈال کر بولی ۔۔۔ "پھر کب آئیں گے رخصت لیکر۔!"
تحسنا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک ٹپک کر خاک میں مل گئے۔

غزل

آج اُن کے لب پہ رسمِ محبت کی بات ہے — میرا نصیب ہے، مری قسمت کی بات ہے
دنیا کو ناگوار اگر ہے، ہوا کرے! — تم میرے ہوگئے مری قسمت کی بات ہے
رونے میں ابر طاق ہے، ہنسنے میں فصلِ گل — یہ اپنی اپنی مشق و مہارت کی بات ہے
واعظ مجاہدوں کی شریعت کو عام کر! — یہ کاروبارِ زہد تو فرصت کی بات ہے
پہونچا ہے کوئی طور تلک، کوئی دار تک، — سب اپنی اپنی جرأت و ہمت کی بات ہے
میں اور باریاب ہوں اُس بزم ناز میں؟ — توقیر یہ تو قبضۂ قدرت کی بات ہے

توقیر طاہر

وارفتہ خیال کو اتنا کہاں خیال — سر تیرے آستاں پہ ہے یا آستاں سے دور
ہم بے نیازِ داد و طلب ہیں تری قسم — سجدے بھی کر رہے ہیں ترے آستاں سے دور

قیصری

آئیں تو سہی وہ مرے گھر آج نہیں کل — تا چند سرِ رہگذر، آج نہیں کل

راحت کاظمی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کس قدر صاف ہوا کرتی تھیں وہ تصویریں!
لیکن اب دل کی امیدوں نے کیا ہے تعمیر
ایک بلّور کا شفاف محل آنکھوں میں،
جس میں تصویر نمایاں ہی نہیں ہے کوئی ——

——(۳)——

ایک بے نام حرارت ہے مرے پہلو میں،
لڑکھڑاتے ہوئے سانس آتے ہیں سینے سے مرے
دل سے اُٹھتا ہے دھواں اور تصوّر بن کر
ساتھ لے جاتا ہے اِک آئنہ خانے میں مجھے ——
یہ نہیں آنکھوں میں بلّور کا شفاف محل،
یہ تو مرقد ہے نگاہوں کی پریشانی کا ——
پھر چلی لہر حرارت کی مرے سینے سے
پھر دھواں بن کے اُٹھا اور مری آنکھوں میں
اور لو! ٹوٹ گیا میری نظر کا مرقد ——
ڈوب کر جیسے اُبھرتی ہے بھنور میں کشتی
اور چکراتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے،
یونہی ٹوٹی ہوئی امیدوں کا شفاف محل
دل کی بے نام حرارت سے ہوا ہے پانی
اور دھارے کی طرح پھوٹ کے بہہ نکلا ہے ——

سیمنو

ترجمہ بالکرشن مضطر

نوکر

بڑے شہروں میں سب سے پہلے ماسکو میں کام ملنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان ایام میں [illegible] دن کا کچھ نہ کچھ بڑا انعام ملنے کی امید پر انسان چھوٹا کام بھی کر لیتا ہے۔ اسی دور میں جراسم اپنے گاؤں سے ماسکو آیا تھا۔ لیکن بیس بیس دن تک ہر گلی کوچے کی خاک چھاننے پر بھی اسے نوکری نہ ملی۔ غریب کسان کے لڑکے کی محنت بیکار ثابت ہوئی۔

ماسکو میں اس کے گاؤں کے کئی رشتہ دار و دوست کام کرتے تھے۔ جراسم انہی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ بھوکا نہیں تھا۔ تاہم تندرست و توانا ہونے پر بھی کام نہ ملنے کی وجہ سے اُسے مایوسی ضرور ہو رہی تھی۔

ماسکو میں جراسم بچپن سے رہتا تھا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ ایک بھاری میں شراب کی بوتلیں دھونے کا کام کرنے لگا اور تھوڑے عرصہ کے بعد ایک امیر آدمی کے ہاں نوکر ہو گیا۔ مگر اب گزشتہ دو سال سے وہ ایک دوکان پر کام کرتا تھا پھر اُسے گاؤں میں ایک فوجی کام کیلئے بلا لیا گیا۔ نہ معلوم وہ فوج میں کیوں بھرتی نہ کیا گیا۔

وہ دیہات میں رہنے کا عادی نہ تھا۔ اس کا دل جلدی ہی گاؤں سے بیزار ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ ماسکو ضرور جاؤں گا۔ چاہے وہاں جاکر پتھر ہی کیوں نہ توڑنے پڑیں۔

وہ ماسکو آ گیا

تو اب سڑکوں پر بیکار گھومتے گھومتے وہ تنگ آ گیا تھا اس نے کسی بھی کام کو پا لینے کے لئے کوشش میں کمی نہ کی۔ جتنے بھی اس کے واقف تھے اُن سب کے پاس وہ ہو آیا تھا۔ یہاں تک کہ راہ چلتے لوگوں کو روک روک کر بھی اس نے پوچھا تھا۔ کہ کیا آپکو کسی کام کیلئے نوکر کی ضرورت ہے ؟

اب اُسے اپنے رشتہ داروں کے پاس رہنا بھی بُرا لگنے لگا کچھ تو اُس کا آنا جانا بھی بُرا لگتا تھا۔ اور کچھ تو اپنے مالکوں سے اُسکے لئے گالیاں کھانی پڑتی تھیں۔ جراسم کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ کہ کیا کرے اور تو اُسے سارا دن بھوکے ہی گذارنا پڑتا تھا۔

سوکولینک ماسکو کے شہر کے کنارے پر ایک محلہ ہے وہاں جراسم کا اپنے گاؤں کا ایک دوست رہتا تھا۔ وہ شروب سوداگر کے پاس کوچوان تھا اور اپنے مالک کے بہت منہ لگا ہوا تھا۔ مالک اُس پر مہربان تھا اور اعتبار بھی کرتا تھا۔ اس کے باعتبار ہونے کا راز تھا۔ تمیز بتانے میں اُس کی چالاکی۔ وہ ہمیشہ سب نوکروں پر حکومت کرتا تھا۔

ایک دن جب جراسم اسی کوچوان کے پاس آیا اور آداب بجا لا کر بیٹھ گیا۔ کوچوان نے اُس کی خوب خاطر کی چائے پلائی اور کچھ مٹھائی بھی کھانے کو دی۔ پھر پوچھا ؛ کہو کیا حال ہے آجکل کیا کر رہے ہو؟

"بُرا حال ہے بھائی کئی ہفتے سے بے کار ہوں"

"کیوں کیا اپنے پرانے مالک کے پاس نہیں گئے"

"گیا تو تھا"

"تو کیا وہ تمہیں رکھتا نہیں!"

"اب میری جگہ وہاں دوسرا آدمی کام کرتا ہے"

"یہ بات ہے۔ تم جیسے چھوکروں کے کام کرنے کا یہ طریقہ ہے جب تک نوکری کرتے ہو تب تک جیسے بے گار ٹالتے ہو۔ اسی لئے تو نوکری چھوڑنے پر تم خود ہی جیسے لوٹ کر آنے کا راستہ بند کر جاتے ہو۔ تمہیں چاہئے کہ اپنے آقا کی اس طرح خدمت کرو کہ تمہارے

چلے جانے پر وہ تم کو یاد کرتے رہیں۔ اور جب تم لوٹو تو تمہیں رکھنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ چاہے تمہارے لئے انہیں دوسرا نوکر نکالنا ہی کیوں نہ پڑے"۔

"کون آدمی اس طرح کام کرتا ہے؟ آجکل ایسے مالک کہاں ہیں؟"

"کیوں بک بک کرتے ہو؟ میری اپنی ہی بات سنو اگر کبھی یہ نوکری چھوڑ کے مجھے گھر جانا پڑے تو واپس آنے پر شرط ہے مجھے بغیر میرے کہے نہ صرف رکھ لیں۔ بلکہ خوش بھی ہوں۔

جاسم اداس بیٹھا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا دوست بڑھ بڑھ کر شان جتا رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ میرا فرض ہے کہ میں بھی اس کی تعریف کے پل باندھ دوں۔

"یہ تو میں جانتا ہوں" وہ بولا "مگر تمہارے جیسے کتنے آدمی ہیں یگور! دنیا میں سب تمہارے جیسے لوگ نہیں۔ اگر تم اچھا کام نہ کرتے تو مالک تمہیں ۱۲ سال کیوں رکھتا"۔

یگور مسکرا دیا۔ اسے اپنی تعریف اچھی لگی۔ "تو تم اب سمجھ گئے" یگور نے پھول کر کہا "اگر تم میری طرح کام کرو تو ایک دن بھی بیکار نہ رہو"۔

جاسم چپ رہا۔

اچانک یگور کو مالک نے بلایا۔

"ذرا ٹھہرو ابھی آیا" یہ کہکر یگور چلا گیا۔

جاسم بیٹھا رہا۔

یگور لوٹ آیا اور جاسم سے بولا "ابھی آدھ گھنٹے میں گاڑی تیار کر کے مالک کو شہر لے جانا ہے" پھر اس نے اپنا چرٹ جلایا اور کمرہ میں گھوم گھوم کر پینے لگا۔ جاسم کے پاس ٹھہر کر بولا۔

"اچھا سنو اگر تم چاہو تو میں مالک سے تمہیں نوکر رکھ لینے کے لئے کہوں"۔

"کیا انہیں نوکر چاہیئے"۔

"نہیں ایک ہے تو پر وہ بہت اچھا نہیں ہے۔ وہ اب بوڑھا ہو چلا تھا"

کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا۔ وہ تو یوں کہو کہ یہاں پڑا ہوا ہے اچھا ہے چپ چاپ رہتا ہے۔ کوئی بہت چہل پہل نہیں ہوتی اسی وجہ سے پولس کچھ کہتی نہیں۔ چاہے صاف رہو یا گندے نہیں تو صفائی کا کتنا اس بوڑھے کے بس کا روگ نہیں"۔

"اگر میرے لئے کہہ سکو تو ضرور کہو یگور! میں عمر بھر تمہارا احسان نہ بھولوں گا۔ مجھ سے اب بیکار نہیں رہا جاتا"۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو میں کہہ دوں گا۔ کل سویرے آنا جب تک کے لئے لو یہ دس "کوپک" لیتے جاؤ کام چلا لینا"۔

بہت بہت شکریہ یگور۔ تم میرے لئے ضرور کوشش کرو۔ یہ کام تو تمہیں کرنا ہوگا"۔

"اچھا اچھا میں کوشش تو کروں گا ہی"۔

جاسم چلا گیا۔

یگور نے گھوڑے تیار کئے اور وردی پہنکر پھاٹک پر پہنچ گیا۔ مسٹر ذنوب گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی چلی۔ شہر میں کام کر کے جب گھر لوٹ رہے تھے تب یگور نے تاڑ لیا کہ مالک خوش ہیں۔

"حضور میرے اوپر ایک مہربانی کیجئے"۔

"کیا ہے؟"

"میرے گاؤں کا ایک لڑکا آیا ہوا ہے۔ بہت بھلا ہے لیکن بچارا بیکار ہے"۔

"تو؟"

"آپ اسے نوکر رکھ لیجئے"۔

"میں اسے کیا کروں گا؟"

"گھر کا سارا اوپر کا کام کرنے کے لئے رکھ لیجئے"۔

"اور پولی کارپ کیا کرے گا؟"

"وہ کس کام کا ہے۔ اب تک تو آپ کو اسے نکال دینا

"یہ تو ٹھیک نہیں ہے وہ میرے پاس کئی برس سے ہے بلا وجہ میں اُسے کیسے الگ کر دوں؟"

"مانا کہ وہ آپ کے پاس برسوں سے نوکری کر رہا ہے۔ تو اس سے کیا ہوا؟ اُس نے مفت تو کام کیا نہیں ہے۔ کام کے اُسے پیسے ملے ہیں۔ اور پھر بڑھاپے کے لئے تو اُس نے کچھ نہ کچھ بچا کر رکھ ہی لیا ہوگا۔"

"بچا لیا ہوگا۔ کیسے بچا سکتا تھا؟ کہاں سے؟ وہ اکیلا تو ہے نہیں اُس کو اپنی بیوی کے لئے بھی پیسے چاہئیں۔"

"وہ بھی تو کوٹھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر کچھ کماتی ہے۔ آپ پولی کا ریک اداس کی عزت کی فکر کیوں کرتے ہیں؟ میں آپ کو سچ بتلاؤں وہ بہت خراب کام کرتا ہے آپ اُس پر اپنا پیسہ کیوں برباد کرتے ہیں؟ کبھی ٹھیک وقت پر وہ برف نہیں اُٹھاتا۔ نہ کوئی کام ڈھنگ سے کرتا ہے۔ جس روز رات کو پہرا دینے کی باری آتی ہے تو وہ ہر بار گھر جا کر سو رہتا ہے پر وہ کیا کرے؟ سردی وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اور آپ دیکھئے گا کہ کسی دن محض اُسی کی بدولت پولس سے آپ کا جھگڑا ہوگا۔ تین مہینے بعد جب صفائی کا دروغہ آ دیگا تو آپ کو پولی کا ریک کی خاطر ہرجانہ دینا اچھا نہیں لگے گا۔"

"پھر بھی تو بری بات ہے میرے پاس وہ پندرہ سال سے کام کر رہا ہے۔ اور اب بڑھاپے میں اُس کو ہٹانا پاپ ہوگا۔"

"پاپ۔ آپ کیسا اُس کا کچھ بگاڑ رہے ہیں یا کچھ چھین رہے ہیں؟ وہ بھوکا تو مریگا نہیں۔ خیرات خانے میں جا کر مزے سے پڑا پڑا روٹیاں کھائیگا۔ اور اب اس بڑھاپے میں اُسے کچھ آرام بھی تو چاہئے۔"

شروب نے یگور کی بات پر کچھ سوچا

"اچھا تو ٹھیک ہے۔ کل اپنے دوست کو میرے پاس لانا میں اُس کے لئے کچھ نہ کچھ کروں گا۔"

"صاحب اُسے ضرور نوکری دیجئے ——— مجھے اس پر بڑا رحم آتا ہے۔ بہت شریف لڑکا ہے اور غریب بے کار ہے۔ وہ آپ کا کام بہت محنت اور سچائی سے کریگا۔ اُسے فوج کے لئے سرکار نے بلایا تھا۔ اس لئے اُسے اپنی نوکری چھوڑنی پڑی۔ اگر وہ وہاں نہ جاتا تو اُس کا مالک کبھی اُسے اپنے یہاں سے نہ نکالتا۔"

دوسرے دن شام کو جراسم یگور کے پاس آیا اور پوچھا۔ "کہو کچھ کیا؟"

"ہاں کچھ ضرور کیا آؤ پہلے چائے پی لیں پھر مالک کے پاس چلیں گے۔"

جراسم کو نوکری کی فکر تھی۔ اُسے چائے اچھی نہ لگی۔ مگر تہذیب کی وجہ سے دونوں نے جلدی جلدی دو پیالے چائے کے پی ڈالے اور پھر شروب کے پاس چلے۔

شروب نے جراسم سے پوچھا۔ "تم پہلے کس کے پاس کام کرتے تھے اور اب کیا کام کرو گے؟"

جراسم کے جواب پر اُس نے کہا "میں تمہیں اوپر کا کام کرنے کے لئے جگہ دے دیتا ہوں۔ کل سویرے سے تم اپنے کام پر تیار ہو کر آ جاؤ۔"

جراسم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ خوشی سے اُس کے پاؤں نہ اُٹھتے تھے۔ جیسے تیسے وہ کوچوان کے کمرہ تک پہنچا۔

یگور نے کہا: "اچھا تو اب کام بہت دھیان سے اور غور سے کرنا۔ نہیں تو پھر مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ تم جانتے ہو کہ مالک کیسے ہوتے ہیں۔ اگر تم ایک بار غلطی کر دو گے تو مالک تمہارے ہر کام میں غلطی نکالے گا۔ اور تمہیں آرام نہیں لینے دیگا۔"

"یگور تم بے فکر رہو۔"

"اچھا۔ اچھا۔"

جراسم چلا گیا۔ کوٹھی کے پھاٹک پر جانے کے لئے باہر کا صحن پار کرنا پڑتا تھا۔ اسی صحن سے جراسم گذر رہا تھا۔ رات ہو چکی

تھی۔ صحن میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس کی کھڑکی سے روشنی باہر نکل کر اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جراسم کا گھر کل سے اس کوٹھڑی میں ہوگا۔ وہ اُسے ایک بار دیکھنے کے لئے بے چین ہوگیا۔ مگر کھڑکی بند تھی۔ اُس کے کواڑوں پر برف جم رہی تھی اس لئے اندر جھانک کر بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ کوٹھڑی کے قریب گیا۔ اُسے سنائی دیا کہ اندر کوئی باتیں کر رہا ہے۔

"تو اب ہم کیا کریں گے؟" ایک عورت کی آواز تھی۔

"میں کیا بتاؤں ..... کیا بتاؤں" ایک آدمی نے کہا۔

یقیناً وہ پولی کارپ بول رہا تھا۔ "بھیک مانگنی پڑے گی اور کیا! اور ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

عورت نے کہا: "ہائے ہم غریبوں کی زندگی بھی کیا زندگی ہے سویرے سے آدھی رات تک کام کرتے رہتے ہیں اور اسی طرح کام کرتے کرتے بڈھے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر سننا پڑتا ہے کہ نکل جاؤ یہاں سے؟"

"کیا کریں پھر مالک ہمارا رشتہ دار تو ہے نہیں۔ اُس کے سامنے رونا دھونا بے کار ہے۔ وہ تو اپنا ہی فائدہ دیکھے گا۔"

"سبھی مالک ایسے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سوا اور کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ انہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم برسوں تک سچائی اور ایمانداری سے اُن کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اب ..... مالک ہمیں ایک سال تک رکھنے کے لئے تیار نہیں حالانکہ ہم اُسی طرح کام کرتے ہیں۔ جب ہم میں کام کرنے کی ہمت نہ رہے گی۔ اپنے آپ چلے جاویں گے۔"

"اس میں مالک کا اتنا قصور نہیں جتنا اُس کوچوان یگور کا۔ وہ اپنے کسی دوست کو نوکری دلانا چاہتا ہے۔"

"ہاں وہی مردود سب باتوں کی جڑ ہے۔ چاپلوسی کرنا اور باتیں بنانا تو اُسے خوب آتا ہے۔ اچھا میں مالک سے جا کر کہوں گی کہ وہ گھاس دانا چرا کر بیچتا ہے۔"

"ارے جانے بھی دو۔ کیوں بڑھاپے میں گناہ کرتی ہو؟"

مگر بڑھیا رو رہی تھی۔

جراسم نے یہ سب کچھ سنا۔ اُس کے سینہ میں جیسے کسی نے چھری گھونپ دی ہو۔ اُسے نوکری ملنے پر اِن بڈھوں کی کیا حالت ہوگی۔ یہ وہ سمجھ چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ پھر وہ کوچوان کے کمرہ میں گیا۔

"ارے کیا کچھ بھول گئے؟" یگور نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں تو یگور" جراسم نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "میں اس لئے واپس لوٹا کہ ...... وہ .... سنو .... میں تمہیں ...... بہت بہت ..... احسان مند ہوں .... تم نے مجھ پر مہربانی کی ..... نوکری دلائی ... لیکن .... یہ نوکری میں نہیں کر سکتا۔"

"اس کا کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں مجھے یہ نوکری نہیں چاہئے۔ میں اپنے لئے کوئی اور کام تلاش کر لوں گا۔"

یگور بگڑ گیا۔

"کیا تو مجھے بیوقوف بنانے آیا تھا۔ کیوں بے بدمعاش کیسا بھولا دکھائی دیتا تھا۔ "مجھے نوکری دلوا دو۔ میرے لئے یہ کر دو" اور اب نوکری دلا دی تو بھی پھرتا ہے۔ میری عزت خاک میں ملا دی۔"

جراسم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اُس کی پلکیں نیچی پڑ گئیں۔ یگور نے اُس کی طرف سے پیٹھ پھیر لی تھی۔

جراسم اپنی ٹوپی اٹھا کر چل دیا۔ جلدی جلدی صحن پار کر کے وہ پھاٹک پر پہنچا اور وہاں سے پھر سڑک پر آگیا۔ اور چلنے لگا۔ آج بہت عرصہ جراسم کا دل ہلکا اور شادماں تھا۔

شفیق الرحمٰن

ڈرپوک

اتنے دنوں کے بعد میں نے آج صبح موٹر سائیکل کو ہاتھ لگایا اُسے چلاتے وقت میں جیسے چونک سا پڑا، چونکنا کیا بالکل ٹھٹک کر رہ گیا۔ اور میری نظریں برابر کی کھڑکیوں کی جانب مڑ گئیں۔

آج سے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا۔ بالکل ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ گلاب کے ننھے بالکل سُرخ ہو رہے تھے، شبنم کے چمکیلے قطروں سے ہرات موتیوں کی بارش ہو چکی تھی۔ آپا کے رنگ برنگے سُریلی سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلا رہے تھے ---- جب میں نے اور ایک سنہری بالوں اور نیلگوں آنکھوں والی ننھی مُنّی گڑیا ---- ہم دونوں نے ڈاکٹر صاحب کی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی تھی۔

اُس روز ہمیں موقع مل گیا۔ اختر نے پورے مہینے سے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ صبح اُٹھتے بیٹھتے بس ایک نظارہ لگا تھا جس کا ورد وہ کرتی رہتی ---- تم ڈرپوک ہو، تم ڈرتے ہو، تم یُوں ہو، تم ڈھیلے ہو۔

کئی بار اُسے کہا کہ بھئی میں بالکل نہیں ڈرتا۔ آخر سائیکل تو چلا ہی لیتا ہوں لیکن موٹر سائیکل کس طرح چلاؤں۔ چلانا تو ایک طرف وہاں میں تو اُسے ہلا بھی نہیں سکتا۔ نہ یہ پتہ کہ چلانے کے لئے کون سی کمانی گھماتے ہیں اور اگر چل پڑے تو روکتے کس طرح ہیں۔

وہ منہ چڑا کر کہتی۔ ڈاکٹر صاحب روز تو چلاتے ہیں، چلانا سیکھ کیوں نہیں لیتے۔

میں کہتا کوئی سبق ہو تو یاد بھی کروں، وہ تو ہینڈل پکڑ کر ایک ڈنڈی سی مارتے ہیں اور پھٹ پھٹ کی آواز آنے لگتی ہے، پھر وہ نہ جانے کیا کھینچا تانی سی کرتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے سائیکل ہوا ہو جاتی ہے۔
تب کہا جاتا کہ تم یہ سب کیوں نہیں کر سکتے ---- بس ڈرتے ہو نا!

میں منت سے کہتا کہ ابھی موٹر سائیکل برابر تو ہم خود ہیں۔ بڑے ہو گئے تو سائیکل چھوڑ پوری موٹر چلایا کریں گے، بھلا کبھی ہمارے جتنے بچوں کو موٹر سائیکل پر چڑھتے کہیں دیکھا؟

اس کے جواب میں ایک تصویر پیش کی جاتی، ایک موٹر سائیکل کو ایک لڑکا چلا رہا ہے اور ایک لڑکی پیچھے بیٹھی ہے۔ میں بہتیرا کہتا کہ یہ تصویر فرضی ہے یونہی کسی نے پنسل سے کھینچ دی ہے، لیکن جواب وہی ملتا کہ بس ڈرپوک ہو!

اختر کے کہنے پر میں آگے ہی طرح طرح کی حماقتیں کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے مشورہ کر کے ابا جان کی سنہری گھڑی کیاری میں بو دی تھی، اختر کا خیال تھا کہ پودے میں پہلے تو ننھی مُنّی گھڑیاں لگیں گی، پھر ٹائم پیس لگیں گے۔ اور جب پودا بڑے ہو کر درخت بن جائے گا تب کلاک لگیں گے۔

لیکن باوجود ایک ماہ کی دیکھ بھال اور باقاعدہ پانی دینے کے کچھ بھی نہ ہوا۔

پھر اُس کے مجبور کرنے پر میں نے دلیری جتانے کیلئے ابا جان کی بندوق چلا دی تھی۔ جب بندوق چلی تو میں کہیں گرا اور بندوق کہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری غلیل تک چھین لی گئی۔ اختر کہتی تھی کہ جو چیز جانور کو جا کر لگتی ہے وہ سالم بندوق ہی ہوتی ہے۔ یہ گولی دولی یونہی جھوٹی

باتیں ہیں۔ اُس روز بندوق چلانے پر کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا، ضرور ہوا کہ بندوق چلنے پر گولی تو خدا جانے کہاں گئی البتہ چھت پر دو بیاں جو غالباً بلّی سے ڈر کر اوپر دھوپ سینک رہے تھے، تڑپ کر اُچھلے اور ساتھ رکھے ہوئے پانی کے ٹب میں گرے، وہاں سے جو تڑپے تو روشن دان میں سے ہوتے ہوئے گرے سیدھے کمرے میں جہاں آپا کے پاس ہونے کی خوشی میں پارٹی ہو رہی تھی۔ خدا جانے اُن کی سہیلیوں پر کیا بیتی۔ آپا جان اِس قدر ناراض ہوئیں کہ بس! اُلٹے رنگ برنگ سیٹیاں بجانے والے پرندے سہم کر رہ گئے۔ اور وہ کمبخت طوطا تو یُوں دُبک گیا جیسے مر ہی گیا ہو۔

پھر لگاتار ایک ہفتے تک ہم نے ایک کتاب میں بیشمار پریوں کی کہانیاں پڑھیں۔ اور اختر کے کہنے پر ساری رات ہم نے چھوٹی ہوئی اور نرگس کی کلیوں پر پہرہ دینے میں گذار دی۔ ہم وہاں پریاں پکڑنے گئے تھے۔ اختر کے ہاتھ میں پریوں کو پکڑنے کے لئے ایک چھوٹا سا جال تھا جس سے ہم تیتریاں پکڑا کرتے تھے، ہم دبے پاؤں پہرہ دیتے رہے۔ جب چاند طلوع ہوا تو ہم اور بھی محتاط ہو گئے۔ اُس رات مجھے بڑا ڈر لگا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے مجھے سسکیاں آ رہی تھیں جب ہمیں مرغ کی اذان سنائی دی تو اپنے کمروں میں جا دبکے۔ صبح صبح ہمیں کھانسی بھی ہو گئی اور زُکام بھی۔

ایک سہ پہر کو ہم باغ میں کھیل رہے تھے ایک درخت کے نیچے منشی جی نماز پڑھ رہے تھے۔ اختر کی اور منشی جی کی آپس میں لگتی تھی۔ اختر بولی: "جب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو اُس کا کوئی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔"

"کیا مطلب ہوا تمہارا؟" یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

بولی: "اب یہ جو منشی جی نماز پڑھ رہے ہیں نا، اگر تم ان کا کان کاٹنا چاہو، تو ہرگز نہیں کاٹ سکتے۔"

میں نے کہا کاٹ سکتا ہوں۔ وہ بولی نہیں! میں مصر ہو گیا۔ طے ہوا کہ جب منشی جی اِس دفعہ نیت باندھیں تو میں اُن کا کان کاٹ

لُوں۔ شرط بھی لگی۔ اختر دوڑ کر چچا ابا کی شکاری چھُری لے آئی۔ میں نے چھُری ہاتھ میں مضبوط پکڑی اور تاک میں بیٹھ گیا۔ منشی جی سجدے میں گئے اب جو وہ بیٹھے ہیں تو لپک کر میں نے اُن کا کان مضبوطی سے پکڑا اور ایک دم چھُری چلا دی۔ اُدھر کان ہے کہ کٹتا ہی نہیں میں ہوں کہ زور لگا رہا ہوں۔ کیا مجال جو منشی جی ذرا بھی ہلے ہوں۔ بدستور پڑھتے رہے۔ اختر کے قہقہوں پہ دو چار نوکر چلے آئے۔ میں جو دیکھتا ہوں تو چھُری اُلٹی پکڑ رکھی ہے۔ نوکروں کو دیکھ کر ہم وہاں سے بھاگے۔ کتنے دنوں تک میں یہی سوچ سوچ کر ڈرتا رہا کہ اگر چھُری کی دھار میں منشی جی کے کان پر پھیر دیتا، تو واقعی اُن کا کان میرے ہاتھ میں آ جاتا۔ اور پھر خون بھی نکلتا۔

پھر ایک روز ہم آپا کے ساتھ سینما گئے جہاں ہم نے تکہ بازی کی ایک فلم دیکھی۔ اختر کو تکہ بازی بہت پسند آئی۔ گھر آ کر کہنے لگی آؤ لڑیں۔ مجھے اُن دنوں بخار آتا تھا۔ وہ ساری گرمیاں پہاڑ پہ گذار کر آئی تھی اور یوں سُرخ ہو رہی تھی کہ بس!

پہلے تو میں نے ٹال مٹول کی کہ بھلا ایک لڑکی سے کیا لڑوں گا وہ کہنے لگی تم ڈرتے ہو۔ خیر! تکہ بازی ہوئی۔ اُس نے اپنے لمبے لمبے تیز ناخنوں سے میرے گال نوچ لئے اور جب میں نے اُسے پرے دھکیل دیا تو اُس نے دوڑ کر میری کلائی میں اس بُری طرح کاٹا کہ اب تک نشان موجود ہے۔ پھر جو روئی ہے تو مجھے چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ میں نے اپنا میکینو کا سیٹ لا دیا، تیتریوں کے سلیٹے پر، چاکلیٹ سے نکلی ہوئی تصویریں، گڑیاں — جو کچھ میرے پاس تھا سب کچھ اُسے دیا تب جا کر چپ ہوئی۔

میں کچھ ایسا ڈرتا بھی نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اختر کے روز روز کے بھوتوں کے قصوں نے مار رکھا تھا۔ صبح سے شام تک مجھے طرح طرح کی جھوٹی سچی کہانیاں سُنایا کرتی اور ہم یقین کر لیتے۔ ایک مرتبہ کوئی رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ سب کے

[illegible]

کچھ دیر بعد آنکھ کھلی ، ”سدا بہار کی ٹہنیوں میں اس طرح
اُلجھا ہوا تھا کہ نکلنا محال تھا۔ ہاتھ منہ لہو لہان ہو رہے تھے۔ اب جو
ہلنے کی کوشش کرتا ہوں تو بازو شل! دیکھتا ہوں کہ اختر بازو کو
چمٹی ہوئی ہے۔ آنکھیں بند ہیں لیکن گرفت اُسی طرح ہے۔

بڑی مشکل سے باہر سر نکال کر دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب، چچا ابا،
اور درجنوں نوکر ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے اپنا بازو چھڑانا
چاہا۔ بہتیرا کہا کہ بھئی اب تو چھوڑ دو ہاتھ۔ لیکن اُس کی گرفت
بدستور رہی۔ آخر تنگ آ کر میں ٹھہر ٹھہر کر ٹہنیوں سے باہر نکلا اور
ساتھ ہی میرے بازو سے لٹکی ہوئی اختر! موٹر سائیکل سدا بہار
کی گھنی ٹہنیوں میں سے پار نکل گئی تھی اور ہم راستے میں اُلجھ کر رہ
گئے تھے! اس کے بعد کیا ہوا؟ — ہمیں دھمکایا گیا، ہر قسم کی
ڈانٹ ہمیں دی گئی۔ بزرگوں سے لیکر بچوں تک — سب نے
حسب توفیق ہمیں لیکچر دیئے۔ ٹیلیفون کو ایک اُونچی سی الماری پر
رکھ دیا گیا۔ (غالباً وہ یہ بھول گئے کہ ہم میز پر رکھ کر بھی وہاں پہنچ
سکتے تھے) ڈاکٹر صاحب نے توبہ کی کہ وہ کبھی موٹر سائیکل پر یہاں
نہ آئیں گے اور اُسی بیہودہ سی موٹر میں آیا کریں گے۔ جس
سے ہمیں نفرت تھی۔ اختر کے ابا کو یہ ساری کہانی لکھ کر بھیجی گئی ہمیں
کسی دور دراز اسکول میں بھیجے جانے کی دھمکی دی گئی۔

کچھ دنوں بعد اختر کہیں چلی گئی مجھے بھی کسی اور جگہ پڑھنے
بھیجدیا گیا۔ پھر مدت کے بعد اُس کی ایک تصویر آئی۔ جس میں وہ
ایسی بنی ہوئی تھی کہ مجھے یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ وہی چھوٹی سی شریر
اختر ہے، جس کے ہاتھ اور کپڑے مٹی میں لتھڑے رہتے تھے۔
جس نے میری کلائی میں اس بُری طرح سے کاٹ کھایا تھا۔ کئی
اور تصویریں آئیں — ہر نئی تصویر میں وہ سنجیدہ اور اجنبی بنتی گئی
پھر سُنا کہ اُس کی کہیں منگنی ہو گئی۔ اُس کے خط آنے بند ہو گئے
اس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آج صبح موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے
وقت میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ یونہی بات یاد آ گئی۔ بالکل ایسی ہی کلیوں
صبح تھی شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے، گلاب کے
تختے سرخ ہو رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے طرح طرح کی
خوشبوئیں پھیلا رہے تھے۔ رنگ برنگ پرندوں کی سیٹیاں سُنائی
دے رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا کہ شاید
پردوں کے پیچھے کوئی نیلگوں آنکھوں اور سنہرے بالوں والی گڑیا سا
منہ چڑا رہی ہو اور باہر ہاتھ نکال کر زور سے کہدے
”ڈرپوک!“

چوپال

یہ کتاب مشہور نوجوان شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے چودہ دیہاتی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ حقیقی ہندوستان دیہات میں ہے اور دیہاتوں کی زندگی کی طرف اب تک ہمارے ادیب اور شاعر پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے۔ اس کتاب نے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ دیہات کے سادہ مناظر اور سادہ باشندوں کی جو تصویریں ندیم نے ان افسانوں میں پیش کی ہیں وہ اُردو ادب میں ایک لرزش کن بیداری کا پیش خیمہ ہیں۔ صحیح مشاہدہ، صحیح احساس اور سلاستِ بیان ان کہانیوں کی جان ہیں۔ سادہ لوح دیہاتی لڑکوں اور لڑکیوں کی محبت دوستی اور دشمنی ان افسانوں کا موضوع خاص ہے اور انہیں پڑھ کر انسان یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے ایک ایسی دنیا میں تیرتا چلا جا رہا ہے جہاں پُر تکلف تہذیب کی ہماہمی اور مشینوں بھرے شہروں کا فلسفہ نہیں بلکہ آسمانی سکوت اور فردوسی خاموشی ہے اور اس سکوت میں غریبوں کی کراہیں اور بیواؤں کی آہیں سننے پر بھلنگے کا کام کرتی ہیں۔

ملک کے مشاہیر اور معتدر اخبارات و رسائل نے اس کتاب پر حوصلہ افزا تبصرے کئے ہیں۔ قیمت عمر

ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت پنجاب۔ لاہور

ابراہیم جلیس

ہوسٹل کا ایک کمرہ

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اس بوسیدہ چار دیواری سے نہ جانے کتنے بڑے آدمی کتنے کلرک اور کتنے بیروزگار نکلے ہوں گے —— اور اب یہاں میں رہتا ہوں۔ نہ جانے میں آگے کیا بنوں گا؟ بڑا آدمی۔ عالم۔ کلرک یا پھر بے روزگار؟ مگر مجھے بڑا آدمی بننا چاہیئے گھر سے ساٹھ روپیہ مہینہ اسی لئے آتے ہیں کہ کل میں تو سو ساٹھ روپے کمانے لگ جاؤں۔ اور گھرانے کا نام روشن کروں۔ دنیا میں نام ہی سب کچھ ہے۔ باقی سب مایا ہے۔ باقی سب قوسِ قزح کے دلفریب رنگ —— اگر میں بڑا آدمی بن گیا تو سب کہہ اٹھیں گے کہ واقعی میں بہت خوش قسمت ہوں۔ چمکتا ہوا چاند ہوں۔ کھلتا ہوا پھول ہوں —— اور اگر کلرک یا بیروزگار؟ تو سب کا خیال یہ ہوگا کہ یہ لڑکا پیدا ہی منحوس ہوا۔ اور سب میری پیدائش کے دن کو اس دن سے ملائیں گے جس دن دنیا میں جنگِ عظیم کا آغاز ہوا یا جس دن شہر میں زوروں کا پلیگ پھوٹ پڑا تھا۔ اور اس طرح سب قسمت کے مسئلے پر خوب خوب بحث کریں گے۔ مجبور انسان اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اور قدرت نے یہ لمبی زبان حلق میں کیوں جڑ دی ہے۔ جب بس میں کچھ نہ ہو تو خوب بولا کرو۔ پوری قوت سے بولا کرو۔ خوش قسمتی —— بدقسمتی —— انسان بھیک مانگتا ہے —— خدا غیر منصف ہے —— نعوذ باللہ من ذالک —— مگر سب ٹھیک ہے۔

کل بہرو کہہ رہا تھا کہ اس کمرے میں چار سال سے جتنے بھی لڑکے رہتے رہے وہ کسی نہ کسی مصیبت کا شکار ہوتے رہے مصیبت بڑی چالاک شکاری ہے۔ ارباب خاں امتحان میں فیل ہو کر گئے۔ رحیم بیگ کو زیادہ پڑھتے رہنے کی وجہ سے دق ہو گیا تھا مشیر حسین کا انتقال ہو گیا تھا۔ رفیق کو کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ اور اب میں —— میرا کیا ہوگا؟

میں نے گھبرا کر کمرے کی چار دیواری پر نظر ڈالی۔ ایک دیوار پر ارباب خاں بستر باندھتا نظر آیا۔ دوسری پر ہڈیوں کے ڈھیر رحیم بیگ پر سوکھی کھانسی کے دورے پڑ رہے تھے۔ تیسری پر مشیر حسین کا جنازہ جا رہا تھا۔ اور چوتھی دیوار پر رفیق دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا —— ارباب خاں بڑا آدمی نہ بن سکا۔ رحیم بیگ عالم نہ بن سکا۔ رفیق کلرک نہ بن سکا۔ مشیر حسین کچھ بھی نہ بن سکا۔ اور اب میری باری ہے۔ میں کیا بنوں گا؟

مجھے اپنے کمرے کی چھت اونچی ہوتی نظر آئی۔

مجھے اپنے کمرے سے وحشت ہونے لگی۔ میں اپنے کمرے سے اٹھ کر باہر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر میری نظر دیوار پر پنسل سے لکھے ہوئے ایک شعر پر پڑی۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

غالباً یہ زندگی سے مایوس رحیم بیگ یا مشیر حسین نے لکھا ہوگا۔ مایوس انسان اپنی بیچارگی پر صبر کا پردہ ڈالنے کے لئے نصیحتوں دوسروں کے تجربوں، شاعروں کے کلام اور مذہبی کتابوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ دل کو تسکین تو ہو جاتی ہے۔ مگر سوکھی کھانسی کے دورے بار بار پڑتے ہیں اور موت آ کر ہی رہتی ہے۔ مگر پھر بھی انسان زندگی کے اس ویرانے میں خوبصورت پھول اگانا چاہتا ہے —— وہ

اِس خار زار کو مرغزار میں بدلنا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ بے فکرا بابا جانے
لکھ گیا ہے۔

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
• کھا ڈبل روٹی ، کلرکی کی خوشی میں پھول جا

اور یہ اشعار رفیق نے لکھے ہوں گے۔

اب کہاں وہ ہم نوایانِ سخن
وہ علی گڑھ اور علی گڑھ کا چمن
مت دلا اب یاد بھولی انجمن
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

ان دیواروں پر سب نے اپنے اپنے مطلب کی باتیں لکھی ہیں یہاں سب ایسے ہی مطلبی ہوتے ہیں۔ سب ایسے ہی خود غرض ——— میرے جی میں آیا کہ چیخ اٹھوں ——— مکار، خود غرض، مطلبی ——— مگر جلدی ہی میں نے اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال لیا۔

یہ پرانی چار دیواری اور یہ بوسیدہ چھت ——— کیا پتہ یہ کیسے کیسے اہم راز اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں ان دیواروں کے کانوں نے کیسی کیسی معرکہ کی باتیں سنی ہیں ——— میں ایسا محسوس کرنے لگا۔ جیسے میں الف لیلہ کے کسی پُراسرار کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اور ابھی کہ ابھی کوئی شیطان میری خدمت میں ہزار ہا روپوں کی تھیلیاں لئے حاضر ہونے والا ہے ——— اچانک میں چونک پڑا۔ شیطان سُرخ پگڑی لگائے آچکا تھا۔ اور ساڑھے روپے کا منی آرڈر لئے میری خدمت میں حاضر تھا۔ ہاسٹل کے چار پانچ لڑکے بھی شیطان کے ساتھ چلے آئے تھے۔ سرخ پگڑی والا شیطان اور یہ غولِ بیابانی ——— میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

"یار آج کھلاؤ پلاؤ"
"یار آج پینے کا موسم آگیا۔"
"یار چائے پئیں گے۔"
"یار بڑھیا سگریٹ اڑے گی۔"
"یار روبی تھیٹر میں لیلا ڈیسائی کا ڈانس دیکھیں گے آج"

اور تھوڑی ہی دیر بعد ہم خوب کھا پی کر چاندی کے سکوں کو سگریٹ کا دھواں بنا کر اڑانے لگے ——— دھواں ——— دھواں ——— ہمارے دیس کے بے شمار گھرانے ایسے ہیں۔ جہاں کے چولہوں تک سے دھواں نہیں نکلتا۔ چہ جائیکہ چاندی کے سکوں کو سگریٹ کا دھواں بنا کر اڑانے لگیں۔ مگر ہم سب فضول باتیں سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ ہمارے سامنے دھوئیں کے ہلکے ہلکے بادلوں پر لیلا ڈیسائی پائل باندھے دھیرے دھیرے پاؤں کو دابے اندھیری رات میں اپنے پیا سے ملنے جا رہی تھی۔ اور خوب کھا جانے کی وجہ سے قلب کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ فرید جمائیاں لے رہا تھا۔ رضوان گنگنا رہا تھا ——— سب مست میں تھے۔ اور اسی عالمِ سرمستی میں دکھ کی ایک ہلکی سی موج کانوں سے بہہ نکلی۔ جیسے کسی خوبصورت لڑکی کے مرمریں چہرے پر زلف کی ایک سیاہ لڑی جھول گئی ہو۔

ایک پیسہ دیدے رے بابا۔ مورے بھوک لگی ہے رے۔
سب چونک پڑے۔ آواز میں نسوانیت گا رہی تھی۔ سب کے جسموں میں بجلیاں کوند گئیں۔ اور سب کے سب کھڑکی میں جمع ہو گئے۔

ایک تباہ حال ادھیڑ عمر کی عورت جس کی خزاں شروع ہو چکی تھی اور پیٹ میں گناہ کا شاید آخری پھل آ رہا تھا۔ اور تین پلے اس کے پیروں سے لگے کھڑے لبور رہے تھے۔ اس کی میلی آنکھوں سے بے حیائی جھانک رہی تھی۔

"تم بھیک کیوں مانگتی ہو۔ کیا تمہارا شوہر نہیں ہے؟"
"وہ تو مر چکا۔"
"کب"
"پانچ برس پہلے"
"اوہ ——— اور یہ پیٹ میں جو کچھ ......"

"چپ چپ چپ چپ"
ایک صاحب کمرے میں خوش خوش چلے آئے۔
"یار مٹھائی کھلاؤ تو ایک بات کہوں۔ نیچے کی دکان پر ایک لڑکی چاکلیٹ خرید رہی تھی ——— حالانکہ وہ خود چاکلیٹ سے زیادہ میٹھی تھی۔ اس کے بال خوبصورت اور چمکیلے تھے اس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔ اور ———"

معلوم اس کا منہ بندریا کی طرح سرخ تھا۔ میں نے چڑ کر کہا۔ یہ سب یہاں کیوں؟ اس لڑکی کے بال چمکیلے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔ مجھے سب سے نفرت ہے۔ مجھے صرف پیسے سے محبت ہے۔ میں چاندی اور سونے کے خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ جن سے خوبصورت اور چمکیلے بالوں والی لڑکیاں ستاروں کی طرح چمکدار آنکھوں والی لڑکیاں اور پھر یہ ساری دنیا خریدی جا سکتی ہے۔

"چپ چپ چپ چپ"
ہم سب چھپکلی کو دیکھنے لگے۔
کمرے میں شام کا اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ مچھر اور مکھیاں بھنبھنا رہے تھے۔ دیوار پر چھوٹے کیڑے اور مکڑیاں رینگ رہے تھے۔

ایک دوست نے کہا۔
"عجیب کمرہ ہے یہ ——— یہ چھپکلیاں۔ مچھر، مکھیاں، کیڑے مکڑیاں اور ہم انسان۔"

میرے جی میں آئی کہوں کاش وہ جانور کہتے نہ انسان۔
"کیوں صاحب۔ کیا یہ جھوٹ ہے۔ کہ ہم چھپکلیوں مچھروں، کیڑوں اور مکڑیوں سے زیادہ ذلیل زندگی بسر کر رہے ہیں ——— اس کمرے میں ادیب خان فضلی ہو گیا ہے اور کسی چھوٹے سے دفتر میں معمولی کلرک بن گیا ہے۔ رحیم بیگ دق کے کسی سینی ٹوریم میں پراگندگی کی جوانمرگی کو یاد کر رہا ہے جس کی بوسیدہ چھت کے نیچے مشیر حسین نے نعمان مسعودی۔ یہاں سے رفیق نکال دیا گیا ——— اور اب میں ——— میں کچھ ہی دنوں میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یہ کمرہ واقعی تماشا سرا ہے۔ یہ چھپکلیاں۔ یہ مچھر۔ یہ مکھیاں۔ یہ مکڑیاں۔ یہ کیڑے اور میں ——— ایک انسان ——— مزے کی بات ہے کہ یہاں کوئی بھی ایک دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا۔

یہ پرانی چار دیواری اور یہ بوسیدہ چھت۔

دی لفینس آف انڈیا رولز۔ اُردو میں طبع ثانی۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک

اُردو زبان میں بہترین

قانونی کتابیں

ملنے کا پتہ:- مطبع راست گفتار جنرل لاء بک ایجنسی۔ ہال بازار امرتسر

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

(قائم شدہ [illegible])

رشید جہاں

فلک پیما کی نظر میں عورت

فلک پیما کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک عرصہ سے اردو پبلک اُن سے واقف ہے۔ پچھلے بیس سال سے آپ برابر لکھ رہے ہیں۔ ویسے تو اُن کی تحریروں میں ظرافت فلسفہ، حکمت، چٹکیاں، مذہبی اور دیگر تنقیدیں، عشق و محبت سب ہی کچھ ایک نرالی ادا سے موجود ہیں لیکن میں اس وقت فلک پیما کا مطالعہ صرف اس نظر سے کروں گی کہ وہ عورت کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود اس بات کو مانتے ہیں کہ وہ عورت کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور ایک جگہ اپنے ایک ملاقاتی سے کہلواتے ہیں "جناب آپ پر تو صنفِ نازک کی پرستش کا بھوت سوار ہے۔ عورت نہ ہوئی کمبخت الف لیلہ کی داستان ہو گئی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی"۔ ہندوستان کی بے بس اور بے کس عورت کو دیکھ کر ان کو غصہ آتا ہے اور ہندوستانی لڑکی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں "لڑکی ہندوستانی گھروں کا ایک پالتو جانور ہے۔ جسے پالنے والے عارضی نمود کی خاطر وقتاً فوقتاً ذبح کرتے ہیں۔ ذبح ہونے پر اس کی نسل بڑھتی ہے"۔

وہ سماج میں ہر فرد کے لئے ایسی آزادی چاہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی زندگی اپنی مرضی سے بنائے اور خاص کر عورتوں کی پوری آزادی چاہتے ہیں۔ عورتوں کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ ان کو اپنے اوپر پورا اختیار ہو...... ان کو اپنا پورا پورا مالک ہونا چاہئے۔ سفید کریں یا سیاہ یہ ان کی مرضی۔ فلک پیما اُن خیرخواہ انسانوں کو جن کا پیشہ صرف عورتوں کو نصیحتیں کرنا ہے بہت بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ لہذا ایک جگہ اُن کی ایک عورت ایک خط میں یوں لکھتی ہے "صنفِ نازک کے سب سے بڑے دشمن وہ ہیں جو ہم سے نہایت رقت آمیز خلوص سے کہتے ہیں "بیبیو ذرا سوچ سمجھ کر قدم بڑھاؤ"۔

فلک پیما کے دل میں ایک عورت کی اتنی عزت ہے کہ وہ اُس میں فیصلہ کی قوت پاتے ہیں اور عورتوں کو نصیحت کرنے والوں کو وہ عورت کا خیرخواہ بالکل نہیں مانتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ عورتوں کے دماغ اور سمجھ اور فیصلہ کی سخت توہین کرتے ہیں۔ ان کو کبھی اپنی طاقت سے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اور ہر وقت اُن کو بچوں کی طرح انگلی پکڑ کر چلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ نہیں چاہتے کہ یہ عورتیں کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں اپنے کو پہچانیں اور اپنا فیصلہ خود کریں۔ لہذا فلک پیما کی ایک اور عورت ان لوگوں کو اس طرح معقولی سے جواب دیتی ہے۔ "میں تو دل سے چاہتی ہوں کہ مجالس میں عورتوں کا ذکر شد و مد سے ہو۔ اس بات کی ہمیں ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کہ نکتہ چینیاں ہوں گی۔ کیا لوگ ابھی سے بھول گئے کہ وہ دن کچھ پرانے نہیں ہوئے۔ جب ہمارا ذکر ہی مفقود تھا۔ بہت کوئی کمبخت مجبور ہوتا تھا تو یوں ذکر کرتا تھا "گھر میں طبیعت اچھی نہیں" مہربانی کر کے اپنے سب دوستوں سے ضرور کہئے کہ بیباک عورتوں کی ایک فوج تیار ہو رہی ہے۔ اور یہ بات خدا کرے مرچ لگا کر کہئے یعنی اس طرح کہ یورپ میں عورتوں نے مردوں کو وہ ناچ نہیں نچایا جو عنقریب ہندوستان میں رائج ہوگا"۔

فلک پیما ہندوستانی عورتوں میں وہی آزادی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جیسی کہ یورپ و امریکہ کے درمیانی اور اونچے طبقہ کی عورتوں کو حاصل

ہے۔ وہ چالیس سال سے ہندوستان کے درمیانی اور اوپر کے طبقہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اُس میں عورت کا پردے میں رہنا۔ عورت کی پرانی لکیر کا فقیر بنکر چلنا۔ شادی بیاہ ہر معاملہ میں اُس کی رائے کو غیر ضروری سمجھا جانا اور سب سے زیادہ نوجوانوں میں عشق اور محبت کا سرے سے ناپید ہونا اُن کو بہت ہی کھلتا ہے۔ عورت کو وہ ان سب بندھنوں سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ اُس کی شخصیت کا بھی اظہار چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ ہندوستان کی عورتوں سے جگہ جگہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ وہ کیوں اپنی اتنی بیقدری کرتی ہیں خاصکر اپنے حسن کی۔ ہر عورت اُن کے خیال میں ایک چلتی پھرتی زندہ تصویر ہے اور جس طرح ایک مصور اپنی تصویر کی زیبائش میں اپنی ساری عقل اور طاقت صرف کر دیتا ہے اسی طرح عورت کو بھی اپنی عقل۔ کو اپنے کو حسین بنانے میں خرچ کرنا چاہیئے۔

ہمارے ملک میں اُن مصنفوں کو جنہوں نے عورتوں کے بارے میں لکھا ہے تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا طبقہ تو وہ ہے جو عورت کی بڑھتی ہوئی آزادی کو نہایت خوفزدہ نظر سے دیکھتا ہے اُسکو اس میں سوائے خرابیوں کے اچھائی تو مشکل سے نظر آتی ہے۔ یہ طبقہ اس بڑھتی ہوئی رَو کے سامنے ایک پاٹھ باندھتا ہے۔ . . . . پرانے زمانے کے رسم و رواج کی تعریف میں بہت کچھ لکھتا ہے اور ساتھ ہی اس ترقی میں کو وہ خطرناک اور زہر آلود پاتا ہے۔ . . . . بہت کچھ لکھتا ہے۔ دوسرا طبقہ اُن مصنفوں کا ہے جو عورتوں کو اعتدال کی چال چلنے کی تبلیغ کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو چال زمانہ چل رہا ہے اُسکو بالکل روکنا تو ناممکن ہے لیکن کسی ترکیب سے زمانہ کی چال کو اس طرح موڑنا چاہیئے کہ انسان آگے بڑھے لیکن آہستہ آہستہ۔ یہ طبقہ بھی عورتوں کی آزادی کی طرف خواہ وہ دماغی ہو یا سماجی ڈرتے ڈرتے ہی دیکھتا ہے

تیسرا طبقہ مصنفین کا وہ پایا جاتا ہے جو اس آزادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اور آگے بڑھکر اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اِس تیسرے طبقہ میں فلک پیما کا شمار ہے۔ اور وہ پہلے دو طبقوں کا مذاق اِس طرح اُڑاتا ہے۔ ایک مرد کہتا ہے "کہنے والے یوں کہہ رہے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا اگر یہ نتیجہ ہے کہ وہ آبائی طرز خیال کو چھوڑ کر دنیا کے نیک و بد کی نسبت خود شخصی رائے قائم کریں۔ تو اِس تعلیم کو دور ہی سے سلام ہے۔ . . . . تم سمجھیں کہ تعلیم سے قومی لیڈروں کا اصل مطلب کیا ہے ؟ وہ مطلب یہ ہے کہ تعلیم تو تم پا جاؤ۔ مگر کہو وہی جو بزرگ کہتے آئے ہیں۔ پڑھو لکھو سب کچھ مگر چلو نانی دادی کے نقش قدم۔ اور جگہ تو تعلیم حالات حاضرہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہے۔ مگر ہمارے ہاں تعلیم اس لئے دی جا رہی ہے کہ ہم زمانہ کا مقابلہ کر سکیں۔ زمانہ ہمیں اگر دو قدم آگے کی طرف لیجانا چاہے تو تعلیم کے زور سے چار قدم پیچھے ہٹیں . . . . . ."

ہندوستان میں جو جوان عورتوں کو عشق و محبت کی آزادی نہیں۔ اس کا اظہار فلک پیما اپنی ایک مشہور حکایت ساڑھی اور سوٹ میں ظاہر کرتے ہیں۔ ساڑھی تو اس کہانی میں ہندوستانی تہذیب کا ایک شرمیلا با عصمت اور حیادار نمونہ ہے اور سوٹ جو یورپ سے ہندوستان لایا گیا ہے۔ یورپ کی زندگی کا نمائندہ ہے۔ یہ دونوں اتفاق سے ایک جگہ مل جاتے ہیں اور بات کرنے لگتے ہیں۔ سوٹ باتوں کے دوران میں یوں کہتا ہے : "میں اس ملک میں جب سے آیا ہوں۔ در اصل جلا بھنا رہتا ہوں۔ میرے وطن میں بہت ہی ذلت ہوتی پھر بھی یہ خوشی ضرور رہتی کہ کبھی کبھار کوئی اچھا سا فراک میری گود میں بیٹھتا۔ کہاں ہے ماہے قہقہوں کی لہر مجھ سے فراک تک اور فراک سے مجھ تک رواں ہوتی۔ چہل پہل میں وقت گزرتا۔ مگر جس دن سے یہاں آیا ہمیں میری تو مٹی خوار ہے۔ یہ سنتے سنتے کہ حد سے تجاوز نہ کرو۔ اعتدال سے کام لو۔ چلو تو سنبھل کر بیٹھو تو سمٹ کر۔ دیکھو تو جھک کر۔ پاس نہ ہو مگر دور دور ہی توجان طلب ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو جو پھٹ پھٹا کر اس دُنیا سے چل نکلوں۔

فلک پیما کو ہندوستانی عورتوں سے علاوہ اور شکایتوں کے ایک یہ بھی شکایت ہے کہ وہ خوش ہونا اور ہنسنا نہیں جانتیں۔ بلکہ ہر وقت متبادر خاموش رہتی ہیں۔ جس طرح کر سازی اور سرٹ میں اوپر کے پراگراف سے ظاہر ہو گیا ہوگا اور بھی کئی مضامین ہیں جن میں یہ گلہ موجود ہے مثلاً "چوہر" بیوی کی ایک دن لاکھ علامتیں وغیرہ۔

فلک پیما کی تصانیف پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت قدرت کا کوئی نہایت ہی بیش بہا کرشمہ ہے۔ لہٰذا ایسی شخصیت کے لئے ایسے قانون کہ "یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو" بنانا بدترین گناہ ہے۔ وہ آزاد ہو لیکن آزادی کی صورت کیا ہو۔ اس سے فلک پیما کو غرض نہیں۔ یہ عورت کے اوپر چھوڑ دیتے ہیں اس کا حق وہ اپنے کو بھی نہیں دیتے کہ وہ نصیحت کریں۔ اس سے... بعض دفعہ خیال ہوتا ہے کہ فلک پیما کی عورت ایک نہایت خوبصورت سوسائٹی کی تتلی ہی بنکر تو نہیں رہ جاتی۔

حاجی لق لق کے افسانے

اے بھائی ہنستے کیوں ہیں! کیا ابتک حاجی لق لق کے افسانے نہیں پڑھے ؟ ممکن ہے آپ حاجی لق لق کے افسانے پڑھیں اور آپکے قہقہوں سے فضا گونج اٹھے۔ ہر شخص حاجی لق لق کے افسانوں کا دیوانہ ہے۔ کیونکہ حاجی لق لق اردو ادب میں اپنی مخصوص مزاح نگاری کا واحد مالک ہے۔ آپ اپنے غموں کو بھولنا چاہتے ہیں تو آج ہی حاجی لق لق کے افسانے پڑھیں ٹائیٹل پیج اتنا شاندار ہے کہ آپ اسے دیکھتے ہی ہنس پڑیں گے

دوسرا ایڈیشن اضافہ شدہ قیمت ایک روپیہ عہ۔

پروازِ لق لق

ظرافت و مزاح کی قہقہہ آفریں فضا میں حاجی لق لق کی تازہ ترین اڑان دیکھنے کے لئے ان کی نئی تصنیف "پرواز لق لق" ملاحظہ فرمائیے یہ حاجی صاحب کے بہترین مزاحیہ مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس کے ایک ایک جملہ سے آپ کی محفل قہقہہ زار بن جائیگی۔ ہم نے اسے خاص اہتمام سے چھاپ کر معنوی اور صوری خوبیوں کو یکجا کر دیا ہے۔

قیمت عہ

مکتبۂ اردو لاہور

گلشنِ صحافت میں ایک غنچۂ نو کا اضافہ

شباب بمبئی

ادب اردو کا ایک ترقی پسند ماہنامہ

ملک کے مشاہیر اہلِ قلم حضرات کے بلند پایہ مقالے ترقی یافتہ ادب کے اعلیٰ مضامین دلچسپ معیاری افسانے اعلیٰ نفسیاتی ڈرامے تاریخی شہ پارے روح فزا پرکیف غزلیں وجد آور سرمدی نظمیں۔ دلآویز پیارے پیارے ماہ بماہ اپنی تمام رعنائیوں دلفریبیوں اور معنوی خوبیوں کے ساتھ مطلعِ صحافت پر عنقریب جلوہ گر ہوگا۔

نمونہ کا پرچہ بالکل مفت روانہ ہوگا۔ فوراً اپنے اسم گرامی اور مکمل پتہ سے مطلع کریں

مینجر شباب پوسٹ بکس نمبر ۱۲۱۶ بمبئی نمبر ۳

پاگل

خلیل جبران کی شہرۂ آفاق شاہکار تصنیف کا ترجمہ ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے شذرات ہیں ننھی ننھی کہانیاں ہیں۔ جو معنوی طور پر بہت وسعت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ پاگل دنیا کا عقلمند ترین انسان ہے اور اس کی حکائتیں زندگی کے گہرے مسائل حل کرتی ہیں۔ قیمت عہ

مکتبہ اردو لاہور

چالیس سالہ تجربات کا نچوڑ

مردوں کی خفیہ جنسی امراض کے متعلق جناب کری دنو وید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما وید موجد امرت دھارا سینکڑوں نہیں ہزاروں ادویات ۴۰ سال سے بنا بنا کر مریضوں پر تجربات کر رہے ہیں قریب سوا سو اکسیریں تو اب بھی تیار رہتی ہیں۔ دوسرے اشتہاروں میں جو بھی ادویات نکلتی ہیں ان کو منگوا منگوا کر بھی تحقیقات کرتے رہے۔ کچھ دیر سے پنڈت جی ان تمام ادویات کے نفع نقصان پر جو مریضوں کے خطوط سے معلوم ہوتے یا مشاہدے میں آتے غور کر کے ایسی چند ادویات بنانے کی فکر میں تھے جو بے نظیر ہوں اور مریضان امراض مخصوصہ کی ساری خواہشیں پوری ہو جاویں غور و خوض کے بعد چند ماہ سے آپ سب کام چھوڑ کر علیحدہ بیٹھ گئے اور انہوں نے ایسی ادویات تیار کر لی ہیں۔ جن کا ثانی اس وقت تو معلوم نہیں ہے آئندہ کی خدا جانے!

ضرورت مند اصحاب

ان ادویات کے متعلق مفصل جاننے کے واسطے مندرجہ ذیل فارم پر کر کے تین پیسہ کے ٹکٹ برائے ڈاکخرچ ساتھ رکھ کر بھیجدیں! لفافہ پر پتہ صرف امرت دھارا ۴۲ لاہور لکھ دیجئے!

بخدمت جناب منیجر صاحب امرت دھارا ۴۲ لاہور

آپ براہ مہربانی ایک کاپی کیا رسالہ امراض مخصوصہ مرداں مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجدیں۔ میں شادی شدہ ہوں اور اپنی ضرورت کے واسطے منگواتا ہوں۔

نام خوشخط ________________

پورا پتہ ________________
____

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہو جائیں گے

سائنس کی حیرت انگیز ایجاد جو سیاہ اور بدنما جلد کو سفید اور دلکش بنا دیتی ہے

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہو جائیں گے۔ یہ فلوروزون کی مشہور فرم کا دعویٰ ہے۔ جو گذشتہ کئی برسوں سے اس معاملہ کی ریسرچ کر رہی تھی۔ اس ایجاد سے ہر ایک شخص گورا ہو سکتا ہے۔ یہ گھر دفتر ازدواجی زندگی اور سوسائٹی میں عزت اور مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ رات کو سوتے وقت فلوروزون کے چند قطرے ہتھیلی پر ڈال کر چہرے پر دو چار منٹ مالش کیجئے۔ صبح چہرے کو نیم گرم پانی سے دھو ڈالئے۔ متواتر چار ہفتہ ایسا کیجئے۔ اور اس کے بعد آئینہ میں اپنی شکل دیکھئے۔ آپ حیران ہو جائیں گے۔ وہ چہرہ جو سیاہ گندمی رنگ کا تھا یا کیل مہاسے اور چھائیاں وغیرہ اور جھریوں سے بدنما ہو رہا تھا۔ چاندی کی طرح سفید، سیب کی طرح سرخ اور بہار کی طرح حسین اور دلکش ہو گیا ہے۔ کیل مہاسے چھائیوں وغیرہ کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ اور بدنما مرجھائے ہوئے چہرے پر پھر سے جوانی اور بہار آ گئی ہے۔ فلوروزون سائنس کی حیرت انگیز ایجاد ہے۔ اس کے ہر قطرے میں لزوزن زتیزا آکسیجن گیس سائنٹیفک طریقوں سے شامل کی گئی ہے۔ جو جلد کی سیاہی کو اپنے آپ میں جذب کر لیتی ہے اور جب آپ سوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت آپ کے چہرے کی سیاہی، کیل مہاسے چھائیاں وغیرہ آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہیں۔ اور چار ہفتوں میں بدنما چہرہ حسین اور دلکش ہو جاتا ہے۔ ہر ایک مرد و عورت اس سہل سائنٹیفک ایجاد سے دائمی خوبصورتی اور جاذبیت حاصل کر سکتا ہے۔ فلوروزون کے استعمال کے بعد عارضی خوبصورتی حاصل کرنے کے لئے کریم پوڈر وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فلوروزون چہرے کے علاوہ جسم کے ہر ایک حصہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ قطعی بے ضرر ہے۔ فلوروزون مکمل کورس تین روپے آٹھ آنے میں ملتا ہے۔

ہندوستان کے ہزاروں مرد و عورتیں فلوروزون سے فائدہ اٹھا چکے ہیں

ڈاک خرچ الگ۔

تیار کنندگان:- فلوری کیمیکل انڈسٹریز

ہندوستان کے نمائندگان:- فلوروزون ڈپو۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۷۳ (A.L.R.) بمبئی

پاکستان اَور چھُوت

بزبان انگریزی

مصنفہ۔ چودھری افضل حق

انگریزی زبان میں یہ کتاب ہندو مسلم تعلقات کو ایک اچھوتے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ یہ تحریر ہندوستان سے دُور بیٹھے کسی مبصر کا بیان نہیں بلکہ اس شخص کے خیالات ہیں جس کی عمرِ عزیز وطن کی خاطر تکلیفوں میں گذری۔ چودھری صاحب کی یہ چوتھی بار جیل یاترا ہے۔ یہ کتاب اس بار جیل میں لکھی گئی۔ ہندوستان میں تحریکاتِ آزادی کیوں ناکام رہیں۔ اسمیں ان اسباب پر بحث ہے۔ یہ کتاب چھوت اور پاکستان پر سیر حاصل تبصرہ ہے چونکہ یہ ایک ذمہ دار شخص کے فکر کا نتیجہ ہے۔ اسلئے ملکی اخبارات نے اس کو بہت اہمیت دی ہے۔ ماڈرن ریویو نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جس قدر کتابیں پاکستان کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے سب پر فائق ہے۔ خیالات کے لحاظ سے نہیں بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی یہ کتاب بلند پایہ [illegible]

ٹوٹے ہوئے تارے

کرشن چندر کے افسانوں کا نیا مجموعہ

کرشن چندر اردو زبان کا رومان پسند افسانہ نگار ہے۔ ٹوٹے ہوئے تارے میں آپ کے شاہکار افسانے شامل ہیں قیمت عہ

گرہن

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں زندگی کی تصویر ہوتی [illegible] اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ دانہ و دام کے نام سے شائع ہو چکا [illegible] دوسرا گرہن کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ (زیر طبع)

بگولے

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا مجموعہ

احمد ندیم قاسمی دیہاتی زندگی کا بہت بڑا عکاس ہے۔ اس کے افسانے ہندوستان کی کثیر آبادی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شہر اور دیہات میں بسنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے (زیر طبع) [illegible]

سیرتِ امام ابن تیمیہ

مولانا شبلی فرماتے ہیں۔ مجددیت کی جس قدر خصوصیتیں امام کے وجود مبارک میں جلوہ گر ہیں۔ اُن کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے۔ اور ریفا[illegible] یا مصلح و مجدد کا اگر کوئی اصلی مصداق ہو سکتا ہے تو وہ ابن تیمیہ ہیں۔ سیر[illegible] امام ابن تیمیہ مصنفہ پروفیسر غلام جیلانی برق ایم۔ اے، پی ایچ ڈی قیمت مجلد [illegible]

نئے زاویئے

جدید ہندوستانی ادب کے ہر مدرسۂ فکر کو آپ اس میں پائیں گے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں، شاعروں اور مقالہ نویسوں کے خیالات کا اہم [illegible]

مرتبہ کرشن چندر ——— قیمت مجلد عہ

ہندوستانی ادب کے موجودہ دَور کے ہر بڑے مصنف کی تحریر اس کتاب میں موجود ہے۔

مکتبہ اُردو لاہور

Regd. L. No. 3521

... قیمت ۲ روپیہ آٹھ